۷

خطباتِ حکیم الامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کی مؤثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ

دنیا و آخرت
صحیح مقصد
دنیا
دنیا کی مسافرانہ زندگی
دنیا پسندی
دنیا پر مطمئن ہونا
دنیاوی ساز و سامان
فانی
باقی
دنیا اور آخرت
فکر آخرت
تجارت آخرت
آخرت کی یاد
دنیا پر آخرت کی ترجیح
سعادت مند کا مقام

زمزم بک ڈپو دیوبند

خطباتِ حکیم الامّت جلد نمبر ۷

دُنیا و آخرت

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرۃ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

کی

مؤثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ

زمزم بکڈپو دیوبند

تفصیلات

نام کتاب ------ دُنیا و آخرت

مصنف ---- حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

باہتمام ------ اسعد واجدی

سنِ طباعت----- اپریل ۱۹۹۶ء

قیمت

ناشر

زمزم بُک ڈپو دیوبند

وَفَرِحُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي
الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ۔

لوگ دنیوی زندگی پر اتراتے ہیں
حالانکہ دنیوی زندگی آخرت کے
مقابلہ میں ایک حقیر سودا ہے۔

ترتیب مواعظ

تفصیل عنوانات

۴۔ الرضا بالدنیا، دنیا پسندی

۵۔ الاطمینان بالدنیا، دنیا پر مطمئن ہونا

پیش لفظ

انسان جس طرح چار چیزوں کا مرکب ہے۔ اسی طرح اس کی زندگی بھی چار حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا ہر حصہ دوسرے حصہ کا دیباچہ، خلاصہ اور عکاس ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اسے شکم مادر کے اندر جنینی زندگی سے گزرنا ہوتا ہے اور وہ ایک ناپاک، غلیظ اور حقیر قطرۂ آب سے اپنا سفر زندگی شروع کرتا ہے۔ اس کی زندگی اس کی پیدائش سے بہت پہلے شروع ہو چکی ہوتی ہے۔

- ڈاکٹر ہربرٹ ٹومس اور بروس بلیون کی تحقیقات کے مطابق اس کی پیدائش سے ۸ ماہ قبل اس کے قلب کی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔
- ۶½ ماہ قبل اس کی شکل و صورت اور جسم کی تشکیل ہو چکی ہوتی ہے۔
- ۵ ماہ قبل تک اس کا نظام عصبی مکمل طور پر تیار ہو چکتا ہے۔
- ۴ ماہ قبل باقاعدہ تنفس تو نہیں لیکن سانس سے ملتی ہوئی چیز کیلئے اس کے سینے میں حرکت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور وہ ان ارتقائی منازل کے دوران میں عالمی ادارۂ صحت (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) کے دو ماہرین فن کی رائے کے مطابق پیدائش سے قبل ہی غذا کھانے لگتا ہے اور جس وقت وہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت اس کی عمر غذائی اعتبار سے نو ماہ کی ہو چکی ہوتی ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس طرح اس دنیا میں خورد و نوش کے معلوم و معروف طریقے رائج ہیں، ماں کے پیٹ کے اندر ان میں سے کسی کا بھی انتظام نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود اس کا خالق اسے اس تنگ و تاریک کوٹھڑی کے اندر غذا بہم پہنچاتا ہے اور وہ پیدائش سے قبل مردہ یعنی محض گوشت پوست کا ڈھانچہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے اندر بھی زندہ ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سکیڑتا ہے، پھیلاتا ہے اور سر کو جنبش دیتا ہے جسے ہر حاملہ عورت بآسانی محسوس کرتی ہے۔

اس جنینی زندگی کے دوران میں مولانا رومؒ کے خیال کے مطابق اگر کوئی اُسے یہ جا کر کہے کہ
"تیری اس تنگ اور محدود دنیا سے باہر ایک بڑی ہی وسیع اور گلزار دنیا آباد
ہے۔ اس میں ہر نعمت حاصل ہے اور وہاں بے انتہا کھانے والے موجود ہیں۔
اس زمین میں بڑے بڑے اُونچے پہاڑ ہیں، موجیں مارتے ہوئے دریا اور سمندر
ہیں۔ لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ باغ ہیں، چمن ہیں۔ سبزہ ہے
اور پھر سب سے اونچا آسمان اور چمکتا ہوا سورج، دمکتا ہوا چاند اور
جھلمل کرتے ہوئے ستارے ہیں۔ پروا، پچھوا کی خوشگوار ہوائیں ہیں نسیم
سحر کے جھونکے ہیں۔ گل و گلزار کے تختے اور چمن ہیں۔ غرضیکہ اس لق و
دق اور پُر بہار دنیا کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ تو ان سب کو
چھوڑے ہوئے اس تنگنائے رحم میں نجاستوں میں لتھڑا ہوا کہاں
پڑا ہے"؛ تو وہ ہرگز اس صدا پر کان نہ دھرے گا اور الٹا انکار و
تکذیب پر تل جائے گا اور کہنے لگے گا کہ یہ سب دھوکے اور مکر کی
باتیں ہیں، ایسا بھلا کہاں ہو سکتا ہے؟"

تو لازمی بات ہے کہ آپ اُس کے اس جواب پر ہنس پڑیں گے اور کہیں گے کہ یہ ابھی کم عقل ہے، نادان ہے۔ اس لئے اس کی محدود عقل، لامحدود کائنات کا احاطہ تو بجائے خود رہا اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتی اور اُسکا ہمارے مشاہدہ و حال کی تردید کرنا محض نادانی ہے۔ ورنہ اُسے کوئی بات خلافِ واقعہ نہیں بتلائی گئی بلکہ جو کچھ بتلایا گیا ہے، وہ صحیح اور سچ ہے۔

۲۔۔۔ جنینی زندگی سے گزر کر انسان جب ناسوتی زندگی کے دور میں داخل ہوتا ہے، تو وہ خود بخود محسوس کرنے لگتا ہے کہ واقعی وہ اس سے قبل قید و بند کی دنیا میں زندگی گزار رہا تھا جس کا اس ناسوتی زندگی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لیکن جب اُسے بتلایا جاتا ہے کہ اس ناسوتی، عنصری جسم کی شکست و ریخت کے بعد اُسے برزخی زندگی اور اُسکے بعد اُخروی زندگی بھی پیش آتی ہے جس کی بے اندازہ وسعتوں اور نعمتوں کے مقابلہ میں یہ ناسوتی زندگی تم کو بالکل جنینی زندگی کی طرح تنگ و تاریک او[...] نظر آئے گی اور اصل زندگی وہی زندگی ہو گی۔ سر دست تم محض سفرِ زندگی میں ہو

تو وہ پھر اپنی کم عقلی اور نادانی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ باتیں ماننے سے انکار کر دیتا ہے اُنہیں جھٹلاتا ہے اور اُنکا تمسخر اُڑاتا ہے۔ حالانکہ قدرت اُسے شب و روز برزخی اور اُخروی زندگی کا نمونہ اسی ناسوتی زندگی میں دکھلاتی رہتی ہے، مگر یہ اس طرف بھول کر بھی دھیان نہیں دیتا اور اسی عارضی اور فانی زندگی کو ہی حاصل زندگی سمجھتا ہے۔

۳ برزخی زندگی کا دور موت کے بعد شروع ہو کر قیام قیامت پر ختم ہوتا ہے اس عالم کی مثال بالکل عالم خواب کی سی ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں کہ:

"سوتے میں خواب ہم سب دیکھتے ہیں۔ ان کا خلاصہ کیا ہے؟ یہی ہے۔ کہ ہم لیٹے تو یہاں ہوتے ہیں، لیکن اپنے کو چلتے پھرتے، بولتے چالتے، لکھتے پڑھتے، ہنستے کھیلتے، اُٹھتے بیٹھتے، لڑتے جھگڑتے، روتے چلاتے، کہیں اور ہی پاتے ہیں۔ اور دور بہت دور کبھی سینکڑوں اور کبھی ہزاروں میل دور، جسم یہیں پڑا ہوتا ہے اور وہ بھی بے حس و حرکت اور بظاہر ہر طرح غافل اور بے خبر، لیکن ہم کہیں اور ہی اپنے آپ کو بے تکلف ہر قسم کے جسمانی افعال میں مشغول پاتے ہوتے ہیں، کہیں کسی دکان پر خریداری کر رہے ہیں، کہیں کسی مسجد میں نماز پڑھ رہے۔ کہیں کسی ملک میں سفر کر رہے ہیں۔ ریل سے، جہاز سے، ہوائی جہاز سے اور یہ سب بالکل اور بعینہٖ اسی طرح جیسے بیداری میں کرتے ہوتے ہیں۔

خواب کو بھی چھوڑیئے۔ خیال کے تصرفات بھی کچھ کم عجیب اور کچھ کم غیر واقع ہیں ہ؟ بیٹھے ہم لکھنؤ میں ہیں اور خیال کلکتہ کا آگیا۔ بس پل بھر میں گویا وہاں پہنچ گئے اور اب سارا کاروبار وہیں کر رہے ہیں۔ لندن، نیویارک ٹوکیو کا فاصلہ خیال کے آگے کوئی فاصلہ ہی نہیں اور لیجئے! چشم تصور سے ادھر کام لیا اور ادھر آناً فاناً مریخ و مشتری، چاند و سورج، عرش و کرسی کے مقامات پلک جھپکنے میں طے کر ڈالے۔

یہ تجربے آخر روز مرہ اور ہر وقت کے ہیں یا نہیں؟ پھر یہ کیا سارے

تجربے لا حاصل رہنے والے اور بلا بلا چلے جانے والے ہیں، یہ ساری مشقیں کار ساز فطرت کی طرف سے زندگی ہی کی ایک دوسری منزل کے لئے کرائی جا رہی ہیں۔ اس ناسوتی زندگی کے معاً بعد جس عالم سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ اس کی فضائے لطیف میں جسم و مادہ کی یہ کثافت کام نہ آئے گی۔ یہ جسم اسی مادی عالم میں پڑا رہ جائے گا۔ یہاں کی خاک میں مل جائے گا یا یہاں کے پانی میں تحلیل ہو جائے گا۔ باقی اس کے اندر جو جوہر لطیف روح کے نام سے مقید ہے۔ وہ برزخ کے عالم لطیف (برزخی زندگی) میں دوڑنے پھرنے کے لئے تمام تر آزاد ہو جائے گا۔ اس کے لئے نہ فاصلہ کوئی معنی رکھے گا نہ بعد مسافت۔ وہ ایک ہی وقت میں یہاں بھی ہو سکے گا اور وہاں بھی۔ پل بھر میں وہ مشرق بھی ہو آئے گا اور مغرب بھی۔ روح کے لئے اس کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے۔"

صدق جدید ۳۱ مئی ۱۹۵۷ء

اب اس ناسوتی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ یہ قدم قدم پر اُخروی، ابدی اور حقیقی زندگی کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس ناسوتی دنیا میں نہ کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے ———— وہ کچھ عرصہ یہاں کی ہوا کھانے کے بعد لازمی طور پر ایک وقت مقررہ پر یہاں سے موت کے راستے ایک دوسری دنیا کو چلا جاتا ہے۔ گویا یہ دنیا مانند سرائے ہے، جس میں ہر شخص کا قیام وقتی اور عارضی ہے، لیکن حضرت انسان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود عاقبت نااندیشی اور نفس پرستی کے ماتحت یہاں مستقل رہائش کے سامان کئے ہوئے ہے۔ اسی ناسوتی زندگی پر حصر کئے ہوئے ہے۔ اسی سے دل لگائے ہوئے اور جب اس کے سامنے کوئی دوسری دنیا کو جا رہا ہوتا ہے تو وہ بزبان حال یہی کہتا ہے کہ یہ موت کا جام تلخ گویا صرف اسی کے لئے تھا۔ جو لُٹے پٹے بے حس و حرکت جا رہا ہے اور اُس کا اس سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔ لیکن جب اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر درپیش آجاتا ہے تو سفر کی ضروریات کے مطابق صرف چند چیزیں اپنے

المراد
صحیح مقصد

ملقب بہٗ

تمییز المرغوبۃ من المرہوبۃ

اندیشہ ناک اور مرغوب اشیاء میں امتیاز

دنیا و آخرت کو مراد بنانے کے آثار و احکام کے متعلق یہ وعظ جمعۃ المبارک مورخہ ۵ رجادی الاولیٰ ۱۳۲۴ھ کو مراد آباد کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر قریباً پانچ ہزار سامعین کو سنایا گیا۔ جس پر ۲ گھنٹے اور ۵ منٹ لگے اور جسے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی نے قلمبند فرمایا۔ اس وعظ کے نام کی نسبت تو شہر کے نام سے ہے اور لقب کی نسبت ایک لڑکی کے نام سے ہے۔ جس کے نکاح کی تقریب پر یہ وعظ ہوا۔ جو اس خوش بخت کے عقد کی تاریخی یادگار ہے۔ اس وعظ کا کچھ حصہ نمازِ جمعہ سے قبل ہوا اور کچھ بعد نماز۔

فی نفسہٖ نہ کوئی شے بُری ہے نہ اچھی۔ یہ اپنے حسن و قبح میں اپنے مضاف الیہ یعنی مراد پر موقوف ہے۔ اگر اچھے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ عمدہ ہے اور بُرے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ بُرا ہے، کسی عمل پر جزا و سزا بدون ارادہ کے مرتب نہیں ہوتی اور ارادہ پر بدون عمل کے بھی گناہ و ثواب لکھا جاتا ہے، لیکن اگر بدون ارادہ کے کوئی گناہ بھول چوک سے ہو گیا تو وہ معاف ہے، جس کے لئے حق تعالےٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولٰنا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا ما نشآء لمن نرید ثم جعلنا لہ جہنم یصلٰہا مذموما مدحورا۔ ومن اراد الاٰخرۃ وسعٰی لہا سعیہا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیہم مشکورا۔ کلا نمد ھٰؤلاء وھٰؤلاء من عطاء ربک وما کان عطاء ربک محظورا۔ انظر کیف فضلنا بعضہم علٰی بعضٍ وللاٰخرۃ اکبر درجٰتٍ واکبر تفضیلا۔

مقصود بیان

اس وقت جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں۔ سب کا بیان کرنا مدنظر بھی نہیں مقصود صرف اول کی دو آیتوں کی بابت کچھ عرض کرنا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہٗ نے دو ارادوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک ارادہ دنیا، دوسرا ارادۂ آخرت اور ساتھ ساتھ دونوں کے ثمرات بھی مذکور ہیں۔ یہ مضمون اگرچہ بارہا کانوں میں پڑا ہوگا، مگر اب تک اسکو سرسری طور سے سنا گیا اور یہی وجہ ہے اُس کے مؤثر نہ ہونے کی۔ کیونکہ اگر مؤثر ہوا ہوتا تو اُس کے علامات و آثار موجود ہوتے۔ اس وقت اس مضمون کو اسی لئے اختیار کیا گیا ہے کہ جو اثر اس کا ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ابھی تک نہیں ہوا اور اس کے ضروری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا اس لئے اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ اس کو سرسری نہ سمجھا جاوے اور مثل سابق بیانات کے اس کو بے توجہی سے نہ سُنا جائے کیونکہ اس طرح سُننا نہ سُننا برابر ہے۔ کسی مضمون کا کانوں میں پہنچنا اس کا نام نہیں ہے کہ اس کو بے توجہی کے ساتھ سُن لیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں کفار کے بارہ میں جا بجا ارشاد ہے کہ یہ قرآن کو سُنتے نہیں۔ بہرے ہیں، حالانکہ آواز تو اُن کے کانوں میں بھی پہنچتی تھی، بلکہ سُننا اس کا نام ہے کہ مضمون سُن کر اس میں تدبر کیا جائے۔ پھر عمل کیا جائے۔ سورہ صٓ میں صاف صاف مذکور ہے کہ ہم نے قرآن تدبر و تذکر ہی کے واسطے نازل کیا ہے۔ قال تعالےٰ۔

کتاب انزلناہ الیك مبارك لیدبروا
ایاتہ ولیتذکر الوالالباب

اور بھی جا بجا قرآن شریف میں تدبر نہ کرنے کی شکایت ہے۔

افلا یتدبرون القرآن؟

ہم لوگوں میں بڑی کمی یہ ہے کہ قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے۔ اس کا مطلب لوگ یہ سمجھے ہوں گے کہ ترجمہ قرآن دیکھنا چاہیئے۔ مگر صرف اتنا کافی نہیں کیونکہ جو لوگ ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں۔ اُن میں بھی یہ کمی موجود ہے کہ وہ تدبر نہیں کرتے محض سرسری طور پر اُس کو پڑھ جاتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ پھر کیا مطلب ہے۔ کیا سب مسلمانوں کو مولوی بن جانا چاہیئے۔ نہیں صاحبو! میں آپ کو مولوی بننے کی صلاح نہیں دیتا۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن میں سے جو ضروری حصہ عمل کے لئے علماء نے مدون کر دیا ہے۔ جس کا نام علم عقائد و علم اخلاق و علم فقہ ہے، آپ لوگ اس میں توجہ نہیں کرتے۔

تدبّر فی القرآن

قرآن میں تدبر کرنے کے یہی معنی نہیں کہ قرآن سامنے رکھ کر ہی اس میں غور کیا جائے بلکہ یہ بھی تدبر فی القرآن میں داخل ہے کہ جن کتابوں میں مضامین قرآن مذکور ہیں۔ اُن میں غور و محنت سے کام لیا جائے۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں میں ترجمہ نہ جاننا کوئی کمی نہیں کیونکہ ترجمہ قرآن ہر شخص نہیں جان سکتا۔ اس لئے کہ ہر شخص کو مولوی بننا تو دشوار ہے، اور جو طریقہ مشہور ترجمہ دیکھنے کا ہے کہ قرآن مترجم لے کر دیکھ لیا۔ اُس کو میں خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ طریقہ ناکافی ہے۔ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجمہ اُردو کا مطالعہ بھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ طریقہ ناکافی ہے۔ اس کو چھوڑ دیا جائے واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ترجمہ دیکھنے والوں کو بہت سے مضامین کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ بہت سے مضامین کا سمجھنا مبادی پر موقوف ہوتا ہے اور مبادی قرآن صرف و نحو و بلاغت و ناسخ و منسوخ و اصول و فقہ وغیرہ ہیں۔ جب تک کوئی شخص مبادی سے جاہل ہے۔ وہ ان مضامین کو کس طرح سمجھ لے گا جو کہ ان پر موقوف ہیں۔

پھر مصیبت یہ ہے کہ آج کل پوچھنے کی عادت بھی لوگوں میں کم ہے۔ اگر کہیں شبہ پڑتا ہے تو اکثر تو اپنی رائے سے اس کا مطلب تراش لیتے ہیں۔ جس سے اکثر عقیدے فاسد ہو جاتے

ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عوام کو مضامین قرآن سے فیض یاب ہونے کا کوئی طریقہ نہ رہا۔ اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ جو کتابیں سلیس مضامین میں لکھی گئی ہیں۔ اُن کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کیا جائے۔ نیز جو لوگ مضامینِ قرآن اور علوم حقہ اپنے وعظ میں بیان کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا وعظ غور سے سنا جائے۔ علاوہ ازیں نفس ترجمہ قرآن سے منتفع ہونے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ آج کل دوقسم کے آدمی ہیں۔ ایک وہ جن کو تحصیلِ علوم کے لئے فراغت مل سکتی ہے۔ اُن کو تو چاہیئے کہ بنامِ خدا اول مبادی قرآن محنت سے حاصل کریں، پھر ترجمہ قرآن دیکھیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں، جن کو اس قدر فراغت میسر نہیں ہوسکتی۔ اُن کو چاہیئے کہ پہلے کسی معتبر عالم سے مشورہ کریں کہ مجھے ترجمہ قرآن کون سا لینا چاہیئے۔ کون سا ترجمہ قرآن صحیح اور معتبر ہے اپنی رائے سے خود تعیین نہ کریں۔ لوگوں نے آج کل تراجم کے لئے خود ہی ایک معیار مقرر کرلیا ہے۔ مگر اس معیار کا غلط ہونا میں ابھی ثابت کردوں گا۔

ٹکسالی تراجم

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ٹکسالی ترجمہ ہے کہ بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ مگر بوجہ زبان بدل جانے کے اور نیز بعض میں محاوراتِ زبان کی رعایت نہ کرنے کے وہ پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ خیر پھیکے ہوا کریں۔ مگر جو مقبولیت اُن کو حاصل ہے، وہ دوسرے ترجموں کو حاصل نہیں۔ یہ اُن حضرات کے خلوص کی برکت ہے۔ آج کل لوگوں نے عمدہ ترجمہ کا معیار یہ قرار دے رکھا ہے کہ رنگین عبارت ہو۔ کیوں صاحبو! اگر دو حکیم ہوں جن میں سے ایک تو ماہر ہے مگر وہ نسخہ پھیکا لکھتا ہے اور دوسرا حکیم بڑی رنگین عبارت سے نسخہ لکھتا ہے۔ مگر ماہر نہیں ہے۔ انصاف سے بتلایئے کہ کس کے نسخہ کی آپ قدر کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ماہر فن کے نسخہ کی ہر شخص قدر کرے گا اور اُس کے مقابلہ میں اُس غیر ماہر کے رنگین نسخہ کو کوئی بھی نہ پوچھے گا اور یہی کہا جائے گا کہ ہم کو مقصود علاج کرنا اور دوا کا استعمال کرنا ہے اس رنگینی کو لے کر کیا پھونکیں۔

صاحبو! اگر ہم قرآن کو کتاب علاج روحانی سمجھتے تو تراجم کے اندر بھی اسی بات کو ملحوظ

کرتے کہ کون سا ترجمہ ماہر فن کا ہے کہ اس کو معتبر جان کر اس پر عمل کیا جائے اور کون سا غیر ماہر کا ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ وہ کیسا ہی رنگین کیوں نہ ہو۔ کیونکہ مقصود تو عمل ہے اور اس میں رنگینی عبارت کو کوئی بھی دخل نہیں۔ مگر ہم لوگ قرآن کو قصہ کہانی کی کتاب سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ جب ہی تو رنگین ترجموں کی قدر ہوتی ہے۔ اگر ترجموں کے مطالعہ سے مقصود عمل ہوتا تو رنگینی پر نظر نہ ہوتی، بلکہ مقصود پر نظر ہوتی۔ اگر رنگین عبارت دیکھنے کا شوق ہے تو اس کے لئے ترجمہ قرآن کا کیوں انتخاب کیا جاتا ہے۔ عمدہ زبان تو قصہ چہار درویش کی ہے اُس کا مطالعہ کر لیا کیجئے۔ ترجمہ قرآن کو خوامخواہ کیوں تکلیف دی۔ غرض صحیح معیار عمدہ ترجمہ قرآن کا یہ نہیں جو آج کل عوام کا مذاق ہو گیا، بلکہ صحیح معیار وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ معتبر ماہر فن کا ترجمہ لیا جاوے۔ پھر اس کو کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جاوے۔ بدون اس کے ترجمہ دیکھنا کافی نہیں۔

اسی طرح ترجمہ سمجھنے کے لئے محض ادب دانی کافی نہیں۔ آج کل لوگوں میں یہ بھی بڑی کوتاہی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ جو عربی میں تقریر و تحریر کر لیا کریں اور اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ مگر قرآن سمجھنے کے لئے محض ادب دانی کافی نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ اگر قانون کی کتاب ایک شاعر سے پڑھی جائے۔ جس کی زبان بہت عمدہ ہے۔ مگر قانون سے اُس کو مس نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جو زبان دانی میں حصہ کم رکھتا ہے مگر قانون سے پورا واقف ہے۔ اب اگر کتاب قانون کی کسی عبارت میں دونوں کا اختلاف ہو شاعر کچھ مطلب بیان کرے اور قانون دان وکیل کچھ اور کہے۔ عقلاء زمانہ انصاف سے بتلائیں کہ اس صورت میں کس کا قول قابل ہو گا۔ ظاہر ہے کہ قانون دان وکیل کے سامنے زباندان شاعر کا قول ایک کوڑی کو بھی نہ پوچھا جائے گا۔ زبان آجانے سے فن سہل نہیں ہو سکتا۔

ضرورتِ اُستاد

اس لئے ترجمہ پڑھنے کے لئے کسی قانونِ شریعت جاننے والے مولوی کو منتخب کیا جائے اور اس سے تمام ترجمہ پڑھ لیا جائے اور یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جب قرآن کا اُردو میں ترجمہ ہو گیا

ہے تو اب اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو خود ہماری زبان ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ترجمہ سے صرف عربی ترکیب اور لغات حل ہو جائیں گے۔ مگر قرآن کوئی مقامات حریری تو نہیں کہ صرف حل ترکیب ولغات اس کے معنے سمجھنے کے لئے کافی ہو جائے۔ قرآن میں تو بڑے بڑے علوم یعنی عقائد وتزکیہ اخلاق وفقہ مذکور ہیں۔ جب تک ان کو نہ بیان کیا جائے۔ اس کا مطلب حل نہیں ہو سکتا اور جو شخص ان علوم سے خود ہی واقف نہیں اور نہ کسی واقف سے پڑھتا ہے۔ وہ اگر خالی ترجمہ دیکھے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ مرجیہ وقدریہ کا ہم عقیدہ ہو جائے کیونکہ ہر فن وہر کتاب کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں، جو محض ترجمہ سے بدون استاد کے بتلائے حل نہیں ہو سکتیں۔ یہ شخص قرآن کا مطلب ویسے ہی سمجھے گا۔ جیسا کہ کسی شخص نے گلستاں کے اس شعر کا مطلب سمجھا تھا

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی !

اس شخص نے بھی اس شعر کا محض ترجمہ دیکھا تھا کہ دوست وہ ہے کہ پریشان حالت وخستگی میں دوست کا ہاتھ پکڑے۔ اس نے ترجمہ ہی پر عمل کیا کہ ایک روز کسی موقع پر اپنے ایک دوست کو پٹتے ہوئے دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ دشمن نے اوجی کھول کر اسے پیٹا۔ اس نے ہر چند ہاتھ چھڑائے، مگر اس نے نہیں چھوڑے، جب وہ خوب پٹ چکے اور مارنے والے نے بھی ہار کر چھوڑ دیا تو اس دوست کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اس نے اسے بہت برا بھلا کہا، کہ ایسے وقت میں امداد تو نہ ہو سکی اور الٹا دوستی کا یہ حق ادا کیا کہ میرے ہاتھ بھی پکڑ لئے۔ اب یہ حیران ہے کہ میں نے تو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے کے موافق دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ یہ خفا کیوں ہوتا ہے اور اس سے کہا کہ بھائی! میں نے تو دوستی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میں نے تو وہی کیا جو گلستاں میں شیخؒ فرماتے ہیں۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

تو صاحبو! اس شخص نے ترجمہ میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ البتہ ایک کمی تھی کہ جائے استاد خالی ست۔ اس نے ترجمہ خود ہی دیکھا تھا، کسی سے پڑھا نہ تھا۔ بس جب گلستاں سمجھنے کے لئے باوجود یکہ

ثواب الفاظ کا تو نہیں۔ بڑا مقصود وہی ہے کہ معنی کو سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا۔ اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ صرف ترجمہ بھی کافی نہیں۔ جب تک کہ اس میں تدبر نہ ہو۔ کیونکہ سمجھنا ہی ہے۔ جس پر اصل مقصود یعنی عمل موقوف ہے۔

اسی طرح ان آیتوں کا مضمون بھی اگرچہ کان میں پڑا ہوا ہے۔ مگر جب تک کہ تدبر نہ ہو۔ وہ سننا مفید نہیں۔ ترجمہ قرآن تو کفار بھی سمجھ جاتے تھے اور ہم سے زیادہ سمجھتے تھے، مگر اُن کو کچھ نفع ہوا؟ کچھ بھی نہیں کیونکہ اس میں تدبر نہیں کیا تھا۔ جس پر عمل مرتب ہوتا۔ سرسری طور پر سنا گیا تھا۔ اس لئے اس مضمون کو اہتمام سے دوبارہ اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں تدبر کیا جاوے اور اس کے موافق عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ثمرہ نیّت

ان آیتوں میں جن کو میں نے تلاوت کیا تھا۔ ایک بہت بڑی چیز کا ذکر ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر چھوٹی معلوم ہو۔ یعنی اس میں دنیا اور آخرت کے ساتھ ارادہ کو متعلق کرنے کا ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کا ارادہ کیا جائے تو اس کا کیا ثمرہ ہے اور آخرت کا ارادہ کیا جائے تو اس کا کیا نفع ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ غرض ان آیتوں میں ارادہ کا ذکر ہے۔ اس امر کی تعیین کے بعد آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ واقعی یہ ایسی چیز ہے، جس کو ہم بہت ہی معمولی اور سرسری سمجھتے ہیں، مگر یہ سرسری چیز ایسی ہے۔ جیسے گھڑی کی بال کمانی کہ دیکھنے میں تو ذرا سی چیز ہے۔ مگر گھڑی کے چلنے کا دار و مدار اسی پر ہے اور وجہ اس بے قدری کی یہ ہے کہ ارادہ ایک موجود غیر حسی ہے۔ اس لئے ہم کو اس کی قدر نہیں۔ مگر واقع میں فکر و ارادہ وہ چیز ہے۔ جس کے ترک کر دینے سے ہمارے سب حال بگڑ گئے اور بہت سے اللہ والوں کے حالات و مقامات اس کی بدولت درست ہو گئے۔ صاحبو! ارادہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس کو حقیر نہ سمجھا جاوے۔ دنیا کے بھی سارے کام اس کی بدولت چلتے ہیں۔ یہ بہت بڑی قوت ہے جو انسان میں رکھی ہوئی ہے۔ ایک مثال سے آپ اُسکو واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص کو جاڑے کے موسم میں اس حالت میں کہ بارش بھی ہو رہی ہے

اس کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا۔

غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس کی کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا کہ سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں، کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لئے، اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی، دوسری تدبیر پوچھیں گے۔ اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لئے اور تدبیر پوچھیں گے۔ اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ بس سہولت کی فکر نہ کیجئے۔ بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک دفعہ پختہ عزم کر لیجئے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو، ہرگز نگاہ اوپر کو نہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کر لیجئے۔ اس ترکیب سے انشاء اللہ مرض زائل ہو جائے گا۔ اس کے بدون زوال ممکن نہیں۔ وہ کہنے لگا کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں، ہمت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں۔ وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہٗ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے:

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔	کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہے۔

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم۔	کہ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں۔

ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ نیچی کرنے پر بندہ قادر ہے۔ اسلئے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا حکم ہے اور ان کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میرے سامنے تو وہ اس دلیل میں تاویلیں نکالتے رہے۔ مگر گھر جا کر جو انہوں نے اس میں غور کیا تو خط آیا کہ واقعی میں غلطی پر تھا۔ انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے۔ البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر عادت ہو جاتی ہے۔

صاحبو! انسان میں ارادہ وہ قوت ہے کہ اس کے ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آسکتا ہے۔ صاحبو! تمہارے ساتھ دو لشکر ہیں۔ ایک ملائکہ کا اور ایک شیاطین کا اور ان دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ ایک چاہتا ہے کہ تم کو بدی سے بچائے۔ دوسرا چاہتا ہے کہ تم کو گناہ میں پھنسائے اور ان لشکروں کی ہار جیت تمہارے ارادہ پر موقوف ہے جس کی طرف تمہارا ارادہ ہو جاوے وہی غالب ہو جائے گا۔ اگر آپ نے گناہ کا ارادہ کر لیا تو لشکر ملائکہ پسپا ہو گیا۔ اب وہ غالب نہیں ہو سکتا اور اگر گناہ سے بچنے کا ارادہ کر لیا تو لشکر شیطان مغلوب ہو گیا۔ اب وہ کبھی غلبہ نہیں کر سکتا۔ افسوس! آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں۔

ظلمتِ معصیت

صاحبو! آپ عاجز ہرگز نہیں۔ ہاں یوں کہئے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں۔ گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل میں ہے۔ اس میں کسی طرح کی بھی کوئی تاویل منہ سے نہیں نکلتی۔ کیونکہ دیکھئے گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کہ صرف شریعت مقدسہ میں حرام ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں۔ بتلائیے! ان گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کر رہے ہیں، جو کہ قانون کی رو سے بھی ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب اس سے اجتناب کریں گے۔ ڈاکہ کوئی نہیں مارتا، چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے یہاں تک کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے۔ کیونکہ قانوناً جرم ہے۔ کیوں صاحب اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے عیال کو بدون ڈاکہ کے پال نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اس کا یہ عذر قبول کر لے گا اور کیا اس کو سزا نہ دے گا؟ یا چور یہی عذر کرنے لگے تو کیا اس کو رہا کر دیا جائے گا؟ حاکم صاف کہہ دیتا ہے کہ ہم یہ باتیں نہیں سننا چاہتے۔ تم نے خلافِ قانون کام کیا ہے۔ تم کو پھانسی دی جائے گی۔

اے اللہ کے بندو! ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا، وہ خدا کے سامنے

کیا جائے گا اور دونوں ساتھ مل نہیں سکتے تو بتلایئے اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ظاہر ہے کہ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی اس ویران کو اختیار نہ کرے گا۔اس فیصلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ عمدہ ہی گھر لینا چاہیئے گو بعد مدت ملے۔ صاحبو! اس شخص کو تو آپ جج بن کر یہی فیصلہ سنائیں گے کہ ویران گھر کو ہرگز اختیار نہ کرے مگر جب یہی معاملہ آپ کے ساتھ ہوا تو اپنے اس فیصلہ کو بھول گئے۔

صاحبو! حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے سامنے دو گھر پیش کر دیئے ہیں۔ایک دنیا جو کہ اسی وقت مل سکتی ہے، مگر بعد چندے چھین لی جائے گی اور خراب و خستہ و فانی بھی ہے۔ دوسرا گھر آخرت ہے جو عمدہ ہے اور باقی رہنے والا ہے۔یہاں آپ نے آخرت کو کیوں اختیار نہیں کیا؟ گزشتہ مثال میں تو ایک ماہ کی بھی مہلت تھی اور یہاں تو کچھ بھی میعاد نہیں شاید "ہمیں نفس نفسِ واپسیں بود" زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ایک منٹ کا بھی بھروسا نہیں طاعون کا حال معلوم ہے کہ کس طرح دفعتہً مخلوق کا صفایا کر دیتا ہے۔کل کا مرنے والا آج کیا جانے کہ میں کب مروں گا۔وہ تو آج بہت کچھ اُمیدیں اپنے دل میں کرتا ہو گا مگر اُسے موت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ سر پر آ چکی ہے۔تو یہاں دنیا کی میعاد تو ایک مہینہ کیا ایک ہفتہ ایک دن بھی نہیں ہے۔ہر سیکنڈ میں خطرہ ہے کہ اسی وقت ختم ہو جائے تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایسا گھر جس کی اتنی کم میعاد اور فنا ہونے والا اور جس کی کوئی راحت بھی تکلیف سے خالی نہیں۔آپ نے اختیار کیا اور آخرت کو جس کے ملنے کے لئے ایک سانس کی دیر ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا اور اس میں راحت ہی راحت ہے، تکلیف کا نام بھی نہیں، آپ نے چھوڑ دی۔حالانکہ اگر ایسی صورت کوئی دوسرا شخص آپ سے پوچھنے آئے تو آپ اس کو یہی رائے دیں گے کہ خراب، خستہ، فانی چیز ہرگز لینے کے قابل نہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دنیا کو بالکل چھوڑ دیجئے۔شکایت اور افسوس تو اس کا ہے کہ اس کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے۔

غرض یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ دنیا کے ملنے کا اگر پختہ وعدہ بھی ہوتا، تب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی۔چہ جائیکہ اُس کے دینے کا پورا وعدہ بھی نہیں۔پھر حالت یہ ہے کہ

دنیائے فانی کو اختیار کرنے سے تو بعض اوقات آخرت کا حصہ بالکل نہیں ملتا۔ جیسے کہ کفار کو اور آخرت اختیار کرنے سے یہ نہیں ہوتا کہ دنیا بالکل نہ ملے۔ بلکہ آخرت اختیار کرنے والے کو دنیا بھی ملتی ہے۔ اگرچہ اتنا فرق ہے کہ آخرت والے کو دنیا کم ملتی ہے اور دوسرے کو زیادہ اور یہ فرق بھی صرف ظاہر ہی میں ہے۔ ورنہ غریب لوگ جتنا لطف دنیا کا اٹھاتے ہیں۔ امیروں کو وہ نصیب بھی نہیں۔ غریب لوگ امیروں سے زیادہ کھاتے ہیں۔ اور سب ہضم کر لیتے ہیں۔ صحت اچھی رہتی ہے۔ خوش و خرم رہتے ہیں۔ درد سر اور زکام و نزلہ کو جانتے بھی نہیں۔ امیروں کو آئے دن مسہل لینے پڑتے ہیں۔

ایک غریب آدمی کی کسی رئیس سے دوستی تھی۔ غریب آدمی بہت موٹا تازہ تھا او رئیس صاحب دبلے پتلے بیمار سے رہتے تھے۔ ایک دن اس رئیس صاحب نے اپنے غریب دوست سے کہا کہ یار یوں تو تم غریب ہو، مگر دیکھنے میں مجھ سے زیادہ موٹے ہو۔ ایسی تم کیا غذا کھاتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں تم سے زیادہ کھانا کھاتا ہوں اور ہر مہینے نیا نکاح کرتا ہوں۔ امیر نے اس کا مذاق اڑایا۔ اُس نے کہا، مذاق کی کیا بات ہے۔ کل کو تمہاری دعوت ہے۔ امیر نے قبول کر لیا اور بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے دن جب کھانے کا وقت ہوا وہ امیر صاحب غریب دوست کے گھر پہنچے تو اُس نے باتیں شروع کیں۔ باتوں باتوں میں بہت دیر ہو گئی۔ اُن رئیس صاحب نے کھانے کا تقاضا کیا۔ اُس نے ٹال دیا کہ ابھی تیار نہیں ہوا۔ ذرا سی دیر ہے اور پھر باتوں میں لگا لیا۔ یہاں تک کہ رئیس صاحب کا مارے بھوک کے بُرا حال ہو گیا اور بار بار تقاضا کیا۔ جب اس نے بُرا حال دیکھا تو یہ کہا کہ تازہ کھانا تو ابھی تیار نہیں ہوا۔ باسی روٹی رکھی ہے اور ساگ ہے۔ کہو تو لاؤں؟ اس نے کہا، جو کچھ ہو لے آؤ۔ باتیں نہ کرو۔ چنانچہ وہ باسی روٹی اور ساگ لے آیا اور ان رئیس صاحب نے اندھے باؤلوں کی طرح لے کے کھانا شروع کیا۔ ہر لقمہ پر سبحان اللہ کہتے جاتے۔ جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکے تو نفیس کھانے بھی اس نے پیش کئے۔ مگر چونکہ وہ خوب سیر ہو کر کھا چکے تھے، اب عذر کر دیا۔ اُس نے کہا کہ کھائیے یہ بہت لذیذ ہیں۔ امیر بولا بس جی! اس سے لذیذ نہیں۔ غریب دوست بولا کہ جناب وہ لذیذ کھانا یہی ہے۔ بھوک میں باسی کھانا

تو ہم کھاتے ہیں تو تمہارے پلاؤ سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تم تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے ہو۔ بھوک سے نہیں کھاتے ہو۔ میرا یہی مطلب تھا۔ وہ رئیس مان گئے کہ واقعی تم لوگ ہم سے زیادہ اچھا کھانا کھاتے ہو۔

پھر پوچھا کہ لذیذ کھانے کا مطلب تو معلوم ہوگیا۔ اب یہ بتلاؤ کہ ہر مہینہ نکاح تم کیسے کرتے ہو۔ اُس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس مہینہ میں ایک بار جاتا ہوں جبکہ طبیعت میں پوری رغبت ہوتی ہے اور شہوت جوش میں ہوتی ہے۔ تم لوگوں کی طرح روزانہ یا دوسرے تیسرے نہیں جاتا۔ بس مجھے ہر مہینے ویسا ہی لطف آتا ہے۔ جیسا کہ نئے نکاح میں آتا ہے اور تم کو تو سوچ فکر سے شہوت کو برانگیختہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے تمہیں کچھ لطف نہیں آتا۔ وہ رئیس صاحب مان گئے کہ واقعی تمہاری دونوں باتیں سچی تھیں اور تم لوگ ہم سے زیادہ لطف میں ہو تو غریبوں کو جتنا ملتا ہے، حلاوت کے ساتھ وہ اُسے کھاتے ہیں۔ ہاں! خدا اس سے تو بچائے کہ کھانے ہی کو نہ ملے اور فاقہ کی نوبت آئے، مگر جب ضرورت ملنے کے بعد غریب آدمی زیادہ حلاوت سے کھاتا ہے۔ کام کاج کر کے بھوکا تھکا ماندہ شوق و رغبت سے کھاتا ہے اور امیر لوگ تو کمیٹی اور مشورہ کے بعد کھانا کھاتے ہیں کہ پہلے خادم آیا کہ میاں کھانا تیار ہے۔ جواب دے دیا کہ بھوک نہیں۔ پھر ایک دوسرا آیا کہ حضور! فاقہ اچھا نہیں۔ کچھ تو نوش جان فرمایئے۔ یار دوستوں کے کہنے سننے کے بعد وہ کچھ زہر مار کرتے ہیں۔ کیوں کہ بے بھوک کھایا ہوا تو زہر ہی ہو کر لگے گا۔ صاحبو! اگر تم کو امیروں کی تکلیف کا حال معلوم ہو جائے تو تم امیری سے پناہ مانگو اور اگر امیروں کو تمہاری راحت کا حال معلوم ہو جائے تو وہ غریبی کی تمنا کرنے لگیں۔ مگر پہلے وہ بات پیدا کر لو جس سے غریبی میں لطف آئے یعنی قناعت اور کفایت علی الضروریات۔ آپ کو تو کھو رکھا ہے تکلف نے اور وضع نے، جس کی وجہ سے خواہ مخواہ قرض کی نوبت آتی ہے اور پریشانی رہتی ہے۔ اگر تکلف اور پابندی وضع نہ ہو بلکہ جیسا جس وقت حال ہو۔ اُسی کے موافق چال چلن ہو تو کبھی پریشانی پاس نہ آئے۔

بے تکلفی کا ایک عجیب واقعہ میں سناتا ہوں۔ ہمارے قصبہ کے قریب ایک قصبہ

غرض یہ بات واضح ہوگئی کہ آخرت کے لئے کوشش کرنے والوں کو دنیا بھی بقدر ضرورت وآسائش ملتی ہے۔ گو زیادہ نہ ملے۔ مگر وہ اس تھوڑی ہی دنیا سے وہ لطف حاصل کرتے ہیں کہ طالبان دنیا کو باوجود کثرت مال کے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا۔ مگر طلب دنیا کے ساتھ آخرت اس طرح نہیں مل سکتی تو اب بتلایئے کہ طالب دنیا ہونا عقلمندی ہے یا طالب آخرت ہونا۔ حالانکہ آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی حقیر ہے کہ اگر آخرت سے محرومی کی صورت میں اس کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی ہوتا۔ جب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی۔ چہ جائیکہ آخرت چھوڑ کر دنیا کے ملنے کا پورا بھروسا بھی نہ ہو۔ کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

من کان یرید العاجلة عجلنا لہٗ فیہا ما نشآء لمن نرید ثم جعلنا لہ جہنم یصلہا مذموماً مدحورا۔ ومن اراد الاٰخرة وسعی لہا سعیہا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیہم مشکورا۔

یعنی جو کوئی دنیائے عاجلہ کا ارادہ وطلب کرے۔ ہم اس کو دنیا ہی میں فی الحال جس قدر چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں۔ دے دیتے ہیں پھر اس کے لئے جہنم مقرر کر دیتے ہیں۔ جس میں وہ برائی اور ذلت کیساتھ داخل ہوگا اور جو لوگ کہ آخرت کا ارادہ کریں اور اس کے لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہوا کرتی ہے۔ درآں حالیکہ وہ مومن بھی ہوں، تو اُن لوگوں کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔

دنیا و آخرت

اب ذرا دونوں مضمونوں میں غور کر لیا جائے کہ طلب دنیا و طلب آخرت دونوں کے ثمرات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے۔ عجلنا لہٗ فیہا ما نشاء لمن نرید یعنی ہم طالبان دنیا میں جس کو چاہتے ہیں اور جس قدر چاہتے ہیں۔ دے دیتے ہیں، معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب ہونا ضروری ہے اور نہ یہ ضروری کہ جو وہ چاہا کریں۔ وہی مل

جائے، بلکہ جو حق تعالیٰ چاہیں گے۔ دے دیں گے۔

اور طالبان آخرت کے متعلق ارشاد ہے۔ اولٰئک کان سعیہم مشکورا۔ کہ جو آخرت کی طلب، کوشش عمل اور ایمان کے ساتھ کرتے ہیں، اُن کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔ ایمان اور سعی کی قید واقعی ہے۔ احترازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے من اراد الآخرۃ کا کہ ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں۔ ایمان اور عمل صالح میں سعی کرنے کو۔ کیونکہ اس کے بدون طلب آخرت متحقق ہی نہیں ہو سکتی ہے اور یہاں سے رد ہو گیا۔ اُن لوگوں کا جو کہ اپنے کو طالب آخرت سمجھتے ہیں، مگر عمل صالح نہیں کرتے کہ دراصل یہ لوگ طالب آخرت ہی نہیں۔ طلب کے لئے علامت بھی چاہیئے۔ طلب آخرت کی علامت یہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے اور میں نے یہ مضمون کہ سعی لہا سعیہا وھو مؤمن قید واقعی ہے، اس لئے بیان کیا تاکہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں جو ثمرہ ارادہ آخرت کے متعلق مذکور ہے۔ وہ صرف ارادہ کا ثمرہ کہاں ہے۔ بلکہ سعی اور ایمان اور ارادہ اس سب مجموعہ کا ثمرہ ہے اور دعویٰ تمہارا ارادہ آخرت کے ثمرہ کا ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ زائل ہو گیا۔ کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ قید واقعی ہے اور یہ ارادہ کا بیان اور اس کی شرح ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر اس کے مقابل ارادہ عاجلہ کی تفسیر کیوں نہ بیان کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ آخرت کی اس تفسیر سے مقصود یہ ہے کہ ارادہ آخرت کا سہل ہونا معلوم ہو جائے کہ اس میں معمولی سعی اور ایمان کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد آخرت کی طلب کے لئے رغبت دل میں پیدا ہو۔ بخلاف ارادہ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں۔ اس لئے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی۔ علاوہ ازیں یہ کہ ارادہ آخرت کی تفسیر کے متعلق تو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں۔ کوئی کسی طریقہ کو طلب آخرت سمجھتا ہے۔ کوئی کسی طریقہ کو۔ اس لئے اس کی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادہ دنیا کو تو ہر شخص سمجھتا ہے۔ اس کے بیان کی حاجت نہ تھی۔

پس ارادہ دنیا و آخرت میں ایک تو فرق یہاں یہ بتلایا گیا کہ طلب دنیا سے یہ کچھ ضرور نہیں کہ وہ مطلوب حاصل ہی ہو جاوے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کو حاصل ہو جائے اور طلب آخرت کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے۔ وہ ضائع نہیں ہو سکتی۔ دوسرا ایک لطیف اشارہ

ایک خاص فرق کی طرف اس آیت میں اور بھی ہے جو اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور ابھی تک اس آیت کی تفسیر میں نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہے۔ کسی نے لکھا بھی ہو۔ وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں تعلق شرط کا جزا کے ساتھ مختلف عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ارادۂ دنیا کی بابت تو ارشاد ہے۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنالہٗ فیہا ما نشآء من کان یرید۔

یہ صیغہ استمرار ہے۔ ترجمہ یہ ہوا کہ جو کوئی دنیا کو طلب کرتا رہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک رہے۔ تب کچھ ملتا ہے۔ اور ارادۂ آخرت کے متعلق من اراد بدون لفظ کان کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمرۂ آخروی حاصل ہونے کیلئے طلب میں مرنا کھپنا نہیں پڑتا بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے بھی وہ ثمرہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ اور طلب مستمر نہیں ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد ارادہ وطلب زائل ہو جاتا ہے۔ نہیں! حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے۔ مگر تھوڑی سی سعی وطلب کے بعد وہ حکم میں مستمر کے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محبت الٰہی پیدا ہو جانے کے بعد وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے۔ مگر بوجہ اعانت غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدون اختیار کے پیدا ہو رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے۔ اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

من تقرب الی شبرا جئت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ۔

اور دنیا مردود بارگاہِ الٰہی ہے۔ اس میں ہمیشہ دقت وتعب ہی رہتا ہے۔ اس کے لئے ہمیشہ اہتمام وانہماک از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ بتکلف از سر نو پیدا کرنا پڑتی ہے۔

پس حقیقۃً تو دونوں ارادے مستمر ہوتے ہیں۔ مگر بوجہ سہولت واعانت غیبی کے ارادۂ آخرت

گویا مستمر نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خود بخود اس کے دل میں ان اعمال کا تقاضا پیدا کر دیتا ہے اور ارادۂ دنیا حقیقۃً اور حکم دونوں کے اعتبار سے مستمر ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ کان استمرار کے لئے بڑھایا گیا اور ارادۂ آخرت کے بیان میں کان نہیں بڑھایا گیا اور شرح اس سہولت و اعانت کی یہ ہے کہ طلب آخرت میں قدرے سعی کرنے سے جب نسبت مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ اسی کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزاوار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے یہی طریق عشق و نسبت مع اللہ مراد ہے اور رسم پارسائی سے وہ طریق عبادت جو بدون نسبت و محبت ہو، مراد ہے۔ جس میں اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے جو بعد میں مذکور ہے ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند
تو بروں درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی
بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

وہ کیف نسبت مع اللہ کا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کام نہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا اور اس طریق میں کچھ باطنی مشقت بھی پیش آتی ہے مگر وہ اس سے بددل نہیں ہوتے، بلکہ اس میں بھی اُن کو بڑا لطف آتا ہے۔ اسی کی بابت ارشاد ہے ؎ از محبت تلخہا شیریں بود۔

اور ارشاد ہے ؎

ناخوشِ تو خوش بود بر جانِ من!
دل فدائے یار دل رنجانِ من!

اور کہا گیا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور کہا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو

دل شدہ بتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں۔ جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے۔ جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں، یعنی موت، وہ بھی ان کے لیے ایسی خوشگوار ہو جاتی ہے کہ اُس کی یہ لوگ تمنائیں کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم

راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے

تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ سب باتیں موت کی تمنا کی پہلے ہی ہوں گی جب موت آئی ہو گی۔ اُس وقت حقیقت معلوم ہوئی ہو گی تو یہ خیال غلط ہے۔ ابن فارض رحمتہ اللہ علیہ نے عین موت کے وقت دکھلا دیا کہ اہل نسبت مرتے وقت کیسے مطمئن ہوتے ہیں اُن کا واقعہ ہے کہ جب مرنے لگے تو آٹھوں جنتیں اُن کے سامنے پیش کر دی گئیں تو انہوں نے جنتوں سے منہ پھیر لیا اور یہ شعر اُسی وقت پڑھا ؎

ان کان منزلتی فی الحب عندکم

ما قد رأیت فقد ضیعت ایامی

کہ اگر میری اس محبت کی یہی قدر تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ جنتیں میرے سامنے کر دی گئیں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے۔ یعنی میں نے تو محبت اس کے واسطے نہیں کی تھی۔ میں تو کسی اور چیز کا طالب ہوں۔ یہ کہتے ہی آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں اور ایک خاص

تجلی حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہوئی۔ اسی کے ساتھ جان پرواز کر گئی۔ اسی مضمون کو قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد
تا نہ بینم رُخ تو روح رمیدن ندہم

یعنی اگر ملک الموت میری جان قبض کرنے آئیں تو جب تک تجلی خاص کو نہ دیکھ لوں گا۔ جان نہ نکلنے دوں گا۔ حق تعالیٰ رحم فرمائے ابن فارض پر۔ انہوں نے اس حالت کو کر کے دکھلا دیا کہ بدون تجلی خاص کے چلنے پر راضی نہ ہوئے۔ اسی لئے میں کہتا تھا کہ طالب آخرت کا ارادہ اگرچہ مستمر ضرور ہوتا ہے۔ مگر بوجہ سہولت و اعانت غیبی کے گویا وہ بالکل ارادہ ہی نہیں کرتا۔ سب کام بدون اس کے ارادہ کے ہوتا رہتا ہے اور میرا مطلب یہ نہیں کہ اُن سے کبھی گناہ نہیں ہوتا یا یہ معصوم ہیں۔ نہیں! بلکہ تقاضا معصیت کا اُن کو بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس اُن کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ مگر ان کے تقاضے کی اور دوسروں کے تقاضے کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کہ ایک تو شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ اُس کو ذرا سی چمکاریں سیدھا کر لیتے ہیں اور ایک غیر شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ وہ نہ مارنے سے سیدھا ہوتا ہے نہ چمکارنے سے۔ وہ جب شرارت کرتا ہے۔ سوار کو پٹک دیتا اور زین کو بھی پھینک دیتا ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ گھوڑا شائستہ ہونے کے بعد بھی کبھی شرارت کرنے پر آتا ہے۔ مگر وہ سیدھا ہو جاتا ہے۔ اہل نسبت کی ایسی ہی مثال ہے۔ یہی لوگ ہیں جو پل صراط پر برق کی طرح جائیں گے۔ کیونکہ پل صراط جیسا اہل کشف نے لکھا ہے۔ شریعت کی صورت مثالی ہے۔ جو لوگ دنیا میں شریعت پر بسہولت چلتے تھے اور شریعت پر چلنا اُن کو ایسا آسان اور خوشگوار ہو گیا تھا۔ جیسا کہ دوسروں کو کھانا پینا سونا۔ یہ لوگ پل صراط پر بھی بآسانی گزر جائیں گے۔ پس مضمون مقصود ختم ہو چکا۔ اب اس آیت میں چند نکات سمجھیے جو اس وقت ذہن میں ہیں۔ ان کو بیان کر کے بس بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

رموز و نکات

ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے۔ عجلنالہ فیہا ما نشآء لمن نرید کہ طالبین دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں عطا کر دیتے ہیں۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لئے یہ فرمایا جاتا اعطیناہ ما یشآء کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا، وہی دیں گے۔ کیونکہ جب دنیا والوں کے لئے یہ فرمایا گیا کہ اُن کو جو ہم چاہیں گے۔ وہ دیں گے۔ تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لئے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہو گی کہ اُن کو اُن کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے۔ مگر بخلاف اس کے اس آیت میں مایشآء نہیں۔ فرمایا گیا۔ بلکہ بجائے اس کے اولئٰک کان سعیہم مشکورا۔ فرمایا گیا۔ تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالیٰ اہلِ آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے کہ اُن کو جو کچھ وہ چاہیں گے۔ وہی دیا جائے گا تو اس میں درحقیقت کچھ زیادتی نہ ہوتی، بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے۔

مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

یعنی نہ اُن کو آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی بشر کے قلب پر خیال گزرا۔

تو بتلایئے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو کچھ وہ چاہیں گے، دیا جائے گا۔ اس سے زیادتی ہوتی یا کمی؟ بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا۔ وہ تو بہت ہی کم ہوتا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انہوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اور وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر موقوف نہیں۔ فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے، خواہش سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔ اسی کے بارہ میں مولانا کا ارشاد ہے:۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را | کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد | آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

اب آپ نے سمجھا کہ ماشاء نہ فرمانا ہی ہمارے لئے رحمت ہے۔ اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہٗ نے اجمالاً فرما دیا اولئک کان سعیہم مشکورا یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہوگی۔ اسی سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدردانی ایسے عظیم الشان قدردان بادشاہ کے دربار میں ہو۔ اُن کو کیا کچھ ملے گا۔ اس کا اندازہ اس سے کر لو کہ بادشاہان دنیا جب کسی کی قدردانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں وہ یہ نہیں کیا کرتے کہ خدمت کی حیثیت پر انعام واکرام کریں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام واکرام کیا کرتے ہیں۔ جس کا اُس کو وہم بھی نہیں ہوتا۔ پھر جس کی قدردانی حق تعالیٰ شانہٗ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے، اندازہ کر لو، اُسے کیا کچھ ملے گا۔ اس وقت اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی۔

دوسرا اشارہ وسعیٰ لہا سعیہا میں ہے کہ یہ کلام اس سعی کے سہل ہونے پر دال ہے۔ جیسا کہ اُردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے جو تدبیر ہے۔ وہ کرنی چاہیئے اس تدبیر کو بیان نہ کرنا اور اجمالاً یہ کہہ دینا کہ جو تدبیر اُس کی ہے۔ وہ کرنی چاہیئے۔ اس سے اس تدبیر کا معلوم اور سہل ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ کلام یہاں پر وارد ہوا ہے کہ وہ جو لوگ طالب آخرت ہیں اور اس کے لئے وہ سعی کرتے ہیں، جو اُس کی سعی ہے۔ اُن کی کوشش کی قدر ہوگی۔" اس طرز کلام سے اس سعی کا معلوم ہونا اور سہل ہونا سمجھا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ سعی مختصر اور مشتہر ہے، بیان کی ضرورت نہیں۔

تیسرا اشارہ مشکورا میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ محض قدردانی ہے۔ عمل کو اس میں دخل نہیں۔ اس سے ناز کرنے والوں کو تنبیہ مقصود ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہیئے۔ جو کچھ وہاں ملے گا، محض انعام ہوگا، ورنہ تم عمل سے اس کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ وجہ یہ کہ طاعت ادائے حق خداوندی اور اُس کے حقوق غیر متناہی ہیں اور حقوق غیر متناہی کا ادا کرنا موقوف ہے۔ عمل غیر متناہی پر اور ہم بوجہ حادث و متناہی ہونے کے عمل

غیر متناہی سے عاجز ہیں۔ تو عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اُسے ملے، وہ محض قدردانی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا ہو گا جو بعض رحم دل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافروں کے لئے ہمیشہ کے لئے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا۔ کفر تو اُس نے کیا، تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم۔ یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالےٰ کے ساتھ جب شرک و کفر کیا تو اُس نے حق تعالیٰ شانہٗ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ پر سزا غیر متناہی موافق قاعدہ عقل کے ہے۔ غرض عمل صالح سے تو حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہو گی۔ یہ البتہ عقل سے آگے ہے۔ عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہیئے۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں، مگر یہ عقل اُن کی خیر خواہ نہیں دُشمن ہے۔ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را

بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

یہ لوگ ہمیں بے عقل بتلاتے ہیں، مگر ہمیں ایسی عقل کی ضرورت نہیں، ایسے سے ہم بے عقل ہی اچھے۔ مگر خبر بھی ہے یہ بے عقلی کس کے لئے ہے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم

مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

خدا کا دیوانہ ہزار عاقلوں سے بہتر ہے۔ ؏

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

پس مشکورا فرمانے سے بتلا دیا کہ عقل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدردانی ہے۔ ایک حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا۔ ہاں رحمت الٰہی ہو جائے تو اور بات ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا اور اس سوال کی ہمت بھی اُنہیں کو

تھی۔ یارسول اللہ! ولا انت کیا آپ بھی اپنے عمل سے جنت میں تشریف نہ لے جاویں گے ؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے اس سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف غالب ہو گیا اور آپ نے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمة۔ کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا۔ مگر یہ کہ خدا کی رحمت میری دست گیری کرے۔ صاحبو! اب کس کی ہمت ہے جو اپنے عمل کو کچھ سمجھے۔ ہماری تو وہ مثال ہے جو کسی بزرگ نے بیان فرمائی ہے ۔

چو آں کرمے کہ در سنگے نہانست

زمین و آسمان وے ہمانست

مولانا نے اس کی مثال میں ایک اور حکایت بیان فرمائی ہے۔ ایک بدوی کی جس نے بجز اپنے گاؤں کے گڑھوں کے کبھی پانی نہ دیکھا تھا اور قحط میں اُن کے خشک ہو جانے سے دنیا سے پانی کو ناپید سمجھتا تھا کہ وہ کسی خلیفہ بغدادی کے پاس زمانہ خشک سالی میں ایک گھڑا شیریں پانی کا لے گیا تھا۔ بڑی دور دراز مسافت سے وہ گھڑا سر پر رکھے ہوئے جب پہنچا تو خلیفہ کے دربار میں اس کو پہنچا دیا گیا۔ خلیفہ کے پوچھنے پر اُس نے کہا کہ اے امیرالمومنین! یہ جنت کا پانی ہے۔ خلیفہ نے بہت قدردانی سے وہ گھڑا لے لیا اور حکم کیا کہ سونے سے پُر کر کے اس گھڑے کو واپس کر دیا جائے اور حکم دیا کہ اس کو نہر دجلہ کی طرف سے واپس کیا جائے تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ یہ ہم نے محض اس کی محبت کی قدر کی ہے ورنہ آب شیریں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔

اسی طرح قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے کہ اس قدر بے شمار نعمت ہے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب محض قدردانی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہٗ اپنے مومن بندے کا حساب چھپا کر لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ یہ انعام فرمائے تھے، تم نے پھر بھی نافرمانی کی۔ فلاں گناہ کو یاد کرو۔ تم نے فلاں دن یہ کام کیا تھا۔ اس دن یہ کیا تھا۔ غرض گناہوں کی فہرست شمار فرمائیں گے۔ یہاں تک کہ مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ذخت حق اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے گا۔ اس وقت حق

اپنا حال کہو۔ دین میں اُن سے مدد لو کہ صحبتِ کامل اکسیر اعظم ہے۔ یہ صحبت بجلی کی طرح اثر کرتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا سے دل یکسو اور آخرت کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

اور سونے کے وقت دن بھر کے تمام کاموں کا حساب کیا کرو۔ جتنے گناہ ہو گئے ہوں، اُن پر نادم ہو کر استغفار کر کے سوؤ۔

اور کچھ وقت تنہائی کا اللہ کی یاد کے واسطے نکالو۔

یہ پانچ باتیں ہوئیں۔ ان پر عمل کر کے دیکھئے۔ انشاء اللہ حق تعالٰے کے ساتھ دل کو پورا لگاؤ ہو جائے گا اور اتنی سہولت کے بعد بھی کوئی نہ کرے تو ایسے ناقدرے کو خدا تعالیٰ ہی ہدایت فرمائیں۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں توفیق فرمائیں۔

والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیّدنا محمد النبی الامّی و علیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

الدُّنیا

یہ وعظ تھانہ بھون میں حافظ ظریف احمد صاحب کے مکان پر ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ کو بعد عصر ہوا جو ایک گھنٹہ میں ختم ہوا۔

توں میں یہ بڑی خوبی ہے کہ ان کو خدا اور رسولؐ کے احکام میں شبہ نہیں ہوتا۔ جب سن لیں گی کہ یہ خدا اور رسولؐ کا حکم ہے، تو گردن جھکا دیں گی چاہے عمل کی توفیق نہ ہو، لیکن اس میں شک و شبہ اور وجہ و علّت کا سوال ان سے صادر نہیں ہوتا۔ بخلاف مردوں کے کہ ان میں یہ مادہ اس خاص انقیاد کا کم ہے۔ خاص کر آج کل کہ اتنی عقل پرستی بلکہ اکل پرستی غالب ہے کہ وہ ہر بات کی وجہ پوچھتے ہیں۔ ہر مسئلہ کو اپنی عقل کی میزان میں جانچتے ہیں اور رائے زنی کرتے ہیں کہ عقل کے موافق ہے یا نہیں اور عورتوں کی سمجھ میں خواہ آئے یا نہ آئے وہ تسلیم کر لیں گی۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سئیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیّدنا محمداً عبدہٗ و رسولہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدنیا دار من لا دار لہٗ ولھا یجمع من لا عقل لہٗ الحدیث۔

دنیا کی محبت

یہ ایک لمبی حدیث ہے۔ اس میں سے اس وقت دو جملے اختیار کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس لئے کہ جو میرا مقصود ہے۔ اُس کے لئے یہ دو جملے کافی وافی ہیں۔ یہ ارشاد ہے جناب فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس میں ایک ایسی ضروری تعلیم ہے کہ ہر حال میں اور ہر شخص کو اس کا یاد رکھنا اور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ خاص کر عورتوں کو۔ اس لئے کہ جس کا مرض شدید ہوتا ہے۔ اُس کو علاج کی زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے اور جس مرض کا اس ارشاد میں معالجہ ہے وہ عورتوں کے اندر زیادہ ہے۔ وہ مرض کیا ہے؟ حُبِ دنیا۔ چنانچہ دیکھا بھی جاتا ہے کہ عورتوں کے اندر یہ مرض بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہے اور عورتوں میں یہ مرض کئی صورتوں سے پایا جاتا ہے۔ بعض کے اندر تو کھلم کھلا ہے۔ وہ تو وہ ہیں کہ جن کے بال بچے، کنبہ، مال و جاہ ہے۔ وہ تو کھلم کھلا اس میں مشغول ہیں اور اُن کو اس سے کسی وقت فراغت نہیں۔ ع

چو میرد مبتلا میرد، چو خیزد مبتلا خیزد

کا قصہ ہے اور اپنی زبان حال سے کہتے بھی ہیں کہ ہم دنیا دار ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے بال بچے نہیں، اُن میں یہ مرض دوسرے رنگ میں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا نام بال بچوں کا ہے، چنانچہ کہتے بھی ہیں کہ دنیا میں ہمارا کیا سا جھا ہے ہمارے بال بچے تو ہیں ہی نہیں۔ حالانکہ جو حقیقت ہے۔ دنیا داری کی وہ اس میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ عنقریب واضح ہو جاوے گا۔

غرض یہ ہے کہ عورتوں میں یہ مرض بہ نسبت مردوں کے واقعی زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں بہت کم ایسے ہیں کہ ان کے پاس سامان دینا نہ ہو اور پھر وہ اس میں اپنے کو پھنسا دیں اور عورتیں بہت ایسی ہیں کہ بال بچے نہیں، پاس کوڑی نہیں لیکن ہر ایک کی بات میں ہر ایک کے معاملہ میں دنیا بھر کے قصوں میں اپنی ٹانگ اڑاتی ہیں۔ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے فراغت دی تھی اس سے نفع حاصل کرتیں اور بہت سے مرد بھی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے فکری دی ہے۔ اُن کو بھی وقت کی قدر کرنا چاہئے تھی اور اطمینان سے حق تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہونا تھا۔ خوب فرمایا ہے۔ مولانا نظامی نے ؎

خوشا روز گارے کہ دارد کسے کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت یساری بود کند کارے از مرد کارے بود

یعنی وہ بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کو بہت حرص نہ ہو اور چار روٹیاں کھانے کو ہوں اور اللہ تعالیٰ کی یاد کرے۔ یہ مطلب نہیں کہ فکر بالکل ہی نہ ہو۔ فکر سے کون خالی ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک تو وہ ہیں کہ اگر چکی نہ پیسو یا سوئی نہ مارو یا اور کوئی دھندا نہ کرو تو روٹی نہ ملے گی اور ایک وہ ہیں کہ گھر کا اناج آتا ہے یا کوئی عزیز خدمت کرتا ہے یا جوان بیٹا ہے۔ وہ خدمت کرتا ہے تو جو دھندوں میں مشغول ہیں۔ اگرچہ معذور تو وہ بھی نہیں، اس لئے کہ اُن کو بھی بہت وقت فراغت کا ملتا ہے۔ جس کو فضول اڑا دیتے ہیں مگر زیادہ شکایت تو ان کی ہے کہ جن کو بلا مشقت و محنت کے کھانے کو ملتا ہے اور پھر وہ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ ہزاروں بندگانِ خدا ایسے بھی ہیں کہ جن کو اس قسم کی بے فکری میسر ہے مگر دیکھا جاتا ہے کہ زیادہ وہی دنیا کے قصوں میں ٹانگ اڑاتے ہیں، بلکہ جو تعلقات والے ہیں، وہ تو کبھی کبھی دنیا کی کلفتوں سے گھبرا بھی جاتے ہیں، مگر جن کو کوئی تعلق نہیں، وہ نہیں گھبراتے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ یہ سوچ کر ان کی خاطر کرتے ہیں کہ بھائی ان کے کوئی بیٹا نہیں اور وہ بھی لوگوں کو دھمکاتے ہیں کہ ہمارا دنیا میں کیا رکھا ہے۔ تم ہمارا کیا کر سکتے ہو اور کھانے پینے کو بلا مشقت ملتا ہے، پھر اس سے دل گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے دنیا ان کی پوری قبلہ و کعبہ ہے، پس یہی وجہ ہے مرض کے شدید ہونے کی کہ مریض ہیں اور اپنے کو صحیح جانتے ہیں اور جن کی اولاد ہے، تعلقات ہیں، وہ تو کبھی

کبھی یوں بھی اُٹھتے ہیں کہ بیٹے کی شادی کے بعد ہم بالکل الگ ہو جائیں گے۔ دنیا کے دھندوں سے کچھ واسطہ نہ رکھیں گے۔ اللہ کا نام لیا کریں گے۔ لیکن جو بے تعلق ہیں، جن کے کوئی نہیں انکو یہ توقع بھی نہیں۔ کیا اُن کو مرنے کا انتظار ہے۔ بعض ایسے بھی باہمت ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ قصے تو جان کو لگے ہوئے ہیں، مر کے سب دھندے چھوٹ جائیں گے۔ یاد رکھو مر کر چھوٹنا کار آمد نہیں، چھوٹنا وہ نافع ہے جو زندگی میں دنیا کے دھندے دل سے نکال دے۔

بہر حال مختلف وجوہ سے اس مرض کے اندر مرد اور خصوصاً عورتیں مبتلا ہیں، چونکہ عورتوں کے اندر یہ مرض زیادہ ہے۔ اس لئے خطاب میں ان کی رعایت زیادہ ہوگی، لیکن یہ نہ ہوگا کہ مردوں کو نفع نہ ہو۔ اس لئے کہ مرض تو مشترک بھی ہے، لیکن چونکہ عورتوں میں زیادہ ہے اور نیز عورتوں ہی کی درخواست سے یہ بیان ہوا ہے۔ اس لئے ان کی مصلحت کی رعایت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر کسی کا ارشاد نہیں ہے۔ اس لئے کہ اصل میں تو حق تعالیٰ کا ارشاد سب سے بڑھ کر ہے، لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بعینہ حق تعالیٰ کا ہی ارشاد ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر کسی کا قول نہیں۔ اس لئے میں اپنے مقصود کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو نقل کر دینا اور اس کا ترجمہ کر دینا کافی سمجھتا ہوں اور نیز اس وجہ سے کہ اس وقت میری مخاطب عورتیں اور عورتوں کی جہاں میں نے بہت سی مذمت کی ہے۔ اسی طرح ایک مدح بھی اُن کی بیان کئے دیتا ہوں۔ بقولِ شاعر ؂

عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

عورتوں کی خوبی

وہ بات مدح کی ان میں یہ ہے کہ ان کو خدا و رسولؐ کے احکام میں شبہ نہیں ہوتا جب سن لیں گی کہ یہ خدا و رسولؐ کے احکام ہیں۔ گردن جھکا دیں گی، چاہے عمل کی توفیق نہ ہو۔ لیکن اس میں شک و شبہ اور وجہ و علت کا سوال ان سے صادر نہیں ہوتا۔ بخلاف مردوں کے کہ اُن میں یہ مادہ اس خاص انقیاد کا کم ہے۔ خاص کر آج کل کہ اتنی عقل پرستی بلکہ اکل پرستی

غالب ہوتی ہے کہ ہر بات کی وجہ پوچھتے ہیں۔ اپنی عقل کی میزان میں ہر مسئلہ کو جانچتے ہیں، اور رائے زنی کرتے ہیں کہ عقل کے موافق ہے یا نہیں اور عورتوں کی خواہ سمجھ میں آوے یا نہ آوے تسلیم کریں گے۔ ابھی ایک تازہ واقعہ ہوا ہے کہ ایک معاملہ میں ایک بی بی کو بہت جوش وخروش تھا۔ میں نے کہلا بھیجا کہ شریعت کا حکم اس کے متعلق یہ ہے، سنتے ہی گردن جھکا دی اور اس کے بعد ایک حرف اس کے خلاف زبان سے اس کی نہیں نکلا اور جس بات پر انکار تھا۔ فوراً اس کو قبول کرلیا۔ پس عورتوں میں یہ خوبی بھی ہے تو اس لئے بھی زیادہ مناسب ہوا کہ بجائے اس کے کہ میں اپنے مضمون کے عقلی دلائل بیان کروں، یہ کہہ دوں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یوں تقریب فہم یا مشاہدہ کرانے یا اسی حدیث کے اندر غور کرانے کی ضرورت سے اور کچھ کہہ دوں۔ وہ دوسری بات ہے، لیکن حجیت اور استدلال کی رو سے اس حدیث کے ترجمہ کو کافی سمجھتا ہوں۔

پس بغور سنو کہ اس حدیث میں دنیا کی مذمت ہے اور دنیا کی مذمت ایسی متفق علیہ ہے کہ تمام حکماء وعقلا قدیم سے کرتے چلے آئے ہیں اور مختلف عنوانوں اور مختلف تعبیروں اور طرح طرح سے مذمت بیان کی ہے۔ مگر ہر ایک نے ایک خاص خاص پہلو سے گفتگو کی ہے جس نے جو پہلو مذمت کا اختیار کرلیا ہے۔ اُس سے دوسرے وجوہ چھوٹ گئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جامع ہے۔ تمام مذمتوں کو۔ کوئی مذمت ایسی نہیں رہی جو اُسکے تحت میں داخل نہ ہو۔

گھر کی اہمیت

چنانچہ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا گھر اُس شخص کا ہے جس کا گھر نہ ہو۔ یعنی دنیا گھر بنانے کی جگہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ گھر سے سب کو محبت ہوتی ہے اور محبت کی وجوہ مختلف ہیں۔ بعض کو تو خود گھر ہی سے بالذات تعلق ہوتا ہے۔ خاص کر عورتیں چونکہ رات دن اسی میں رہتی ہیں۔ اس لئے اُن کو گھر سے شدید تعلق ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں میں ایک بی بی تھیں بہت بوڑھی ہوگئی تھیں۔ جب کبھی ان سے عرض کیا جاتا کہ تم ہمارے یہاں

آجاؤ تو وہ یہی کہتی تھیں کہ نہیں بھائی میں تو یہی چاہتی ہوں کہ جس گھر میں ڈولی آئی تھی، اسی گھر کھٹولی نکلے (یعنی جس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی، اسی گھر سے جنازہ بھی نکلے) اور بعضوں کو گھر سے اس وجہ سے محبت ہوتی ہے کہ گھر میں آسائش بہت ہوتی ہے۔ کسی کا زور نہیں، دباؤ نہیں، چین سے پڑے ہیں۔ بعضوں کو اس لئے ہوتی ہے کہ گھر میں سامان ہے، راحت کی سب چیزیں مہیا ہیں۔ دوسری جگہ جاتے ہیں تو پریشانی ہوتی ہے۔ جب جی گھبرایا گھر چلے گئے۔ جب بھوک لگی، گھر میں جو کچھ رکھا ہو خواہ باسی خواہ تازہ یا کوئی اور شے کھالیا۔ یہ بات باہر کہاں! بلکہ وطن ہی میں اگر کہیں دعوت ہو جائے اور باسی روٹی کو جی چاہے تو ممکن نہیں کہ آپ باسی کھائیں۔ تازی ہی کھانا پڑے گی یا کسی شے خاص کو جی نہیں چاہتا، کبھی وہ شے کھائی نہیں اور دعوت میں وہی سامنے آئی۔ جھک مار کر وہی کھانا پڑے گی یا اس وقت بھوک نہیں، اپنے گھر تو نہ کھاتے، لیکن یہاں کھانا ہی پڑے گا خواہ تھوڑا ہی کھائیں۔ یہ آسائش گھر ہی میں ہے۔ غرض اور بلاد کے اعتبار سے اپنے وطن میں اور وطن کے اجزاء کے اعتبار سے وطن کے اُس خاص حصہ میں جس کو اپنا گھر کہتے ہیں زیادہ راحت ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ گھر وہ شے ہے کہ جتنی چیزیں آدمی کو مرغوب ہوتی ہیں۔ اُن سب چیزوں کا میزان الکل لفظ گھر ہے۔ یعنی حق تعالیٰ نے اس کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، جاہ و مال، اولاد، کھانے پینے پہننے کی چیزیں اور تمام تفریح کا سامان وہ سب گھر کے اندر آ گئیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد الدنیا دار من لا دار لہٗ ہزاروں دفتروں کا ایک دفتر ہے، اگر دنیا کی تمام چیزوں کی، مال کی، جاہ کی، اولاد کی، کھانے پینے وغیرہ کی الگ الگ مذمت کی جاتی اور اُن کو دل سے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو اتنا بلیغ اور مختصر مضمون نہ ہوتا، جس قدر یہ ابلغ ہے کہ اس میں سب کچھ آ گیا اور پھر صرف دو لفظ۔

ملکیت کی حقیقت

پس تفصیل اس ارشاد کی کہ دنیا کو گھر نہ سمجھو یہ ہوئی کہ اپنے گھر کو گھر نہ سمجھو، اپنے مال

اپنا کا نام ہے تو اُس کی تو بڑی قدر و وقعت ہوتی ہے، مگر یہ باتوں کا تمبا کو کھانے کی جن کو عادت ہے یہ کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ خواہ ذلت ہو خواری ہو، کوئی اُن کی بات بھی کان لگا کر نہ سنے، لیکن اُن کو اپنی بڑ ہانکنے سے کام۔ بس عادت پڑ جاتی ہے۔ جیسے نمرود کو جوتیاں کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔

نمرود کا حشر

قصہ یہ ہوا تھا کہ جب نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کو بہت سمجھایا، مگر نہ مانا اور برابر سرکشی کرتا رہا اور یہ کہا کہ اگر تو سچا ہے تو اپنے خدا کا لشکر منگالے۔ جانتا تھا کہ ان کا معاون و مددگار کون ہے اور اپنے لشکر اور خدم وحشم پر گھمنڈ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوحی الٰہی اس کو اطلاع دی کہ فلاں دن خدائی لشکر آوے گا، تو تیار ہو جا۔ چنانچہ اُس نے لشکر کو مہیا کیا اور خیال کرتا تھا کہ ابراہیمؑ کا یہ خیال ہی خیال ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں مچھروں کا ایک غول ایک جانب سے آیا اور ایک ایک مچھر نے ہر سپاہی کے دماغ میں گھس کر کام تمام کیا۔ نمرود یہ منظر دیکھ کر محل میں گھس گیا۔ ایک لنگڑا مچھر آ کر اُس کے ناک میں بھی گھس ہی گیا اور دماغ پریشان کر دیا۔ اگر سر میں جوتا لگتا تھا تو چین کچھ آجاتا۔ چنانچہ جو آتا تھا۔ بجائے سلام کے چار جوتیاں اس کے سر پر مارتا تھا۔ حق تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تیری شوکت و قوت بس اتنی ہے کہ ایک مچھر نے اور وہ بھی لنگڑا، تجھے پریشان کر ڈالا۔

اسی طرح جو مرد یا عورت دین کے رشتہ کو چھوڑ کر اپنی خواہشات نفسانی اور خرافات میں مبتلا ہیں اور اس حالت میں وہ خوش ہیں، خدا کی قسم ہے۔ یہ جوتیاں کھانا ہے۔ بعض مردوں کو بھی میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو فراغت دی ہے، مگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ بس رات دن یہ شغل ہے کہ بیٹھک میں یا کسی دکان پر بیٹھ گئے۔ کسی کی غیبت کر لی، کسی کے حسب نسب میں طعن کر دیا۔ کسی کو صلاح دے دی۔ کسی کو بڑھا دیا۔ کسی کو اتار دیا۔ اُن سے کوئی پوچھے کہ اگر تم یہ باتیں نہ کرو تو تمہارا کون سا کام اٹکا ہوا ہے اور اس سے کسی کا کچھ نقصان نہیں۔ اپنی ہی زبان اور قلب گندہ کرتے ہیں اور بعض عورتیں خود تو شیطنت سیکھتی ہیں

ہیں، لیکن دوسروں کو بھی سکھلاتی ہیں۔ چنانچہ بہو بیٹیوں کو کہتی ہیں کہ بیٹی! تجھ کو گھر برتنا ہے سب کام آنکھوں میں سے نکالا کرتے ہیں۔ اُن کو تو اپنی آزادی پر بہت شکر کرنا چاہیئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب قصوں سے آزاد کیا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آزاد کی حکایت لکھی ہے کہ سفرِ حج میں پیادہ جارہا تھا اور یہ شعر پڑھتا تھا

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیرِ بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلامِ شہر یارم

کہ میں نہ اونٹ پر سوار ہوں اور نہ اونٹ کی طرح لدا ہوا ہوں اور نہ رعیت والا ہوں اور نہ بادشاہ کا غلام ہوں۔ بڑا خوش قسمت ہے، وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے آزاد رکھا۔ خاص کر آج کل کی اولاد کہ اُن سے تو بجز اس کے کہ اپنا دین اور وقت ضائع ہو، کچھ نفع نہیں ہے۔

اولاد کا نعمت ہونا

ہاں اگر اولاد دین میں مدد دے تو سبحان اللہ! ایک بزرگ تھے نکاح نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سو رہے تھے۔ دفعتہً چونک پڑے اور کہنے لگے کہ جلدی کوئی لڑکی لاؤ۔ ایک مخلص مرید حاضر تھے۔ اُن کے ایک لڑکی کنواری تھی، لاکر فوراً حاضر کی۔ اسی وقت نکاح ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بچہ دیا اور وہ مرگیا۔ بی بی سے کہا کہ جو میرا مطلب تھا، پورا ہوگیا۔ اب تجھ کو اختیار ہے۔ اگر تجھ کو دنیا کی خواہش ہے تو میں تجھ کو آزاد کردوں۔ کسی سے نکاح کرلے اور اگر اللہ کی یاد میں اپنی عمر ختم کرنا ہو تو یہاں رہو۔ چونکہ وہ بی بی اُن کے پاس رہ چکی تھی اور صحبت کا اثر اس کے اندر آگیا تھا، اُس نے کہا کہ میں تو اب کہیں نہیں جاتی۔ چنانچہ دونوں میاں بی بی اللہ کی یاد میں رہے۔ اُن کے بعض خواص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی۔

فرمایا کہ بات یہ تھی کہ میں سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میدانِ محشر ہے اور پُل صراط پر لوگ گزر رہے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اُس سے چلا نہیں جاتا۔ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے اُسی وقت ایک بچہ آیا اور ہاتھ پکڑ کر آناً فاناً میں اُس کو لے گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ

کون ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہ اس کا بچہ ہے جو بچپن میں مر گیا تھا۔ یہاں اس کا رہبر ہو گیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور مجھے خیال آیا کہ میں اس فضیلت سے محروم نہ رہوں۔ شاید بچہ ہی میری نجات کا باعث ہو جائے۔ اس لئے میں نے نکاح کیا تھا اور میرا مقصود حاصل ہو گیا ہے۔

بتلایئے! اب بھی کوئی ایسا ہے کہ بچہ کے مرنے کو مقصود کا حاصل ہونا سمجھتا ہو تو اب اگر کسی کا کوئی بچہ مر جاتا ہے تو پیٹ پھاڑ پھاڑ کر سر رہتے ہیں۔ یہ اہل اللہ ہی کی ہمت ہے۔ پس اگر اولاد مر کر یا زندہ رہ کر آخرت کا ذخیرہ ہو تو ایسی اولاد تو بڑی نعمت ہے۔ ورنہ وبالِ جان ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو قتل کر دیا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہ ایک بے گناہ بچہ کو مار ڈالا۔ اوّل خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کی یہ شرط کر لی تھی کہ میرے کسی فعل پر اعتراض نہ کرنا۔ اس لئے انہوں نے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم سے صبر نہ ہو سکے گا۔ اس کے بعد اس واقعہ کی یہ حکمت بیان فرمائی کہ اس لڑکے کے والدین مومن ہیں اور یہ لڑکا بڑا ہو کر کافر ہوتا اور اس کی محبت میں اس کے ماں باپ بھی کافر ہو جاتے۔ اس لئے ارادہ الٰہی یہ ہوا کہ اس کا پہلے ہی کام تمام کر دیا جاوے اور اس کا بدلہ نیک اولاد اُن کو ملے۔

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جو بچے بچپن میں مر جاتے ہیں۔ اُن کا مر جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اسی واسطے جو دیندار ہیں۔ اُن کو اولاد کے مر جانے کا غم تو ہوتا ہے، لیکن پریشان نہیں ہوتے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کو حکیم سمجھے گا۔ وہ کسی واقعہ سے کبھی پریشان نہ ہوگا۔ ہاں! جس کی اس پر نظر نہیں۔ اُس پر اگر کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ مر جاتا ہے تو اس کو بڑا اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے کہ اگر زندہ رہتا تو ایسا ہوتا۔ دل کے اندر سے شعلے اُٹھتے ہیں۔ ارمان آتے ہیں حسرتیں ہوتی ہیں کہ ہائے! ایسی لیاقت کا تھا۔ ایسا تھا۔ ایسا ہو جاتا۔ صاحب! معلوم نہیں کیا خبر ہے کہ وہ کیسا ہوتا۔ غنیمت سمجھو۔ اسی میں مصلحت تھی۔ ممکن ہے کہ بڑا ہو کر شریر ہوتا اور تم کو بھی کافر

بنا دیتا۔ اب لوگ تمنا کرتے ہیں، اولاد کی۔ یاد رکھو! جس طرح اولاد ہونا نعمت ہے۔ اسی طرح نہ ہونا بھی نعمت ہے، بلکہ جس کے نہ ہوئی ہو یا ہو کر مر گئی ہو۔ اُس کو اور بھی زیادہ شکر کرنا چاہیئے۔

اولاد کا وبالِ جان ہونا

بعضوں کے لئے اولاد عذاب جان ہو جاتی ہے۔ جیسے منافقین کے بارہ میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

لا تعجبك اموالھم واولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا۔

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اُن کے مال اولاد اچھے نہ معلوم ہوں۔ اللہ تعالٰے تو یہ چاہتے ہیں کہ ان مالوں اور اولادوں کی وجہ سے اُن کو اس دنیا کی زندگی میں عذاب دیں۔

واقعی بعضوں کے لئے تو اولاد وبالِ جان ہی ہو جاتی ہے۔ بچپن میں تو اُن کی گوہ موت میں نمازیں برباد کرتے ہیں۔ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو اُن کے لئے طرح طرح کے افکار ہوتے ہیں کہ اُن کے لئے جائیداد ہو، روپیہ ہو، گھر ہو، خواہ دین رہے یا نہ رہے۔ لیکن جس طرح بن پڑے گا۔ اُن کے لئے دنیا سمیٹیں گے اور ہر وقت اسی اُدھیڑ بن میں رہیں گے اور حلال و حرام میں کچھ تمیز نہ کریں گے۔ پس اولاد کا نہ ہونا ہی نعمت ہے۔ جن لوگوں کے اولاد نہیں اُن پر خدا کی بڑی نعمت ہے۔ اگر اولاد ہوتی تو واللہ اعلم، ان کی کیا حالت ہوتی۔ ایسے لوگوں کو تو بس یہ مناسب ہے کہ کسی کی بات میں نہ بولیں۔ بیٹھے اللہ اللہ کئے جاویں۔ عورتیں اس کو سن کر کہا کرتی ہیں کہ بیٹھ تو جاویں۔ کوئی چین بھی لینے دے۔ میں کہتا ہوں کہ تم اپنے منہ کو جب گوند لگا کر بیٹھو گی تو کیا کسی کا سر کھپرا ہے، جو تم سے مزاحمت کرے۔ زیادہ فساد اور گناہ اس بولنے ہی سے ہوتے ہیں۔

کم گوئی کے فوائد

حدیث شریف میں ہے۔من سکت سلم جو چپ رہا۔اُس نے نجات پائی۔

ایک شہزادہ حدیث کی کتاب پڑھا کرتا تھا۔جب یہ حدیث پڑھی، اُستاد سے کہا، جناب بس میں آگے نہیں پڑھتا۔جب اس پر عمل کروں گا۔اس وقت آگے چلوں گا اور اسی وقت سے بولنا چھوڑ دیا۔بادشاہ کو بڑی فکر ہوئی۔سمجھے کہ لڑکے کو آسیب ہو گیا ہے۔عامل اور تعویذ گنڈا کرنے والے جمع ہوئے۔سب نے تدبیریں کیں۔اطباء بھی جمع ہوتے۔یہ رائے ہوئی کہ ان کو شکار میں لے چلنا چاہیئے۔ وہاں تفریح ہو گی۔طبیعت درست ہو جائے گی۔چنانچہ گئے اور شکاری تیر اور بندوق لے کر چلے کہ اس سے شاید تفریح ہو۔شکاری جانوروں پر تیر چلانے لگے۔اتفاق سے ایک جھاڑی کے پیچھے ایک تیتر چھپ رہا تھا۔وہ بولا۔بولتے ہی اس کے تیر لگا۔شہزادہ یہ دیکھ کر بولا کہ کم بخت نہ بولتا نہ مارا جاتا۔شہزادے کی اتنی بات سُن کر مبارک بادی کا غل پڑ گیا۔بادشاہ کو خبر ہوئی۔بادشاہ نے بہت چاہا کہ شہزادہ کچھ بولے، مگر نہ بولا۔بادشاہ نے حکم دیا کہ باندھ کر اس کو مارو۔معلوم ہوتا ہے کہ قصداً نہیں بولتا ہے۔غرض مار پیٹ شروع ہوئی۔شہزادہ دل میں کہتا تھا کہ ایک دفعہ بولنے سے تو مجھ پر یہ آفت آئی ہے۔اگر پھر بولوں گا تو جانے کیا ہو گا۔اس کے بعد تمام عمر کسی سے نہیں بولا۔

واقعی زیادہ گناہ ہم لوگوں سے اس زبان ہی کی بدولت ہوتے ہیں خصوصاً عورتوں کو تو اس قدر شوق بولنے کا ہے کہ جب بیٹھیں گی۔وہ چرخہ چلاویں گی کہ ختم ہی نہیں ہو گا۔خدا جانے ان کی باتیں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں اور جب یہ باتوں میں مشغول ہو جاتی ہیں تو ان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بس یہ باتوں ہی کو مقصود اصلی سمجھتی ہیں۔وہ مزے لے لے کر باتیں کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترس ترس کر ان کو یہ دولت ملی ہے۔بخلاف مردوں کے کہ ان کی باتوں اور تمام اشغال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ختم کر کے وہ دوسرے کام میں لگنا چاہتے ہیں۔خدا کے واسطے اپنی عقل درست کرو، بس ولیھا یجمع من لہ عقل لہ ــــــ سے یہی مراد ہے اور نفس مال مراد نہیں ہے۔

اور میرے اس بیان سے اولاد والے اور تعلقات والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو معذور ہیں۔ یاد رکھو! آپ نے بھی فضول تعلقات بڑھا رکھے ہیں اور وہ ایسے تعلقات ہیں کہ جب چاہو گھٹا سکتے ہو۔ ہاں جو ضروری ہیں۔ وہ تو حقوق ہیں۔ ان میں مشغول ہونا تو عبادت ہے۔ پس جو تعلقات دنیا میں۔ اس کے قطع کے آپ بھی مخاطب ہیں۔ میرا مطلب تقریر سابق سے یہ نہ تھا کہ آپ معذور ہیں۔ آپ ہرگز معذور نہیں ہیں۔ میرا مقصود یہ تھا کہ تعلق والوں کو تو ان کے نزدیک ایک عذر بھی ہو سکتا ہے۔ گو وہ نامسموع ہو اور جن کے کچھ نہیں، ان کے پاس تو یہ بھی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تعلقات والے اور بے تعلق سب دنیا کے تعلقات چھوڑنے کے مخاطب ہیں۔

بس یہ مضمون تھا جو اس وقت مجھ کو بیان کرنا تھا مجھے امید ہے کہ اس مضمون کو مرد اور عورتیں سب یاد رکھیں گے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیں گے۔ آج کل مشکل یہ ہے کہ آنسو بہالیں گے۔ آہیں بھر لیں گے اور سن کر کہیں گے کہ بس جی ہمارا کیا ٹھکانا ہے۔ صاحبو! ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ کام تو کئے ہی سے ہوتا ہے۔ پس کام کرو اور باتیں نہ بھنگارو۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماوے۔ آمین ثم آمین۔

دنیا کی مُسافِرانہ زندگی

غریب الدُّنیا

تعلقاتِ غیر ضروریہ کو کم کرنے کے سلسلہ میں یہ وعظ ۲۴، محرم الحرام ۱۳۴۱ھ کو بروز سہ شنبہ حضرت حکیم الامت نے اپنے دولت خانہ پر تھانہ بھون میں مستورات کی درخواست پر تعمیر مکان کے شکریہ کے طور پر بیٹھ کر فرمایا۔ جس پر ۲ گھنٹے ۲۵ منٹ لگے۔ سامعین میں پچاس مرد تھے۔ مستورات علاوہ تھیں۔ یہ وعظ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

دنیا میں رہ کر اس سے بے تعلق ہونا دشوار ہے
اس لئے دنیا میں ہی رہو۔ آسمان پر اُڑنے کی فکر نہ
کرو۔ مگر دنیا سے اتنا ہی علاقہ رکھو، جتنا مسافر
کو رات یا سرائے سے علاقہ ہوا کرتا ہے۔ یعنی نہ بالکل
تارک الدنیا ہو جاؤ نہ بالکل فنافی الدنیا ہو جاؤ۔
بلکہ دنیوی تعلقات میں اختصار پیدا کرو۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ
ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من
شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا
من یھدہٗ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہٗ فلا
ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ
لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا
محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالےٰ
علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔
امابعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
کن فی الدنیا کانک غریب او عابری
سبیل ـــــــــ !

اس موضوع کے انتخاب کی وجہ

یہ ایک حدیث ہے۔ یعنی ارشاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو لفظاً نہایت مختصر ہے مگر اس میں ایک علم عظیم اور ضروری مضمون پر متنبہ کیا گیا ہے۔ جس کی ضرورت ہر شخص کو واقع ہوتی ہے۔ پس لفظی اختصار پر نظر نہ کی جائے۔ بلکہ معنی کی عظمت پر نظر کرنا چاہیئے یہ مضمون نہایت ضروری ہے توجہ سے سننا چاہیئے اور گو یہ مضمون نیا نہیں بلکہ اس کو ان لفظوں سے یا ترجمہ سے بارہا سُنا ہوگا اور اس وجہ سے عجب نہیں کہ کسی کو یہ خیال ہوا ہو، کہ یہ فرسودہ مضمون بیان کے لئے اختیار کیا گیا ہے، بلکہ کوئی نئی بات بیان کرنا چاہیئے جو کہ ہم کو معلوم نہ ہو۔

صاحبو! اس خیال میں تو گویا اپنے اعتقادِ جہل کی درخواست ہے کہ ہم کو جاہل سمجھ کر نیا مضمون کیوں نہ بیان کیا۔ کیونکہ جدّت، عدمِ علم پر موقوف ہے اور عدم علم جہل ہے[1]۔ سو اُسکا جواب یہ ہے کہ میں آپ کو جاہل نہیں سمجھتا بلکہ عالم سمجھتا ہوں۔ اس لئے نیا مضمون اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ اہل علم کے لئے کوئی مضمون نیا نہیں۔ پس نیا مضمون تو وہ اختیار کرے جو اپنے مخاطبوں کو جاہل سمجھے کہ اُن کو یہ بات معلوم نہیں، اس کو بیان کرو تاکہ ان کا جہل کم ہو اور جو اپنے مخاطبوں کو عالم سمجھے گا، وہ اس کا اہتمام نہ کرے گا اور یہ محض میری خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقعہ ہے کیونکہ شریعت محدود ہے۔ غیر متناہی نہیں ہے۔ آدمی تھوڑے سے وقت میں

لہ یعنی نیا علم تو جب بیان کیا جائے۔ جب آپ کو پہلے اُسکا علم نہ ہو اور آپ اس سے جاہل ہوں لہ

بھی تمام احکام سے اجمالاً واقف ہوسکتا ہے اور اس وقت جو لوگ مخاطب ہیں وہ تو زیادہ وقت تک احکام سنتے رہے ہیں پھر اُن کی نسبت سے دین کا کوئی مضمون نیا کیوں کر ہو سکتا ہے ۔ پس نئے مضمون کی درخواست کرنا گویا اپنی طرف نسبت جہل کی درخواست کرنا ہے اور یہ تمنا تو ہونا نہ چاہیئے کیونکہ جب خدا نے آپ کو عالم بنایا ہے تو آپ اپنی طرف نسبت جہل کی تمنا یا درخواست کیوں کرتے ہیں ؟ ۔

رہا یہ سوال کہ جب ہم کو عالم مانا گیا ہے اور یہ مضمون ہم کو معلوم ہے تو پھر بیان سے فائدہ کیا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فائدہ کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ غیر معلوم کو معلوم کرایا جائے، بلکہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلوم سے غفلت ہو تو اسے غفلت کو دور کیا جائے بلکہ یہ زیادہ اہم ہے ۔ کیونکہ جو بات معلوم نہیں، اس پر تو عمل کی توقع قریب ہے کہ شاید علم کے بعد عمل کرے اور جو معلوم ہے اور پھر بھی عمل نہیں کیا گیا تو یہ حالت سخت ہے ۔ اس میں کوتاہی زیادہ ہے ۔ کیونکہ اب عمل کے لئے کس بات کا انتظار ہے ؟

دوسرے کبھی یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون ایک عنوان سے معلوم ہے، دوسرے عنوان سے معلوم نہیں اور دوسرا عنوان زیادہ مؤثر ہے ۔ اس لئے معلوم کو دوسرے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اثر زیادہ ہو اور یہ بھی ایک نیا فائدہ ہے ۔

نیز کبھی علم اجمالی ہوتا ہے تفصیل سے معلوم نہیں ہوتا ۔ اس لئے مجمل کو مفصلاً بیان کیا جاتا ہے ۔ کیونکہ تفصیل بعد الاجمال اوقع فی النفس ہوتی ہے ۔ یہ بھی ایک نیا فائدہ ہے ۔

اور اگر بالکل ہی تکرار ہو جب بھی فائدہ ہے ۔ کیونکہ تکرار سے تاکید ہوتی ہے اور تاکید سے قوت حاصل ہوتی ہے ۔

پس یہ مضمون فرسودہ نہیں بلکہ بعض حیثیات سے اس میں بھی جدّت[1] ہے کیونکہ جس عنوان سے اس وقت بیان ہوگا، یہ عنوان بہت کم کانوں میں پڑا ہوگا ۔ پس یہ مضمون قدیم بھی ہے اور جدید بھی ہے ۔ ذاتاً قدیم ہے اور وصفاً و عنواناً جدید ہے[2] ۔ اب اس کو قدیم سمجھ کر

---

[1] نیاپن ۱۲ [2] یعنی مضموناً گو پُرانا مگر انداز نیا ہے ۔

بیٹے تو میری تحقیق کے موافق ہے کہ جدید کا انتظار نہ کرنا چاہیے اور جدید سمجھ کر سنیئے تو آپ کے مذاق کے مطابق ہے۔ غرض یہ مضمون ہر طرح سے مفید ہے۔ اس کی وہی حالت ہے۔

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را بہ بُو اربابِ معنی را

اس کے حسن کی بہار کا عالم دل و جان کو تازہ رکھتا ہے۔ صورت دیکھنے والوں کو رنگ سے اور معنیٰ سمجھنے والوں کو اپنی خوشبو سے۔

دنیا کے مقیم مسافر ہیں

ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں دنیا میں تم ایسے رہو جیسے مسافر رہا کرتے ہیں آگے ترقی فرماتے ہیں کیونکہ مسافر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو سفر کر کے کہیں کچھ دنوں کے لئے ٹھہر گیا۔ دوسرے وہ مسافر ہے جو برابر چلا آرہا ہے کہیں ایک دو منٹ کو یا گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو ٹھہر گیا تو وہ معتدبہ نہیں۔ اس کو قیام نہیں کہتے۔ چنانچہ مسافر چلتا چلتا کہیں تھوڑی دیر کو آرام لے لے تو اس کو مقیم نہیں کہیں گے، واقف[1] کہیں گے اور جو مسافر دس پانچ دن کو ٹھہر جائے اس کو مقیم کہہ دیتے ہیں۔ محاورات میں ان دونوں حالتوں میں فرق ضرور ہے۔ لہٰذا مسافر کلی مشکک ہے جو مختلف افراد پر محمول ہوتا ہے[2]۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترقی کر کے فرماتے ہیں۔ او عابری سبیل (فیہ او بمعنی بل ۱۲) یعنی بلکہ اس مسافر کی طرح رہو، جو راستہ طے کر رہا ہو۔ کہیں مقیم نہیں ہوا۔ یہ تو ترجمہ حدیث کا ہے۔ اس مضمون کو سن کر ہر شخص یہ کہے گا کہ الحمد للہ ہم تو اس پر عامل ہیں، دنیا میں ہم اپنے کو چندروزہ مسافر ہی سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ ہم ہمیشہ ہی زندہ رہیں گے۔

مرنے کا ہر ایک کو یقین ہے

اس پر مسلمانوں کا تو کیا کفار کا بھی عقیدہ ہے کہ ایک دن مرنا ضرور ہے۔ ملحد بھی اس

---

[1] ٹھہرنے والا [2] یعنی مسافر ہونے کے مختلف درجات ہیں۔

کا قائل ہے۔ جو نہ مبدا، کا قائل ہے۔ نہ معاد کا، سو یہ مضمون ایسا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہستی میں تو بعضوں نے شک بھی کیا ہے۔ مگر اس میں کسی کو شک نہیں۔ دنیا سے چلا جانا سب کو مسلم ہے۔ ملحد بھی اس کا قائل ہے بلکہ وہ تو ایسی موت کا قائل ہے جو اہل مذاہب کے اعتقاد سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ اہل مذاہب تو موت کے بعد بھی حیات کے قائل ہیں اور اُنکے نزدیک یہ موت دائمی اور ابدی نہیں، بلکہ منقطع ہونے والی ہے۔ تو وہ موت کامل کے معتقد نہیں، بلکہ ناقص کے قائل ہیں اور ملحد حیات ثانیہ کا قائل نہیں ہے تو اس کے نزدیک یہ موت مؤبّد[1] ہے۔ جو کامل موت ہے تو وہ ایسی موت کا قائل ہے جو موت کی بہت بڑی فرد ہے گو وہ مقدر ہی ہے۔ فرد محقق نہیں، غرض میرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اہل حق سے زیادہ موت کے قائل ہیں عجیب تماشا ہے کہ خدا کے منکر موجود، رسولؐ کے منکر موجود، فرشتوں کے منکر موجود مگر موت کا منکر کوئی نہیں ہے۔

تو اے صاحبو! جس چیز کے ملحدین تک بھی منکر نہیں، اگر تمہارے اندر اس کے انکار کی کوئی امارت و علامت پائی جائے تو یہ افسوس کی جگہ ہے یا نہیں۔ یقیناً بڑے افسوس کی بات ہے۔ شاید تم یہ کہو کہ ہم کہاں منکر ہیں۔ تو سنو! کہ زبان سے تو اس کا کوئی بھی منکر نہیں۔ ہم ہی کیسے انکار کر سکتے ہیں۔

مگر علم کے مقتضا پر عمل نہیں

مگر اپنی حالت کو دیکھو کہ تمہاری حالت سے انکار ٹپکتا ہے یا نہیں اور تمہارے اندر علامات انکار ہیں یا نہیں۔ اس کو اس مثال سے سمجھو۔

دیکھو! اگر کوئی شخص آگ کا انگارہ ہاتھ میں لے لے تو یہی کہا جائے گا یہ شخص احراق[2] نار کا منکر ہے۔ اگر کوئی شخص سانپ کو پکڑنا چاہے تو یوں کہتے ہیں کہ شاید یہ سانپ کو جانتا نہیں ہے۔ چنانچہ اس پر وجوہ بلاغت اور نکات معنی متفرع ہوتے ہیں کہ سانپ

---

[1] ہمیشہ کی موت [2] یعنی آگ کے جلا دینے کا۔

پکڑنے والے سے کہتے ہیں، دیکھ کیا کرتا ہے۔ سانپ ہے سانپ۔ یعنی اس کے ساتھ اسی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ جیسے منکر کے ساتھ کی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی اپنے باپ کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرے تو کہتے ہیں دیکھ تیرا باپ ہے باپ۔ حالانکہ باپ کا باپ ہونا اُسے بھی معلوم ہے۔ مگر پھر اُس سے یُوں ہی کہتے ہیں کہ دیکھ یہ تیرا باپ ہے۔ اہل بلاغت نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہاں تنزیل العالم بمنزلہ الجاہل اور تنزیل المقر بمنزلہ المنکر ہے اور یہ قواعد ہر زبان میں جاری ہیں۔ کیونکہ بلاغت کے جو اصول ہیں۔ وہ سب عقلی ہیں۔ جو کسی خاص زبان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر زبان میں موجود ہیں۔

میرے اُستاد مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک طالب علم کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ اُس نے اُستاد سے "مختصر معانی" پڑھی تھی۔ جب ختم کر چکا تو اُس نے دوسری کتاب پڑھنا چاہی۔ اُستاد نے کہا۔ امتحان لے کر شروع کراؤں گا۔ وہ آمادہ ہو گیا مگر اُستاد نے متعارف طریق سے امتحان نہیں لیا۔ بلکہ اس نے کہا بازار میں جا کر دیکھو کہ لوگ مختصر معانی کے قواعد کا استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ گیا اور واپس آکر کہنے لگا کہ لوگوں کو تو ان قواعد کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ طالب علم ابھی اصطلاحی الفاظ کے چکر میں تھا۔ اُس پر حقیقت منکشف نہ ہوئی تھی۔ اس لئے استاد نے کہا کہ تم نے مختصر معانی کو سمجھا ہی نہیں، دوبارہ پڑھو۔ چنانچہ اُس نے دوبارہ پڑھی۔ اس کے بعد اُستاد نے کہا کہ اب تو بازار میں جا کر دیکھو۔ وہ گیا اور واپس آ کر کہنے لگا کہ حضرت واقعی کوئی شخص بھی ان قواعد سے خالی نہیں۔ فرمایا، اب تم مختصر معانی سمجھ گئے۔

غرض یہ قواعد عقلی ہیں۔ سب اہل زبان ان پر عامل ہیں۔ چنانچہ یہ قاعدہ بھی ہر زبان میں مستعمل ہے کہ کسی شے کے مقتضاء کے خلاف عمل کرنے سے اُس شے کو کالعدم سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جو شخص باپ کو جانتا ہو کہ یہ میرا باپ ہے، مگر اُس کے ساتھ خلاف مقتضائے ابوت برتاؤ کرتا ہے۔ اُس کو منکر ابوت قرار دے کر اُس سے اسطرح کلام کرتے ہیں جیسے منکر سے کیا جاتا ہے اور یہ قاعدہ عقلی بھی ہے۔ کیونکہ انتفاء لازم عقلاً انتفاء ملزوم کو مستلزم ہے۔

اب میرا عار دلانا صحیح ہے کہ اے مسلمانو! جس چیز کے ملحد بھی منکر نہیں افسوس ہے کہ تم اُس کے منکر ہو اور انکار عام ہے۔ خواہ انکار حالی ہو یا قالی ہو یا عملی ہو۔ ملحد اگر اس کا بالکل بھی انکار کر دے تو جائے تعجب نہیں۔ کیونکہ اس کے زعم میں انکار موت و مابعد الموت پر کوئی مواخذہ نہیں۔ وہ اپنے اعتقاد میں اس کے انکار کو مضر نہیں سمجھتا مگر تم تو مضر سمجھتے ہو۔ تمہارا کسی درجہ میں بھی اس کا منکر ہونا حیرت کی بات ہے اور یہ ابھی بیان ہو چکا کہ مقتضائے علم پر عمل نہ کرنا بھی انکار کے مثل ہے اور یقیناً ہم لوگ علم موت کے مقتضاء پر عمل نہیں کرتے اس لئے حاجت ہوئی اس مضمون کے بیان کرنے کی۔ کیونکہ گو ہم کو اس کا اعتقاد ضرور ہے مگر مقتضاء پر عمل نہیں ہے۔ اجمالاً تو کوتاہی بیان ہو چکی۔ اب تفصیلاً سنیئے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کسی سے یہ کہو کہ کیا تم دنیا میں ہمیشہ رہو گے تو وہ فوراً کہتا ہے کہ صاحب دنیا میں رہنا تھوڑا ہی ہے۔ ایک دن مرنا ضرور ہے۔ مگر حالت یہ ہے :-

اتتخذون مصانع لعلکم تخلدون

کہ سامان ایسے کرتے ہیں کہ گویا ہمیشہ یہاں ہی رہیں گے۔

اپنے لئے بھی اور اپنے بعد کے لئے بھی سامان ایسے کرتے ہیں کہ گویا خدا تعالیٰ کو مجبور سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔ (نعوذ باللہ منہ)

قوی القلب بزرگوں کی مثال

اس کی توضیح ایک مثال سے اچھی طرح ہو گی۔ وہ یہ کہ ابھی کچھ دنوں پہلے طاعون آیا تھا۔ غور کیجئے۔ اس وقت دل کی کیا حالت تھی۔ بعض کے دل تو اُس وقت بھی قوی تھے جس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ پر نظر ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ اُن کے حکم سے ہوتا ہے۔ بدون خدا کے حکم کے کسی کی موت نہیں آسکتی۔ اس لئے وہ طاعون کے زمانہ میں بھی ویسا ہی بے فکر رہتا۔ جیسا اور دنوں میں۔ کیونکہ اس کے نزدیک جب موت خدا کے حکم پر ہے تو ہر زمانہ اس کے لئے مساوی ہے۔ یہ تو قوتِ قلب ہے۔

جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ جنگ صفین میں گردنیں گیند کی طرح اڑ رہی تھیں۔ مگر آپ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سو رہے تھے کہ بعض دفعہ تلوار بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتی تھی۔ کسی نے کہا۔ اے امیر المومنین! اس حالت میں یہ بے فکری۔ ذرا ہوشیار ہو کر رہیئے۔ دشمن کا حملہ بہت سخت ہے۔ فرمایا ؎

ای یومین من الموت افر　　یوم لا یقدر او یوم قدر
یوم لا یقدر لا یاتی القضاء　　یوم قد قدر لا یغنی الحذر

کہ میاں موت سے کوئی کب بھاگ سکتا ہے۔ یہاں نہ آئی اور کسی دن آئے گی۔ پھر گھبراہٹ کس بات کی۔

اور سنئے! امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ حدیث پڑھا رہے تھے کہ بچھو نے اُن کے کاٹا اور گیارہ بار کاٹا۔ مگر آپ نے ذرا بھی اُف نہ کی اور برابر حدیث بیان کرتے رہے۔ یہ انہی کا دل تھا کہ گیارہ بار بچھو نے کاٹا مگر حدیث کو ترک نہ کیا۔ یہ بات کہہ دینی تو آسان ہے۔ چنانچہ میں نے بھی کہہ دی ہے۔ مگر ابھی بچھو سامنے سے نکل آئے تو شاید سب سے پہلے میں ہی بھاگوں۔ جب امام مالکؒ حدیث پڑھا چکے تو خادم نے دریافت کیا کہ اثناء درس میں آپ کے چہرے کا رنگ کیوں بدل رہا تھا۔ فرمایا بچھو نے میرے گیارہ بار ڈنک مارا مگر میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے نہ اُٹھا۔ اب اس کو تلاش کر کے مار ڈالو۔ چنانچہ تلاش کر کے مار دیا گیا۔ یہ تو اسی اللہ کے پاک بندہ کا دل تھا۔ اُس کا نام قوتِ قلب ہے۔

تو طاعون کے زمانہ میں بعضے تو اس لئے بے فکر تھے کہ وہ یُوں سمجھتے تھے کہ زمانہ میں اسی طرح ہوا کرتا ہے۔ کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے۔ جس میں طاعونی جراثیم پیدا ہو گئے وہ مر گیا اور جس نے اپنے جسم کی حفاظت کی وہ بچ گیا تو ہم تدابیر حفظ صحت پر عامل ہیں۔ ہم کو طاعون نہیں ہو گا۔

قاسی القلب لوگوں کی حالت

یہ قلب قاسی ہے۔ جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے۔

ابعد شئ عند اللہ القلب القاسی

کہ حق تعالےٰ سے سب سے دُور قلب قاسی ہے۔

جس میں نہ خدا سے خشیت ہے نہ محبت ہے۔ یہ تو قوی القلب اور قاسی القلب لوگوں کا حال تھا۔ مگر جو لوگ کمزور دل کے ہیں اور زیادہ ایسے ہی ہیں۔ اُن کے چہرہ پر طاعون کے زمانہ میں ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دکان کا کام بھی کرتے تھے۔ عورتیں کھانا بھی پکاتی تھیں۔ زمیندار لگان کا تقاضا اور نالش بھی کرتے تھے۔ مگر دل کسی کام میں نہ تھا۔ بس موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا کہ دیکھئے کب بلاوا آجاوے۔ ہر شخص دنیا سے دل برداشتہ تھا کسی چیز سے دلچسپی اور دلبستگی نہ تھی۔ اس لئے بہت سے بے نمازی اُس وقت نمازی اور دیندار ہو گئے تھے۔ اگر ہر وقت ہماری یہی حالت رہے تو یہ کچھ نمونہ ہے۔ کن فی الدنیا کانک غریب کا۔ اور اگر یہ حالت نہیں تو غفلت ہے۔ مگر انسان کی حالت یہ ہے۔ جس کو حق تعالیٰ بطور شکایت کے بیان فرماتے ہیں۔

واذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما۔ فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ۔ کذلک زین للمسرفین ما کانوا یعملون۔

یعنی انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے۔ لیٹے بیٹھے بھی کھڑے بھی (چنانچہ طاعون میں اکثر بے نمازی نماز پڑھنے لگتے ہیں) پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی پہلی حالت پر آجاتا ہے (پھر وہی دھما چوکڑی کرنے لگتا ہے اب نہ نماز ہے نہ روزہ ہے) کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی۔ اُس کے ہٹانے کے لئے ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال اُن کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں۔

صاحبو! اگر ہم کو وہ حالت نصیب ہو جائے جو طاعون کے زمانہ میں تھی تو پھر اُسکا لطف ہم کو خود معلوم ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے کہ تم دنیا کے

کاروبار چھوڑ کر بیٹھ جاؤ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ سب کام کرو مگر دل کی حالت وہ ہو جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ آدمی سب کام کرتا ہے۔ مگر دل کسی کام میں نہیں ہوتا۔ دنیا سے تعلق اور لگاؤ نہیں ہوتا۔ بتلائیے! اس زمانہ میں ضروری کام کون سا چھوٹ گیا تھا۔ ایک بھی نہیں۔ ہاں لغویات اور گناہ کے کام البتہ کم ہو گئے تھے۔ بس آپ کا مقصود یہ ہے کہ عمر بھر اسی طرح رہو۔

حدیث میں ہے۔ یا عبداللہ اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمسآ واذا امسیت فلا تحدث نفسک بالصباح وعد نفسک من اھل القبور۔ اے عبداللہ بن عمرؓ جب تم صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام کرو تو صبح کا خیال نہ لاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت امانی محضہ نہ پکاؤ کہ شام کو یوں کریں گے صبح کو یوں کریں گے۔ کیونکہ الحدیث یفسر بعضہٗ بعضا اور دوسری حدیث میں اس قید کی تصریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من حسن اسلام المرأ ترکہ ما لا یعنیہ۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لایعنی امور کے ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضروری اور مفید امور کا ترک ضروری نہیں تو اس میں ضروری خیالات کی بھی اجازت ہے۔ مثلاً کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کی بابت تحدیث النفس جائز ہے۔ بلکہ واجب ہے کہ اس کے ادا کی تدبیریں سوچے، یہ ممنوع نہیں بلکہ ممانعت اس کی ہے کہ شیخ چلی کی طرح خیالی منصوبے پکائے۔

شیخ چلّی کا واقعہ

جیسے شیخ چلّی ایک گھڑا تیل کا دو پیسہ کی مزدوری پر لے کر چلا تو راستہ میں سوچنے لگا کہ ان دو پیسوں کے انڈے خریدوں گا۔ ان کو مرغی کے نیچے رکھوں گا۔ اس میں دو بچے نکلیں گے۔ ایک مرغا ہو گا ایک مرغی۔ ابھی تک پیسے تو ملے بھی نہیں اور بچے نکلنے لگے۔ پھر وہ بھی ان کے حساب کے موافق ایک مرغا اور ایک مرغی۔ پھر ان کے اور انڈے بچے ہوں گے۔ پھر بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی تو بیچ کر بکری خریدوں گا۔ اس کی نسل بڑھے گی تو سبا

کو بیچ کر گائے لوں گا۔ اس کی بھی نسل بڑھے گی تو پھر بھینس لوں گا۔ پھر اس کی نسل بڑھے گی، تو سب کو بیچ کر ایک بہت بڑی دکان کھولوں گا۔ جس سے مجھے بہت نفع ہو گا تو مالدار ہو جاؤں گا۔ پھر ایک عالیشان مکان بناؤں گا اور وزیر زادی کو نکاح کا پیغام دوں گا۔ اس سے میرے ایک لڑکا ہو گا جو بڑا ہو گا۔ جو بڑا ہو کر میرے ساتھ ساتھ رہا کرے گا۔ وہ مجھ سے پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا۔ ہشت۔ بس ہشت کہنا تھا کہ سر کو حرکت ہوئی اور گھڑا گر پڑا۔ مالک نے دھمکایا کہ ارے یہ کیا کیا، تو آپ کہتے ہیں۔ جاؤ میاں! تمہارا تو چار پانچ سیر تیل ہی ضائع ہوا اور میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا (کیونکہ اس کی تو ساری بنا وہ دو پیسے تھے۔ جو مزدوری میں ملتے۔ گھڑا چھوٹنے سے مزدوری گئی تو سارا کنبہ بھی جاتا رہا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت کو منع فرماتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کا واقعہ

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ ایک رات مجھے ایک تاجر کے پاس رہنے کا اتفاق ہو گیا۔ جس کے پاس سامانِ تجارت تھا اور بہت سے غلام اور خدمت گار تھے۔ اس نے تمام رات میرا سر کھایا کہ اس وقت میرے پاس اتنا مال ہے اور میرا فلاں شریک ترکستان میں ہے اور کچھ سامانِ تجارت ہندوستان میں ہے اور یہ فلاں زمین کی دستاویز ہے اور فلاں سامان کا ایک شخص ضامن ہے۔ کبھی کہتا کہ اسکندریہ جانے کا خیال کر رہا ہوں کہ وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے۔ کبھی کہتا نہیں! وہاں کا دریا خطرناک ہے۔ پھر کہنے لگا، سعدی! مجھے ایک سفر اور درپیش ہے۔ اگر وہ پورا ہو جائے تو بقیہ زندگی قناعت کے ساتھ گوشہ نشین ہو کر گزار دوں گا۔ میں نے پوچھا، وہ کون سا سفر ہے؟ کہا، فارس کی گندھک چین میں لے جانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سنا ہے۔ وہاں اس کی بہت قیمت ہے اور چینی گلاس روم میں لے جا کر فروخت کروں گا اور دیبائے رومی ہندوستان اور فولاد ہندی حلب میں اور حلبی شیشہ یمن میں اور یمنی چادر فارس میں۔ اس کے بعد سفر ترک کر کے ایک دکان میں بیٹھ جاؤں گا۔ اب بھی ترکِ دنیا کا ارادہ نہیں، دکان ہی میں بیٹھنے کی نیت ہے۔ غرض اس

قسم کا خیالی پلاؤ پکار رہا۔ اخیر میں سعدی سے کہا کہ آپ بھی کچھ اپنی دیکھی اور سنی ہوئی باتیں سنائیں۔ سعدی نے یہ جواب دیا ؎

آں شنیدی کہ در صحرائے غور بار سالارے بیفتاد از ستور

گفت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

تو نے غور کے جنگل کا قصہ سنا ہو گا کہ ایک تاجر کا سامان سواری سے گر گیا تو وہ بولا کہ دنیا دار حریص کی آنکھ کو یا تو قناعت بھرتی ہے یا قبر کی مٹی۔

موت کو قریب سمجھو

واقعی دنیا دار کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بس مر کر ہی ختم ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ انسان کی حرصِ شکم کو مٹی ہی بھرتی ہے۔ ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب ویتوب اللّٰہ علی من تاب۔ اس طول امل اور فضول لایعنی خیالات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ صبح آوے تو شام کی فکر نہ کرو اور شام ہو تو صبح کی فکر نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شمار کرو۔ یعنی یہ سمجھ لو کہ گویا آج ہی کا تھوڑا سا وقت زندگی کا باقی ہے۔ پس وہ کام کرو جو زندگی سے مایوس ہو جانے والا آدمی اخیر میں کیا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے کو ایک دن یا ایک گھڑی کا مہمان سمجھتا ہو وہ غیر ضروری کاموں میں وقت کو ضائع نہیں کیا کرتا۔ اس کو اتنے دور دراز کے منصوبوں کی کہاں فرصت بس یہی حال انسان کا عمر بھر ہونا چاہئے۔ مگر اب طاعون کے بعد ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ہمارے سامنے آج کل مر بھی جاوے تب بھی ہم کو یہ خطرہ اور وسوسہ نہیں ہوتا کہ ہم بھی اسی جگہ آئیں گے جہاں یہ مردہ آیا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ قبر کے اوپر سب قصے دنیا بھر کے ہوتے رہتے ہیں، قبر سامنے ہے اور لوگ ادھر اُدھر کی حکایتوں اور مقدمہ بازی کی باتوں میں مشغول ہیں، گویا یوں سمجھتے ہیں کہ یہ مردہ سب کی طرف سے کفارہ ہو گیا۔ بس سب کی طرف سے اسی کو موت آگئی اور کسی

کو نہ آئے گی۔ جیسے نصاریٰ کا خیال ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت کی طرف سے کفارہ ہو گئے۔ اَب یہ جو چاہیں بدمعاشی کریں۔ کسی سے کچھ بازپُرس نہ ہوگی۔ غرض موت کا بھول کر بھی خیال نہیں آتا اور وہ سامان کرتے ہیں جیسے ہمیشہ یہیں رہیں گے۔ اگر ہمارا اپنے گھر کے متعلق وہ اعتقاد ہوتا، جو اسٹیشن یا سرائے کے متعلق ہے تو گھر کے استحکام اور زیب و زینت کا اس درجہ اہتمام نہ کرتے۔ کیونکہ سرائے میں اگر کوئی دیوار یا کمرہ شکستہ ہو تو اس کی کوئی مرمت نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کو اپنا گھر نہیں سمجھتے۔ رات بھر کی یا ایک دو دن کی قیام گاہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس کی شکستگی سے کچھ بھی فکر نہیں ہوتا۔ اگر ہم غفلت میں مبتلا نہ ہوتے تو یہاں کے گھر کو اپنا گھر نہ سمجھتے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ الدنیا دار من لا دار لہ کہ دنیا اُس شخص کا گھر ہے جس کے گھر نہ ہو گو اس میں دنیا کو دار کہا گیا ہے۔ مگر جب اس صفت پر نظر کی جائے کہ وہ بے گھرے کا گھر ہے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ دنیا حقیقت میں گھر ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو کیسا گھر ہے؟

دنیا کے گھر کی حقیقت

ایسا ہے جیسا حق تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ وما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب وان الاٰخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ یعنی یہ حیات دنیویہ کچھ نہیں، صرف ایک لہو ولعب ہے۔ اس میں ایک مثال کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا گھر ایسا گھر ہے۔ جیسا بچے کھیل میں گھر بنایا کرتے ہیں اور اپنی بے وقوفی سے اس کو گھر ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کو ڈھا دو تو روتے چلاتے ہیں کہ ہمارا گھر ڈھا دیا۔

پہلے رسم تھی کہ لڑکیاں پیر مکوڑا بنایا کرتی تھیں۔ اس میں مکوڑوں کے لئے مٹھائی رکھتی تھیں، بیچ میں ایک قبر بھی ہوتی تھی۔ دروازہ اور کمرہ وغیرہ۔ غرض سارا شہر اس میں ہوتا تھا۔ رات کو چراغ بھی جلائے جاتے تھے۔ یہ رسم پیرزادوں نے ایجاد کی تھی تاکہ بچوں میں بچپن ہی سے پیر پرستی اور قبر پرستی پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ عقلاء نے گڑیوں کا کھیل اس لئے ایجاد کیا تھا تاکہ لڑکیوں کو گڑیوں کے کپڑے سینے میں سینا پرونا آجاوے تو جیسا کہ

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

جس کا جی چاہے آوے اور جس کا جی چاہے چلا جاوے۔ اس درگاہ
پر روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں۔

اگر تم خود ہاتھ کھینچ لو گے تو پھر وہ بھی کھینچ لیں گے کیونکہ وہ زبردستی اپنی نعمتوں کو کسی کے سر نہیں چپکاتے کہ چاہے تم چاہو یا نہ چاہو، پھر بھی دیتے ہی رہیں۔ فرماتے ہیں

انلزمکموہا وانتم لہا کارھون اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کو شروع کر کے چھوڑ دینا یہ بھی بندہ کی طرف سے ترکِ طلب کی علامت ہے جو کبھی کراہت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اسی لئے حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

یاعبداللہ! لا تکن مثل فلان کان یقوم من اللیل ثم ترکہ۔

اے عبداللہ! تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو اٹھا کرتا تھا پھر
قیام لیل کو ترک کر دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شخص کی حالت پر انکار تھا جبھی تو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم ایسے نہ ہو جانا۔ پس کسی عمل کو شروع کرنے کے بعد ترک کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا تکمیل کے بعد بھی عمل میں کمی کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی طرف سے بھی کمی ہو جائے گی اور راز اس میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔

اب دیکھ لیجئے کہ اگر ایک آدمی روز ہمارے پاس آیا کرتا ہو، پھر آنا چھوڑ دے تو ہم کو اس سے انقباض ہو جاتا ہے۔ یہی برتاؤ اُدھر سے بھی ہوتا ہے۔ اس پر شاید کسی کو اشکال ہو کہ ہم کو تو کسی دوست کے نہ آنے سے اس لئے انقباض ہوتا ہے کہ ہم کو علم غیب نہیں۔ ہم آثار و علامات سے ہی استدلال کرتے ہیں۔ تو ممکن ہے کہ جس دوست نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ حقیقت میں اس کی محبت کم نہ ہوئی ہو مگر ہم نے ترک آمد و رفت سے قلت محبت پر استدلال کر لیا اور اس سے منقبض ہو گئے۔ مگر حق تعالیٰ کو تو ہماری حالت کا علم

ہے کہ ہم کو محبت ہے گو عمل میں کمی آگئی۔ پھر وہاں سے یہ برتاؤ کیوں ہوا
جواب یہ ہے کہ اُن کو یہ بھی معلوم ہے کہ بہت لگ لپٹنے کے بعد عمل کو وہی چھوڑتا ہے جو خود بھی بدل جائے۔ بدون کسی قدر تغیر کے پہلے برتاؤ میں کمی نہیں ہو سکتی۔ ہاں عذر سفر و مرض کی وجہ سے ہو تو اس صورت میں عمل کی کمی اور کوتاہی معاف ہے۔ بشرطیکہ ضروریات میں خلل نہ آوے۔ اس وقت تو حق تعالیٰ ایسا کرم فرماتے ہیں کہ تم سے چاہے عمل کم ہو مگر وہاں اتنا ہی کام لکھا جاتا ہے۔ جتنا صحت میں لکھا جاتا تھا۔ باقی بدون عذر کے کوتاہی کرنا بدون تغیر حالت کے نہیں ہو سکتا۔

انسان طبعاً حریص ہے

طبعاً انسان میں استیلاء کی حرص رکھی ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ مظہر صفت الٰہیہ ہے اور استیلاء خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ انسان اس صفت کا بھی مظہر ہے تو جس چیز کی اس کو طلب ہوتی ہے۔ اس پر استیلاء کا حریص ہوتا ہے۔ پس اگر اس کو حق تعالیٰ کی معرفت و محبت مطلوب ہو گی تو طبعاً یہ اُس میں بھی استیلاء کا حریص ہو گا۔ کسی مطلوب میں نقص اور تنزل کو انسان کبھی گوارا نہیں کرتا۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اب سمجھئے کہ جس مطلوب میں انسان سے استیلاء کے خلاف تنزل اور کوتاہی کا ظہور ہو گا۔ وہاں ضرور طلب میں کوتاہی ہو گی۔ بدون اس کے یہ کبھی تنزل کو گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی طبیعت کا اصلی مقتضا۔ تو استیلاء ہے۔ بوجہ مظہر صفت الٰہی ہونے کے۔ مگر چونکہ بعض دفعہ استیلاء کامل کی طلب نہیں کرتا۔ بس اتنی ہی بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ مجھے احوال و کیفیات پر استیلاءً علمی تو ہو گیا ہے۔ میں شوق اور محبت کے پیدا کرنے کی ترکیب جان گیا ہوں۔ دفع وساوس کی تدبیر مجھے معلوم ہو گئی ہے۔ گو شوق و محبت اس میں راسخ نہ ہوتی ہو، اور وساوس اس کے قلب سے دفع نہ ہوئے ہوں۔ اس وقت اس کی وہ مثال ہوتی ہے جیسے ایک شخص بخیل گھی سامنے رکھ لے اور ہر لقمہ پر کہے، تجھ کو کھالوں گا۔ روٹی ختم ہو جائے اور گھی باقی رہے۔ اس پر خوش ہو کہ مجھ کو کھانے کی قدرت ہے ——— اور جیسے

ایک جولاہے کی بھینس چورلے گئے تو وہ کہتا ہے، لے جاؤ رسی تو میرے ہی پاس ہے تم کاہے سے باندھوگے۔ اسی طرح احوال وکیفیات کے وارد کرنے کی ترکیب معلوم کر کے بعض سالکین بے فکر ہو جاتے ہیں کہ بس جب چاہیں گے۔ اُن کو حاصل کرلیں گے چاہے توفیق کبھی نہ ہو۔ اسی طرح بعض لوگ نماز شروع کرکے پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ نمازی مشہور ہوگئے ہیں۔ استیلاء شہرت حاصل ہو چکا ہے۔ چاہے اب وہ عید ہی کے نمازی ہوں، کیونکہ نمازی کی ایک قسم یہ بھی ہے۔

چنانچہ ایک واعظ صاحب گاؤں میں پہنچے اور واعظ میں کہا کہ بے نمازی سور ہیں۔ یہ سُن کر گاؤں کے لوگ بگڑ گئے اور لاٹھیاں لے کر چڑھ آئے۔ مولوی صاحب نے کہا، کیوں آئے خیر تو ہے۔ کہا تم نے ہم کو سور کہا تھا۔ کہنے لگے میں نے تم کو تھوڑا کہا تھا تم تو نمازی ہو۔ کیا تم کبھی عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ گاؤں والوں نے کہا۔ ہاں عید کی نماز تو پڑھ لیتے ہیں۔ کہا، پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے۔ میں نے تم کو سور نہیں کہا اس پر سب راضی ہوگئے۔

بعضے حج کرکے ناجائز افعال کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ حاجی تو مشہور ہوگئے ہیں۔ اب کسی عمل کی کیا ضرورت ہے۔ بعضے ایک کافر کو مار کر خوش ہیں کہ ہم غازی مشہور ہوگئے ہیں یا خادم قوم کہلانے لگے ہیں۔ پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ بعضے کچھ دنوں خوب ذکر و شغل کرکے پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ ذاکر اور بزرگ مشہور ہوگئے ہیں اور اب اس لئے نہیں کرتے کہ لوگوں کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ ہمارا قلب جاری ہوگیا ہے اب ہم کو ذکر لسانی کی ضرورت نہیں رہی۔

غرض انسان میں طبعاً استیلاء کا تقاضا تو ہے مگر کبھی یہ استیلاء ضعیف یا استیلاءُ ظاہری کو کافی سمجھ لیتا ہے جو نقص طلب کی دلیل ہے۔ کیونکہ جہاں اس کی طلب کامل ہوتی ہے۔ وہاں بدون استیلاء کامل کے اس کو صبر نہیں آتا۔ پس جب یہ عمل کرکے چھوڑ دیتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس پر توجہ کم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اُس نے خود ہی طلب چھوڑ دی یا کم کردی ہے۔ پس خوب یاد رکھو کہ استیلاء علمی کافی نہیں، بلکہ استیلاء حقیقی کی ضرورت ہے۔

اس دھوکہ میں سو میں سے اٹھانوے سالک مبتلا ہیں جو احوال وکیفیات ومقامات کا قدرے ذوق حاصل کر کے پھر عمل سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اس دھوکہ سے بچنا چاہیئے طالب وہ ہے جو تکمیل کے بعد بھی عمل سے بے فکر نہ ہو۔

حضرت موسیٰؑ کا واقعہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ کا گزر ایک پتھر پر ہوا جو رو رہا تھا۔ اس کی تصدیق وہ کرے گا جو قدرت خدا کا قائل ہے، پوچھا کیوں روتا ہے؟ کہا جب سے میں نے سنا ہے کہ جہنم میں پتھر بھی جائیں گے۔ وقودھا الناس والحجارۃ اُس وقت سے بوجہ خوف کے رو رہا ہوں۔ آپ نے دعا کی کہ اے اللہ! اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالا جائے دعا قبول ہو گئی۔ آپ نے اُس کی تسلی کر دی جس سے کچھ دیر کے لئے اُس کو سکون ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے چلے گئے۔ واپسی میں دیکھا کہ پھر رو رہا ہے۔ پوچھا، اب کیوں روتا ہے۔ اب تو تیری تسلی کر دی گئی۔ کہا رونے ہی کی برکت سے تو یہ بشارت ملی ہے تو میں ایسے محسن کو کیوں چھوڑوں۔

ایسے ہی اے سالکین! اگر آپ کو مجاہدہ وعمل کی بدولت احوال وکیفیات اور مشاہدہ حاصل ہو گیا تو جب بھی آپ کو عمل ومجاہدہ ترک نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اسی کی برکت سے تو یہ دولت ملی اور اسی محسن سے آپ اعراض کرتے ہیں۔ اس وجہ سے میں نے یہ چوتھی قسم بڑھائی تاکہ معلوم ہو جائے کہ زھد فی الدنیا حال غیر راسخ کے درجہ میں منتہی نہیں، بلکہ منتہی یہ ہے کہ حال سے مقام ہو جائے۔

زہد فی الدّنیا کی تفصیل

اب میں چاروں درجوں کی تفصیل کرتا ہوں کہ زھد فی الدنیا کا ایک تو علم کا درجہ ہے کہ اعتقاد درست ہو جائے اور یہ جان لے کہ ہم کو ایک دن مرنا ہے اور قیامت بھی آنے والی ہے۔ مگر اس میں ایک دھوکا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ جو اہل حق کہلاتے

ہیں۔ اُن کو اپنے اعتقادات کی صحت پر ناز ہو جاتا ہے۔ بس وہ اعتقاد صحیح کر کے نحن ابنآ اللہ واحباءہ کا مصداق ہو جاتے ہیں کہ ہم اہل حق میں داخل ہیں۔ اب ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔ چاہے کچھ بھی کرتے رہیں۔ بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درستی عقائد کے بعد اعمال میں کوتاہی زیادہ مضر نہیں اور اس کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتقادیات میں محض علم کو مقصود سمجھ لیا ہے اور میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ اعتقادیات میں علم ہی مقصود ہے مگر سالہا سال کے بعد ایک آیت نے مجھے اس طرف راہبری کی کہ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہیں اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبراٴھا ان ذالک علی اللہ یسیر۔ لکیلا تاسو علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم واللہ لا یحب کل مختال فخور۔

یہاں پہلی آیت میں تو مسئلہ تقدیر کی تعلیم ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے زمین میں یا تمہاری ذات میں وہ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔ (یعنی لوح محفوظ میں) اس مصیبت کے پیدا ہونے سے بھی پہلے بے شک یہ بات حق تعالیٰ پر آسان ہے (اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس کو قدرتِ الٰہیہ کا علم نہ ہو) آگے تعلیم مسئلہ کی تعلیل فرماتے ہیں کہ یہ بات ہم نے تم کو کیوں بتلائی۔ اس لئے تاکہ کسی چیز کے فوت ہونے پر تم کو رنج نہ ہو (بلکہ اس سے تسلی حاصل کرلو کہ یہ مصیبت تو لکھی ہوئی تھی۔ اس کا آنا ضروری تھا ۱۲) اور کسی نعمت کے ملنے پر اتراؤ نہیں۔ (بلکہ یہ سمجھو کہ اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں۔ حق تعالےٰ نے پہلے ہی یہ نعمت ہمارے لئے مقدر کر دی تھی ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کر لینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر پریشان نہ ہو۔ اسی طرح نعمتوں پر تکبر و بطر نہ ہو۔ اُن کو اپنا کمال نہ سمجھے۔ جب نص سے اس کا مقصود ہونا معلوم ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ الشئ اذا خلا عن غایتہ انتفی۔ شے جب اپنی غایت

سے خالی ہو تو وہ کالعدم ہوتی ہے۔ تو اب جس شخص کا مصائب وغم کے وقت یہ حال نہ ہو، وہ گویا تقدیر کا معتقد ہی نہیں یعنی کامل معتقد نہیں۔ اگر کامل اعتقاد ہوتا تو اُس کی غرض ضرور مرتب ہوتی

اسی طرح توحید کا مسئلہ تعلیم کیا گیا ہے۔ اُس سے بھی صرف علم مقصود نہیں بلکہ قرآن میں غور کرنے سے توحید کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع نہ رہے۔ اَب جو شخص توحید کا قائل ہے، مگر غیر اللہ سے خوف وطمع بھی رکھتا ہو، وہ گویا توحید کا معتقد ہی نہیں، بلکہ مشرک ہے۔ چنانچہ صوفیاء نے اس پر شرک کا اطلاق کیا ہے اور صوفیاء نے کیا حق تعالیٰ نے اس کو شرک فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملا صالحا ولا يشرك بعبادة ربه احدا۔

کہ جو کوئی لقاء رب کی اُمید رکھتا ہو۔ وہ نیک عمل کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حدیث میں لا یشرک کی تفسیر لا یرائی آئی ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ عبادت میں ریا نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریا شرک ہے۔ حالانکہ ریاء میں غیر اللہ معبود نہیں ہوتا مگر چونکہ فی الجملہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں بڑا بننے کے لئے بنا سنوار کر عبادت کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو شرک فرمایا اور یہ بالکل عقل کے مطابق ہے۔ کیونکہ عبادت غیر اللہ جوارح سے ہوتی ہے اور جب وہ شرک ہے تو قلب سے غیر اللہ کو مقصود بنانا کیونکر شرک نہ ہوگا۔ یہ تو قلبی عبادت ہے۔ پس غیر اللہ سے خوف وطمع پر صوفیہ کا لفظ شرک اطلاق کرنا غلط نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں توحید کی غایت مفقود ہے۔ اسی طرح تمام عقائد میں غور کرو تو نصوص سے معلوم ہوگا کہ ہر اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہے۔ تنہا اعتقاد مطلوب نہیں اور ہماری عادات میں بھی اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہوتا ہے۔

چنانچہ دیکھو ایک شخص سفر سے آیا ہو۔ جس کے دو لڑکے ہیں۔ ایک بڑا ایک چھوٹا بڑا تو باپ کو پہچانتا ہے اور چھوٹا نہیں پہچانتا، کیونکہ باپ اس کو شیر خوار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

جب زمانہ دراز کے بعد یہ گھر پہ آیا تو چھوٹے لڑکے نے بڑے سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بڑے لڑکے نے بتلایا کہ یہ تیرا اور میرا باپ ہے۔ اس کے بعد چھوٹے لڑکے نے باپ کے ایک گھونسا مارا کہ تو ہمارے گھر میں کیوں آ گیا۔ تو اس وقت بڑا لڑکا بولا، ارے کم بخت! ابھی تو بتلایا تھا کہ یہ تیرا باپ ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بڑے لڑکے کا اس طرح دھمکانا بجا ہے یا بے جا؟ حالانکہ چھوٹا لڑکا کہہ سکتا ہے کہ تو نے باپ ہونا بتلایا تھا تو میں نے انکار کب کیا۔ میں نے تو گھونسہ ہی مارا ہے۔ مگر اہل زبان بڑے لڑکے کی بات کو سب صحیح کہیں گے اور اس کا مطلب یہ بیان کریں گے کہ اس علم کا مقتضا یہ تھا کہ تم اس کا ادب کرتے۔ جب تم نے مقتضائے علم کے خلاف کیا تو گویا تم کو علم ہی حاصل نہیں۔ معلوم ہوا کہ اہل زبان بھی اعتقاد کے ساتھ عمل کو بھی مقصود سمجھتے ہیں اور جب عمل خلاف مقتضائے علم ہوتا ہے تو علم کو کالعدم سمجھتے ہیں۔

علم پر ناز نہ کرو

پس صاحبو! محض علم پر ناز نہ کرو۔ بلکہ عمل کا اہتمام کرو۔ تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو دنیا کا فانی ہونا معلوم ہے۔ مگر عمل اور برتاؤ ایسا ہے جیسا باقی رہنے والی شے کے ساتھ ہوا کرتا ہے تو ان کا یہ اعتقاد کافی نہیں۔ بلکہ کالعدم ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ عمل کا ہے کہ دنیا کے متعلق اعتقاد فنا رکھ کر عمل بھی اس کے ساتھ وہی ہے جو فانی کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مگر حالت یہ ہے کہ تکلف اور مشقت کے ساتھ تعلقات کو کم کرتے ہیں۔ دل میں تعلقات سے نفرت نہیں۔ یہ درجہ بھی ناکافی ہے۔ کیونکہ جب دل میں تعلقات دنیا سے نفرت نہیں تو اندیشہ ہے کہ اگر ان سے کسی وقت مجاہدہ میں کمی کر دی تو تعلقات دنیا میں پھنس جائے گا۔ اس لئے حال کی ضرورت ہے کہ فنائے دنیا کا قلب سے مشاہدہ ہو جائے اور دل میں تعلقات دنیا سے نفرت پیدا ہو جائے پھر بھی نہیں کہ ایک دفعہ وعظ سن کر یا ذکر میں مشغول ہو کر تھوڑی دیر کے لئے تعلقات سے نفرت ہو جائے نہیں! بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ حال راسخ ہو جائے اور ہمیشہ کے

لئے تعلقات دنیا سے قلب کو الجھن ہونے لگے۔ یہ مقام کا درجہ ہے۔ یہ ہے مطلوب اور منتہیٰ۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دنیا سے ایسا برتاؤ کرو، جیسا مسافر کیا کرتا ہے۔ یعنی عملاً بھی اور حالاً بھی۔ عمل تو اس طرح کہ جیسے مسافر سفر میں محض ضروریات پر اکتفا کیا کرتا ہے۔ فضول اسباب ساتھ نہیں لیا کرتا۔ ایسے ہی تم دنیا کے ساتھ عمل کرو کہ قدر ضرورت پر اکتفا کرو۔ زائد از ضرورت سامان کی فکر میں نہ پڑو۔ مگر قسمت سے ہمارا تو سفر بھی مثل حضر ہی کے ہوتا ہے۔ ہم اس میں بھی فضول سامان بہت ساتھ لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی حضر کی نسبت سے کچھ اختصار ضرور ہوتا ہے۔ تو خیر آپ اتنا ہی کر لیں کہ اپنے سفر جیسا ہی اختصار کر لیا کریں۔ دیکھئے! یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکِ تعلقات دنیا کی تعلیم نہیں فرمائی، بلکہ ان میں اختصار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

واللہ! اگر تمام عارفین اور عقلاء و حکماء جمع ہو کر زہد فی الدنیا کے مضمون کو بیان کرتے تو اس حقیقت تک کبھی نہ پہنچ سکتے۔ وہ تو بس یہی کہتے کہ دنیا کو بالکل ترک کر دو اور اگر ترک کی تعلیم نہ کرتے تو اس کی کوئی حد معین نہ کر سکتے کہ دنیا کے ساتھ کتنا اور کیسا علاقہ رکھنا چاہیے۔ قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ دو لفظوں میں آپ نے کتنے بڑے مضمون کو حل فرما دیا۔

كن فى الدنيا كانك غريب۔

جس میں یہ بھی بتلا دیا کہ دنیا میں رہ کر اس سے بالکل بے تعلق ہونا تو دشوار ہے۔ دنیا میں رہ کر آسمان پر اڑنے کی فکر نہ کرو بلکہ دنیا ہی میں رہو۔ آگے کانک غریب میں حد مقرر فرما دی۔ مگر دنیا سے اتنا ہی علاقہ رکھو۔ جتنا مسافر کو راستہ یا سرائے سے علاقہ ہوا کرتا ہے۔ پس نہ ترکِ تعلقات کی تعلیم ہے نہ انہماک فی الدنیا کی اجازت ہے بلکہ تعلقات میں اختصار کی تعلیم ہے۔ اسی لئے عقلاء نے شریعت کو دیکھ کر کہا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ممتنع العمل کوئی چیز نہیں اور جبھی تو ببانگ دعویٰ کیا گیا ہے۔ يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر اور ما جعل عليكم فى الدين من حرج۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شریعت نے تعطل کی تعلیم کی ہے۔ انہوں نے شریعت کو سمجھا ہی نہیں اور دیکھا

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالےٰ نے بلا واسطہ تعلیم دی ہے۔ اس لئے آپ کے برابر کسی کی حکمت نہیں ہو سکتی۔ سو آپ نے ترک اسباب کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ یہ فرمایا ہے :-

کن فی الدنیا کانک غریب

جس میں اختیار اسباب کی اجازت ہے۔ مگر ان میں اختصار کرنے کی تعلیم ہے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا۔ کن فی الدنیا کانک میت کہ دنیا میں مردہ بن کر رہو۔ گو عارفین نے یہ لفظ کہہ ہی ڈالا۔ اُن کی تعلیم یہ ہے موتوا قبل ان تموتوا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ ہر شخص ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ ہر ایک کو آسان نہیں مگر کچھ تسلی آپ نے اُن کی بھی فرما دی تاکہ کسی کو اُن پر اعتراض کا دعویٰ نہ ہو کہ یہ صوفی نئی نئی باتیں کہاں سے کہتے ہیں۔ بدعتیں نکالتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو آپ نے فرمایا ہے۔ وعد نفسک من اھل القبور گو وہاں بھی آپ نے موتوا نہیں فرمایا۔ مگر اہل قبور کا لفظ تو آ گیا جس سے صوفیہ کی تعلیم بھی بدعت ہونے سے نکل گئی۔ کیونکہ اُس کی اصل بھی موجود ہے، لیکن یہ تعلیم خواص کے لئے ہے چنانچہ اس حدیث میں نام لے کر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو خطاب ہے باقی عام تعلیم آپؐ کی یہی ہے کہ دنیا میں ایسے رہو۔ جیسے مسافر رہا کرتا ہے۔

پھر آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا کن فی الدنیا غریباً۔ کہ بالکل ہی مسافر بن کر رہو کیونکہ اگر بالکل مسافر بن جاتے تو بعض دفعہ دقت پیش آتی۔ مثلاً تم نے سارا سامان خیرات کر ڈالا اور مسافر کی طرح صرف دو وقت کا کھانا رکھ لیا۔ کیونکہ مسافر عادۃً اس سے زیادہ کھانا نہیں رکھتا۔ پھر اگلے دن تم کو پریشانی ہوتی تو حدیث پر شبہ ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم دیا ہے۔ جس پر عمل کرنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ مگر اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو حرف گیری کا کیا منہ ہے۔ آپؐ تو کن فی الدنیا غریباً نہیں فرماتے بلکہ کانک غریب فرما رہے ہیں یعنی مثل مسافر کے رہو۔

پڑتا مگر اس بات کا شوق ہے کہ ہمارے گھر میں اتنے برتن اور اتنے پلنگ اور اتنے بستر ہیں۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے ہیں۔ باقی قدر ضرورت کی ممانعت نہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ زیادہ تر غیر ضروری چیزیں ہی دل کو پریشان کرتی ہیں اور جو ضرورت کے موافق ہوں۔ ان سے پریشانی نہیں ہوتی اور آج کل ہم لوگ زیادہ تر فضول چیزوں ہی کے در پے رہتے ہیں۔ انہی کے جمع کرنے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ ورنہ ضروری سامان تو بہت جلد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے گھر کی اشیاء میں غور کرے کہ روز اس کے استعمال میں کتنی چیزیں آتی ہیں تو معلوم ہو گا کہ دو چار دس پانچ چیزوں کے سوا اور تمام سامان ایسا ہے۔ جس کی ضرورت مہینوں اور برسوں کبھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے صائب کہتے ہیں۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش

آنچہ ما در کار داریم اکثری در کار نیست

حرص قناعت نہیں کرنے دیتی اے صائب ورنہ اسباب ضرورت

جتنا ہم ضرورت کے لئے رکھتے ہیں۔ اکثر حصہ اس کا بھی زائد از ضرورت ہے۔

اس سے معلوم ہو گا کہ حق تعالیٰ نے ہم کو کیا کچھ نعمتیں دے رکھی ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں۔ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔ میرے خیال میں یہاں احصاء استعمالی مراد ہے۔ یعنی "اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننے لگو تو وہ اس قدر ہوں گی۔ جن کو استعمال سے تم احصا نہیں کر سکتے" بلکہ بہت چیزیں ایسی ملیں گی۔ جن کے استعمال کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ غرض لوگ خواہ مخواہ بے ضرورت چیزیں جمع کرتے ہیں۔ جن میں بلا وجہ دل اٹکا رہتا ہے۔

جیسے مولانا عطار سے ایک مجذوب نے کہا تھا۔ اس وقت مولانا عطاری کی دکان کرتے تھے، طریق کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے۔ حق تعالیٰ نے ایک مجذوب کے ذریعہ سے اُن کو ہدایت کی۔ وہ ان کی دکان پر کھڑا ہو گیا اور ایک بوتل کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، اس میں کیا ہے؟ کچھ شربت بتلایا۔ دوسری طرف کو پوچھا، کوئی خمیرہ بتلایا۔ تیسری میں کوئی لعوق بتلایا گیا۔ تعجب سے پوچھنے لگا جب چیزیں چپکتی ہی چپکتی ہیں تو ایسی حالت میں اتنی چپکتی چیزوں میں سے تیری جان کیونکر نکلے گی۔ مولانا نے ہنس کر کہا، جس طرح تیری جان

کا ہے بلکہ سب اسی شاعر کا سمجھتے۔

عورتیں زیادہ حریص ہوتی ہیں

بہر حال سامان کے بارہ میں تو عورتیں بالکل اس شعر کا مصداق ہیں کہ ہر چیز اُن کے لئے دل رُبا ہے۔ البتہ عفت کے باب میں تو یہ اس کی مصداق نہیں۔ خصوصاً ہندوستان کی عورتیں کہ یہ تو اپنے خاوند کے سوا کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں نہ اُن کے قلب پر غیر کا وسوسہ آتا ہے۔ باقی زیور اور لباس میں تو ان کی بالکل یہی حالت ہے کہ جہاں کوئی نئی چیز دیکھی اور اُن کی رال ٹپکی۔ چاہے اپنے پاس کتنا ہی زیور ہو اور کیسا ہی عمدہ کپڑا ہو۔ مگر نئی وضع اور نیا طرز دیکھ کر اپنی چیز سے معاً دل اتر جاتا ہے۔ اور دوسری بنوانے کی فکر ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالرب صاحب کا لطیفہ عورتوں کے متعلق خوب ہے۔ فرماتے تھے، کہ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ چاہے اُن کے پاس کتنے ہی برتن ہوں، مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں، چار ٹھیکرے اور کپڑے کتنے ہی صندوق میں بھرے ہوں۔ مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں۔ چار چیتھڑے اور جوتوں کے جوڑے چاہے کتنے ہی ہوں، مگر جب پوچھو یہی کہیں گی، کیا ہیں دو لتیرے۔ قافیہ خوب ملایا ٹھیکرے، چیتھڑے، لتیرے۔ آخر تھے نا دہلی کے لطیفہ سنج۔ واقعی عورتوں کی ہے تو یہی حالت۔

ایک عورت نے خود اقرار کیا کہ ہم تو جہنم ہیں۔ جیسے اس کا پیٹ نہ بھرے گا۔ اور ھل من مزید کہتی رہے گی۔ ایسے ہی ہمارا پیٹ بھی نہیں بھرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس انہماک سے منع فرماتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غیر ضروری چیزوں میں دل اٹکا ہوا ہے۔

اور اس کا علاج یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اختصار کرو۔ مثلاً ایک عورت پان چھوڑ سکتی ہے۔ وہ پان چھوڑ دے۔ ایک چائے کی عادی ہے۔ جس میں دل اٹکا رہتا ہے وہ چائے چھوڑ دے۔ ایک روپے گز کا کپڑا پہنتی ہے۔ وہ بارہ آنے گز کا پہننے لگے۔ علیٰ ہذا اسی نا ... تمام اخراجات اور سامانوں میں اختصار کرو، یعنی قدر ضرورت پر اکتفا کرو۔ پھر ضرورت

کے بھی درجے ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ جس کے بغیر کام نہ چل سکے۔ یہ تو مباح کیا واجب ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ایک چیز کے بغیر کام تو چل سکتا ہے۔ مگر اس کے ہونے سے راحت ملتی ہے۔ اگر نہ ہو تو تکلیف ہو گی گو کام چل جائے گا۔ مگر دقت سے چلے گا ایسے سامان کے رکھنے کی بھی اجازت ہے۔

۳۔ ایک سامان اس قسم کا ہے۔ جس پر کوئی کام نہیں اٹکتا نہ اس کے بغیر تکلیف ہو گی مگر اس کے ہونے سے اپنا دل خوش ہو گا تو اپنا جی خوش کرنے کے واسطے بھی کسی سامان کے رکھنے کا بشرط وسعت مضائقہ نہیں۔ یہ بھی جائز ہے۔

۴۔ ایک یہ کہ دوسروں کو دکھانے اور ان کی نگاہ میں بڑا بننے کے لئے کچھ سامان رکھا جائے۔ یہ حرام ہے۔

پس جو عورتیں اپنی راحت کے لئے یا اپنا اور اپنے خاوند کا جی خوش کرنے کے لئے قیمتی کپڑا یا زیور پہنتی ہیں۔ اُن کو تو بشرط مذکور گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کے لئے پہنتی ہیں۔ وہ گنہگار ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ذلیل و خوار جھنگنوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں تقریب میں نکلیں گی تو نواب کی بچی بن کر جائیں گی جیسے لکھنو کے مزدور دن بھر تو لنگوٹہ باندھ کر مزدوری کریں گے اور شام کو کرایہ کے کپڑے پہن کر جیب میں دو پیسے ڈال کر نکلتے ہیں۔ جن میں سے ایک پیسہ کا تو پان کا بیڑا لیں گے اور ایک پیسہ کا پھولوں کا گجرا گلے میں ڈالیں گے، جیسے کسی نواب کے بچے ہوں۔

اب عورتیں دیکھ لیں کہ یہ جوڑے بدل بدل کر جاتی ہیں۔ اس میں ان کی نیت کیا ہے۔ اگر اپنی راحت اور دل کی خوشی ہے تو گھر میں اس ٹھاٹھ سے کیوں نہیں رہتیں بعض کہتی ہیں کہ ہم تو اپنے خاوند کی عزت کے لئے عمدہ جوڑا پہن کر نکلتی ہیں۔ اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو پہلی دفعہ جو ایک جوڑا تم نے تقریب کے لئے نکالا۔ خاوند کی عزت کے لئے تمہارے خیال میں وہی کافی تھا۔ اب دیکھو کہ اگر کبھی تقریب میں پے در پے دو تین دن جانا ہو جائے تو تم تینوں دن اسی ایک جوڑے میں جاؤ گی یا ہر دن نیا جوڑا بدلو گی۔ ہم تو یہ دیکھتے

ہیں کہ ہر دن نیا جوڑا بدلا جاتا ہے۔ آخر یہ کیوں خاوند کی عزت کے لئے تو ایک ہی بہت کافی تھا مگر نہیں! اس واسطے ہر دن نیا جوڑا نہیں بدلتی ہیں۔ اس لئے ایک جوڑا میں ہر دن نہیں جا سکتیں۔ اگر اور بھی کچھ نہ بدلیں گی تو دوپٹہ تو ضرور ہی بدلیں گی۔ کیونکہ وہ سب سے اوپر رہتا ہے۔ سب کی نظریں اس پر پہلے پڑتی ہیں۔ اس لئے اس کو ضرور ہی بدلیں گی تاکہ ہر دن نیا جوڑا معلوم ہو۔

پھر محفل میں بیٹھ کر ان کو زیور دکھلانے کی حرص ہوتی ہے۔ بعض تو اسی غرض کے لئے ننگے سر رہتی ہیں تاکہ سب کو سر سے پیر تک کا زیور نظر آ جائے اور جو ان میں سے مولوی ہیں۔ وہ ننگے سر تو نہیں رہتیں۔ مگر کسی نہ کسی بہانہ سے وہ بھی اپنا زیور دکھلا دیتی ہیں کہیں سر کھجاتی ہیں۔ کبھی کان کھجلاتی ہیں۔ یہ ریا ہے اور اس غرض سے قیمتی کپڑا یا زیور پہننا حرام ہے۔

ایک مرض عورتوں میں زیادہ ہے!

ایک مرض عورتوں میں یہ ہے کہ جب کہیں یہ محفل میں جاتی ہیں تو سب کے لباس اور زیور کو سر سے پیر تک تاک لیتی ہیں تاکہ دیکھیں کہ ہم سے تو کوئی زیادہ نہیں اور ہم کسی سے گھٹے ہوئے تو نہیں۔ یہ بھی اسی ریاء اور تکبر کا شعبہ ہے۔ یہ مرض مردوں میں کم ہے۔ اگر دس آدمی ایک جگہ مجتمع ہوں تو مردوں میں سے کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کس کا لباس کیسا ہے۔ اسی لئے مجلس سے اٹھ کر وہ کسی کے لباس کا حال بیان نہیں کر سکتے اور عورتوں میں سے ہر ایک کو یاد رہتا ہے کہ کس بی بی کے پاس کتنا زیور تھا اور لباس کیسا تھا۔ یاد رکھو! اس غرض سے قیمتی لباس وغیرہ پہننا جائز نہیں اور یہ جو ضرورت وغیرہ کے درجات میں نے لباس وزیور کے متعلق بیان کئے ہیں۔ یہ انہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ درجے ہر چیز میں ہیں۔ مکان میں بھی اور برتنوں میں بھی۔ ہر چیز میں ضرورت کا معیار یہ ہے کہ جس کے بغیر تکلیف ہو، وہ ضروری ہے اور جس کے بغیر تکلیف نہ ہو۔ وہ غیر ضروری ہے۔ اب اگر اس میں اپنا دل خوش کرنے کی نیت ہو تو مباح ہے اور اگر دوسر دل

حضرت غوث اعظم نے فوراً فی البدیہہ جواب دیا؎

خوب شد اسباب خود بینی شکست

"بہت خوب جو اسباب خود بینی کو شکست ہوئی"

نیز حال ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ ملک سنجر نے حضرت کو لکھا کہ میں آپ کی خانقاہ کے لئے ملک نیمروز کی آمدنی مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت عطا فرمایئے۔ آپ نے یہ قطعہ جواب میں لکھ بھیجا؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد
در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جَو نمی خرم

"سنجر کے بادشاہ کے چھتر کی طرح میرا نصیبہ سیاہ ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ادنیٰ ہوس بھی ہو۔ جس دن سے ملک نیم شبی کی دولت ملی ہے۔ میں ملک نیمروز کا ایک دانہ جو کے بدلے بھی خریدار نہیں ہوں"

آخر حضرت ابراہیم بن ادھم میں کیا بات تھی جو انہوں نے سلطنت چھوڑ دی۔ عقل اس کے لئے کافی نہیں نہ علم سے یہ بات ہو سکتی ہے۔ ہزاروں تاویلیں اس میں ہم ہی کر لیتے کہ سلطنت نہ چھوڑنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں خدمت خلق ہے۔ دوسرے ہمیں بحمد اللہ دین کا خیال ہے۔ ہماری سلطنت سے دین کی اشاعت و خدمت ہو گی۔ کوئی دوسرا نہ معلوم دین کا خیال کرے یا نہ کرے۔ مگر صاحب اُن پر تو حال غالب تھا۔ جس نے سب تاویلوں کا دروازہ بند کر دیا۔ صاحب حال کو تاویلیں سوجھتی ہی نہیں۔ حال کے غلبہ کے آثار ہی دوسرے ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ نے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ حضرت میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب نے فرمایا مولوی صاحب ابھی تو پوچھ ہی رہے ہو۔ پوچھنا دلیل تردد کی ہے اور تردد دلیل خامی کی ہے۔

قصوں میں منزل کھوٹی نہ کرے۔

دوسرا ایک اور جواب ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان جائیے کہ آپ نے یہاں پر کانک مسافر نہیں فرمایا بلکہ کانک غریب فرمایا ہے غریب کے لازم معنی مسافر کے ہیں۔ ورنہ اصلی معنی اجنبی اور بے یار و مددگار کے ہیں۔ پس غریب مطلق مسافر کو نہیں کہیں گے بلکہ غریب وہ مسافر ہے جو بے یار و مددگار ہو تو مطلب حدیث کا یہی نہیں کہ دنیا میں مسافر محض کی طرح رہو۔ کیونکہ بعضے مسافر بے یار و بے مددگار نہیں ہوتے۔ اُن کے اخلاق اور طرح کے ہوتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مسافر کی طرح رہو جو پردیس میں اجنبی اور بے یار و مددگار ہو۔ اب اس سوال کا دوسرا جواب بھی نکل آیا کہ سفر میں وہی مسافر لڑے گا جو کسی کو اپنا حامی سمجھتا ہو اور جو اپنے کو بے یار و مددگار سمجھے گا۔ وہ کبھی نہ لڑے گا ایک جگہ میں نے ایک مسافر کو دیکھا کہ لوگ اُس کے سر ہو رہے تھے کہ غسل خانہ میں تُو نے پاخانہ پھرا ہے اور وہ بے چارہ خاموش تھا۔ کیونکہ اپنے کو بے یار و مددگار سمجھ رہا تھا۔ حدیث میں اسی مسافر سے تشبیہ ہے۔ جس کی یہ شان ہو اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے۔

اسلام کی ابتدا اور انتہا

ان الاسلام بدا غریبا وسیعود غریبا فطوبی للغرباء

کہ اسلام غریب ہو کر ظاہر ہوا اور اخیر میں بھی غریب ہو جائے گا۔ یہاں غریب کے معنی مسکین نہیں، کیونکہ دین کسی حال میں مسکین نہیں تھا۔ اگر مسکین ہوتا مالداروں کی خوشامد کرتا، اُن سے دبتا۔ حالانکہ اسلام نے تو شروع ہی سے متکبرین کو نیچا دکھایا ہے۔ اُن کے آلہہ باطلہ کی صاف صاف مذمت کی ہے اور ان کو اپنی اتباع و اطاعت کی دعوت دی ہے۔ مسکین کہیں ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ہاں ابتداء میں دین بے یار و بے مددگار اور اجنبی البتہ تھا کہ لوگوں نے اس کا ساتھ کم دیا۔ زیادہ آدمیوں نے مخالفت ہی کی۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے

دُنیا پسندی

الرضا بالدُّنیا

آخرت سے غفلت اور دنیا کی مصروفیت کے متعلق

یہ وعظ مسجد علی حسن صاحب جلال آباد میں ۱۵ صفر ۱۳۳۰ھ کو تقریباً ۱۰۰ آدمیوں کے مجمع میں ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہوا اور مولوی سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

رضا اور اطمینان میں فرق ہے۔ رضا امر عقلی ہے اور
اطمینان امر طبعی۔ بعض دفعہ انسان ایک فعل کو عقلاً
پسند کرتا ہے۔ مگر دلچسپی نہیں ہوتی۔ جیسے کڑوی دوا
پینا کہ عقلاً تو پسند ہے۔ مگر اس کے ساتھ پوری دل
چسپی نہیں ہوتی اور کبھی دلچسپی تو ہوتی
مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے۔ جیسے زنا وغیرہ
غرضیکہ کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور
کبھی بالعکس لیکن وہ حالت بڑی سخت ہے کہ
رضا اور اطمینان دونوں ہوں۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمدللّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہ ونؤمن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سئیات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیّدنا ومولانا محمّداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ علیه وعلیٰ آلہ واصحابه وبارک وسلم۔

اما بعد اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیٰوۃ الدنیا واطمانّوا بھا والذین ھم عن آیٰتنا غٰفلون اولٰئک ماوٰھم النار بما کانوا یکسبون۔

تمہید

ان آیتوں میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ایک خاص جماعت کی مذمت ایک خاص صفت پر فرمائی ہے۔ جس جماعت کی مذمت اس میں ہے۔ بحمداللہ حاضرین میں اس جماعت کا ایک فرد بھی نہیں ہے۔ لیکن اس سے اس بیان کو بے ربط یا بے ضرورت نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اس میں غور کرنا چاہیئے کہ جس کی مذمت ہوتی ہے۔ ذات کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ منبع مذمت کا خاص صفات ہوتی ہیں۔ تو صفات ذمیمہ جس میں ہوں گی۔ وہ مذموم ہو گا۔ جس میں نہ ہوں گی، وہ نہ ہو گا۔ چنانچہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ جس کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ ساتھ ہی وہ صفات بھی ذکر فرمادی ہیں۔ جن پر مذمت فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح خوشنودی اور رضا میں بھی انکا خاص منبع صفات ہی ہوتی ہیں کہ چونکہ یہ صفات ان میں پائی جاتی ہیں، اس لئے ہم ان سے خوش اور راضی ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ مدح اور مذمت وغیرہ کا مدار حمیدہ یا ذمیمہ صفات ہیں۔ جس میں جیسی صفات ہوں گی۔ ویسے ہی آثار اس پر مرتب ہوں گے۔ اس کے بعد یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ جس جماعت کے باب میں یہ آیتیں ہیں۔ جب حاضرین میں اُن میں سے ایک فرد بھی نہیں تو ان آیتوں کو کیوں اختیار کیا گیا اور ترجمے سے معلوم ہو جائے گا کہ کس جماعت کی مذمت ہے۔ مگر میں پہلے ہی بتلائے دیتا ہوں کہ وہ جماعت کفار کی ہے اور اسی وجہ سے وہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ یہاں اس کی تلاوت کی کیا ضرورت ہوئی اور اسی شبہ کی بناء پر بعض لوگ یہ سُن کر کہ فلاں آیت کفار کے حق میں ہے بے فکر بھی ہو جاتے ہیں کہ خیر ہم تو اس کا مورد نہیں ہیں۔

مگر غور کرنے کی بات ہے کہ وہ آیت جو کفار کی شان میں ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے بجائے بے فکر کرنے کے بہت بڑا تازیانہ ہے۔ مگر مسلمان اس کو سنکر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ یہ تو کفار کی شان میں ہے۔

صفاتِ حمیدہ بناءِ رضا ہیں

صاحبو! یہ صحیح ہے کہ یہ کفار کی مذمت ہے اور قرآن شریف میں اکثر مواقع پر کفار ہی کی مذمت کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی مذمت قرآن شریف میں بہت کم ہے۔ مگر یہ تو غور کرنے کی بات ہے کہ کفار کی مذمت ہم مسلمانوں کو کیوں سنائی گئی ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ ان صفات کا مسلمانوں میں ہونا بہت زیادہ عجیب ہے۔ یہ صفات تو صرف کفار میں ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں۔ کسی کی ذات سے محبت نہیں بلکہ صفاتِ حمیدہ بنائے رضا ہیں اور صفاتِ ذمیمہ بنائے ناراضی و مذمت ہیں تو اگر وہی صفاتِ ذمیمہ مسلمانوں میں بھی ہوں جو مدعی اطاعت اور عبدیت کے ہیں تو اُن کو اور بھی شرمانا چاہیئے کہ کفار کو جن صفات پر ستا ڈالا گیا ہے۔ ہم میں وہی صفات ہیں تو اُن کی درستی بہت زیادہ کرنی چاہیئے۔

مثلاً ایک باغی کو بادشاہ برا بھلا کہے کہ تو نے بغاوت کی۔ تو نے سرکار کا مقابلہ کیا تو نے یہ کیا، تو نے وہ کیا۔ اس خطاب کو سن کر دوسرے اہل جرائم کو بھی ڈرنا چاہیئے، اور بے خوف نہ ہونا چاہیئے۔ اُس کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو الزامات باغی پر لگائے گئے ہیں وہ مجھ میں تو نہیں ہیں۔ بعضاً یا کلاً۔ یا مثلاً ایک باوجاہت آدمی ظلم کرتا ہے اور رعایا کو ستاتا ہے یا ڈکیتی کرتا ہے۔ لیکن باغی نہیں ہے۔ ہاں فوجداری کی بہت سی دفعات اس پر عائد ہیں اور اتفاق سے اسی کے سامنے بادشاہ نے ایک باغی کو تہدید کی اور اُن صفات پر بھی تہدید کی جو اس کے اندر بھی پائی جاتی ہیں تو اس کے بھی کان ہونے چاہئیں۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے کہ اگر جرائم کم ہوں گے تو ناخوشی کم ہوگی اور اگر زائد ہوں گے تو ناخوشی زائد ہوگی۔

بد دین مسلمان کافر سے بہتر ہے

سو مسلمان خواہ کیسا ہی بد دین مجرم ہو۔ مگر اس کے جرائم کافر کے برابر نہیں ہو سکتے تو یہ تو ماننا پڑے گا کہ مسلمان سے اتنی ناخوشی نہ ہوگی، لیکن اس پر تو تسلی نہ ہونی چاہیئے کہ ہم سے کم ناخوشی ہے۔ دیکھو! اگر کسی مجرم کو دس برس کی قید ہو اور دوسرے کو پانچ برس کی تو کیا اس دوسرے کو بے فکری ہوگی۔ میرے خیال میں کوئی عاقل ایسا نہیں کہ وہ اس وجہ سے بے فکر ہو جائے کہ میری سزا فلاں شخص سے تو کم ہے۔ بلکہ ایک باریک بات یہ ہے کہ بعض اوقات بڑی دفعہ اور بڑی سزا سن کر اتنی کلفت نہیں ہوتی، جتنی چھوٹی دفعہ اور چھوٹی سزا سن کر ہوتی ہے کیونکہ بڑی سزا میں تو مایوسی ہو جاتی ہے اور مشہور ہے۔ الیاس احدے الراحتین۔

ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس کو ایک جرم میں جج نے سات برس کی قید کا حکم دیا اور اس سے کہا کہ دیکھو تم اپیل نہ کرنا ورنہ تم کو زیادہ سزا ہو جائے گی۔ میں نے تم کو بہت کم سزا دی ہے۔ مگر اس شخص نے اپیل کی۔ اس میں شاید ۲۸ برس کی سزا ہوئی۔ ۲۸ برس کا نام سنکر اس کو بالکل یاس ہو گئی کہ اب زندہ بچ کر نہیں نکل سکتا اور اس یاس سے گونہ راحت ہو گئی۔

تو اس حیثیت سے تو مسلمان کو چھوٹی سزا سن کر زیادہ فکر میں پڑنا چاہیئے کہ اس کو تو یاس بھی نہ ہوگی۔ غرض اس حیثیت سے یہ تفاوت ہے، اگرچہ دوسری حیثیت سے دوسرے تفاوت بھی ہیں۔ مگر میں نے اس کو اس لئے بیان کیا کہ بے فکری نہ رہے۔ کیونکہ اس کو سنکر کہ ایک نہ ایک دن دوزخ سے نکل آئیں گے۔ اکثر لوگ بے فکر ہیں۔ سو یہ بڑی غلطی کی بات ہے کہ تھوڑی سزا کو سنکر بے فکر ہو جائے۔ غرض کفار اور مسلمانوں کی سزا میں تفاوت کا انکار نہیں لیکن وہ تفاوت بے فکر نہیں کر سکتا، بلکہ زیادہ فکر ہونا چاہیئے یا برابر ہی ہو یا کم ہی فکر ہو۔

دین سے بے فکری کی سزا

مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ بالکل ہی بے فکر بیٹھے ہیں، بعض تو بالکل ہی خیال نہیں کرتے۔

ان کی تو شکایت ہی کیا۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ بعض خبردار بھی بے فکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ کفار کے برابر سزا تھوڑا ہی ہوگی۔ میں اس بے فکری کے رفع کرنے کے لئے یہ تمام تقریر کر رہا ہوں کہ اس خیال کو کبھی دل میں نہ لائے اور اس اعتراض کا جواب دے رہا ہوں کہ یہ تو کفار کے حق میں ہے۔ پھر ہم کو کیا فکر۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن صفات پر کفار کو یہ وعید سنائی گئی ہے اگر آپ میں بھی وہ صفات ہیں تو آپ کو ضرور فکر ہونی چاہئے۔ دوسرے اگر چمار کو چمار کہہ کر دس جوتیاں ماری جائیں تو عجب نہیں، لیکن اگر کسی بڑے آدمی کو یہ کہہ دیا جائے تو نہایت شرم کی بات ہے تو کافروں کو اگر منکر لقاء اللہ اور راضی بالحیوٰۃ الدنیا اور غافل عن الآیات کہہ دیا جائے تو کچھ عجب نہیں، لیکن اگر مسلمان میں یہ صفات پائی جائیں اور اس وجہ سے اس کا اتصاف ان کے ساتھ ہو تو زیادہ شرم کی بات ہے اور لیجئے اگر کسی کو بھنگی کے ساتھ قید کریں تو اس کے لئے کتنی ننگ کی بات ہے۔ یاد رکھو کہ جہنم خاص کافروں کے لئے ہے۔ مگر مسلمان اپنے ہاتھوں وہ اخلاق اختیار کر کے جو کافروں میں پائے جاتے ہیں۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کے مصداق بنتے ہیں اور ان کے ساتھ قید ہونے کے کام کرتے ہیں۔

تشبہ کے معنی و شرح

اس حدیث میں تشبہ کو اوّل تو لوگوں نے اڑا ہی دیا اور اگر لیا بھی ہے تو صرف لباس میں۔ بہت سے ثقات بھی اس میں مبتلا ہیں کہ وضع اہل شرع کی بنا کر اپنے کو متقیوں میں شمار کرنے لگے گو افعال کیسے ہی ہوں۔ لیکن اس حالت میں اس خیال کی بالکل ایسی مثال ہے۔ جیسے میرے وطن میں ایک مہر وپیا میرے پاس انعام لینے کی غرض سے کسی بڈھے کی شکل بن کر آیا۔ ایک شخص نے مجلس میں کہا کہ خدا کے یہاں ان مہروپیوں کی کیا حالت ہوگی کہ کبھی عورت بنتے ہیں۔ کبھی اور کوئی مکر کی شکل بناتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم وہاں اس طرح تھوڑا ہی جائیں گے۔ مولویوں کا لباس پہن کر جائیں گے۔ بس فوراً مغفرت ہو جائے گی۔ میں نے ڈانٹا کہ کیا واہیات ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہے۔ یہی حالت

تھی ہر گز نہیں اُن کی تو ہر وقت یہ حالت تھی کہ

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

وہ تو ہر وقت زبان پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ذکر رکھتے تھے بقول مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے کہ ہم تو ہر وقت مولد کرتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کہتے ہیں جب بھی آپ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ ہمارے تو ہر وقت دل میں بسے ہیں۔ زبان سے ہاتھ سے ہر وقت حضورؐ کی یاد میں ہیں۔ سبحان اللہ! کیا محققانہ بات کہی ہے تو صحابہؓ تو ہر وقت ذکر کیا کرتے تھے اور نرا ذکر نہیں بلکہ ویسا بننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ پخند جواب ہیں صحابہ کرام میں کہیں نام کو نہ تھے۔ کسی صحابی نے کبھی مٹھائی تقسیم نہیں کی۔ کبھی ذکر کی تاریخ مقرر نہیں کی اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو خوشی میں مٹھائی تقسیم کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ روز کیوں تقسیم نہیں کرتے۔ اس کی کیا وجہ کہ ایک مجمع خاص میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح کھڑا ہونا۔ اس کی بابت بھی یہی ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ خاص مجمع میں خاص وقت میں قیام ہو۔ اس وقت جو حضورؐ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ کہ اس وقت کوئی نہیں اُٹھتا۔

یہ یاد رکھو کہ یہ سب کمانے والوں کی من گھڑت ہے کہ ہر ہر جزو کو خاص طور سے ایجاد کیا کہ لوگ ہر کام میں اُن کے محتاج رہیں اور جب اُن سے وہ کام لیں تو کچھ دیں بھی۔ اور جب واعظ کے لئے کچھ ہوا تو آنے والوں کے لئے بھی کچھ چاہیئے۔ اس لئے مٹھائی ایجاد کی گئی۔

لوگ عرب کے فعل سے استدلال کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ عرب میں کس طرح کا مولد ہوتا ہے۔ گو اس میں بھی نشیب و فراز ہے، مگر پھر بھی یہاں کی نسبت بہت سادگی ہے۔ مٹھائی تقسیم کرتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ اگر نصف مجلس کو تقسیم ہونے کے بعد مٹھائی ختم ہو جائے تو بلا تامل کہہ دیں گے کہ "خلاص" یعنی اب ختم ہو گئی۔ بھلا یہاں کوئی صاحب مجلس ایسا کر کے دکھلا دیں۔ واللہ! یہاں جو کچھ ہوتا ہے۔

سب تفاخر کے لئے ہوتا ہے۔

ایصالِ ثواب کا آسان طریقہ

صاحبو! محبت کے طریقے ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی ربیع الاول میں کچھ کھانا پکا کر تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو کچھ میسر نہ ہوا، تو آپ نے پیسے دو پیسے کے چنے بھنوا کر تقسیم کر دیئے۔ خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن چنوں کو تناول فرما رہے ہیں۔ دیکھئے محبت اللہ والوں ہی میں ہوتی ہے۔ اُن سے سیکھو اور اُن کے طرزِ عمل پر چلو۔

میں اس کا بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں مگر وہ طریقہ نفس کو گوارا نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ خفیہ خرچ کیا کرو، مثلاً ربیع الاول کے مہینہ میں پچاس روپیہ خرچ کرو۔ مگر ظاہر نہ کرو اور ایک ایک روپیہ ایک ایک مسکین کو دے دو۔ اگر واقعی حضورؐ سے محبت ہے تو اس طریقے پر عمل کرو۔ مگر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ نفس کہے گا کہ میاں پچاس روپے بھی خرچ ہوئے اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی۔

آج کل تو یہ حالت ہے کہ میں کانپور میں تھا۔ ایک شخص ذکرِ رسولؐ کے لئے مجھے بلا کر لے گئے۔ میں چلا گیا۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ اسی جگہ جہاں ذکرِ رسولؐ ہوا تھا۔ آج رنڈی کا ناچ ہوا ہے۔ مجھے سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے میاں شادی تھی اور اصل مقصود ناچ کرانا تھا، لیکن بعض ثقہ احباب کی خاطر سے ذکرِ رسولؐ بھی کرا دیا تھا۔ تو یہ ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ ثقہ دوستوں کے لئے ہوا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ناچ کا موازنہ ہوا اور ناچ اُسی جگہ ہوا۔ نعوذ باللہ منہ۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو حضورؐ سے محبت ہے اور ہم محبِ رسولؐ ہیں۔

اور میں کانپور میں سنا کرتا تھا کہ آج فلاں رنڈی کے ہاں مولود ہے، آج فلاں کے ہاں ذکرِ رسولؐ ہے۔ افسوس ہے کہ جب وہاں ضروری مضامین زنا کی مذمت وغیرہ کو کوئی بیان نہیں کرتا تھا تو نرے ذکرِ رسولؐ سے کیا فائدہ کی توقع ہے۔ دیکھو! اگر دستر خوان پر نری

چٹنی ہو تو کیا کوئی اس دستر خوان سے سیر ہو سکتا ہے۔ کبھی نہیں۔ البتہ اگر نرا کھانا ہو اور چٹنی نہ ہو تو وہ کار آمد ہو سکتا ہے اور اگر دونوں چیزیں ہوں تو نور علیٰ نور ہے۔

یہ اس پر یاد آ گیا تھا کہ لوگ دعویٰ محبت کرتے ہیں تو دیکھ لیں کہ ابو طالب کی کیا حالت ہے کہ اگرچہ حضورؐ کی بدولت صرف دو جوتے آگ کے پیر میں ہوں گے مگر حالت یہ ہو گی کہ یوں سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں۔ دنیا ہی میں دیکھ لو کہ اگر ببول کا کانٹا بھی لگ جاتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے تو اگر یہ کوئی کہے کہ مجھے تو ہلکا عذاب ہو گا تو خوب سمجھ لے کہ وہاں کا ہلکا بھی ناقابلِ برداشت ہے تو اس ناز میں ہرگز نہ رہنا چاہیئے کہ مجھے تو تھوڑی سزا ہو گی۔ یہ شبہات تو رفع ہو گئے۔

بے فکری کی سزا کی تفصیل

اب وہ باتیں بھی سن لیجئے۔ جن پر اس آیت میں ستار گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے۔ سو اس سے تو ہم بری ہیں، لیکن اس سے بے فکری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے نہ ہونے سے گو سزا کم ہو، لیکن ہو گی تو ضرور اور دوسری بات یہ فرمائی کہ

ورضوا بالحیٰوۃ الدنیا واطمانوا بہا والذین ھم عن ایٰتنا غٰفلون۔

کہ جو حیٰوۃ الدنیا پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہمارے احکام سے غافل ہیں۔

یہ کل چار چیزیں ہیں۔ ان پر فرماتے ہیں۔ اولٰئک ماوٰھم النار۔ ترجمے سے معلوم ہوا ہو گا کہ ان چار پر سزا ہے تو ان چاروں کا مذموم ہونا ثابت ہوا اور یہ احتمال نہ کیا جائے کہ شاید مجموعہ پر یہ سزا ہو گی اور ہم مجموعہ سے بری ہیں۔ کیونکہ لا یرجون لقآءنا۔ یہ جزو ہم میں نہیں پایا جاتا۔ سو بات یہ ہے کہ یہاں اول تو اس احتمال کی کوئی دلیل نہیں اور عطف بالواؤ میں کبھی ہر واحد بھی مقصود بالافادہ ہوتا ہے اور شاید سے بے فکری ہو نہیں سکتی دوسرے

اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی تدریجوں پر اکتفا نہ کرنا اور دوسرے افعال کا بھی ذکر کرنا ظاہر ہے کہ عبث تو نہیں ہے اور اگر ان کو حکم جزئی میں کچھ دخل نہ ہو تو محض عبث ہونا لازم آئے گا۔ پس سب کو دخل ہوا۔ پس سب کا مذموم اور مؤثر فی العقوبۃ ہونا ثابت ہو گیا۔

ان چار چیزوں میں سے ایک تو یقیناً ہم میں نہیں ہے۔ اس دفعہ سے تو ہم یقیناً بری ہیں اور ایک میں شبہ ہے، یعنی اخیر کا جرم اس میں شک ہے کہ ہم میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کی تفسیریں دو ہیں، ایک تو یہ کہ عقیدہ نہیں۔ اس سے غفلت ہے اور التفات نہیں ہوتا۔ اس سے تو ہم بچے ہیں یا مطلق غفلت مراد ہو تو اس میں ہم مبتلا ہیں۔

رضا و اطمینان میں فرق

رہے بیچ کے دو جز، ان میں ہم یقیناً مبتلا ہیں اور وہ دونوں ایک ہیں مگر قدرے تفاوت ہے۔ یعنی ایک تو مرتبہ عقل کا ہے اور ایک مرتبہ طبع کا، کیونکہ رضا تو امر عقلی ہے اور اطمینان امر طبعی ہے تو بعض دفعہ تو ایک فعل کو عقلاً پسند کرتا ہے۔ مگر دلچسپی نہیں ہوتی، جیسے کڑوی دوا یا شہادت کے لئے سفر کہ عقلاً تو پسند ہے، مگر اس کے ساتھ دلچسپی نہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی تو ہوتی ہے۔ مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے۔ جیسے زنا وغیرہ۔ غرض کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور کبھی بالعکس لیکن وہ حالت نہایت سخت ہے کہ رضا اور اطمینان دونوں ہوں تو کفار کو تو علی العموم یہ بات ہے، مگر اکثر مسلمانوں کو بھی ہے۔

چنانچہ پسند کی تو کھلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا اور دین میں تزاحم ہو جیسے مقدمات میں یا رشوت لینے میں یا جیسے بعضوں کے پاس زمینیں دبی ہوتی ہیں تو ان کو سب جانتے ہیں کہ گناہ ہے۔ مگر دل سے پسند ہے کہ جی برا نہیں ہوتا بلکہ جب اس کی اصلاح کی رائے دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ ریاست کے معاملے ہیں۔ ناصح کیا جانیں۔ غرض عقلاً پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ عقیدہ ایسا نہیں ہے۔ علیٰ ہذا تعلیم کے باب میں جانتے ہیں کہ ابتدائے تعلیم زمانہ حال میں مشغول کرنے سے اولاد دین سے بے خبر رہتی ہے مگر کہتے ہیں کہ ایسا نہ کریں تو ترقی کیوں کر کریں۔ یہ سب رضا بالدنیا ہے۔ بلکہ اب تو یہ وہ پالیسی ہو گئی ہے کہ اہل

علم اور درویشوں میں بھی یہ مرض ہے۔ اِلّا ما شاء اللہ۔ حالانکہ درویش کو زیادہ محتاط ہونا چاہئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کثرت سے ایسے مولوی اور درویش ہیں کہ اس رضا بالدنیا سے اُن کا مذہب یہ ہوگیا ہے کہ مُردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں ہمارے چار پیسے سیدھے ہو جائیں اور یہی وہ جماعت ہے۔ جن کو دیکھ کر اہل دنیا علم دین سے نفور ہو گئے ہیں۔

علم دین کی بے قدری

صاحبو! علم دین کو ہم نے خود ذلیل کیا۔ ورنہ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ دربار دہلی میں جب بادشاہ کے سامنے علماء گئے ہیں تو اُن کو دیکھ کر بادشاہ خود جھک گئے۔ افسوس ہے کہ دوسری قوم کے لوگ تو عزت کریں۔ بادشاہ کی یہ حالت تھی کہ والیان ریاست کے سامنے اُس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور علماء کو دیکھ کر جھک کر اُن سب کی تعظیم کی۔ اب بتلایئے کہ اُن کے پاس کیا چیز تھی۔ کونسا ملک تھا۔ صرف یہ بات تھی کہ یہ عالم ہیں، دین کے پیشوا ہیں، لیکن اگر ہم خود ہی بے قدری کرائیں تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ یہی حالت ہوگئی ہے پیروں کی کہ طمع سے ان کی بھی سخت بے قدری ہوگئی ہے۔

مجھے ایک گنوار کا واقعہ یاد آیا کہ فصل پر جب کمینوں کا اناج نکالنے بیٹھا تو گھر والوں نے سب کو شمار کیا۔ دھوبی کو بھی، خاکروب کو بھی اور یہ بیٹھا سنتا رہا۔ جب سارے کمینوں کا نام سُن چکا تو کہنے لگا کہ اس سُسرے پیر کا بھی تو نکال دو، مگر یہ پیر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ موضع مساوی کے بعضے لوگ قاضی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے تھے۔ پھر خاندانی پیر صاحب کو جب خبر ہوئی تو کہنے لگے کہ اچھی بات ہے۔ دیکھو! میں بھی تمہیں پل صراط پر دھکا دوں گا۔ تو ایسے پیر میں بھی اس قابل۔ علی ہذا بعضے علماء بھی ایسے ہونے لگے ہیں۔

ایک سب جج پرانی وضع پرانی روشنی کے ایک مقام پر بدل کر آئے۔ انہوں نے چاہا کہ وہاں کے رؤساء سے مل آئیں۔ ایک رئیس صاحب کے پاس پہنچے تو وہ دور ہی سے صورت دیکھ کر گھر میں چلے گئے۔ انہوں نے خادم کے ذریعے سے کہلا کر بھیجا کہ میں فلاں شخص ہوں، آپ سے ملنے کو آیا ہوں۔ نام سن کر وہ رئیس صاحب باہر آئے اور معذرت کر کے کہنے لگے کہ

آپ کا عبا دیکھ کر یہی یہ سمجھا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں، چندہ لینے کی غرض سے آئے ہیں یہ خیالات ہیں عوام کے علماء کے متعلق۔ مگر اس میں زیادہ قصور ان عوام کا نہیں، بلکہ ایسے مولویوں کا ہے کہ اُن ہی نے اپنے افعال سے عوام کے خیالات کو خراب کیا۔ اگر علماء اس سے پرہیز کرتے تو عوام کو کبھی ایسی جرأت نہیں ہوسکتی یہ تو اہل علم کی غلطی تھی۔

ترغیب تعلیم علمِ دین

لیکن جن لوگوں نے ایسوں کو دیکھ کر علم دین سے کنارہ کیا ہے۔ وہ بھی غلطی سے خالی نہیں۔ کیونکہ علم دین کے ساتھ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اخلاق بھی سکھلائیں۔ جن سے یہ افعال نا ملائم پیدا نہ ہوں۔ دوسرے ایک خاندانی رئیس زادہ اگر علم دین پڑھے گا تو وہ بوجہ اس کے کہ فطرۃً عالی حوصلہ ہے۔ کیونکر ایسی حرکات کرنے لگا اور جو لوگ ایسی حرکات کرتے ہیں، وہ اکثر کم خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ پس جب یہ ہے تو تعجب ہے کہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اپنے بچوں کو تعلیم دینی نہ دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم حال نہ دو۔ ضرور دو، مگر یہ بھی تو دیکھو کہ علم دین ہر وقت کی ضرورت کی چیز ہے تو چاہیئے تو یہ کہ اوّل علم دین پڑھاؤ اور اس کے بعد دوسرے علوم۔ ورنہ دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ تو اس کی تعلیم ضرور ہی ہونی چاہیئے۔ اگر زیادہ وقت نہ ہو تو اُردو کے ہی رسائل پڑھاؤ لیکن سبقاً سبقاً پڑھاؤ۔ یہ نہیں کہ کتاب دے دی اور کہہ دیا کہ دیکھ لو۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ پورا نصاب ہو اور کسی دیندار آدمی کو رکھ کر سبقاً سبقاً پڑھاؤ۔ اگر چوبیس گھنٹہ میں سے ایک گھنٹہ ہی دو، بلکہ میں کہتا ہوں کہ فضول وقت میں سے جو کھیل کود میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں سے اگر ایک گھنٹہ دو اور وقتاً فوقتاً امتحان لیا کرو۔ کامیابی پر بچے کو انعام دو اور ناکامی پر سزا دو اور عمل کرانے کی بھی کوشش کراؤ۔ جیسے حساب میں مشق کراتے ہو اور اگر وہ نہیں کرتا تو سزا دیتے ہو۔ اسی طرح ہر مسئلے میں التزام کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ ساتھ کے ساتھ دیندار ہوتا چلا جائے گا۔ ہاں اس کے لئے ایک عالم کے بلانے کی ضرورت ہوگی تو جب سینکڑوں روپیہ انگریزی میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر

دس روپے اس میں صرف ہو جائیں گے تو کیا ظلم ہو گا اور اُن مولوی صاحب سے آپ اپنے لئے بھی یہی کام لے سکتے ہیں کہ اُن سے خود بھی مسائل سیکھیں۔

مرض رضا بالدنیا کا عموم

اور اس موقع پر یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں جیسا پہلے تھا پھر کوئی سلسلہ علم دین کا ہو تو اچھا ہے کہ یہاں کے بچے کچھ نہ کچھ تو ضرور پڑھ لیں۔ دیکھو اگر دو گھنٹے کی صحبت کسی عالم کی ہو جائے تو خواہ یہ بچے دیندار نہ ہوں، لیکن اُن کو بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ مگر اس طرف لوگوں کو توجہ نہیں۔ اگر کہیے کہ یہاں کوئی مولوی نہیں ملتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر راج کی ضرورت ہو اور وہ نہ ملے تو کیا کرتے ہو۔ یہی کہ دوسرے مقام سے راج کو بلاتے ہو۔ پھر مولوی کو دوسرے مقامات سے کیوں نہیں بلاتے۔ یہاں اس کے منتظر کیوں رہتے ہو کہ مولوی خود آئیں۔ صاحبو! اگر دین کی کچھ بھی عظمت قلب میں ہوتی تو خود مولوی کو تلاش کرتے۔

خلاصہ یہ کہ رضا بالدنیا کی ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں۔ حتیٰ کہ مولوی اور درویش بھی اور مولویوں اور درویشوں سے ایسا ہونا یہ زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ یہ دھوکا دے کر کماتے ہیں۔ مگر ہر جماعت میں کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہیں۔ دنیا داروں میں بھی دینداروں میں بھی۔

یہ تو رضو بالحیٰوۃ الدنیا تھا۔ آگے فرماتے ہیں:۔

واطمأنوا بہا

کہ دنیا میں جی بھی لگایا اور دنیا ان کے دل میں بھی گھس گئی۔ اس کا ازالہ ذرا مشکل ہے۔ دنیا سے تو دل گھبرانا چاہیئے مگر ہر مسلمان بتلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اُس کا جی گھبرایا ہے اور کب وحشت ہوئی ہے۔ ہاں اگر وحشت ہوتی ہے، تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے۔ حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہیئے کہ جو مظفر نگر کی سرائے سے کہ اگرچہ وہاں سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل جلال آباد میں پڑا رہتا ہے۔ اس کا مطلب

بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں! مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں سرائے کا تعلق رکھو۔ دیکھو کیا سرائے میں کھاتے نہیں ہو یا کوٹھڑی کرائے پر نہیں لیتے۔ سب کچھ کرتے ہو، مگر وہاں جی نہیں لگتا اور دنیا میں جی لگا لیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ ہماری بعینہٖ وہ حالت ہے۔ جیسے بچہ سرائے کے کسی آرام کو دیکھ کر ضد کرنے لگے کہ میں یہیں رہوں گا۔ باقی جن کو دنیا کی حقیقت سے واقفیت ہے اُن کی یہ حالت ہے کہ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم
راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
بر در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

"وہ دن کیسا ہوگا جب کہ میں اس ویران منزل یعنی دنیا سے کوچ کر جاؤں گا اور میں اپنے محبوب کے پاس جا کر راحتِ جان کی خواہش کروں گا وصال محبوبِ حقیقی کے بعد زندگی دوام ملے گی میں نے منت مانی ہے کہ جس دن اس غم کا خاتمہ ہوگا تو میں مے کدہ کے دروازہ تک خوش و خرم اور غزل پڑھتا جاؤں گا۔"

دیکھئے! منت مان رہے ہیں کہ اگر یہاں سے چھٹکارا ہو تو یوں کریں گے۔

دنیا کی محبت زائل کرنے کا طریقہ

بیان تو بہت طویل ہے مگر میں وقت نہ ہونے سے ایک ترکیب بتلا کر مضمون کو مختصر کرتا ہوں اور وہ ایسی ترکیب ہے کہ جس سے تم کو انشاء اللہ تعالیٰ صحبت کی برکت حاصل ہوگی اور یہ جو دائرے سے باہر قدم نکلا جا رہا ہے۔ یہ رک جائے گا اور وہ حالت ہو جائے گی جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ سب کچھ کرتے ہو، مگر کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ تو وہ ترکیب یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اُس میں موت کو یاد کیا کرو۔

دُنیا پر مطمئن ہونا

الاطمینان بالدُّنیا

یہ وعظ ۱۴، رجب ۱۳۲۶ھ کو موضع اجراڑہ ضلع میرٹھ میں ہوا۔ جو دو گھنٹے جاری رہا اور جسے حکیم محمدؐ یوسف صاحب بجنوری نے قلم بند کیا۔

دنیا کے سب کاروبار کرو مگر دنیا پر مطمئن نہ ہو
جاؤ۔ آخرت کو پیش نظر رکھو اور جو وقت کام کاج
سے بچے اس کو فضول باتوں میں ضائع نہ کرو۔
یہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے۔ اس کی قدر کرو۔ یہ
اتنی قیمتی چیز ہے کہ جس وقت عزرائیلؑ روح قبض
کرنے کے لئے آئیں گے تو تم تھوڑے سے وقت
کے لئے تمام سلطنت بھی دینے کے لئے تیار ہو
جاؤ گے، مگر ایک منٹ کی بھی مہلت نہ ملے گی۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبہ ماثورہ معمولہ ۔ اما بعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِہَا وَالَّذِیْنَ ہُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۔

حُبّ دنیا تمام امراض کی جڑ ہے

ہر چند کہ ہمارے اندر مختلف امراض پائے جاتے ہیں لیکن بنص حدیث اصل تمام امراض کی صرف ایک ہی چیز ہے۔ وہ کیا ہے؟ حُبّ دنیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں یُوں ارشاد فرمایا ہے :-

حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ۔

(ترجمہ) کہ دنیا کی محبت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

اس وجہ سے بجائے اس کے کہ اس وقت ہر ہر مرض کو جدا جدا مفصل بیان کیا جائے مناسب یہ ہے کہ سارے امراض کی اصل اور اس کے علاج کو بیان کر دیا جائے کیونکہ اول تو ہر ایک مرض کو مفصلاً بیان کرنے کے لئے وقت میں گنجائش نہیں۔ دوسرے اصل کا علاج بیان کرنے میں یہ بھی نفع ہے کہ مرض اصلی کا علاج کلی معلوم ہو جانے سے قریب قریب سب امراض کا علاج ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل مرض بقیہ امراض کا سبب ہوا کرتا ہے تو اس کے علاج سے سب کا علاج ہو جائے گا کیونکہ علاج کی حقیقت اصل میں سبب ہی کا ازالہ ہے۔

بنیادی مرض کا علاج پہلے کرنا چاہیئے

مثلاً کسی کے جسم میں خون ضرورت سے نکل گیا اور اس وجہ سے قلب اور دماغ میں ضعف لاحق ہو گیا اور اس کے علاوہ اور امراض بھی پیدا ہو گئے۔ اس حالت میں ایک تو علاج یہ ہے کہ ہر ہر مرض کا علاج جُدا گانہ کیا جائے۔ جیسے مقوی دماغ اور مقوی قلب اجزاء استعمال کئے جاویں تاکہ دماغ میں قوت پیدا ہو اور قلب کا ضعف رفع ہو۔ غرض ہر مرض کا علاج جُدا جُدا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بہت ہی وقت صرف ہو گا اور دقتیں پیش

آئیں گی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام امراض کی اصل اور جڑ کو تلاش کیا جائے کہ وہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے یہ تمام امراض لاحق ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں تمام امراض کی اصل خون کا جسم سے نکل جانا ہے پس مناسب ہے کہ اس حالت میں ایسی تدابیر کی جائیں جن سے خون میں ترقی ہو۔ جب خون بڑھے گا۔ تمام امراض خود بخود زائل ہو جائیں گے۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجیے کہ اصل کا علاج کرنے سے جملہ امراض کا دفیعہ ہو جائے گا۔ حُبِّ دنیا چونکہ تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔ جب اس کا علاج ہو جائے گا تو سارے امراض خود ہی دفع ہو جائیں گے اور یہ ایک کلی علاج ہے۔

حُبِّ دنیا کس طرح بنیادی مرض ہے

البتہ ایک سوال یہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حُبِّ دنیا کو جو تمام امراض کی جڑ بتلایا گیا ہے تو اس کو دیگر امراض سے کیا علاقہ ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو جملہ امراض کی اصل قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً نماز نہ پڑھنے کو حُبِّ دنیا سے کیا علاقہ؟ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص میں حُبِّ دنیا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو یا ایک شخص میں حُبِّ دنیا ہو اور روزہ بھی رکھتا ہو۔ علیٰ ہذا اور اعمال کو دیکھئے تو حُبِّ دنیا کو تمام خطاؤں کی جڑ قرار دینے کا کیا مطلب ہے۔ بظاہر تو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یا مثلاً کسی میں غصہ ہو اور دنیا کی محبت نہ ہو۔

بات یہ ہے کہ اگر غور کیا جاوے تو حُبِّ دنیا کو ہر مرض سے علاقہ ہے۔ کیونکہ جب میں حُبِّ دنیا ہوگی۔ اس کو آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا تو وہ شخص اعمالِ حسنہ کو انجام ہی نہ دے گا نہ برائیوں سے بچے گا اور ایسے ہی برعکس جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے مثلاً جو لوگ جرائم کرتے ہیں۔ وہ محض اس وجہ سے کہ آخرت کی فکر نہیں۔ اگر آخرت کے واقعات لوگوں کے پیشِ نظر ہوں تو جرائم کبھی صادر نہ ہوں۔ مگر حُبِّ دنیا کے مراتب مختلف ہیں۔ جیسے فکرِ آخرت کے مراتب مختلف ہیں۔ پس جن درجات میں تضاد ہے۔ وہ جمع نہیں ہو سکتے اور جن میں تضاد نہیں، وہ جمع ہو سکتے ہیں اور یہی راز ہے۔ اس کا کہ ایک حدیث

میں تو فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومنٌ ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن۔

زانی شخص اس حال میں کہ وہ مومن ہے زنا نہیں کرتا اور چور اس حال میں کہ چور ہے، چوری نہیں کرتا۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق۔

جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ جنت میں داخل ہوا۔ اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔

مراتب ایمانی مختلف ہیں

بات یہ ہے کہ مراتب ایمانی مختلف ہیں۔ ایک مرتبہ اہتمام آخرت کا ایمان کا درجہ نفس تصدیق ہے کہ اس سے کم پر اکتفا جائز نہیں۔ یہ درجۂ فکر آخرت و ایمان کا زنا اور سرقہ و دیگر معاصی کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے اور ایمان کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی طبیب نے مریض کو نسخہ لکھ کر دیا اور جملہ امور اس کے متعلق بتلا دیئے اور طبیب کو مقصود ہے کہ اس مریض کو اس نسخہ سے کامل شفا ہو جاوے گی۔ مگر مریض نے پورے نسخہ کا استعمال نہ کیا، بلکہ آدھے نسخہ کا استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ آدھے نسخہ سے ادنیٰ درجہ کا نفع ہو گا اور پورے سے پورا نفع ہو گا۔ اسی طرح نفس تصدیق عذاب دائمی جہنم سے بچنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ مگر پوری نجات کا سبب نہیں بن سکتی اور اس درجہ کے ساتھ معاصی جمع ہو سکتے ہیں اور دوسرا درجہ ایمان کا وہ تصدیق ہے۔ جس پر اثر کامل مرتب ہو اور یہی تصدیق کامل ہے۔ یہ مرتبہ ایمان کا معاصی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہو تو اس سے زنا اور سرقہ وغیرہ سرزد ہی نہیں ہو گا۔

الغرض خدا تعالیٰ و رسولؐ کو سچا سمجھنے کے مراتب مختلف ہیں۔ کامل سچا سمجھنا وہ ہے۔

جس پر اثر کامل مرتب ہو کہ معاصی تمام ہا چھوٹ جائیں اور دوسرا درجہ ناقص تصدیق کا ہے کہ کچھ معاصی چھوٹ جائیں، کچھ باقی رہیں۔ دوسرے درجہ ایمانی کی مثال آدھے نسخہ کی سی ہے، کہ آدھے نسخہ سے آدھا فائدہ ہو گا۔ اسی طرح اس درجہ کے ایمان سے یہ نفع ہو گا کہ آدمی عذاب دائمی جہنم سے نجات پا جائے۔ پوری نجات یعنی نجات اولی اس کو حاصل نہ ہو گی، اور پہلے درجہ ایمانی کی مثال پورے نسخہ کی سی ہے۔ جیسے پورے نسخہ سے پورا نفع ہوتا ہے اسی طرح پورے ایمان سے پورا نفع ہو گا کہ آدمی علاوہ جہنم سے نجات پانے کے اور انعامات کا بھی مستحق ہو گا۔

یا مثلاً دو شخص ہوں کہ ہر ایک ان میں سے سنکھیا کو مہلک سمجھتا ہے۔ مگر ایک نے باوجود مہلک سمجھنے کے اس کو کھالیا اور ہلاک ہو گیا اور دوسرے نے نہیں کھایا ظاہر ہے کہ دونوں نے اس کو مہلک تو سمجھا۔ مگر پہلے شخص کا مہلک سمجھنا کامل نہیں۔ کیونکہ مہلک جاننے کا اثر مرتب نہیں ہوا، اور دوسرے کا مہلک سمجھنا کامل درجہ کا ہے، کیونکہ اس پر اثر مرتب ہوا۔

یا ایک شخص کو کسی نے خبر دی کہ تیرا حاکم آ گیا۔ اُس نے اس خبر کو سن کر اس کے آنے کا کچھ بھی اہتمام نہ کیا۔ نہ کام کی درستی کی۔ ویسے ہی پڑا رہا۔ معلوم ہوا کہ اُس نے حاکم کے آنے کی خبر کو کامل طور پر سچا نہیں سمجھا۔ معمولی سمجھا۔ اگر اس کو تصدیق کامل ہوتی تو اس پر اثر مرتب ہوتا۔

اسی طرح ایمان سچا اور کامل وہی ہے، جس پر اثر مرتب ہو۔ ہر ہر قدم پر اثر ہو۔ جس شخص کی یہ حالت ہو گی۔ کبھی نافرمانی نہ کرے گا اور ایسا شخص ماضی کی کوتاہیوں کا بھی تدارک کرے گا اور آئندہ معاصی سے مجتنب رہے گا۔ اسی طرح مراتب مختلف ہیں۔

مراتب حُبّ دنیا مختلف ہیں

حُب دنیا کے بھی مراتب مختلف ہیں۔ کسی میں کم ہے۔ کسی میں زیادہ۔ کفار میں زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں کم مگر ہیں ضرور، اور یہی جڑ ہے۔ تمام گناہوں کی۔ کیونکہ حُب دنیا میں

عہدے داروں کو فکر ہے کہ ہمارے اگر آج پچاس ہیں تو کل کو سو ہو جاویں۔ مکان بناتے ہیں تو فکر ہے کہ اور بنائیں اور بڑھائیں۔ اس میں یہ زیادہ کریں، اس میں وہ بڑھائیں ایک رئیس کا قصہ ہے کہ ان کو عمارت سے بے حد شوق تھا۔ اسی کی دھن تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک میرے کان میں بسولی کی آواز نہیں آتی چین ہی نہیں پڑتا۔ عمارت کے بارے میں معماروں کا مقولہ ہے کہ ایک گز زمین میں ساری عمر تعمیر جاری رکھ سکتے ہیں۔ ایک گز زمین عمر بھر کو کافی ہے۔ اس طرح کہ اوپر کو عمارت بڑھاتے ہوئے چلے جائیں ساری عمر بھی ختم نہ ہو۔ یا ایسی صورتیں اس میں پیدا کرتے چلے جائیں کہ ساری عمر کام جاری رہے۔ ایک گز زمین ہی میں لیچ بچے کچے بناتے چلے جاؤ۔ تو ساری عمر بھی ختم نہ ہو۔

غرض جس کو جس چیز کی لت ہوتی ہے اس سے جی نہیں بھرتا، افسوس ہے کہ آخرت سے جی بھر گیا ہے اور دنیا سے نہیں بھرتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؂

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں
صبر چوں داری زنعم الماہدون
اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن
صبر چوں داری ز رب ذوالمنن

دنیا کے دھندوں سے جی نہیں بھرتا مگر جی بھرا تو خدا سے اور رسول سے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ کہاں ذوق! کہاں شوق!! فکر ہی نہیں کہ کیا ہوگا۔ بس یہی شکایت ہے کہ ہم کو دنیا کی زندگی پر قرار ہو گیا ہے۔ صاحبو! جس کو حرکت ہوتی ہے اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے ؂

دل آرام در بر دل آرام جو
لب از تشنگی خشک و بر طرف جو

دنیا میں کوئی کسی پر عاشق ہو جائے تو بس وصل ہونے پر انتہا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کسی مردار صورت پر عاشق ہو جاوے تو وصل ہو جانے پر منتہی ہو گیا۔ اور

لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاٰخرۃ ــــــ!

تاکہ تم دنیا و آخرت کے معاملات میں سوچ لیا کرو ــــــ!

کہ فکر کرتے ہیں دنیا اور آخرت میں۔ اس فکر فی الدنیا کی کسی نے کیا اچھی تفسیر کی ہے کہ دنیا کی تکالیف اور دنیا کی لذات میں غور کرے کہ یہاں کی لذات سب ایک دن فنا ہو جائیں گی۔ اور دنیا کی زندگی تکالیف سے بھری ہوئی ہے اور فکر الآخرت سے اس کا عکس ثابت ہوگا۔ اس مجموعے کے سوچنے سے دنیا کی بے قدری ہوگی اور آخرت کی طرف رغبت بڑھے گی۔ جب دونوں کا موازنہ کرے گا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا لاشئے محض ہے۔ اور اس مراقبہ سے دنیا کی تکالیف میں بھی کمی ہوگی۔ کیونکہ جب سوچے گا کہ دنیا میں بالفعل اگرچہ تکالیف ہیں مگر یہ ایک روز فنا ہو جائیں گی۔ اور آخرت میں راحت ہی راحت ہے تو وہ تکالیف نہ معلوم ہوں گی۔ اس لیے میں نے اس ذاکر سے کہا کہ جب موت کے تفکر سے جی گھبراتا ہے تو حیات کا تفکر کرو۔ حق تعالےٰ نے ہر شخص کے مناسب سوچنے کی چیزیں بتلا دی ہیں مگر افسوس! ہمارا کوئی وقت سوچنے کے لیے فارغ نہیں۔

تفکر اور اس کے موانعات

اب میں موانع تفکر کو بیان کرتا ہوں۔ سو وہ دو چیزیں ہیں جو سوچنے سے مانع ہوتی ہیں۔ کبھی تو شہوت جسمانی مانع ہوتی ہے کہ انسان دنیا کی شہوات میں گرفتار ہو کر آخرت کی سوچ نہیں کرتا اور یہیں کی شہوات میں رہ جاتا ہے اور کبھی لذات نفسانی میں مبتلا ہونا مانع ہوتا ہے۔ کیونکہ آخرت کی سوچ میں یہاں کی لذات میں کمی ہو جائے گی۔ مگر لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ آخرت کی سوچ سے یہاں کی تکالیف میں بھی تو کمی ہو جائے گی۔ پھر لذت کے متعلق بھی انسان کو یوں سوچنا چاہیئے کہ اگر میں دنیا کی لذات میں مبتلا رہا تو آخرت کی لذات مجھ سے فوت ہو جاویں گی۔ اس سوچنے میں ہر ہر قدم پر نفع ہے۔

اصل علاج مختصر سوچ ہے کہ اس سے ساری باتیں علم و عمل کی درست ہو جاویں

گی۔ اب یہ سمجھو کہ عمل دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ کہ جن کا جائز ناجائز ہونا آپ کو معلوم ہے۔ ان پر تو یاد کر کر کے ابھی سے عمل کرنے لگو۔ دوسرے وہ کہ جن کا جائز ناجائز ہونا معلوم نہیں چنانچہ زمینداری کے بہت سے ایسے اعمال ہیں جن کا جواز عدم جواز لوگوں کو معلوم نہیں۔ ان کو تلاش کر کے علماء سے پوچھو۔ یہ نمونہ کے طور پر میں نے ذکر کر دیا۔ سوچنے سے سارے ابواب دین کے مفتوح نظر آویں گے۔

سوچنے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے گھڑی میں بال کمانی۔ کہ ہے تو وہ بہت مختصر مگر تمام پرزوں کو حرکت اسی سے ہوتی ہے۔ اسی طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہو جاویں گے عوام کو تو کیا کہا جائے میں کہتا ہوں کہ علماء بھی کیا کر رہے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کرتے۔ اور میں بھی اس میں داخل ہوں۔ ان کا جی تو چاہتا ہے سوچنے کو مگر خلوت کا اہتمام نہیں غرض عموماً ہمارے مذاق خراب ہو گئے ہیں۔ ہر وقت ہاؤ ہو اور ہنسی دل لگی میں وقت گذار رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ چوپال میں پہنچے اور ہنسی میں سارا وقت گذار دیا۔ اول تو دنیا کے دھندوں سے سوچنے کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی اگر فرصت مل بھی تو پھر بجائے آخرت کے سوچتے ہیں کہ فلانے دوست کے پاس جا کر باتیں کریں گے۔ وقت کٹے گا، طبیعت بہلے گی۔ بس وہاں جا کر خرافات میں وقت عزیز کو گذار دیتے ہیں۔

خوب سمجھ لو کہ تمہارے دوست حقیقت میں دشمن ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تمہارا کوئی روپیہ چرا لے۔ تو اس حرکت پر آپ کو کس قدر افسوس ہوگا۔ اسی طرح جو آپ کے دوست ہیں وہ آپ کے بیش قیمت کو جو اشرفیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے لوٹ رہے ہیں۔ ایک ڈاکو حقہ ہے اس نے خدا اُسے سلامت رکھے ایسا رواج پایا ہے کہ دو پیسہ کا تمبا کو خرچ کر کے اس کی بدولت جتنا چاہو مجمع کر لو اور اوقات سب کے برباد کر لو۔ بس حقہ کیا ہے جامع المتفرقات ہے۔ یہ حقہ ثقہ اور غیر ثقہ دونوں کا جامع ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب کبھی کسی کو اپنے گھر کی رونق اور آبادی مدنظر ہوتی ہے تو وہ حقہ کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کا اہتمام کرنا تھا پھر مجمع کی کیا کمی۔ گویا ہم لوگ حقیقت میں خود اس واسطے مجمع کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس دولت ہے وہ سب چرا کر لے جائیں (یعنی وقت)

وقت بڑا بیش قیمت ہے

صاحبو! یہ وقت بڑی بیش قیمت چیز ہے۔ اس کی قدر کرو۔ وقت اتنی قیمتی چیز ہے کہ جس وقت عزرائیلؑ آجاویں گے قبض روح کے لیے تو تم تھوڑے سے وقت کے لیے تمام سلطنت بھی دینے کے لیے تیار ہو جاؤ گے مگر ایک منٹ کی بھی مہلت نہ ملے گی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۔

جب ان کا وہ وقت آپہنچتا ہے تو ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔

اس اجتماع و اختلاط کے متعلق ایک ضروری اور مفید بات ہے وہ یہ کہ وحشت ناک لوگوں کی فہم سے اندیشہ ہے کہ الٹا نہ سمجھ جائیں۔ کیونکہ آج کل فہم کا قحط ہے۔ سیدھی بات کو بھی الٹا سمجھ جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو کہتے ہوئے جی رکتا ہے۔ مگر خیر اس وقت زبان پہ بات آگئی اس لئے توکلا علی اللہ بیان کئے ہی دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض لوگوں کا آج کل یہ مشغلہ ہو گیا ہے کہ مختلف بزرگوں کے پاس دورہ کرتے پھرتے ہیں۔ آج اس بزرگ کے پاس پہنچ گئے کل دوسرے کے پاس پرسوں تیسرے کے پاس۔ خوب سمجھ لو کہ آج کل اس میں بھی دین کا نقصان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر بزرگوں کے یہاں ہر قسم کے لوگوں کی مجلس ہوتی ہے اور وہ لوگ ہر قسم کی باتیں وہاں کرتے ہیں۔ حتی کہ غیبت بھی۔ پھر یہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ آج کل اکثر مجالس ایسی ہی ہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص بزرگوں کے پاس سے اتنا لاتا نہیں جتنا کھو کر آتا ہے جب یہ حالت ہے بزرگوں کی مجالس کی تو اور مجالس کی خرابیاں کیسی کچھ ہوں گی۔ مگر آج کل جا بجا مجالس گرم کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے چوپالیں اسی واسطے بنائی جاتی ہیں پھر ان میں یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے تو غیبتیں اور لایعنی باتیں شروع ہوئیں۔ اور درحقیقت یہ سارے قصے بے فکری کی بدولت ہیں، جب کوئی کام نہیں ہوتا تو چوپالوں میں بیٹھ کر معاصی میں وقت گذارتے ہیں یہ نشست گاہیں اسی واسطے آج کل موضوع ہیں۔ یہاں تک کہ جن چیزوں کی طرف نگاہ کرنا حرام کیا گیا

ہے، چوپال میں بیٹھ کر اُن پر بھی نظر ہوتی ہے۔ ان سے پرہیز کی عادت ہی جاتی رہتی ہے اس کا کچھ خیال نہیں کہ بے موقع نگاہ کرنے پر بھی سخت مواخذہ ہوگا۔ اس لئے اسلم یہی ہے کہ ایسی صحبت ہی سے جدا رہے شاید بچنا آسان ہو جاوے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل ہماری بزرگی کی ایسی مثال ہے جیسے رڑکی گودام کے کاریگروں کی کاریگری کہ جب تک اس احاطہ میں ہیں اس وقت تک کاریگر ہیں اور جہاں باہر نکلے تو اناڑی۔ کیونکہ وہاں سب کام مشین سے ہوتے ہیں۔ باہر مشین کہاں ایسی حالت ہماری ہے کہ جب تک گوشہ میں ہیں تو کچھ عمل کرتے بھی ہیں اور معاصی سے بچتے ہیں اور جہاں گھر سے باہر نکلے اور آفتیں نازل ہوئیں ہیں پختہ لوگوں کو نہیں کہتا اور پختہ لوگ ہیں کتنے۔ پختہ لوگ تو اس سے مستثنیٰ ہیں اُن کی مثال تو آج کل ایسی ہے جیسے ہزاروں چنے میں ایک گیہوں کا دانہ۔

آج کل کی مجالس کی حالت

ورنہ عام مجالس کی تو بُری ہی حالت ہے۔ اور یہ خرابی کس وجہ سے ہوئی۔ اس وجہ سے کہ دین کی فکر نہیں رہی دنیا پر اطمینان ہوگیا۔ جس کو دین کی فکر ہوگی وہ تو لوگوں کے رات دن کے برتاؤ کو دیکھ کر تنگ ہوگا، پریشان ہوگا۔ دیکھے گا کہ لوگ دین کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور دنیا میں ایسے مشغول ہیں اور اس پر ایسا اطمینان کئے ہوئے کہ دین کی ذرا بھی فکر نہیں بس جس کو دین کی فکر ہوگی وہ تو لوگوں کی اس حالت کو دیکھ کر گوشہ ہی قبول کرے گا۔ میں کھیتی سے منع نہیں کرتا، خرید و فروخت، دنیا کے اور معاملات سے نہیں روکتا، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے کام دنیا کے اور تعلقات کو چھوڑ کر مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کاروبار سب کرو مگر دنیا پر مطمئن مت ہو، آخرت کو پیش نظر رکھو۔ اور جو وقت کام کاج سے بچے اُس کو فضول باتوں میں ضائع نہ کرو۔

ممنوعات شرعیہ میں مبتلا مت ہو بلکہ جو لوگ آج کل کی مجالس میں شریک ہونے

سے محترز ہیں اور بیلوں کی صحبت میں رہتے ہیں وہ پھر اچھے ہیں۔ بہت ہوگا ایسا شخص بیلوں کی صحبت میں رہنے سے بیل ہو جائے گا مگر مواخذہ آخرت سے تو بچے گا۔ میں اسی لئے کھیتی کو پسند کرتا ہوں کیونکہ ان لوگوں کو گناہوں کے لئے کم موقع ملتا ہے۔ کہیں پانی دے رہے ہیں، کہیں نولائی کر رہے ہیں، کہیں آوازیں لگا رہے ہیں۔ بعضے خدا کے بندے ایسے ہیں کہ آوازیں بھی اللہ کے ذکر کی لگاتے ہیں۔ گو اس میں قدرے کلام ہے مگر مقصود ان کے مذاق کا بیان کرنا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو واہی تباہی باتوں سے غیبت وغیرہ سے تو بچاؤ ہوتا ہے۔

کسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ صبح سے کھیتی کے کام میں مشغول رہے۔ دوپہر کو گھر سے کھانا پہنچ گیا۔ اس کو کھا کر ذرا آرام کیا۔ پھر کام میں مشغول ہو گئے۔ رات کو مارے تھکے آئے نماز پڑھی اور سو گئے۔ ساری خرافاتوں سے بچے۔ ان میں تکبر و نخوت نہیں ہوتا بہت ہوگا ایسے اشغال میں ذرا بے تمیز ہو جاویں گے۔ مگر یہ بے تمیزی ہزار درجہ اچھی ان خرافات میں مبتلا ہونے سے جو شہروں میں ہو رہی ہیں۔ مگر ستم یہ ہے کہ جو لوگ ان مکروہات میں گرفتار ہونے سے پرہیز کرتے ہیں ان کو آج کل دیوانوں میں شمار کرتے ہیں۔ مگر واقعی بات یہ ہے

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم — مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد — مر عسس را دید و در خانہ نشد

خلوت اور اس کی حقیقت

گوشہ سے مراد مسجد کا گوشہ نہیں بلکہ تنہائی ہو چاہے گھر ہو چاہے جنگل ہو کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ اپنی حالت ممتاز مت بناؤ اور مسجد کا گوشہ آج کل ممتاز حالت ہے۔ بلکہ خلوت ہو مگر اس طرح کہ کسی کو خلوت کا پتہ بھی نہ چلے۔ اگر لوگوں کو خلوت کا پتہ چل جائے گا تو جان کھا جائیں گے۔ اس لیے خلوت بھی ترکیب سے کرو۔ کھیتی کر لو اور کوئی شغل کر لو مگر مکروہات سے بالکلیہ بچے رہو۔ بس یہ آج کل خلوت ہے۔

مولوی ظہیر الدین صاحب ایک درویش تھے۔ میرے پھوپھا صاحب کے بھائی

لیے راضی رکھنے کی فکر کریں کہ مخلوق ہم سے راضی ہوجائے۔ اور اگر ذات حق سبحانہ تعالے راضی ہوں اور مخلوق راضی بھی نہ ہو تو حرج ہی کیا ہے۔ اللہ میاں کی رضا کو مقدم سمجھنا چاہئے خواہ مخلوق راضی ہو یا نہ ہو۔ یاد رکھو کہ اگر سب کی ٹکو تو رکھو گے تو دین برباد ہو جائے گا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ مخلوق کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرو بلکہ جب یہ دیکھو کہ لوگوں میں بیٹھ کر دین خراب ہوتا ہے تو نرمی سے اُن کو سمجھاؤ کہ اس قسم کی باتوں سے دین کی خرابی ہے۔ اس واسطے میں کنارہ کشی چاہتا ہوں۔ اس صورت میں لوگ ناراض تو ہوں گے مگر نصیحت ہو گی اور آئندہ کے لیے اُن کا حوصلہ پست ہو جاوے گا کہ پھر وہ خرافات کا ذکر بھی تمہارے سامنے نہ کریں گے۔ آج کل بدون بے مروتی کے کام نہیں چلتا۔ میں بد اخلاقی کرنے کو نہیں کہتا۔ لیکن اگر خدا کی نافرمانی میں مخلوق سے مروّت کی تو خدا تعالیٰ کو کیا منہ دکھلاؤ گے خرافات میں وقت گذارنے سے کیا فائدہ ہے؟ وقت کی بڑی قدر کرنی چاہیے اور اس کی اچھی صورت یہی ہے کہ اختلاط کم کر دو۔ دکانداری وغیرہ خلوت کے منافی نہیں بس دکانداری میں اتنا کام ہے کہ کوئی سودے کا نرخ دریافت کرے اس کو بتلا دو اگر وہ کہے دے دو۔ مختصر سی بات کر لو۔ ضروریات کو شریعت نے مستثنیٰ کیا ہے۔

خوب سمجھ لو کہ جو شخص پھیری لگاتا ہے اور اپنا سودا بیچنے کے لیے آوازیں دیتا ہے، جو نور اُس کے قلب میں سبحان اللہ کہنے سے ہوگا ویسا ان آوازوں کے لگانے سے ہوگا کیونکہ یہ بھی ضروری چیز ہے۔

مسلمان کا ہر فعل عبادت ہے!

مسلمان کا تو ہر فعل جو غرض محمود سے ہو شرع میں عبادت ہے گو بظاہر دنیا کا کام نظر آتا ہو۔ پس اس کا مضائقہ نہیں مگر جس بات سے دین کی مضرت ہو اگرچہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو اُس سے بچو۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کم تعلقی کے برکات دیکھنا چاہو تو یوں کرو کہ دس دن کے

لیے اپنے کاموں کا انتظام کر کے تنہائی اختیار کر لو۔ دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ اس لیے تم جنید بغدادی تو نہ ہو گے مگر انشاء اللہ حس پیدا ہو جاوے گی۔ اوّل اوّل جی گھبرائے گا مگر پھر آسانی ہو جائے گی۔ پھر خلوت کے بعد سمجھو گے کہ جن خرافات میں مبتلا تھے انھوں نے ہمارے دل کا ناس کر دیا ہے۔ پھر ذرا سی بھی خلاف بات ہونے پر یہ کیفیت ہو گی ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغِ دل خلالے کم بود

حس کے صحیح ہو جانے پر اس کا تجربہ کر لیجئے گا۔ اس وقت تو ہماری حس ہی صحیح نہیں رہی۔ حس کے صحیح ہونے پر یہ حالت ہو گی کہ اگر ایک منٹ کے لیے بھی باہر آجادیں اور ایک بات فضول منہ سے نکل جاوے تو سارا کیا ہوا برباد معلوم ہو گا۔ باقی معاصی کا تو کیا پوچھنا ہے۔

اب ہماری حس کی ایسی مثال ہو رہی ہے جیسے سانپ کے کاٹے ہوئے کو نیم کی پتیاں میٹھی معلوم ہوتی ہیں۔ اس طرح ہم کو معاصی جو زہر قاتل ہیں مزیدار معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس کا علاج کرو اور علاج کے لیے کسی تجربہ کار طبیب کو تلاش کرو۔ اور جب تک طبیب نہ ملے ایک بڑا علاج یہی ہے کہ جو عرض کیا گیا کہ سوچنا شروع کر دو۔ آخرت کے تمام امور کو سوچا کرو کہ میں مر کر قبر میں جاؤں گا۔ وہاں سوالات ہوں گے اگر ٹھیک جواب دے دیا تو راحت ہو گی۔ اور اگر جواب ٹھیک نہ دیا گیا تو عذاب ہو گا۔ پھر اس کے بعد دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا۔ میدانِ قیامت کی سختیوں کو بھی سوچے یہ کہ خدا تعالیٰ کے روبرو کھڑا کیا جاؤں گا۔ اس کے بعد پل صراط پر چلنا ہو گا۔ پھر جنت ملے گی یا دوزخ میں ڈالا جاؤں گا۔ دوزخ میں کوئی پرسانِ حال نہ ہو گا غرض سارے امور کو سوچا کرے۔

ایک قابلِ عمل بات

اور اس کے ساتھ ہی کسی بزرگ سے تعلق پیدا کر لو۔ اگر ممکن ہو سکے تو اس کی صحبت میں رہو۔ اگر اس کے حقوقِ صحبت ادا نہ کر سکو تو اس سے خط و کتابت کر کے اپنے اعمال

کی حفاظت رکھو۔ دیکھ بھال رکھو کہ زبان کو کس چیز میں مشغول رکھتے ہو، کان سے کیا کام لیتے ہو۔ تمام اعضاء کی حفاظت رکھو۔ اور شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع کرتے رہو۔ اور جو وہ بتلائے اُس پہ عمل کرو کیونکہ امراض باطنی کی جو دوائیں ہیں وہ اُن کی خاصیت خوب جانتا ہے۔ وہ بصیر ہے، دانشمند ہے، طبیب روحانی ہے، امراض قلبی کے علاج سے بخوبی واقف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل مرض ہمارے اندر یہ ہے کہ آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا پر اطمینان کر لیا ہے۔

یہ اطمینان بالدنیا ہے تو چھوٹا سا عنوان، مگر اصل ہے تمام امراض کی۔ اس کا علاج ہونے سے تمام امراض کا علاج ہو جاوے گا۔ مطلب یہ ہے کہ قلب کو دنیا پہ قرار ہو جانا اور آخرت کے لیے قلب کا بے چین نہ ہونا یہی جڑ ہے تمام بیماریوں کی۔ پس یہ اطمینان دل میں سے نکالو اور خدا تعالیٰ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لو گو بتکلف ہی سہی خدا کی طاعت میں اثر خاص ہے کہ اس سے فکر پیدا ہو گی اور فکر کے پیدا ہونے سے تمام کام درست ہو جائیں گے۔

ایک بات اپنے اوپر اور لازم کر لو۔ وہ یہ کہ جو اپنے جی میں آئے فوراً مت کر لیا کرو بلکہ علماء سے تحقیق کر کے کیا کرو۔ اگر ناجائز بتلائیں ہرگز اس کام کو مت کرو۔ اپنے کو علماء کا محتاج سمجھو، علماء کی قدر کرو۔ اس طرح دستور العمل رکھنے سے پھر قلب دنیا پہ ہرگز مطمئن نہ ہو گا۔

اور یہ بھی سمجھ لو کہ بدون خود حرکت کیے ہوئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ محض توکل پہ بیٹھ رہنا اور خود متوجہ نہ ہونا بے سود ہے۔ خود قصد کرو گے تو اس طرف سے بھی توجہ ہو گی چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب قصد بھاگنے کا کیا تھا تو قصد کرتے ہی سارے قفل مکانوں کے ٹوٹ گئے تھے۔ رحمتِ حق کے متوجہ ہونے کے لیے عادۃً قصد شرط ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اھدی بن گئے ہیں۔ حرکت ہی نہیں کرتے۔

بس اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ سوچنا عمر بھر کا نسخہ ہے اسی پہ عمل رکھو۔ سارے کام تمہارے درست ہو جاویں گے۔ میں نے مختصر علاج بتلا دیا اب جو کوئی عمل نہ کرے تو اس کا کیا علاج؟ اس وقت اس سے زیادہ اور کوئی ضروری مضمون ذہن میں نہیں گو تفصیل کی حاجت باقی ہے۔ مگر اس پہ عمل کرنے سے تفاصیل کی خود فکر ہو جاوے گی۔ جتنا بتایا ہے اس کو تو شروع کر دو۔ اب دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق دیں۔

متاع الدّنیا

دنیاوی سازوسامان

دنیا کو اپنا وطن اور قیام گاہ نہ سمجھنے کے متعلق یہ وعظ ۱۴ شعبان ۱۳۳۲ھ کی رات کو تھانہ بھون میں منشی اکبر علی صاحب کے مکان پر کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جہاں حضرت تھانویؒ کی برادر زادی بچی فوت ہو گئی تھی۔ اور قریباً ۶۰ افراد کا مجمع تھا۔ یہ وعظ سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے، جس
کا علاج موت کی یاد ہے ــــــــــ
ــــــــ اور ــــــــ
ــــ موت کے توحش سے بچنے کا علاج
خدا کی رحمت کو یاد کرنا ہے۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیات أعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ وَنشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد ان سیّدنا و مولانا محمّدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ وبارك وسلم ۔ اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالےٰ ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ــــــــــــــــ !

کے تذکرے کے کوئی کام کوئی قصہ نہیں ہوتا۔ گویا یہی ان کا دین ہے یہی دنیا ہے۔ اور کم و بیش ہم بھی اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو بھی آخرت یاد نہیں رہتی ورنہ اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستا سکتی تھی۔ اور اپنے وطن اصلی کو یاد کر کے راحت ہو جایا کرتی خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی۔ مثلاً اس شخص کا کوئی پیارا بچہ مر جاتا تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوتی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً اگر کوئی سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ گم ہو جائے اور اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا بچہ وہاں چلا گیا ہے جہاں میرا گھر ہے اور جہاں میں بھی جا رہا ہوں۔ تو کیا وہ روئے پیٹے گا۔ ہرگز نہیں، بلکہ اس کو یہ سن کر اطمینان ہو جائے گا اور سمجھے گا کہ اب کوئی دن میں میں بھی اس سے جا کر مل لوں گا۔ تو اگر ہم آخرت کو اپنا وطن سمجھتے تو اولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا قصہ لے کر نہ بیٹھا کرتے ہاں جدائی کا غم ہوتا ہے۔ تسلی بھی تو ہونی چاہئے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہنچ گیا۔ اپنے گھر پہنچ گیا۔ ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے۔ خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس آیت کے دوسرے جملے میں سکھلایا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔۔۔۔!

یعنی جو چیز گئی وہ خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے اور سب کے سب وہیں جمع ہو جائیں گے تو اس کو سوچ کر تسلی ہونی چاہئے تھی۔ اگر آخرت کو گھر سمجھتے لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائیداد چھین لی۔ غرض یہ ہے کہ یوں ہونا چاہئے تھا جیسے دنیا کی مثال میں سمجھا دیا۔ مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس سے سمجھ میں آیا ہو گا کہ اولاد کے مرنے کا ایسا غم بھی اس لئے ہوتا ہے کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔

دنیادار کو موت کا خوف

بس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ثابت ہوئی کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے اسی لئے یہاں سے جدا ہونے کا رنج و غم ہوتا ہے۔ ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں

مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے اور یہ حالت دنیاداروں ہی کی ہے کیونکہ وہ دنیا ہی کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کو اس کا ذرا بھی غم نہیں ہوتا اور ان کو نہ اپنے مرنے کی پروا ہوتی ہے نہ اولاد کے مرنے کی پروا ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ تو جہلاء کو ان کے سنگ دل ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ ان سے زیادہ تو کوئی رحم دل ہی نہیں ہوتا مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اس لئے اُن کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک گونہ مفارقت سے قلق ہوا۔ بس زیادہ نہیں کیونکہ وہ آخرت کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں جس طرح عادت ہے کہ سفر سے واپس آتے ہوئے گھر کے قریب پہنچ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس خوشی کو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم و ز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بوڑھے ہو گئے۔ آپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمدللہ اب قریب وقت آیا۔

مگر ان حکایات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو اعمال پر یا مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے۔ اس لئے احتمال مواخذہ نہ ہونے پر خوش رہتے ہیں۔ استغفراللہ ناز کی مجال کس کو ہے۔ بلکہ وہ خوشی صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کو دارو گیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں۔ تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے لیکن رحمت خداوندی سے اُمید بھی ہوتی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ پھر چھوٹ جائیں گے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہو اور سرائے نہایت پختہ

ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کرے گا۔ اور سوچے گا کہ اگرچہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے۔ لیکن میں انشاء اللہ تعالیٰ پھر اس کو پختہ کر لوں گا۔ اسی طرح اگرچہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی ہے تو ضرور رحمت ہوگی۔ غرض وطن سے طبعی محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو تو کوئی یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ ان کو ناز ہوتا ہے۔

دنیا کی حقیقت کے استحضار کا اثر

غرض حقیقت واقعی یہ ہے جو مذکور ہوئی۔ اس کو اگر کوئی سمجھ جائے۔ تو ہزاروں غم کم ہو جائیں اور دنیا کی تمام ہوسیں فنا ہو جائیں۔ ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ اور فانوس سب لگا دیئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے۔ خاص کر جب کہ یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہیں کر سکے گا۔ اس وقت تو اپنی کمائی کو وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خللِ دماغ ہے۔ اور دنیا ایسی ہی محدود القیام سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔ اول تو سرائے میں اگر قیام اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہیئے بلکہ اس سے توحش اور ضیق رہنا چاہیئے۔

الدنیا سجن المومن کے معنے

یہی معنے ہیں میرے نزدیک الدنیا سجن المومن کے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنے کہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا کیونکہ بعض مومنین کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس لئے فرمایا کہ جیل خانے میں کبھی جی نہیں لگا کرتا اگرچہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور وہ گھر نہیں ہے۔

پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچے گا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو۔ بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح سے بھی دن گذر جائیں ٹھیک ہے۔ اور دنیا کی سوچ کے بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لیے یہ سامان ہونا چاہیے۔ اور یہ فکر ہونا چاہیے۔ اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اور یہ سوچے کہ اگر یہ سامان ہوگیا تو پھر یوں بہار ہوگی اور یوں عیش ہوگا ورنہ یوں مصیبت ہوگی، یوں پریشانی ہوگی۔

اب غور کر کے دیکھو کہ کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ دنیا دار تو الگ رہے دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق کبھی نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے خدا تعالیٰ صاف فرماتے ہیں:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ

دیکھو! ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے۔ آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے۔ اس کے لیے کیا زادِ راہ تیار کر رکھا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ وطن اور گھر بھی ہے کہ اس صورت میں تو اس کے لیے بہت کچھ سامان کرنا چاہیے تھا۔ یعنی قطع سفر کے لیے زاد اور ناشتہ اور گھر پر بیٹھنے کے لیے کمائی اور ذخیرہ۔ پس ایک اثر تو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا۔ ایک دوسرا اثر اس کے گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کے حوادث سے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے اور نہ لگے سگے کے واسطے۔ گھر تو وہاں ہے۔ اب جو موت سے ہم کو موت آتی ہے۔ جیسے کسی کو جیل خانے میں لے جاتے ہوں۔

ہمارے حضرت (حاجی صاحب) رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا۔ کہنے لگا کہ میری بیوی مرتی ہے۔ حضرت فرمانے لگے کہ اچھا ہوا جیل خانے سے چھوٹتی ہے اور پھر فرمایا کہ یہ کیوں غم کرتا ہے تو بھی چلا جائے گا۔ کہنے لگا روٹی کون پکائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے وہی روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی۔ تو موت کے متعلق اس تمام کرب ورنج کی وجہ یہی ہے کہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں، ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا

غم ہوتا۔ اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ کسی سے عداوت اور رنج نہ ہوتا اگرچہ معمولی طور پر کسی بات میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی۔

دیکھو! ریل میں مسافروں میں لڑائی تو ہوتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ اپنے سفر کے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اس سے سفر کھوٹا ہوگا مگر اس طرح سے دنیا کے فضول قصوں میں بھی کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو گھر نہیں سمجھتے۔ نیز اگر آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تو دنیا کے سازو سامان پر اترایا نہ کرتے۔ چنانچہ اگر سفر میں کہیں سیج بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی بھی اس پر نہیں اتراتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے ہوں تو ہم اُن پر اتراتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ اور بہت سے دلائل اس کے کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ یہی بڑی خرابی ہے اور اسی سے آخرت کے کاموں میں سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے۔

یہ تو ہماری حالتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے آخرت کو اپنا گھر نہیں سمجھا۔ اب صحابہ کرامؓ کو دیکھئے کہ انہوں نے کیسی کیسی سختی اٹھائی لیکن اُن کو کبھی ہراس نہیں ہوا۔ اور ان سختیوں سے تو اُن کو کیا اثر ہوتا جو سب سے بڑی سختی ہے موت وہ اس کے مشتاق رہتے تھے کہ کون سا وقت ہوگا کہ ہم یہاں سے چھوٹیں گے۔ وہ حضرات کماتے بھی تھے لیکن لاچاری کو جیسے بڑی زبردستی سے کوئی کام کرتا ہے۔ بس وہ حضرات آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور یہ اس کے آثار تھے۔

دنیا سے کتنا تعلق رکھنا چاہیئے!

میں جو کہتا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا مت کماؤ۔ دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں۔ مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جاؤ۔ جیسے ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ گویا خدا تعالیٰ سے کوئی واسطہ ہی ہم کو نہیں۔ مثلاً جب کپڑا لے کر پسند کرنے بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ گویا ان کا یہی ایمان ہے۔ جب زیور کے پیچھے پڑیں گے

تو اس طرح کہ بس وہی دل میں بسا ہوگا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں دنیا کا کام کرنے سے منع نہیں کرتا مگر یہ کہتا ہوں کہ اس میں دل نہ لگاؤ۔ کام سب کرو مگر جی اترا ہوا ہونا چاہئے۔ دل کو کھپا دینا ہی زہر ہے۔ یہ وہ بلا ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت بھی غالب نہ ہو جائے اور اللہ و رسول ؐ کے نام سے اس وقت بالکل بے تعلقی نہ ہو جائے۔ لہذا جہاں تک ہو اس کی کوشش کرو کہ دنیا میں دل لگا ہوا نہ ہو۔ دل کو خدا تعالیٰ ہی میں لگاؤ۔ ہاتھ سے کام کرو کچھ حرج نہیں

حدیث شریف میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں سب کام کر لیتے تھے لیکن جب اذان ہوتی تو یہ حالت ہوتی کہ قام کانہ لا یعرفنا۔ اور ہم لوگوں کی اور بالخصوص عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر مثلاً سینے میں لگیں تو نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کی۔ اس طرح دنیا کے ہر کام میں ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دین کی کچھ خبر ہی نہیں۔ اور یہ دین کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ افسوس! کیا دین ایسی بے فکری کی چیز ہے یہ معاملہ تو دنیا کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ خوب کہا ہے ؂

غم دیں خور کہ غم غم دین ست
ہمہ غمہا فروتر از این ست
غم دنیا مخور کہ بیہودہ است
ہیچ کس در جہاں نیاسودہ است

واقعی یہاں کا غم ہی کیا؟ یہاں کے غم کی تو ایسی حالت ہے جیسے خواب کا غم۔ سو خواب میں اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے اور اسی وقت آنکھ کھل جائے اور دیکھے کہ ایک نہایت عمدہ، سیج بند کیے ہوئے پلنگ پر آرام کر رہا ہے اور بہت بڑا محل ہے۔ لوگ ادھر ادھر کھڑے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں تو کیا اس شخص کے ذہن میں وہ خواب رہے گا۔ ہرگز نہیں۔

اسی طرح یہاں کی خوشی بھی خواب کی سی خوشی ہے چنانچہ اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوں اور آنکھ کھل جائے تو دیکھے کہ چاروں طرف پولیس کے سپاہی بیڑیاں لئے کھڑے ہیں۔ اور اس کو جیل خانہ لے جانا چاہتے ہیں تو کیا اس خواب

فرق اُن لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور اُن میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے ۔
اسی کو خدا تعالےٰ فرماتے ہیں۔

اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ساری خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے ۔
اس کو دل سے نکالنا چاہیئے ۔

دنیا کی محبت کم کرنے کا طریقہ

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جائے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی ۔ اور آخرت کی نعمت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے پھر ایک دن ہمارا حساب ہو گا ۔ اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی ورنہ سخت سخت عذاب ہوں گے ۔ اور نفس سے کہا کرو کہ اے نفس! تو دنیا کو چھوڑنے والا ہے قبر میں تجھ سے سوال ہو گا ۔ اگر اچھے جواب دے سکا تو ابدالآباد کا چین ہے ۔ ورنہ سدا کی تکلیف ہے ۔ پھر تجھے قیامت کو اٹھنا ہے اور اس روز تمام نامۂ اعمال اڑائے جائیں گے ۔ تجھے پل صراط سے گذرنا ہو گا ۔ پھر آگے یا جنت ہے اور یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو ۔ اس سے آخرت کے ساتھ تعلق ہو گا اور دنیا سے دل سرد ہو جائے گا ۔

اور موت کے مراقبے سے ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان ہو کہ اس سے تو وحشت ہو گی اور جی گھبرائے گا ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالیٰ کی رحمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اُس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی محبت نہیں ہے ۔ تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں ۔

اور اگر اس مراقبے کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل راغب ہو اور گناہ کو جی

الفانی

◉

دنیا کی بے ثباتی کے متعلق یہ وعظ ۳۰ / جمادی الآخری سنہ ۱۳۳۱ ہجری کو تھانہ بھون میں منشی اکبر علی صاحب کے مکان پر مولانا سعید احمد صاحب کی وفات پر تعزیت کے لئے جمع شدہ حضرات کے روبرو ہوا ۔ جو دو گھنٹے میں ختم ہوا ۔ اور اسے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا

کرو۔ شریعت نے عقل کی بھی رعایت کی اور طبیعت کی بھی۔

فنائے دنیا سے غفلت

اسی طرح یہاں جس مسئلہ کا ذکر ہے اس میں عقل کا مقتضا یہ ہے کہ فنائے دنیا سے کبھی غفلت نہ ہو کیونکہ جب واقع میں اُس کو بقا نہیں اور فنا اس کے ساتھ لگا ہوا ہے تو اس سے غفلت بڑی غلطی ہے۔

دیکھو اگر بادشاہ کسی خزانچی کے سپرد خزانہ کر دے اور اس کو معلوم ہے کہ یہ میرے پاس بطور امانت کے ہے جو چند روز کے بعد لے لیا جائے گا۔ اس کو لازم ہے کہ اس کی امانت ہونے سے غافل نہ ہو۔ اگر کوئی خزانچی خزانہ کو اپنی ملک سمجھ کر اُس میں مالکانہ تصرف کرنے لگے تو یقیناً سب اس کو احمق بنائیں گے۔

اسی طرح فنائے دنیا سے غفلت عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے۔ کیونکہ فنائے دنیا کو بار بار دیکھتے دیکھتے مساوات سی ہو جاتی ہے۔ اور جس چیز کی مساوات سی ہو جائے اُس سے طبیعت کو غفلت ہو جاتی ہے شریعت نے یہاں بھی دونوں کو معتدل کر دیا اور دونوں کی رعایت فرمائی کہ غفلت کا تو مضائقہ نہیں مگر نہ اتنی غفلت کہ احکام عقلیہ بالکل برباد ہو جائیں۔

اگر تھوڑی سی غفلت بھی نہ ہو تو انسان معطل ہو جائے۔ جس کے سامنے ہر دم موت ہی کھڑی ہو وہ کوئی کام اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لئے ایک حد ہے جس کے آگے طبیعت کے احکام ختم ہو جاتے ہیں۔ اور وہ حد یہی ہے کہ اتنی غفلت کا تو مضائقہ نہیں جس کی انتظام معاش میں ضرورت ہے۔ مگر اتنی نہ ہو جس سے احکامِ عقلیہ بالکل برباد ہو جائیں۔ کہ دنیا سے ایسی وابستگی ہو کہ گویا ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ جو شخص دنیا سے ایسی وابستگی کرے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی مسافر سرائے میں دل لگا لے اور ایک رات کے قیام کے لئے وہاں خوبصورت مکان تعمیر کرنے اور باغ وغیرہ لگانے لگے۔ یقیناً سب اُس کو بے وقوف کہیں گے کہ صرف رات بھر کا تو قیام اور اس کے لئے اس

سب بخش دیں گے. گویا اُن کے نزدیک آخرت میں فقط ایک ہی جزو کا ظہور ہوگا دوسرے جزو کا یعنے عذاب کا ظہور نہ ہوگا. کیوں صاحب! جہاں یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بخش دیں گے وہاں یہ خطرہ کیوں نہ ہوا کہ شاید کسی بات پر پکڑ ہونے لگے. شاید دوزخ میں بھیج دیئے جائیں.

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ کام بہت کر کے بھی ڈرتے تھے. چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ ہم نے جو اعمال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں اُن کا اجر تو ہمارے واسطے سالم رہے اور جو اعمال حضورؐ کے بعد کئے ہیں اُن پر گرفت نہ کی جائے چاہے ثواب بھی نہ دیا جائے. تو حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں ان کا اجر بھی سالم رہے اور جو حضورؐ کے بعد کئے ہیں اُن کا ثواب بھی ملے کیونکہ ہم نے حضورؐ کے بعد بھی بہت کام کئے ہیں.

اور ظاہر میں یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ صحابہ نے زیادہ تر فتوحات و غزوات حضورؐ کے بعد ہی کی ہیں. حضرت عمرؓ کی مدت خلافت میں جس قدر فتوحات ہوئی ہیں کہ اسلام مشرق سے مغرب تک پھیل گیا. اُن سے پہلے اس قدر فتوحات نہیں ہوئیں.

مگر باوجود اس کے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی میں تو اس پر راضی ہوں کہ جو اعمال ہم نے حضورؐ کے سامنے کئے ہیں وہ سالم رہیں اور اُن کا ثواب ہم کو مل جائے اور جو اعمال بعد میں کئے ہیں اُن سے برابر سرابر چھوٹ جائیں کہ گرفت ہی نہ ہو، تو غنیمت ہے. ثواب تو کیا ہوتا. اور حضرت عمرؓ کو جو ان اعمال پر ثواب کی امید ہوئی جو حضورؐ کے سامنے کئے تھے تو وہ بھی اس لحاظ سے نہ تھی کہ وہ اپنے اعمال ہیں بلکہ محض اس وجہ سے امید تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو اعمال حضورؐ کے سامنے کئے ہیں وہ حضورؐ کی برکت سے ٹھیک ہو گئے ہوں گے. ان میں خلوص و نورانیت وغیرہ حضورؐ کی برکت سے آگیا تھا.

مردِ کامل کی ضرورت

حقیقت میں یہی باتیں ہیں جن سے ہم غافل ہیں۔ اور یہ ایک باریک بات ہے جس کی ہم کو خبر نہیں کہ ہم جو بعضے کام کرتے ہیں۔ کبھی تو وہ اپنی قوت سے ہوتا ہے اور کبھی اہل اللہ کی نظر و توجہ سے ہوتا ہے۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو

بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

یعنی باطنی راستہ کے لئے کوئی رفیق ساتھ لے لو تنہا اس راستہ کو طے کرنے کا ارادہ نہ کرو کیونکہ تم تنہا اس کو قطع نہیں کر سکتے۔ اس پر شبہ ہو سکتا تھا کہ بعض اہل اللہ کا پیر و مرشد کوئی نہ تھا۔ اور وہ بدون مرشد کے واصل ہو گئے اس کا جواب مولانا نے یہ دیا ہے۔

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ را برید

ہم بعون ہمت مرداں رسید

کہ جو لوگ شاذ و نادر تنہا اس راہ کو طے کرنے والے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی حقیقت میں تنہا منزل مقصود پر نہیں پہنچے بلکہ کسی کامل کی مخفی مدد اور پوشیدہ نظر کی برکت سے واصل ہوئے ہیں۔ ایک تو لفظ نادر بڑھا کر بتلا دیا کہ اول تو ظاہر میں بھی اس کا وقوع نادر ہے۔ دوسرے حقیقت کے لحاظ سے وہ بھی تنہا نہیں چل رہا بلکہ کسی کامل کی مدد اس کے ساتھ ہے گو اس کو خبر نہ ہو کہ کون میری مدد کر رہا ہے۔ جیسے آفتاب کی حرارت سے کھل پختہ ہوتا ہے۔ مگر کھانے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے لئے اس کو کس چیز نے پکایا۔ کس چیز نے تیار کیا۔

آفتاب طریقت کی ضیاء باری

اسی طرح ہر زمانہ میں کوئی خدا کا بندہ آفتاب طریقت ہوتا ہے جس کی نورانیت سے اس کے زمانہ والوں کو مدد پہنچتی ہے۔ مگر لوگوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا ہم کو کون چلا رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تنہا چل رہے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے اس راز

اللہ سے مانگنے کی ضرورت

اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔ اے لوگو! سنو کہ تمہارے واسطے دو قسم کی چیزیں ہیں ایک وہ جو تمہارے پاس ہیں جن میں تم نے دل لگا رکھا ہے۔ وہ تو ختم ہونے والی ہیں اور دوسری وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالٰی کے پاس ہیں وہ باقی ہیں۔ اور وہ چیزیں بھی تمہاری ہی ہیں مگر تم اُن سے ایسے غافل ہو گویا وہ غیر کی ہیں۔

حالانکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کچھ تو بچہ کے پاس روپیہ ہو اور باقی سرمایہ باپ کے قبضہ میں ہو۔ بچہ کے پاس جو روپیہ ہے وہ اس کو اپنا سمجھتا ہے مگر ٹھیکرا سمجھ کر برباد کر دیتا ہے۔ اور جو سرمایہ باپ کے پاس ہے اُس کو اپنا سرمایہ نہیں سمجھتا حالانکہ وہ بھی اُسی کے واسطے ہے مگر باپ اس لئے اس کو نہیں دیتا کہ برباد کر دے گا۔ وہ اس کو خاص موقع کے واسطے اپنے بچہ کے لئے محفوظ کرتا ہے تو جیسے وہ بچہ احمق ہے کہ باپ کے پاس کے سرمایہ کو اپنا نہیں سمجھتا ایسے ہی ہم بے وقوف ہیں کہ اپنی چیز اسی کو سمجھتے ہیں جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور جو نعمتیں اللہ تعالٰی نے ہمارے واسطے اپنے پاس رکھی ہیں اُن کو اپنی نہیں سمجھتے، وہ گویا کسی غیر کے لئے ہیں۔

اے صاحبو! وہ بھی ہماری ہیں۔ مگر جب تک اُن کی قدر نہ کرو گے وہ نہ ملیں گی۔ اور قدر یہی ہے کہ ان کو مانگو۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مانگو یا نہ مانگو۔ چاہو یا نہ چاہو یعنے قدر کرو یا نہ کرو زبردستی تمہارے سر منڈھ دی جائے۔ اللہ تعالٰی خود فرماتے ہیں۔

أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ۔

کیا ہم اپنی نعمت کو تمہارے سر چپکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت ہی کرتے رہو۔

آخر اُن کو اس کی ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ تمہارے سر چپکا دیں۔ کیا خدا کے پاس جگہ نہیں ہے یا وہ دولتیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی۔ ہرگز نہیں! خدا کے پاس جگہ کم نہیں اور نہ وہ نعمتیں سڑنے والی ہیں اس لیے بدوں مانگے نہیں ملیں گی اور مانگنے سے

بعد کچھ بھی دیر نہ لگے گی۔ حدیث قدسی میں بالفظ نبوی وارد ہے۔

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا

وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا ..... الخ

کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف دو بالشت جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اور جو میری طرف چل کر آتا ہے، میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔

خدا سے نہ مانگنے کا نتیجہ

ایک حدیث میں آیا ہے مَنْ لَمْ یَسْئَلِ اللّٰہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اُس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں۔" دوسرے آقاؤں کی تو یہ حالت ہے کہ اُن سے اگر برابر مانگتے رہو تو تنگ آجاتے ہیں۔ اور جو اُن سے مانگتا نہ ہو، اُس سے خوش رہتے ہیں اور تعریف کے طور پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا بے زبان ہے کبھی کچھ نہیں مانگتا۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ جو اُن سے نہ مانگے۔ اُس سے خفا ہوتے ہیں۔ یہاں تک ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو۔ یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی مانگو۔ نمک نہ رہے۔ وہ بھی ان ہی سے مانگو۔ یہ اس لئے فرمایا تاکہ لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگیں؟ ظاہر میں یہ مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں نفس کا کید ہے۔ جس پر شارع علیہ السلام نے ہم کو متنبہ فرمایا ہے۔ وہ کید یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چیزیں نہیں مانگتا وہ اپنے خیال میں ان چیزوں کو گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بڑی سمجھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سلطنت ہفت اقلیم اور جوتی کا تسمہ برابر ہے۔ دوسرے کیا چھوٹی چیزوں کے لیے کوئی اور خدا ہے۔ اگر نہیں تو اُسی سے کیوں نہیں مانگتے۔ اور مغفرت و جنت کے مانگنے

کا تو قرآن میں جا بجا امر ہے

سَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

"اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے۔"

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند فرماتے ہیں جو دعا میں الحاح کرتے ہیں"

تو دیکھو ہمارے آقا کیسے کریم ہیں۔ اب بھی کوئی نہ مانگے تو اس کی محرومی اور بدقسمتی ہے ؎

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

صاحبو! اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ انہوں نے حفاظت سے اپنے پاس تمہارے لیے بہت سی نعمتیں رکھی ہیں۔ اور جو نعمتیں تمہارے پاس ہیں اس کو چور لے جائیں، ڈاکو چھین لیں مگر افسوس کہ ہم اس پر فریفتہ ہیں اور جو محفوظ ہیں اُن کو اپنی حماقت سے بھولے ہوئے ہیں۔

ہماری ہر چیز پرائی ہے

اللہ تعالیٰ اسی غلطی پر ہم کو متنبہ فرماتے ہیں کہ جو تمہارے پاس ہے واقع میں وہ تو غیر کی چیز ہے یعنے امانت چندروزہ ہے جو ایک وقت میں تم سے چھین لی جائے گی، یا موت کے بعد وارثوں کو ملے گی۔ اور جو ہمارے پاس ہے واقع میں وہ تمہاری چیز ہے جو ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ مگر ہم نے اس مضمون کو بھلا رکھا ہے علماً بھی اور عملاً بھی۔ علماً ذہول کے معنی ہیں کہ اس کا استحضار نہیں ہے ورنہ اس کا عقیدہ تو ہم سب مسلمان اپنے دل میں پاتے ہیں۔

مگر جس اعتقاد سے کام نہ لیا جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک زنانہ شہزادہ کی حکایت ہے کہ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً سانپ نکل آیا تو وہ کہنے لگا ارے بلا نا کسی مرد کو

کو کسی نے کہا، حضور بھی تو ماشاء اللہ سردہیں۔ کہا، ارے ہاں خوب یاد دلایا، اچھا لاٹھی لاؤ۔ پھر نہ معلوم سانپ مارا یا نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کو اپنے مرد ہونے کا اعتقاد ضرور تھا مگر ایسے اعتقاد سے کیا نفع جو وقت پہ یاد نہ آئے حتی کہ دوسروں کو یاد دلانے کی ضرورت پڑے۔ گو اعتقاد کے بارہ میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ڈھول کے بعد بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ایسا اعتقاد بھی اخیر میں کام آجائے گا۔ پٹ کٹ کر اس عقیدہ ہی کی بدولت کسی وقت جنت میں پہنچ جائیں گے۔ جس کی دلیل یہ آیت ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

جب ذرہ بھر نیکی بھی ضائع نہیں تو ضعیف اعتقاد ایمان کی جزا بھی ضرور ملنا چاہیئے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ کسی وقت یہ لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں۔ تو ہر چند کہ یہ اعتقاد بھی ایک درجہ میں نافع ہے مگر جب وقت پر پوری طرح کام نہ آیا اور مرتے ہی جنت میں جانا نصیب نہ ہوا تو یہ اعتقاد نافع کامل نہ ہوا اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ اس باب میں علماً بھی کوتاہی کرتے ہیں اور عملاً بھی مگر عمل کے مقابلہ میں علم کے دو درجے ہیں۔ ایک اعتقاد ایک استحضار۔ اور ہماری کوتاہی دوسرے درجہ میں ہے یعنی ہم استحضار میں کوتاہی کرتے ہیں۔

اب عدم استحضار کا ایک قوی سبب سنیئے۔ وہ یہ کہ شیطان نے یہاں ہم کو یہ سبق پڑھا رکھا ہے کہ ہماری قسمت کہاں کہ ہم جنت میں پہلے ہی پہنچ جائیں۔ اس لیئے اس کی سعی نہیں اور اس لئے استحضار بھی نہیں۔ استحضار اسی چیز کا ہوتا ہے جس کے لیئے سعی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ! تمہاری قسمت کھانے پینے میں تو بڑی تیز ہے اس میں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہماری یہ قسمت کہاں کہ دو وقت پیٹ بھر کے روٹی کھایا کریں۔ یہ تو بڑے لوگوں کی قسمت ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ چاہتے تو ہم بھی یہ ہیں کہ جنت میں مرتے ہی پہنچ جائیں تو میں کہوں گا کہ یہ چاہنا آپ کا ایسا ہے جیسے کوئی یہ چاہے کہ بدون ہاتھ ہلائے روٹی منہ میں پہنچ جائے۔ اس کو سب یہ کہتے ہیں کہ یہ روٹی کھانا نہیں چاہتا۔ اگر چاہتا تو اس کے اسباب اختیار کرتا۔ ایسے ہی ہمارے بھائی یہ تو چاہتے ہیں کہ کھڑے کھڑے جنت میں پہنچ جائیں ہاتھ نہیں ہلاتے۔ اس کے اسباب

اختیار نہیں کرتے۔ اور دنیا کی جس بات کو چاہتے ہیں اُس کے لیئے خوب کوشش کرتے ہیں۔
پس حاصل یہ ہے کہ روٹیاں کھانا تو تم چاہو اور دین کی باتوں کو اللہ میاں چاہیں کہ اگر خدا نے چاہا اور قسمت میں ہوا تو دیندار بن جائیں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کامیابی اللہ تعالےٰ کے چاہنے سے ہی ہوگی۔ مگر جس طرح دنیا کے اسباب و تدابیر کو بھی ترک کرکے بیٹھ گئے۔ حالانکہ دنیا کے کاموں میں کوئی بھی تدبیر کو ترک نہیں کرتا۔ اس کا تو یہ حاصل ہوا کہ اپنے مطلب میں تو تم بڑے ہوشیار ہو مگر آخرت کو مطلوب ہی نہیں سمجھتے۔ اس کی وقعت دل میں نہیں جبھی تو یہ بہانے ہیں۔ اس کی شکایت ہے۔

موت لوگوں کو یاد نہیں

خصوصاً عورتوں میں یہ عدم استحضار بہت ہی زیادہ ہے۔ چنانچہ جس وقت عورتیں زیور پہنتی یا کپڑے قطع کرنے بیٹھتی ہیں اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کبھی اس کا گمان نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔ اور عام طور پر یہ ذہول اس قدر ہے کہ اگر کوئی ہمارے سامنے مرتا بھی ہے تب بھی ہم کو اپنی موت یاد نہیں آتی میں بقسم کہتا ہوں کہ بہت لوگوں کو اپنی موت یاد نہیں آتی جس کی دلیل یہ ہے کہ عین جنازہ کے ہمراہ ہنسی دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں۔ قبرستان میں جا کر بھی مقدمات کے فیصلے اور تذکرے ہوتے ہیں۔ واللہ! اگر اپنی موت[1] اس وقت یاد ہو تو انسان سب چھوڑ کر بھول جائے۔

جیسے ایک بڑھیا کی حکایت ہے کہ اس کی بیٹی بیمار تھی۔ یہ محبت میں دعا کرتی تھی کہ اے اللہ! یہ اچھی ہو جائے اور اس کی جگہ میں مر جاؤں۔ ایک دن اتفاق سے محلہ کی گائے نے ہانڈی میں منہ ڈال دیا اور سینگ ہانڈی میں پھنس گئے۔ وہ اسی صورت سے بڑھیا کے گھر میں آگھسی۔ یہ دیکھ کر ڈر گئی اور یہ سمجھی کہ جس موت کی میں تمنا کرتی تھی وہ سامنے آگئی۔

---

[1] حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک شخص کو قبر پر کھڑے ہوئے ہنستا ہوا دیکھا، فرمایا بخدا میں تجھ سے عمر بھر کلام نہ کروں گا۔ تو ایسی جگہ بھی ہنستا ہے جہاں رونا چاہیئے تھا۔ ۱۲)

بس یہ عزرائیل فرشتہ ہے جو میری روح نکالنے آیا ہے تو وہ گھبرا کر کہنے لگی۔ اے موت مہتیؔ نہیں ہوں۔ مہتی تو وہ پلنگ پر پڑی ہے۔ میں تو غریب بڑھیا ہوں ؎

گفت اے موت من نہ مہستیم
پیرزال غریب محنتیم

صاحبو! ہم اپنی موت کو یاد رکھتے تو ہوش اڑ جاتے اور اس کی علامات ظاہر ہوتیں مگر ہمارے اندر اس کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی۔ اور اگر اپنی موت یاد آتی تو پھر دوسرے مردہ پر بھی اتنا نہ روتے۔ کیونکہ اگر کوئی قید سے چھوٹ جاوے تو اس میں اتنے رنج کی کیا بات ہے۔ گو طبعاً حزن ہوتا مگر عقلاً تو یہ خوشی کی بات ہے اس وقت اس بات کی خوشی ہونا چاہئے تھی کہ ایک دن ہم بھی قیدخانہ سے چھوٹنے والے ہیں۔ جیسا یہ چھوٹ گیا۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

شوقِ لقاء میں موت کی تمنا جائز ہے

اہل اللہ تو موت کے دن کی تمنا کرتے ہیں اور یہاں ہم کو اُس کے نام سے بھی جاڑہ بخار چڑھتا ہے۔ تو موت کو ہم اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتے دیکھ کر بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ منزل ہمارے سامنے بھی ہے۔ بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اسی کے واسطے تھی۔ اور اگر کوئی یاد بھی کرتا ہے تو بطور وظیفہ کے۔ مگر کیا اگر کوئی لڈو مٹھائی کا نام لے کر وظیفہ پڑھا کرے تو اس سے اس کا منہ میٹھا ہو جائے گا ہرگز نہیں۔ اسی

ؔ اس کی بیٹی کا نام ہے ۱۲۔

طرح موت کا وظیفہ پڑھنے سے کام نہیں چل سکتا ۔ اس کو موت کی یاد نہیں کہہ سکتے بموت کی یاد یہ ہے کہ زیوروں کی کثرت سے نفرت ہو جائے گھر میں زیادہ سامان اور بکھیڑا ناگوار معلوم ہو۔ جیسے سفر میں زیادہ اسباب برا معلوم ہوتا ہے یہاں تک کہ سفر میں اتنا مختصر سامان ساتھ لیتے ہیں جس کے عدد شمار میں آجائیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ سفر آخرت سامنے ہے اور گھر میں اس قدر سامان ہے جس کی تفصیل گھر والے کو بھی معلوم نہیں ۔ ہم رات دن لاتے جاتے ہیں اور گناہوں کا بوجھ جو گردن پر لادا جا رہا ہے۔ وہ اس کے علاوہ ہے۔

اعتقاد فنائے دنیا میں عملی کوتاہی

یہ تو علمی کوتاہی تھی اور عملی کوتاہی یہ ہے کہ آخرت کے لئے کوشش نہیں کرتے بس بڑی کوشش یہ ہوگی کہ بیٹھ کے دو آنسو بہا لئے گو یا اللہ میاں کی نہر میں پانی کم ہو گیا تھا ۔ دو آنسو بہا کر اللہ میاں پر احسان کیا اور اُن کو خرید لیا ۔ بس اُن کے نزدیک دو آنسو بہانے سے سارے گناہ ان کے واسطے جائز ہو گئے ۔ یہ سب کا کفارہ ہو گیا ۔ بات یہ ہے کہ آنسو بہانے میں کوئی دقت نہیں ، کچھ کرنا نہیں پڑتا ۔ اس لئے رونا اختیار کر لیا۔

جیسے ایک بدوی کے ساتھ سفر میں ایک کتا تھا ۔ وہ راستہ میں مرنے لگا اور بدوی رونے لگا ۔ ایک مسافر نے رونے کا سبب پوچھا ۔ کہا یہ کتا میرا رفیق ہے اور آج مر رہا ہے ۔ اس واسطے رو رہا ہوں ۔ کہا اس کو مرض کیا ہے ؟ کہا ، بھوک سے مر رہا ہے ۔ مسافر نے دیکھا کہ ایک طرف پوٹلا بندھا رکھا ہے ۔ پوچھا ، اس میں کیا ہے ؟ کہا ، روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہیں ۔ کہا ، پھر کتے کو کیوں نہ کھلا دیئے جس سے تجھ کو اس قدر محبت ہے ؟

گفت ناید بے درم در راہ ناں   لیک ہست آب دو دیدہ رائیگاں

مجھے ایسی محبت نہیں کہ رقم کی چیز اس کو کھلا دوں اور رونے کا کیا ہے مفت کے آنسو ہیں دو گھڑی بہا لوں گا۔

یہی حال ہمارا ہے کہ ایسے مواقع پر ہم نے صرف رونا سیکھا ہے جس میں کچھ خرچ نہیں۔ صاحبو! بقسم بتاؤ کہ جتنی کوشش تم بھوک کے وقت غلہ لانے اور آٹا پسوانے روٹی پکوانے میں کرتے ہو کیا آخرت کے واسطے بھی کبھی اتنی کوشش کی ہے ہرگز نہیں اور اگر کوئی نصیحت کرتا ہے تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق دیں گے تو آخرت کا سامان کریں گے۔ گویا اس میں بھی نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی خطا ہے۔ اُن کی کچھ خطا نہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہماری تو قسمت پھوٹی ہوئی ہے۔ ہمیں دنیا کے دھندوں سے کہاں فرصت ہے۔ اسمیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی خطا بتائی جاتی ہے ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ یہ کیا دین ہے اور جو ذرا خیال آخرت کا ہوا تو بزرگوں سے دعا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔

جیسے ہمارے حضرت حاجی صاحب ؒ سے ایک سوداگر نے بمبئی میں کہا تھا کہ حضرت دعا فرمایئے مجھے بھی حج کی توفیق ہو جائے۔ فرمایا، ہاں ہم دعا کریں گے اور ایک کام تم کرو کہ جہاز کی روانگی کے دن مجھے اپنی ذات پر پورا اختیار دے دو کہ جو میں کہوں اُس کے خلاف نہ کرو۔ کہا، حضرت اختیار لے کر کیا کریں گے۔ فرمایا جس وقت جہاز روانہ ہو گا تم کو پکڑ کر جہاز میں سوار کر دوں گا۔ وہ حیلے حوالے کرنے لگا تو حضرت نے فرمایا، پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بیوی کی بغل میں رہو اور رات دن گھر ے اڑاؤ اور ہم دعا کیے ہو رہیں۔

یہی حال ہمارا ہے کہ خود کچھ نہ کریں گے ہاں ناصحین سے کہیں گے کہ آپ دُعا کریں۔ خصوصاً ان بوڑھی عورتوں کا تو یہ حال ہے کہ دین کا کوئی کام ہو تو سب سے کم ہمت اور دنیا کا کام ہو تو یہ شیطان کی خالہ سب سے پہلے اس کام کو کریں گی۔ اس میں سب سے زیادہ باہمت ہو جائیں گی۔ اللہ میاں کا دھیان بھی نہیں آتا۔ ہاں ہو بیٹیوں کے لئے زیور کپڑے کا رات دن تقاضا ہے۔ ہم تو اُن کو کم ہمت اسی وقت سمجھتے کہ یہ دنیا کے کاموں میں بھی کم ہمت ہوتیں۔ حالانکہ خود دنیا کی یہ حالت ہے کہ کوشش سے کبھی تو حاصل ہوتی ہے اور کبھی کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ اور آخرت کے لیے سعی کسی حال میں ناکام نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی عمل آخرت کا اہتمام کرے اور وہ حاصل بھی نہ ہو یا پورا نہ ہو جب بھی اس کو ثواب ملتا ہے۔

یہاں سے عوام کی ایک اور غلطی بھی معلوم ہو گئی۔ وہ یہ کہ جب ان سے کہا جاتا ہے

کہ میاں قرآن صحیح کرو، تو جواب میں کہتے ہیں کہ کیا اب میری تعلیم کا وقت ہے اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے۔ یہ جواب بالکل غلط ہے کیونکہ آپ کا کام صرف کوشش ہے صحت ہو یا نہ ہو۔ اگر تم کوشش میں لگ جاؤ پھر بھی کامیابی کا درجہ حاصل نہ ہو تب بھی ثواب ملے گا۔ بلکہ دونا ثواب ملے گا۔ ایک محنت کا ایک ناکامی کی حسرت اور رنج کا۔ یا یہ کہو کہ ایک پڑھنے کا ایک مشقت کا۔ اور ناکامی پر ثواب ملنے سے حیرت نہ کیجئے۔ حدیث میں تصریح ہے۔

وَالَّذِیْ یَتَتَعْتَعُ فِیْہِ وَھُوَ عَلَیْہِ شَاقٌّ لَہٗ اَجْرَانِ ——— !

یعنی جو شخص قرآن میں اٹکتا ہو اور وہ اس پر دشوار معلوم ہوتا ہو اس کو دو اجر ملیں گے۔

ناکامی بھی موجب اجر ہے

اسی بناء پر اہل اللہ نے ناکامی کو بھی سبب ثواب بنا دیا ہے۔ چنانچہ حضرت رابعہ نے جب حج کیا تو حج سے فارغ ہو کر جناب باری میں عرض کیا، یا اللہ! میں نے حج کر لیا اب ثواب دیجئے خواہ حج قبول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ اگر قبول ہو چکا ہے تب تو حج مبرور پر ثواب دینے کا آپ کا وعدہ ہے ہی اور اگر قبول نہیں ہوا تو یہ سخت مصیبت ہے کہ ؎

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اور مصیبت زدہ کے لئے بھی آپ نے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لئے بہر حال ثواب دینا پڑے گا۔ غرض اس دربار میں کوشش کے بعد ناکامی بھی کامیابی ہے تنخواہ ضرور ملے گی۔ اور حضرت رابعہ نے جو یہ عنوان اختیار فرمایا یہ ناز کا مقام ہے جو ہر ایک کا مقام نہیں ہمارے لئے تو یہ بھی زیبا نہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد	چوں نداری گرد بد خوئی مگرد
پیش یوسف نازش و خوبی مکن	جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
عیب باشد چشم نابینا و باز	زشت باشد روئے نازیبا و ناز

غرض یہ عنوان نازک ہے مگر مضمون یہ ہے کہ جب اپنے نزدیک مقبول بنانے کی کوشش کی مگر پھر کوتاہی ہو گئی تو قاعدہ سے گو مقبول ہونے کے قابل نہیں مگر وہ مقبول فرما کر اجر عطا فرما دیتے ہیں۔ یہ معنی ہیں عدم مقبول میں اجر کے۔ اور یہ مضمون سالکین کے بہت کام کا ہے کہ دین کے راستہ میں اگر کوشش ناکام بھی ہو یا کمزور ہو جب بھی اجر ملے گا۔

صاحبو! اگر وصول الی کمال العمل نہ ہوا تو ثواب و قرب تو وصول الی المقصود ہو جائے گا۔ اگر تم نے قرآن صحیح کرنے کی کوشش کی اور نہ ہوا تو کیا حرج ہے خدا تو راضی ہو گیا۔ ہمارے ایک مجمع نے ایک موقعہ پر ایک دینی کام کے لئے کوشش کی تھی اور ناکام رہے تو ایک بددین نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں کو کیا حاصل ہوا۔ ایک اللہ کے بندہ نے جھلا کر جواب دیا ؎

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست
بے مرادی نے مراد دلبر ست

اسے مراد میں تو مزہ ہے ہی مگر نامرادی میں بھی ایک مزہ ہے۔ وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہم نے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم
کہ من نیز از خریداران اویم

کیا یہ تھوڑی دولت ہے کہ تم ان کے خریداروں میں داخل ہو گئے گو ناکام ہی خریدار سہی۔ وائے اس کے حال پر، جو خریدار بھی نہ بنا پس آخرت وہ شے ہے کہ اس کا طالب ناکام ہو کر بھی مستحق اجر ہے۔ مگر ایسی مد کوئی نہیں کہ کچھ بھی نہ کرو اور اجر مل جائے۔ پھر افسوس ہے کہ ہم لوگ دنیا کے لیے تو ہر طرح کی تدبیر و سعی کرتے ہیں جہاں ناکامی سراسر خسارہ ہے

اور آخرت کے لئے سعی نہیں کرتے جہاں ناکامی بھی کامیابی ہے۔ سرمد اُن لوگوں کے جواب میں جو اس طریق میں ناکامی کی شکایت کیا کرتے ہیں۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد

یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد

یا قطع نظر ز یار می باید کرد

کہتے ہیں کہ بس ان شکایات کو ختم کرو۔ یا تو محبوب کے ہو رہو اور اُسکی رضا پر راضی رہو یا اس محبوب سے قطع نظر کر کے کوئی دوسرا محبوب تلاش کر لو۔

پس اگر خدا تعالٰی کسی کا بیٹا وغیرہ لے لیں تو اس کو شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ تم سب اپنے نہیں ہو بلکہ سب خدا کے ہو۔ جب تم اس کے ہو تو تمہاری ہر چیز اُسی کی ہے۔ جب ہر چیز خدا ہی کی ہے تو تمہارا کیا اجارہ ہے اگر وہ لے لیں۔ ایسے ہی اگر تم ذکر کرو، نماز پڑھو اور مزہ نہ آئے تو تمہارا کیا بگڑ گیا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے غلام نے آقا کی زمین میں کاشت کی ہو اور پیداوار نہ ہو تو اُس کو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا کیا نقصان ہے۔ اسی طرح تم نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور ذکر اللہ کیا اور حلاوت نہ ہوئی تو تمہارا کیا حرج ہے۔ تم کام میں لگے رہو کہ اس دربار کا نامراد بھی بامراد ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست !

بے مرادی نے مراد دلبر ست

اور اس کو بے مرادی کہنا بھی عاقل کے گمان کے اعتبار سے دنیا میں ہے اور وہاں تو اس کو پوری مراد ملے گی۔ افسوس ایسی دولت کے لئے تو ہم کوشش نہیں کرتے جس میں طالب کبھی ناکام نہیں اور دنیا مردار کے لئے ہر وقت مرتے کھپتے ہیں۔ جس میں ناکامی کے وقت خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اور کامیابی بھی محض ناتمام و ناپائیدار۔

جائے کہ وہی ہر دم خیال میں رہے۔ جس کو عارف جامی اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

بسکہ در جانِ فگار و چشمِ بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

اور اس کی ایسی مثال ہے جو عورتوں کے مناسب ہے کہ جس وقت اُن کو کسی کے آنے کا انتظار ہوتا ہے تو ہر وقت دروازہ کی طرف دھیان رہتا ہے۔ جہاں کسی کی آہٹ سنی اور یہی خیال ہوا کہ وہ آیا۔ سمجھو کہ خدا نے عمل میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس سے آخرت کا شوق ہو جاتا ہے۔ جس سے ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے۔ اس کو حال کہتے ہیں۔ حال کی دوسری مثال عورتوں کے لئے اور ہے یعنی تمباکو۔ کیونکہ عورتوں پر کچھ بلائیں تو قدرتی ہیں ناک میں اور کان میں اور ہاتھ گلے میں زیور اور ہار اور طوق وغیرہ مگر منہ کا اندر کا حصہ بچا ہوا تھا۔ اس میں کوئی زیور نہ تھا۔ تو کیسے بچتا۔ اس کے لئے انہوں نے تمباکو اور پان تجویز کیا ہے۔ جس سے پہلے پہل تو گھمیر ہوتی ہے پھر ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ ذرا دیر ہو جائے تو اسی میں دھیان لگا رہتا ہے۔ ایسا شوق ہو جاتا ہے کہ نہ ملنے سے پریشانی ہوتی ہے۔

بس اسی درجۂ طلب کا نام حال ہے۔ نیک اعمال سے بھی ایک کیفیت شوق کی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کا تصور ہر دم خیال میں حاضر رہتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسا مثلاً پیشاب پاخانہ اس پر گر پڑا۔ اور نیک کام کر لیا تو گویا سلطنت مل گئی۔ نیک اعمال میں یہ اثر ہے کہ اس سے معاصی سے نفرت اور آخرت کی رغبت ہو جاتی ہے۔ خاص کر اگر کسی بزرگ کی نظر بھی اس پر پڑ جائے کیونکہ ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

بزرگوں کی نظر کا اثر

حضرات صحابہؓ میں سارے لکھے پڑھے نہ تھے بلکہ بعضے تو حسیات تک میں بالکل بھولے بھالے تھے۔ چنانچہ فتوحات اسلامیہ میں ایک صحابی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں

کسی شہزادی پر نظر پڑ گئی۔ اور اس سے محبت ہو گئی۔ واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے فلاں عورت سے محبت ہو گئی ہے آپ مجھ کو لکھ کر ایک یادداشت دیجئے کہ اگر ہم کو فتح ہو گئی تو وہ عورت مجھ کو دے دی جاوے آپؐ نے لکھ دیا۔ چنانچہ خلفاء کے وقت میں وہاں جہاد ہوا اور وہ لڑکی گرفتار ہوئی انہوں نے سالار لشکر کو حضورؐ کا تحریری وعدہ دکھلا دیا۔ انہوں نے اس کو ان کے حوالہ کر دیا۔ پھر اس لڑکی کا بھائی آیا اور اُن سے کہنے لگا کہ اس کو بیچتے ہو؟ کہا ہاں! کہا، بتلاؤ کیا لوگے؟ انہوں نے کہا: ایک ہزار روپے۔ وہ ایک ہزار روپے لے آیا۔ تو آپ نے کہا، یہ تو تھوڑے سے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ ایک ہزار روپے اتنے ہوں گے کہ میرا گھر بھر جائے گا۔ اُس نے سالار لشکر سے شکایت کی کہ بیع کے بعد انکار کرتے ہیں۔ سالار لشکر نے اُن کو مجبور کیا کہ جب بیع کر چکے ہو تو اب تم کو رکھنے کا حق نہیں چنانچہ دینا پڑا۔

ایک اور قصہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد دعا کی تھی۔

اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي وَمُحَمَّدًا وَلَا تُشْرِكْ فِي رَحْمَتِنَا اَحَدًا

اے اللہ! مجھ پر رحمت فرمائیے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اور ہماری اس رحمت میں کسی کو شریک نہ کیجئے۔

حضورؐ نے فرمایا۔

لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا ——— !

کہ تو نے ایک وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔

اس کے بعد وہ نماز کی جگہ سے اٹھے اور مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگے صحابہؓ نے روکا اور منع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اب اس کا پیشاب نہ روکو۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ سبحان اللہ! کیسی حکمت کی بات ہے کہ اب اُس کو پریشان کرنے میں ایک تو اس کے جسمانی ضرر کا اندیشہ ہے۔ دوسرے اگر وہ بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں تک مسجد کو ناپاک کرے گا۔ ایسے وقت پر سب پہلوؤں کا پیش نظر رہنا بڑا ضروری ہے پھر حضورؐ نے حکم دیا کہ پیشاب کی جگہ ایک ڈول پانی کا بہا دو۔ اس کے بعد اعرابی کو بلا کر بہت نرمی اور شفقت سے سمجھا دیا کہ مسجد نماز اور ذکر اللہ کے لئے موضوع ہے اس میں پیشاب

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

تو اے صاحبو! باوجودیکہ ہر طرح سے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے پھر بھی ہم اس مسئلہ میں عملاً و حالاً کچے ہیں۔ اسی کو حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھو عملاً بھی استحضاراً بھی۔ اور اس کو ہر وقت یاد رکھو تاکہ درجۂ حال حاصل ہو جائے۔ اعتقاد میں جو شخص پختہ ہو گا اور رسوخ حال کرے گا اس کو اعمال صالحہ کی زیادہ توفیق ہو گی۔ کیونکہ اصل مرض دنیا سے جی لگانا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ فنائے دنیا کو سوچتا رہے۔ اور دوسری اشیاء کے فناء کے استحضار میں اگر تکلیف ہو مگر اپنی موت کا استحضار تو کچھ مشکل نہیں۔ چاند سورج کے فنا کو کہاں تک سوچو گے۔ تم اپنی موت کو سوچا کرو۔ اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ یعنے الموت۔

طریق عمل علاج

پس علاج کا حاصل یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت مقرر کر کے اس بات کو سوچ لیا کرو کہ اے نفس! ایک دن تو مرے گا اور دنیا سے تجھ کو جانا پڑے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اسی مضمون کے مناسب ایک قطعہ پڑھے دیتا ہوں۔ شاید اس کا مضمون معین استحضار ہو سکے

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی!
اس طرف آوازِ طبل اُدھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا رہے گلگلوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

جن کے واقعہ وفات پر یہ بیان ہوا ہے اور اُن کے اعزہ و پسماندگان کو صبر جمیل اور تیاریٔ آخرت کی توفیق ہو۔ آمین!

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ہ

○

بچّہ جب ماں کے پیٹ کے اندر ہوتا ہے تو اسی کو دنیا سمجھتا ہے۔ جب باہر آتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ میں تو بڑی تنگ و تاریک جگہ میں مقید تھا۔ اصل دنیا تو یہ ہے۔ یہی حالت اس عالم کی ہے۔ جب انسان اس دنیا سے اُس دنیا میں پہنچے گا تو یہی محسوس کرے گا۔ یہاں سے وہاں جانے والا مرتا نہیں۔ فی الواقعہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہوتا ہے۔ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم میں چلا جاتا ہے۔ اگر آپ اس علم کو دیکھ لیں تو آپ مرنے والے پر کبھی نہ روئیں گے بلکہ اپنے یہاں رہنے پر روئیں گے۔

○

اعلانِ فنا کی ضرورت

"جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والی ہے اور جو چیز اللہ تعالےٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض اُن کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔"

یہ وہی آیت ہے جس کا جزوِ اوّل یعنی ما عندکم ینفد کل بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا جزو ما عند اللہ باق "یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے" باقی تھا۔ اس کے بیان کرنے کا اس وقت قصد ہے۔ اس آیت میں دو باتوں کی اطلاع ہے۔ ایک یہ کہ جو چیز تمہارے پاس ہے ختم ہونے والی ہے اور دوسرے یہ کہ جو چیز حق تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے۔ کل اوّل حصہ کا ذکر کیا گیا تھا اس کا مکرر بیان کرنا ضروری نہیں اور نیز یہ بات بھی ہے کہ اس کا کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا۔ رہا یہ شبہ کہ جب اس قدر ظاہر بات تھی تو اس کی کیوں خبر دی۔ بات یہ ہے کہ مقصود حق تعالےٰ کا یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی سب چیزیں دل سے اتر جائیں اور دل سے اتارنے کا طریقہ معتاد یہی ہے کہ اس شے کا کوئی عیب بیان کر دیا جاوے لیکن جو شے محبوب ہوا کرتی ہے اس کا جو بھی عیب بیان کیا جاوے محب اس کی تاویل کر دے گا اور محبت زائل نہ ہوگی جیسا متنبی کہتا ہے ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ

وہوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

"یعنی ملامت گروں کی ملامت تو دل کے چاروں طرف رہتی ہے ، اور دوستوں کی محبت سودائے قلب میں ہے۔"

پس اگر حق تعالیٰ دنیا و مافیہا کے عیوب بیان فرماتے تو محبینِ دنیا اس میں ضرور گفتگو کرتے اور دنیا دل سے نہ اترتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمام عیوب میں سے

ایسا عیب بیان فرمایا کہ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اے محبین دنیا! ہم نے مانا کہ دنیا حسین بھی ہے۔ ہر طرح کی اس میں راحت بھی ہے۔ سب سبز ہیں۔ لیکن ایک عیب ایسا ہے کہ اس نے ان سب خوبیوں کو خاک میں ملا دیا۔ وہ یہ ہے کہ ختم ہو جانے والی ہے۔ ایک وجہ تو اس خبر نفاد کی یہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سوا دوسرا عیب بیان کیا جاتا تو اس کا ہر شے میں مشترک ہونا ضروری نہ تھا بلکہ کسی شے میں کوئی عیب پایا جاتا کسی میں کوئی۔ ہر شے کے دل سے اتارنے کے لئے ایک مستقل عنوان تلاش کرنا پڑتا۔ مثلاً کسی شے کے لئے کہا جاتا کہ حسین نہیں ہے۔ کسی شے کی نسبت کہا جاتا کہ یہ نقصان کرتی ہے، وغیرہ ذلک۔ نیز بعض عیوب ان میں نظری ہوتے اور بعض بدیہی۔ پھر نظری محل کلام ہوتا تو باوجود عنوانات کثیر اور کلام کے طویل الذیل ہو جانے کے بھی احاطہ نہ ہوتا اور نہ مفید و مسکت[1] اس قدر ہوتا۔ اس لئے یہ صفت ایسی بیان فرمائی کہ مشترک بھی اور بدیہی بھی اور دل سے اتارنے میں پوری مؤثر۔ سبحان اللہ! کیا جامع اور موجز کلام ہے۔ غرض باوجود اس صفت کے مسلّم ہونے کے صرف دنیا کی محبت دل سے نکالنے کے لئے اس کی تصریح فرمائی۔

یہاں ممکن ہے کہ کوئی دہری یہ کہے کہ سما اور ارض تو فنا ہونے والے نہیں۔ اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ دلائل عقلیہ سے ان کا حدوث ثابت ہو چکا ہے۔ ثانیاً یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام میں ہمارے امراض کا علاج فرمایا ہے یعنی جن چیزوں سے ہم کو حبی تعلق ہے اُن چیزوں کی مذمت سے اس تعلق حبی کو زائل فرمایا ہے اور سما و ارض سے ہمارا تعلق حبی نہیں۔

عبادت کرنے کی فطری دلیل

اگرچہ فی نفسہٖ بہت تعلق ہے کہ ہم اپنی بقا میں زمین و آسمان وغیرہ سب اشیائ کے

---

[1] خاموش کرنے والا۔

محتاج ہیں اور زمین و آسمان ہمارے محتاج نہیں۔ اگر آدمی نہ ہوتا تو کسی شے میں کچھ نقصان نہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے کہ آدمی نہیں تھا اور آسمان و زمین، شجر و حجر و دیگر حیوانات سب کچھ تھے۔ چنانچہ جو کسی مذہب کے پابند نہیں وہ بھی اور جو مذہب کے متبع ہیں وہ بھی سب اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ انسان ہو اور کوئی شے عالم میں سے نہ ہو۔ اور تمام عالم تو علیحدہ رہا اگر ایک شے بھی کم ہو جاوے تو زندگی وبال ہو جاوے گی پس سب اشیاء کام کی ہیں اور انسان کسی کام کا نظر نہیں آتا۔ یعنی انسان نہ ہو تو کسی شے میں خلل نہیں پڑتا اور اگر ان اشیاء میں سے ایک شے بھی نہ ہو تو انسان یا تو ہلاک یا کالہلاک[1] ہو جائے گا۔ اور نیز دیکھا جاتا ہے کہ ماتحت اور انسان کے اور مخلوق آپس میں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ یعنی ہر ایک محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ مگر یہ انسان صاحب محتاج الیہ نہیں محتاج ہی ہیں۔ جب یہ ہے تو تمام کائنات کے خلق کی اغراض سمجھ میں آتی ہیں۔ مگر بشر کی کوئی علت غائی مفہوم نہیں ہوئی کہ یہ کس مصرف کا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کی تخلیق (نعوذ باللہ) عبث نہیں اور مخلوق کے کام کا ہے نہیں پس لامحالہ خالق کے کام کا ہے اور خالق کے کام کا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالےٰ کا کوئی کام کرے۔ اللہ تعالیٰ تو سب سے غنی ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لئے بنایا ہے کہ مخلوق کا مخدوم اور ہمارا خادم ہو۔ افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے ایسا قلب موضوع کیا ہے کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کے خادم ہو گئے۔ چنانچہ کوئی مال کا خادم ہے کوئی اولاد کا۔ کوئی عمارت کا، کوئی باغ کا، کوئی بیلوں کا۔ اور اس کا نام رکھا ہے کھانا کمانا۔ ہاں ایک معنی کہ کمانا ہے جیسے بھنگی کماتا ہے اسی طرح ہم کماتے ہیں، گویا بھنگی ہو گئے حق تعالےٰ نے اس کو وزارت عطا فرمائی تھی، اپنا نائب بنایا تھا۔ اس نے اس سے اعراض کیا اور سائیسی اختیار کی کتنی بدقسمتی کی بات ہے! یہ ساری دنیا کا مخدوم ہوتا اس نے خود ہی ہر شے کی خدمت میں لیتے

---

[1] مثل ہلاک۔ [2] سواتے ص ۱۲

اوقات ضائع کئے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان خدا کے لئے پیدا ہوا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کے نفع کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کی خدمت و عبادت کر کے خود منتفع ہو۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود سابق یہ ہے کہ گو بقا میں سب کا محتاج ہو مگر اس کو آسمان و زمین سے خاص کوئی ایسی محبت نہیں جیسے دوسری استعمالی چیزوں سے اور ان چیزوں کا فانی ہونا ظاہر ہے۔ پس اگر آسمان و زمین کا فنا اس آیت میں مذکور نہ بھی ہو تو آیت کے اصل مقصود میں کوئی خلل نہیں آتا اور عجب نہیں کہ عندکم یعنی تمہارے پاس چیزیں سے مراد یہی ہماری محبوب چیزیں ہوں۔ غرضیکہ قرآن شریف ایک طبِّ روحانی ہے اور طب میں مرض و صحت کی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ پس جن چیزوں سے ہمارا تعلق ہے اُن کا فنا ہونا مشاہد ہے اس لئے ینفد "ختم ہو جائے گی" میں یہی اشیا داخل ہوں گی اور زمین و آسمان سے کچھ بحث نہ ہوگی پس اگر آسمان و زمین قدیم بھی ہوتے تو ہمارے مدعائے مقام کو مضر نہ تھا لیکن دوسرے دلائل سے ان کا حدوث و فنا بھی ثابت ہے۔ انسان کی دلچسپی گھر سے، جائداد سے، اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے اس لئے یہی چیزیں مراد لی جاویں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے ان اشیاء کی ایک ہی جگہ فہرست بھی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جہاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ و اللہ لا یہدی القوم الفاسقین۔

"یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! آپ فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ دادے اور تمہارے بیٹے پوتے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور جو مال تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو۔ یہ چیزیں تم کو اللہ و

رسول سے اور اس کے راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نا فرمانوں کو ہدایت نہیں دیتے۔"

اور دوسرے مقام پر بعض اشیاء کے لئے ارشاد ہے :-

اتبنون بکل ریع آیۃ تعبثون وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون - " یعنی کیا تم بناتے ہو ہر اونچی جگہ پر ایک نشان کہ کھیلتے ہو اور تیار کرتے ہو مضبوط محل شاید تم ہمیشہ رہو گے"

واقعی آدمی ایسے مکانات بناتا ہے اور ان کو ایسا مستحکم کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے یہاں ہی رہے گا، اور ہنسی خوشی رہتے ہیں کبھی اس کا خیال بھی تو نہیں آتا کہ یہاں سے جانا ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا ہے ؎

الا یا ساکن القصر المعلی | ستدفن عن قریب فی التراب
له ملک ینادی کل یوم | لدوا للموت وابنوا للخراب
تنیل عمرنا دائما ودنیا | ومرجعنا الی بیت التراب

"یعنی آگاہ رہ اے بلند محل کے رہنے والے کہ تو عنقریب مٹی میں دفن کیا جائیگا۔ اس کے لئے ایک فرشتہ ہے جو ہر دن منادی کرتا ہے کہ مرنے کے لئے جنے رہو اور ویران ہونے کے لئے مکان بناتے رہو۔ ہماری عمر دنیا میں بہت تھوڑی ہے اور ہم سب کا مرجع مٹی کا گھر ہے۔"

مولود کے کان میں اذان کہنے کا نکتہ

بعض اہل لطائف نے لکھا ہے کہ مولود کے کان میں جو اذان کہی جاتی ہے اس میں ایک نکتہ ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اس کو کہہ رہے ہیں کہ اذان تکبیر ہو گئی ہے، اب جنازہ کی نماز کے منتظر رہو۔ اور یہ بھی حکمت ہے کہ اذان و تکبیر میں اللہ کا نام ہے تو شروع ہی سے اس کے کان میں اللہ کا نام اس لئے لیا جاتا ہے تاکہ استعداد ایمان کی قوی ہو جائے اور شیطان اس سے دور ہو جائے اور دونوں حکمتوں میں گویا اشارہ ہے اس

گا، دُور ہو جاؤ۔ یہ لفظ کہتے ہی لٹھ کو حرکت ہوئی اور سر پر سے تیل کا گھڑا گر پڑا اور تمام تیل ضائع ہوگیا۔ وہ شخص ملامت کرنے لگا تو آپ کہتے ہیں، بندۂ خدا! تمھارا تو ایک گھڑا ہی تیل کا ضائع ہوا اور میرا تو کنبہ کا کنبہ جاتا رہا۔

ہم کو شیخ چلّی کے خیالات باطلہ پر ہنسی آتی ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ہم میں ہر ایک شیخ چلّی ہے۔ رات دن ہوس کیا کرتے ہیں کہ کیسا اچھا ہو کہ ہماری شادی ہو جاوے۔ شادی بھی ہوگئی تو اب ہوس ہے اولاد ہو جاوے۔ اولاد ہوگئی تو اولاد کی اولاد کی تمنا ہوتی ہے۔ اسی میں موت آجاتی ہے اور تمنا باقی رہتی ہے ۔

وما قضی احد منھالبانتہ لا ینتھی ارب الا الی ارب

دین داروں کی خُود فریبی

یہ تو اُن کا حال ہے جن کو دین کی کچھ پروا نہیں اور جو دین دار کہلاتے ہیں اور جن کو آخرت کی کچھ فکر ہے وہ اس وعدہ میں ہیں کہ فلاں کام کرلیں اس کے بعد سب ترک کر کے اللہ اللہ کریں گے ۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم بازچوں فردا شود امروز را فردا کنم

"ہر رات ہم یہی کہتے ہیں کہ کل کو یہ خیال ترک کردیں گے اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جائیں گے۔ پھر کل آتی ہے تو یہی کہتے ہیں کہ کل ترک کردیں گے۔ اسی طرح ساری عمر ختم ہو جاتی ہے۔"

جب موت آجاتی ہے تو وہ حالت ہوتی ہے جس کی حکایت خود اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :

لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصلحین ۔

"یعنی جب موت آوےگی تو کہے گا اے میرے رب! تھوڑی سی مدّت کے واسطے مجھ کو مہلت مل جاتی تو میں خیرات کرلیتا اور نیک کاروں میں سے ہوتا۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

[illegible]

ایک اشکال عدم پریشانی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ ہے کہ گمان موت سے پریشانی نہیں ہوتی ۔ تو جو اللہ تعالیٰ کے پاس رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ بزرگوں نے تو مرنے پر نذریں مانی ہیں ؎

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

"میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ (موت) کا دن نصیب ہو جائے تو محبوب کے دربار میں خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں گا۔"

موت کے متمنّی

بعض بزرگوں نے اپنے جنازہ کے ساتھ اشعار پڑھوائے ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھا جائے ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بر دست و بر بازوئے تو

"آپ کے دربار میں ہم مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کا صدقہ کچھ عنایت کیجئے۔ ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے۔ آپ کے دست بازو پر آفریں صد آفریں ہے۔"

اور ظاہر ہے کہ یہ باتیں بڑے اطمینان اور فرصت کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرنے کو حیات پر ترجیح دیتے تھے۔ اس سے بڑھ کر لیجیے کہ بعض بزرگوں کو مرنے کے بعد اس پر وجد ہوا ہے۔ چنانچہ جب حضرت سلطان الاولیا سلطان نظام الدین قدس سرہٗ کی وفات ہوئی ہے تو ان کے ایک خلیفہ نے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھے ؎

سرو سیمینا بصحرا میروی سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

"اے محبوب آپ جنگل کی طرف تشریف لیجا رہے ہیں۔ سخت بے مہری ہے کہ آپ ہم کو چھوڑ کر تنہا جا رہے ہیں۔ اے محبوب! آپ کا رخ انور جہان کا تماشا گاہ ہے۔ آپ تماشا کے لئے کہاں جا رہے ہیں۔"

لکھا ہے کہ کفن سے ہاتھ اونچا ہو گیا۔ لوگوں نے انکو خاموش کر دیا۔ آخر ان کے اندر

کیا خوب سمائی تھی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

"یعنی جس کو عشقِ حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہو گئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذّتِ قرب اس کو کامل درجہ کی حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیئے۔"

جس کو تم سمجھتے ہو کہ مر گیا وہ واقع میں جی گیا: بل احیاء عند ربھم۔ "بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں" مرنے کی مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا۔ جب بچہ ماں کے پیٹ کے اندر ہوتا ہے تو اسی کو عالم سمجھتا ہے۔ جب باہر آتا ہے تو دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ میں تو بڑی تنگ و تاریک جگہ میں مقید تھا۔ اسی طرح جب مرے گا تو معلوم ہو گا کہ میں واقع میں جیل خانہ میں مقید تھا۔ عالم تو یہ ہے تو مرتا نہیں بلکہ جی جاتا ہے۔ اس عالم سے البتّہ جدا ہو جاتا ہے مگر دوسرے عالم میں چلا جاتا ہے۔ اگر تم اس عالم کو دیکھ لو تو تم مُردہ کے جانے پر کبھی نہ رؤو بلکہ اپنے یہاں رہنے پر رویا کرو۔ البتّہ وہاں جانے کی قابلیّت پیدا کر لو۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو!
ہمہ خنداں بوند تو گریاں

آنچناں زے کہ بعد مردنِ تو
ہمہ گریاں بوند تو خنداں

"یعنی تمہارے پیدا ہونے کے وقت سب ہنستے تھے اور تم روتے تھے اب تم ایسی زندگی بسر کرو کہ مرنے کے وقت سب روویں اور تم ہنسو کہ الحمد للہ ایک جیل خانہ سے چھوٹ آیا۔ جیل خانہ سے جو چھوٹتا ہے وہ تو خوش ہوتا ہی ہے۔"

دنیا کا جیل خانہ

اور دنیا فی الواقع جیل خانہ ہے جیسا حدیث میں سجن (جیل خانہ) آیا ہے اور اس کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد ہرگز بھی قابلِ التفات نہیں ؎

حال دُنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ   گفت یا خوابے ست یا بادے ست یا افسانۂ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل در وے ببست   گفت یا غولے یا دیوے ست یا دیوانۂ

"ایک عاقل سے دنیا کی حالت کے متعلق میں نے سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ دنیا ایک خواب ہے یا ایک ہوا ہے یا ایک افسانہ ہے۔ پھر میں نے اس شخص کے متعلق دریافت کیا کہ جس نے اس دنیا میں دل لگایا تو اس نے جواب دیا کہ وہ یا تو غول ہے یا دیو ہے یا پاگل ہے"۔

جب یہ ایسی شئے ہے تو یہاں سے تو جانے کی فکر ہونا چاہیے نہ کہ رہنے کی خصوصاً اگر کوئی مرے تو زیادہ عبرت ہونا چاہیے۔ دنیا کی مثال ریل کی سی ہے کہ سوار ہوتے ہیں اترتے ہیں، آج وہ پیدا ہوا کل وہ مرا۔ دم بدم گھنٹی بجانے کے لئے بجتی ہے ؂

مرا در منزلِ جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم   جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

"مجھ کو منزلِ جاناں میں کیا عیش و آرام کہ جب جرس شور مچاتا ہے کہ محملوں کو باندھو۔ یعنی مجھ کو دنیا کی مستعار زندگی میں کیا راحت مل سکتی ہے جب کہ تقاضائے موت کسی وقت کسی جگہ چین نہیں لینے دیتا اور وہ گھنٹیاں یہی ہیں، اپنے دوستوں کا اپنے رشتہ داروں کا مرنا۔ مگر ہم ایسے خوابِ غفلت میں سو رہے ہیں کہ کچھ عبرت ہی نہیں ہوتی۔"

غفلت کا علاج

حق تعالیٰ نے اس آیت میں بہت مختصر لفظوں میں اس غفلت کا علاج بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوچا کرو کہ دُنیا فانی ہے۔ جی لگانے کے قابل نہیں اور آخرت باقی ہے۔ اور اپنی نافرمانیاں اور حساب و کتاب، قبر سے اٹھنا یہ سب باتیں سوچا کرو۔ جہاں چوبیس گھنٹے دنیا کے کام کرتے ہو پانچ منٹ اس کام کے لئے بھی مقرر کر لو۔ انشاء اللہ تعالےٰ اس مراقبہ سے سب آثار جو پہلے بیان ہوئے پیدا ہوں گے۔ آگے فرماتے ہیں:

ولنجزین الذین صبروا اجرہم باحسن ما کانوا یعملون

"یعنی ہم ضرور جزا دیں گے ان کو جو صبر کرتے ہیں ......" صبر کے معنی ثابت قدم کے ہیں۔ ہم میں اس کی بھی کمی ہے۔ ایک وقت نیک عمل دوسرے وقت ندارد۔

ثبات نہیں ہے ۔ آگے فرماتے ہیں بسبب اُن کے اچھے عمل کے ۔ معلوم ہوا کہ وما عند اللہ باق ______ "جو چیز اللہ تعالےٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے" کی تحصیل کا طریقہ نیک عمل ہے ۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور مکرر بطور خلاصہ کے بیان کرتا ہوں کہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے کا جیسا اعتقاد ہے اس کا دھیان کیا کرو تاکہ یہ اعتقاد حال بن جاوے ۔

اب دعا کیجیے کہ اللہ تعالےٰ توفیق عطا فرماوے ۔ آمین !

اَلدُّنیا وَالآخِرۃ

دُنیا و آخرت

اثباتِ معاد کے متعلق یہ وعظ ۱۸ شعبان سنہ ۱۳۴۲ھ کو مسجدِ شاہ گُل قصاب پورہ دہلی میں منبر پر بیٹھ کر زائد از ایک ہزار کے مجمع کو سنایا گیا جس پر ۳ گھنٹے اور ۵۲ منٹ لگے۔ اسے ادریس میرٹھی متعلّم دار العلوم دیوبند نے قلم بند کیا

قرآن کریم خداوند کریم کو دکھلانے والا آئینہ اور رب العزت تک پہنچانے والا زینہ ہے کہ اس کی شاہراہ پر پڑ کر انسان کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فی الحقیقت قرآن شریف تجلیاتِ خداوندی میں سے ایک تجلی ہے۔ جو شخص تجلّی حق کو رہنما بنائے گا، وہ اس تجلّی کے مبدا یعنی خداوند حقیقی تک کیسے نہ پہنچے گا ——————— !

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان محمدا عبدہٗ ورسولہٗ۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَّاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

مسئلہ معاد

اس آیت سے قبل مسئلہ معاد مذکور ہے اور اس سے قبل مسئلہ نبوت اور اس سے قبل مسئلہ توحید ہے۔ غرض یہ تینوں مضمون قریب قریب بترتیب مذکور ہیں اور یہ ہر سہ مسائل جمیع مسائلِ قرآنیہ میں امہات المسائل شمار کئے جاتے ہیں۔ باقی جمیع مسائل ان کے لئے متمم ہیں یا توطیہ وتمہید ہیں اور یہ اصل اصول۔ مگر باوجود اس کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیگر مسائلِ قرآنیہ غیر مہتم بالشان اور غیر ضروری ہیں بلکہ قرآن حکیم کا ہر ہر مسئلہ ضروری اور مہتم بالشان ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہر سہ مسائل مرجع ومآل جمیع مسائل ہیں لہٰذا جزوی فضیلت واہتمام شان بہ نسبت جمیع مسائل کے ان کے واسطے زیادہ ثابت کی گئی۔

پرسوں دہلی مدرسہ عبدالرب کے وعظ میں مسئلہ توحید پر بیان ہوا تھا۔ بفضلہ اس پر بقدر ضرورت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اور کل پانی پت میں مسئلہ نبوت کا بھی کافی بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا آج اس وعظ میں مسئلہ معاد کو بیان کرنا زیادہ اولیٰ وانسب معلوم ہوتا ہے تاکہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے ہر سہ مسائل کو ایک سلسلہ میں مترتباً بیان کیا ہے اسی طرح اس سفر میں ان تینوں مسئلوں پر بترتیبِ قرآنی بیان ہو جائے۔

اور یہ آیت درحقیقت تمام مضمون معاد مذکور الصدر کا خلاصہ ہے تو اوّل تو یہ تینوں مضامین جمیع مسائلِ قرآنیہ میں اہم ہیں۔ لہٰذا اہمیت مسئلہ معاد کے لئے ویسے ہی ثابت تھی۔ علاوہ ازیں یہ آیت خلاصہ ہے مسئلہ معاد کا اور خلاصہ کسی مضمون کا چونکہ اصل اور نچوڑ ہوتا ہے لہٰذا بہت ضروری شمار کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خلاصہ کو روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو اوّل تو خود مضمون معاد مثل اپنے دو قرین کے روح جمیع مسائل اور ضروری اور پھر اس کا خلاصہ! وہ تو اور بھی زیادہ ضروری اور روح الروح ہو گا۔ لہٰذا اہمیت اس کی کافی طور سے واضح ہو گئی۔ سامعین کو

چاہیے کہ وہ اس اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت غور ویکسوئی کے ساتھ اس مضمون کو سنیں اور اس پر کاربند ہوں۔

یہ مضمون اگرچہ بالکل بدیہی اور واضح ہے کسی قسم کی دقت ونظریت اس میں نہیں۔ لہٰذا محتاج بیان بھی نہ تھا لیکن چونکہ آج کل اس مضمون سے لوگ بالکل غافل ہو گئے ہیں اور اس کو بھلا بیٹھے ہیں اس لئے متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جیسا کہ عام طور سے قاعدہ ہے کہ بدیہی امر محتاجِ دلیل تو کبھی بھی نہیں ہوتا ہاں تغافل کے وقت تنبیہ کی ضرورت پیش آجایا کرتی ہے جیسے کوئی شخص بینا ہو مگر روزِ روشن میں کام اندھوں کے سے کرے تو اس سے کہتے ہیں کہ میاں دن نکل رہا ہے یا سورج نکل رہا ہے۔ حالانکہ وہ مخاطب بھی اور تمام اہلِ دنیا یہ جانتے ہیں کہ سورج نکل رہا ہے اور روزِ روشن ہے تو چاہیے کہ اس کا یہ کہنا عبث ولغو ہوتا حالانکہ کوئی اس کو لغو نہیں کہتا۔ اس وجہ سے کہ اس تخاطب سے مقصود طلوع کی خبر دینا نہیں۔ اس وجہ سے کہ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

بلکہ مقصود یہ ہے کہ تم کو جو کام طلوعِ آفتاب کی حالت میں کرنا چاہیے تھا تم وہ نہیں کرتے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ تمہارے نزدیک بوجہ عدمِ استفادہ کے طلوعِ شمس نہیں ہوا۔ لہٰذا میں تم کو تنبیہ کرتا ہوں کہ ہوش میں آ کر کام کرو۔

یا جیسے کوئی شخص کسی ایسے شخص سے کہے جو کہ اپنے باپ کے ساتھ گستاخی و بے ادبی سے پیش آتا ہے کہ میاں یہ تیرا باپ ہے۔ تو کیا اس سے مقصود ابوۃ کی خبر دینا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس وجہ سے کہ ابوۃ کا علم مخاطب کو قائل سے زائد ہے۔ قائل کو تو ابوۃ کا علم ابھی دو چار برس سے ہوا ہوگا اور مخاطب نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ابّا ابّا کہہ کر پیسہ مانگتا ہے۔ تو اگر یہ مقصود ہوتا تو اہلِ دنیا اس کو بے وقوف کے نام سے یاد کرتے۔ حالانکہ کوئی بھی اس کو بے وقوف نہیں کہتا۔ معلوم ہوا کہ یہ مقصود ہے ہی نہیں بلکہ اس کی غرض محض تنبیہ ہے اس امر پر کہ یہ تیرا باپ ہے۔ تجھ کو چاہیے کہ حقوقِ ابوۃ کا لحاظ رکھو اور عظمتِ پدری کو مدِّ نظر رکھو۔ یہ تیرا موجودہ رویہ شانِ ابوۃ

کے خلاف ہے بلکہ اس طرزِ عمل سے ابہام ہوتا ہے کہ شاید تیرے نزدیک یہ تیرا باپ ہی نہیں ہے کیونکہ یہ طرزِ عمل تو اغیار کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا یہ قول نہایت ضروری بلکہ اس قسم کی تنبیہہ کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے۔

تو دیکھیے! اگرچہ الوۃ اس کی بالکل بدیہی بلکہ حسی اور ظاہر و باہر بھی، محتاجِ بیان ہرگز نہ تھی لیکن پھر اس بیان کو تنبیہہ پر محمول کر کے قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ مضمون بھی گو اجلی بدیہیات سے ہے۔ اس کی بداہت میں کوئی شک و شبہ نہیں مگر محض تغافل کی وجہ سے ضرورت بیان کی پیش آئی۔

فناءِ دنیا و اثباتِ آخرت

اب میں مضمون بیان کرتا ہوں اور یہ مضمون مرکّب ہے دو جزوں سے۔ اوّل تو فناءِ دنیا دوسرا اثباتِ آخرت۔ تو اگرچہ جزوِ اوّل بوجہ مشاہد ہونے کے اتنا صاف اور واضح ہے کہ اصلاً محتاجِ بیان نہیں لیکن دوسرا حصّہ مضمون کا کہ بہ نسبت اس کے غامض و دقیق ہے وہ محتاجِ بیان ہے اور بہ نسبت اس کے اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی زیادہ دقیق نہیں چنانچہ اگر بنظرِ غور و تامل دیکھا جائے تو چونکہ مضمونِ ثانی مثل لازم مضمونِ اوّل کے ہے۔ لہٰذا جب ملزوم بدیہی ہوا اور وہ کافی طور سے واضح ہو گیا تو لازم خود بخود سمجھ میں آجاویگا اور اس کا ماننا ضروری ہو گا۔ درحقیقت مضمون اوّل ہی اضطراراً و فطرتاً علم کرا دیتا ہے مضمونِ ثانی کا اس وجہ سے کہ وہ محسوس ہے اور لازم محسوس خود محسوس ہوتا ہے اور محسوس محتاجِ بیان و وضاحت نہیں۔ باقی رہا کہ جزوِ اوّل مسلّم و محسوس کیوں کر اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام عقلا کا اتفاق ہو چکا ہے فناءِ دنیا پر لہٰذا یہ مسئلہ متفق و مسلّمہ ہو گیا۔

باقی رہا استلزام۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کا اعتقاد فناءِ دنیا کے متعلق راسخ ہو جاوے گا اور اس امر کا یقین کامل ہو جائے گا کہ اس سرائے فانی سے ایک دن کوچ کرنا ہے عنقریب طبل بازگشت بجنے والا ہے۔ تو اس یقین کا لازمی اثر یہ ہے کہ اس

کو دنیا و لواحقات دنیا سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ ہر ہر شے پر نظر واپس ہوگی، متاع دنیا سے رغبت منقطع ہوگی۔ اس وجہ سے کہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اس کو اشیاء فانیہ سے تنفر و انقباض پیدا ہو جاتا ہے۔ طبیعت برداشتہ خاطر ہو جاتی ہے یکسوئی و یکجہتی کی طالب ہوتی ہے۔ روز و شب ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک مسافر شام کے وقت سرائے کے کمرے میں جا کر قیام کرتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ اپنا اسباب اس میں رکھے، قیام کا انتظام کرے، اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ میں اس کوٹھڑی میں صرف رات رات کا مہمان ہوں۔ صبح ہوتے ہی مجھ کو یقیناً کوچ کرنا اور اس کمرے کو چھوڑنا ہے۔ اس سے میری ملاقات صرف چند گھنٹوں کی ہے۔ پھر میں کہاں اور یہ کہاں۔ پھر اگر یہ کوٹھڑی کہیں سے ٹوٹی ہوتی ہے تو اس کی اصلاح کا مطلق خیال نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کڑی نکلی ہوئی ہوتی ہے تو اس کو یہ خیال بھی ہرگز نہیں ہوتا کہ اس میں دوسری کڑی ڈلوانی چاہیے۔ یا کہیں سامانِ زینت میں کمی ہو تو اس کو پورا کرنے کا بھی اہتمام بالکل نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس کو یہاں ایک رات تو ضرور بسر کرنی ہے اور یہیں آرام کرنا ہے۔

اور فطرتِ انسانی کا مقتضا ہے کہ وہ اپنے آرام کے ذرائع کو مہیا کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا موافق اس اقتضاء کے اس کو اصلاح کرانی چاہیے تھی لیکن نہیں کراتا۔ محض اس یقینِ کامل کی وجہ سے جو اس کے قلب میں راسخ ہے کہ صبح کو یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ میرا قیام صرف چند ساعت کا ہے۔ یہ کوٹھڑی عنقریب چھٹنے والی ہے۔

اسی طرح جب انسان کا یہ عقیدہ ثابت و راسخ ہو جائے گا کہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔ اس سے مفارقت و مہاجرت لازمی ہے تو ضرور اس کو دنیا سے تنفر و انقباض پیدا ہوگا جیسا کہ سرائے کی کوٹھڑی سے ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ اپنے مکان کی کوٹھڑی کے ساتھ نہیں۔ اگرچہ سرائے کی کوٹھڑی اور مکان کا کمرہ اس حیثیت سے دونوں برابر ہیں کہ ان دونوں سے ہم کو جدا ہونے کا یقین ہے۔ لیکن باوجود اس کے پھر جو ہم تھوڑا سا فرق دیکھتے ہیں کہ جو معاملہ آپ کا سرائے کی کوٹھڑی کے ساتھ ہے وہ مکان کی کوٹھڑی کے

ساتھ نہیں۔ مکان کے کمرے کی اگر کڑی نکل جاتی ہے تو آپ فوراً اس فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جلد اس میں کڑی ڈلوائی جائے۔ اگر قلعی کم ہوجاتی ہے تو فوراً سفیدی کرانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اسباب زینت کی کمی کے وقت آپ اس کے اہتمام میں مشغول ہوجاتے ہیں تو یہ فرق کیوں ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ خدانخواستہ آپ کو دنیا اور اس کے مکانات کے فنا ہونے کا یقین نہیں۔ بلکہ یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ آپ سرائے کی کوٹھڑی میں داخل ہونے سے قبل اس بات کا یقین کامل رکھتے ہیں کہ صبح کو ضرور اس سے کوچ کرنا ہے اور جتنا زمانہ آپ وہاں پر مقیم رہتے ہیں برابر یہی خیال اور یہی صورتِ مفارقت پیش نظر رہتی ہے۔ بخلاف مکان کے کہ اس کے کمرہ میں نہ داخل ہوتے وقت آپ کو اس سے نکلنے اور جدا ہونے کا خیال مستحضر رہتا ہے اور نہ قیام کے زمانہ میں قوتِ متخیلہ آپ کے سامنے کبھی صورتِ مفارقت پیش کرتی ہے بلکہ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا حالانکہ اس کا یقین و اعتقاد راسخ ہے لیکن صرف استحضار نہیں بخلاف سرائے کے کمرے کے کہ وہاں پر یقین و اعتقاد کے ساتھ استحضار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرائے کا کمرہ توحش و ہیبت ناک معلوم ہوتا ہے۔ اس سے دلچسپی نام کو نہیں ہوتی بخلاف مکان کے کہ وہ مجسّم ذریعۂ دلچسپی ہوتا ہے۔ اس سے طبیعت بہلتی ہے۔ اس کی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں آکر وحشت دور ہوتی ہے۔ اس کی تزئین کی امنگیں طبیعت میں لہریں مارتی ہیں۔ حالانکہ سببِ وحشت یعنی اعتقادِ مفارقت و یقینِ مہاجرت دونوں میں مشترک ہے۔ مابہ الفرق صرف یہ ہے کہ وہاں پر اعتقاد کے ساتھ استحضار بھی ہے اور یہاں پر اعتقاد محض ہے استحضار نہیں۔

نیز ایک مابہ الفرق اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ فنا و مفارقتِ دنیا کا خیال اگر ہوتا بھی ہے تو موجودہ حالت یا حالتِ قریبہ میں نہیں بلکہ زمانہ مستقبل بعید میں ہے۔ بچے گمان کرتے ہیں کہ میاں ابھی تو بچے ہیں۔ ابھی جوان ہوں گے۔ زندگی کے مزے اڑائیں گے پھر کبھی بڈھے ہوں گے۔ پھر کبھی موت آئے گی۔ ایسے ہی جوان خیال کرتے ہیں کہ میاں ابھی تو بوڑھا ہونا باقی ہے۔ ابھی کیا ہے۔ ابھی تو ایک منزل ہم میں اور فنا میں حدِ فاصل ہے۔ ایسے ہی بوڑھے خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو بڑھاپا ہی آیا ہے۔ ابتدائے پیری ہے۔ اس کی انتہا بھی

ہوگی جب کبھی موت آئے گی۔ غرض ہر شخص فنا کو اپنے لئے زمانہ مستقبل بعید میں سمجھتا ہے

چنانچہ میں حج کو جا رہا تھا تو ایک میرے بزرگ نے کہا کہ میاں ابھی تو تم بچے ہو۔ ابھی کیا جلدی ہے۔ کر لینا حج جب ہماری عمر پر آؤ گے۔ اور ایسے ہی جلدی ہے تو آئندہ سال ہم بھی چلیں گے جب ہمارے ساتھ حج کرنے چلنا۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ حضرت آپ کی تو اتنی عمر گزر چکی۔ اگر آپ مجھ کو بھی عمر کا پٹہ لکھ دیں کہ تیری عمر بھی ہماری برابر ضرور ہوگی تو میں بے شک اس وقت کا جانا موقوف کروں اور آپ کے ساتھ ہی جاؤں۔ تو واقعی بات یہ ہے کہ ان کی عمر تو اتنی ہو گئی نہ معلوم ہماری عمر اتنی ہو یا نہ ہو۔ ہمارے پاس کون سا امر موجب یقین ہے کہ ہم ان کی عمر تک ضرور زندہ رہیں گے جو ہم اُن کے کہنے کو قبول کر لیں۔

میرے سامنے ایک واقعہ ہوا کہ ایک جوان شخص کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی جو کہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو بوڑھے بولے کہ دیکھیے! نہ معلوم اب آپ سے ملاقات نصیب ہو یا نہ ہو۔ ہم تو عمر طبعی کو پہنچ چکے ہیں چراغ سحری ہیں۔ ہر وقت منتظر موت ہیں۔ تو اس جوان نے کہا کہ آپ تو چراغ سحری ہیں کچھ عمر تو باقی ہے۔ لیکن ہم چراغ شام ہی ہیں۔ ابھی روشن ہوئے ہیں بلکہ اچھی طرح ابھی روشن بھی نہیں ہونے پائے۔ اگر ابھی ایک ہلکا بھی ہوا کا جھونکا لگ گیا تو گل، بخلاف آپ کے کہ آپ چراغِ سحری ہیں۔ آپ پر رات تو سلامتی کے ساتھ گزر گئی ہے اب صبح ہی کو احتمال گل ہونے کا ہے۔ اور ہمیں تو رات کے بھی صحیح و سالم گزر جانے میں شک ہے۔ لہٰذا ہماری حالت آپ سے زیادہ قابلِ یاس ہے۔ اور یاس ملاقات میں ہم آپ سے اوّل نمبر پر ہیں۔ لہٰذا اس حسرت ملاقات کی آپ سے کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ہم اور آپ دونوں اس میں شریک ہیں۔

ماشاء اللہ! کتنا لطیف جواب دیا ہے اور واقعی بالکل صحیح بلا مبالغہ کہا کہ ہم تو چراغ شام ہیں۔ ایک خفیف جھونکا ہوا کا ہمارے نیست و نابود کرنے کے واسطے کافی ہے۔ یہ بالکل نیا محاورہ ہے اور قابل داد جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بوڑھے اور جوان سب کے سب چراغ ہی کے مثل ہیں مگر کوئی چراغ شام ہے اور کوئی چراغ سحر خطرہ

سے کوئی بھی خالی نہیں۔

غرض جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو بچے ہیں، پھر جوان ہونگے، پھر بوڑھے ہوں گے، پھر بہت بوڑھے ہوں گے۔ تو حضرت یہ بتلایئے کہ آپ کے پاس وہ کون سا اللہ میاں کے یہاں کا سرٹیفکیٹ ہے کہ جس سے آپ کو اپنے جوان اور بوڑھے ہونے کا یقین ہوگیا یا کوئی وحی آپ کے پاس نازل ہوئی کہ جس نے آپ کو اس تحدی سے دعویٰ کرنے پر مجبور کیا؟ کیا خبر ہے کہ شاید یہ ساعت وہی ساعت ہو جس کو دنیا کی آخری ساعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاید یہی نفس نفس واپسیں ہو۔ اور شاید ابھی آب وہوا دنیا کی منقطع ہونے والی ہے۔ حیات دنیوی اجلِ مقدر پر پہنچ چکی ہو۔

عدم استحضار فنائے دنیا

غرض یہ کہ اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا روشن دلیل ہے عدم استحضار فنا، دنیا کی۔ گو ہم کو فنا ہونے کا عقیدہ تو ہے لیکن اس وقت کا استحضار نہیں، اور اگر ہے بھی تو زمانۂ مستقبل بعید میں ہے لیکن اعتقاد و یقین سب کو ہے حالانکہ مقصود شریعت کا جیسا کہ آیت بھی بدلالتِ واضح بتلا رہی ہے، یہی استحضار ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی استحضار کی تحصیل کا علاج بتلایا ہے کہ:

کن فی الدنیا کانک غریب

"یعنی دنیا میں اس طرح رہو جیسا کہ ایک مسافر" اور اس کی حیاتِ دنیوی کو ایسا سمجھو کہ ایک مسافر کی حالت سفر میں ہوتی ہے جس طرح کہ ایک مسافر اپنے سفر کی حالت میں پڑاؤ پر یا سرائے کی کوٹھڑی میں ہر وقت رخت بر دوش بسر اوقات کرتا ہے اسی طرح تم بھی دنیا میں رہ کر بسر اوقات کرو۔ دنیا کو سفرِ آخرت کی سرائے اور پڑاؤ سمجھو کہ جیسا اس کا قیام مطلوب نہیں ہوتا ایسے دنیا کا قیام بھی مقصود نہ ہونا چاہیے۔ اور آپ کے اس کلام رحمت التیام میں تو یہ اس لئے کہ ہم کو خطاب فرمایا ہے پھر کسی قدر ہمارے مذاق کی رعایت ہے اس وجہ سے کہ اس میں لفظ غریب سے پھر بھی ایک قسم کا قیام فی الدنیا مفہوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ایسا

وہ حرکت کرتے کرتے ایک ایسی آخری ساعت پر پہنچ جائے گا کہ جس کے بعد ہم آخرت میں ہوں گے نہ کسی سیڑھی کے ذریعہ سے نہ کسی زینہ کے واسطہ سے بلکہ حرکت زمانی کے ذریعہ سے جو کہ ہمارے اختیار سے باہر ہے کیونکہ ہم حرکتِ زمانہ کے بڑھانے اور گھٹانے پر قادر نہیں چہ جائیکہ روکنے پر۔

اگر آپ یہ چاہیں کہ ہم آٹھ ہی کے گھنٹہ میں رہیں اور نو کے گھنٹہ میں داخل نہ ہوں تو چاہے سر سے پاؤں تک زور کیوں نہ لگائیں۔ ناممکن ہے کہ آپ نو کے گھنٹہ میں داخل نہ ہوں بلکہ آپ ضرور داخل ہوں گے اور اضطراراً داخل ہوں گے۔ حرکتِ زمانہ آپ کو مجبور کرتی ہے ورنہ اگر کوئی سیڑھی آخرت میں پہنچنے کی ہوتی تو ممکن تھا کہ ہم نہ چڑھتے مگر وہ تو اللہ میاں نے سیڑھی ہی ایسی عجیب بنائی ہے جو کہ اختیار سے بالکل باہر اور غیر محسوس ہے۔

لہٰذا حرکت زمانی ضرور متحقق ہے اور انتفاع احدالحرکتین مستلزم انتفاء ثانی کو نہیں تو جو لازم قطع مسافت تھا یعنی حرکت مطلقہ وہ موجود ہے اور جو منتفی ہے یعنی حرکت مکانی وہ لازم نہیں۔ اس وجہ سے کہ حرکت مطلقہ کا تحقق کسی ایک فرد سے ہو سکتا ہے جو یہاں فرد ثانی یعنی حرکتِ زمانی کے ضمن میں ہے۔ لہٰذا حضورؐ کا یہ فرمانا کہ ہماری مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر سفر کو قطع کر رہا ہو، بالکل صحیح ہو گیا۔ یقیناً ہماری مثال ایک راہرو مسافر کی سی ہے جو اپنے سفر کو قطع کر رہا ہے۔ یہی حرکت زمانی ہے جو بوجہ خارج از اختیار و کسب ہونے کے سبب تغافل بنتی ہے کہ ہمیں اپنی حالت کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس ساعت سے قبل ہماری کیا حالت تھی اور اب کیا ہے اور اس ساعت کے گزر جانے سے کس قدر حصہ ہمارے اس دنیوی حیات کا ختم ہو گیا۔

اسی وجہ سے محققین نے کہا ہے کہ بچہ جس وقت پیدا ہو کر ایک ماہ کا ہوتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے کہ میرا بچہ ایک ماہ کا ہو گیا لیکن درحقیقت وہ سمجھتی نہیں کہ اس کی عمر سے ایک مہینہ کم ہو گیا جس ساعت سے اس نے دنیا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس کی عمر سے ہر ہر ساعت محسوب ہونے لگی ہے اور اسی قدر حصہ عمر گھٹنے لگتا ہے جیسے برف ہوتی ہے کہ اس کو جس قدر رکھا جائے اسی قدر وہ برابر گھلتی رہتی ہے حتیٰ کہ آخر ایک ساعت ایسی آئے گی کہ برف گھل کر بالکل ختم ہو جائے گی۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کسی گاؤں کے رہنے والے ملازمت کی غرض سے وطن سے باہر گئے اور کسی جگہ جا کر ملازمت کی۔ چند ماہ بعد ملازمت سے رخصت لے کر جب گھر کو جانے لگے تو جہاں اور فرمائشیں اور عمدہ عمدہ چیزیں گھر لے جانے کے واسطے انھوں نے خریدیں ان میں دو چار سیر برف بھی تھی۔ چونکہ سامان بہت تھا۔ لے جانے میں دقت کے واقع ہونے کا احتمال تھا تخفیفِ سامان کی غرض سے دو چار شخص انھی کے گاؤں کے جو اُن سے ایک دن پہلے چلنے والے تھے ان کو وہ برف کا پلندہ دے دیا کہ بھئی! یہ برف ہمارے گھر پہنچا دینا، تمھاری مہربانی ہوگی، ہمارے بوجھ میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ کل انشاء اللہ ہم بھی آجائیں گے۔ انھوں نے وہ برف لے جا کر ان کے گھر پہنچا دی۔ وہ بیچارے دیہاتی گاؤں کے رہنے والے برف کے خواص کیا جانیں۔ اتنا جانتے تھے کہ ٹھنڈی چیز ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اہلِ خانہ جس شے کو مرغوب سمجھتے ہیں اس کو آنے والے شخص پر انتظار رکھا کرتے ہیں کہ جب وہ آئے گا اسی وقت اس کو کھائیں پئیں گے۔ اس عادت کے موافق ان بیچاروں نے برف کو ویسے ہی معمولی کپڑے میں لپٹا ہوا اٹھا کر رکھ دیا کہ کل کو انھی کے سامنے جب وہ آئیں گے استعمال کریں گے۔ اگلے دن جب وہ صاحب گھر پہنچے تو مکان پر قیام کرنے کے بعد منجملہ دیگر تحائف کے برف کا بھی ذکر چھیڑا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کل ایک شخص کے ہمراہ برف بھیجی تھی وہ پہنچی یا نہیں۔ گھر والوں نے نہایت خوشی سے کہا کہ ہاں وہ برف پہنچ گئی اور اب تک تمھارے انتظار میں ویسے ہی رکھی ہے۔ کسی نے چھوا بھی نہیں۔ اُس نے کہا ہائیں! کیا وہ برف اب تک رکھی ہے؟ تمھارا بھلا ہوئے وفوفو! تم نے برف کو ہی کھو دیا۔ دیکھوں تو سہی وہ اب تک کیسے رکھی ہے۔ وہ خوشی خوشی اٹھانے گئے کپڑا جو کھول کر دیکھا تو برف کا پتا بھی نہیں! صرف قدرے نمی کپڑے میں باقی تھی۔ اتنا بڑا برف کا ڈلا ندارد۔ کفن موجود مردہ غائب۔

دیکھئے! یہ بیچارے برف کی خاصیت سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایسی شے ہے کہ اس کو جس قدر دیر تک رکھا جائے اتنی ہی گھٹتی چلی جاتی ہے بخلاف دیگر

بلکہ جو موانع اتفاقیہ پیش آ کر مخل مقصود بنتے ہیں اور نقصان منزل کا باعث بنتے ہیں اُن کی وجہ سے بھی طبیعت کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ اگر کہیں مرکب خراب ہو جاتا ہے تو نئی سواری کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کہیں گاڑی لیٹ ہو جاتی ہے تو بے حد غمگین ہوتا ہے اگر کہیں گارڈ گاڑی کی رفتار تیز کر کے اس نقصان کو پورا کر دیتا ہے تو اس سے بہت مسرت انتہا درجے کی ہوتی ہے۔ غرض اگر کہیں اتفاقیہ نقصانات پیش آ جاتے ہیں تو ان کے جبر نقصان کے درپے اور تلافی مافات میں کوشاں رہتا ہے۔

سفرِ آخرت کا سا اہتمام

یہ شان ہمارے اسفار دنیویہ کی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ کم از کم یہی شان اور یہی اہتمام اپنے سفرِ آخرت میں بھی پیدا کریں کہ جس طرح اسفارِ دنیویہ میں موانع سفر سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اتفاقیہ نقصان پر طبیعتوں میں آثارِ غم پاتے ہیں اور جو امور معین ہوتے ہیں اُن کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت ہم کو چاہیے کہ اپنی ہر ہر نقل و حرکت کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ آیا یہ ہمارے سفرِ آخرت کے واسطے عائق ہے یا معین۔ اگر کوئی حالت یا کوئی فعل ہمارا مانع سفر ہے تو اس سے احتراز کریں اور اس کو اپنے حق میں رہزنِ منزل شمار کریں۔ جس طرح کہ ایک مسافر اپنی حالت میں جان و مال کی چور ڈاکوؤں حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی ان امور کو اپنے حق میں رہزن و غارتگر شمار کریں، اور جو امور بھی اس سفر میں مدد دینے والے ہیں، منزلِ مقصود تک جلد سے جلد پہنچانے والے ہیں اُن کی طرف دوڑیں۔ انھیں رغبت کے ساتھ بطیب خاطر اختیار کریں۔

غرض ہر وقت اپنی حالت پیشِ نظر رکھیں اور یہ خیال رکھیں کہ کہیں کوئی خار راہ ہمارے اس شاہراہ پر رونما نہ ہو یا کسی ظلمت کا اثر اس روشن راستہ پر نہ پڑے جس کی ظلمت میں ہم ہاتھ پیر مارتے ہوتے بھٹکتے پھریں اور صراطِ مستقیم سے دور جا پڑیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہر حالت کو معین سمجھ کر اختیار کریں اور مانع سمجھ کر اس سے احتراز کریں۔

مگر افسوس ہماری غفلت حد سے بڑھ گئی۔ لاپروائی کی کچھ انتہا نہیں۔ مادہ عقل

بفضلِ تعالیٰ ہمارے اندر بہت کچھ موجود ہے۔ کاش! ہم کو ہوش آئے اور ہم غور کریں اور تامل کی نظر سے دیکھیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ امور ہمارے حق میں مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں۔ نتیجہ ہمارے اِن افعال کا بجز اضاعتِ وزیاں کے اور کچھ نہیں۔

نفس کی حیلہ بازی

مگر وائے بر ما و بر حال کہ ہماری اس قدر ردّی حالت ہو گئی ہے کہ اگر کسی وقت اپنے ان نامنزا افعال پر توبہ کا خیال بھی ہوتا ہے تو نفس حیلہ باز فوراً کہتا ہے کہ میاں ابھی کیا ہے۔ ایک مرتبہ پیٹ بھر کر گناہ کر لیں تو پھر ایک دفعہ ہی توبہ کر لیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج توبہ کریں اور کل پھر کسی دلچسپ گناہ کی طرف میلانِ خاطر ہو اور ارتکاب معصیت میں مبتلا ہوں تو فضول توبہ ٹوٹے گی محنت ٹوٹے گی۔ اللہ میاں کے سامنے جھوٹے بنیں گے۔ منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اوّل ایک طرف سے فارغ البالی حاصل کر لیں تب دوسری طرف مائل ہوں گے۔ گناہ کر کے ایک دفعہ پیٹ بھر لیں پھر توبہ کی فکر کریں گے۔

افسوس! ہماری مثال بالکل اس مسافر کی سی ہے جو ایک دور دراز سفر کا عازم ہے، سفر سخت اور منزل دشوار ہے۔ وہ راستہ میں اپنے گھوڑے کی ایک ٹانگ توڑ دے اور کہے کہ دوسرا گھوڑا عمدہ لے کر سفر کریں گے۔ پھر دوسرے گھوڑے کا یہی حشر کرے۔ غرض اسی طرح سے وہ اپنے مرکب کا جانی دشمن بن جاوے تو آپ ہی بتلائیے کہ کیا یہ مسافر اس منزل سے ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے یا کوئی عاقل اس کی نسبت سوال کر سکتا ہے کہ یہ کسی صورت سے کسی زمانہ میں منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس طرح توبہ یہاں سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہی کیفیت ہماری ہے کہ رات دن معاصی میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے مرکب عمر کے ہر ہر قدم کو توڑ کر دوسرے مرکب کی ہوس میں ہیں۔ پھر کسی وقت جو کچھ ٹوٹی پھوٹی توفیق طاعات کے بجا لانے کی میسّر آتی ہے اور جو کچھ نماز روزہ ادا کرتے ہیں

تو اس سے دو چند معاصی کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لیتے ہیں۔ تو بھلا کیا ہم اس مسافر کی طرح کوئی قدم بھی سفرِ آخرت کی طرف بڑھا سکتے ہیں یا اِنچ دو اِنچ مسافت قطع کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ جس طرح وہ مسافر بیچ میں پڑا ہوا ہے کہ آگے نہیں بڑھ سکتا، اسی طرح ہم ہیں کہ شاہراہ آخرت پر ایک قدم نہیں بڑھا سکتے۔ یہی نہیں بلکہ ہم اتنے تو بدنصیب ہیں کہ اس مسافر کی طرح ایک حالت پر بھی قائم نہیں رہتے بلکہ جس قدر ہم آگے بڑھتے ہیں اس سے دو چند پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اس وقت ایک حکایت حسب حال یاد آئی کہ ایک عزیز کسی ملازمت پر مامور تھے۔ رخصت لے کر مکان پر آئے۔ رخصت ختم ہونے پر آئی۔ احتیاطاً ذرا پہلے چلنا چاہا۔ شام کا وقت تھا۔ گھر والوں نے بہت روکا مگر وہ بھی تھے ضد کے پورے۔ کہا نا صاحب! میں تو ابھی جاؤں گا ورنہ میرا بہت حرج ہو گا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ چنانچہ وہ اپنی ہٹ کے مطابق گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ چلتے وقت کچھ جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔ گھر سے تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ رات ہو گئی۔ اتفاق سے زمانہ مہینہ کی آخری تاریخوں کا تھا۔ رات اندھیری تھی اور اتفاق سے اس وقت سخت گہری گھٹا اور اس کے ساتھ کچھ ترشح بھی ہو رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے راستہ بھول گئے اور اتفاق کی بات کچھ ایسا راستہ سے بچھڑے کہ ساری رات چکر لگایا مگر راستہ ہی ہاتھ نہ آیا بلکہ کچھ ایسے چکر میں پڑے کہ آدھی رات اپنے ہی گاؤں کو ہو لیے۔ جب صبح ہوئی تو سامنے اپنا گاؤں دکھائی دیا۔ جب مسجد میں پہنچے تو کہیں ان کے گھر کے سامنے ایک جامع مسجد تھی اور اس میں ایک برگد کا درخت تھا، تو آپ اس مسجد کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں کہ بھئی! یہ تو بالکل ہمارے ہی ہاں کی سی جامع مسجد ہے اور کسی نے برگد بھی تو ہمارے مسجد ہی کا اکھاڑ کر یہاں لگا دیا ہے۔ مگر کتنی زبردست مشابہت ہے کہ بالکل وہی معلوم ہوتی ہے ذرا بھی تو فرق نہیں۔ آگے جو بڑھے تو سامنے ہی سے اپنے مکان کا دروازہ دکھلائی دیا۔ دیکھ کر فرمایا، اوہ! یہ گھر تو بالکل ہمارے ہی گھر کی طرح ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالکل ہمارا ہی گھر ہے یعنی سارا دروازہ، چبوترا، چوکیاں بالکل ویسے ہی ہیں۔

حق عیر میں زکوٰۃ کہاں! اس وجہ سے ہم زکوٰۃ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ تم ہی بتلاؤ کہ ہم کیوں کر زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر ہمارا مال سُودی نہ ہوتا تو ہم بھی بطیب خاطر زکوٰۃ ادا کرتے۔ دیکھئے! نفس کی کتنی زبردست چال ہے۔ کیسا عجیب بہانہ چھانٹتا ہے کہ لینے کے وقت تو جو کچھ بھی آجائے حلال ہے اور اگر نہ بھی حلال ہو تب بھی حلال ہے اور دینے کے وقت حرام اعلیٰ درجہ کا حرام بلکہ تمام دنیا کے حرام مالوں سے بڑھ کر حرام۔ کیونکہ اس وقت دینا بھی پڑتا ہے۔ غرض ہر وقت نفس اس قسم کے بہانے تراشتا رہتا ہے اور سہولت کی صورتیں چھانٹتا رہتا ہے۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چوں شتر مرغے شناس ایں نفس را ۔۔۔ نے برد بار و نہ پرد بر ہوا

گر بہ پرگوئیش گوید اشترم ۔۔۔ ور نہی بارش بگوید طائرم

یعنی نفس کی مثال شتر مرغ کی سی ہے کہ جب اس سے اڑنے کو کہا جاتا ہے تو کہتا ہے میاں! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اُڑنے کو مجھ سے کہتے ہو۔ کہیں اونٹ بھی دنیا میں اڑا ہے۔ میں تو اونٹ ہوں اُونٹ۔ تم میرا نقشہ و صورت نہیں دیکھتے۔ بتلاؤ میں اونٹ سے کس بات میں کم ہوں۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ اچھا اگر تم اڑنے سے اس لئے معذور ہو کہ تم اونٹ ہو تو پھر اونٹ ہی کے سے کام کرو۔ بوجھ لادو اور آگے آگے چلو، تو جواب دیتا ہے کہ میاں تم بھی آنکھوں سے اندھے، عقل سے خارج معلوم ہوتے ہو۔ تم کو میرے دو بڑے بڑے بازو اور لمبے لمبے پر نظر نہیں آتے۔ کہیں پرندوں نے بھی بوجھ لادا ہے۔ وہ تو اس واسطے وضع کئے گئے ہیں کہ اُڑتے پھریں۔ غرض جس صورت میں عافیت نظر آتی ہے اسی کو اختیار کرتا ہے۔ اگر اونٹ بننے میں بوجھ لادنا پڑتا ہے تو پرندہ بن جاتا ہے اور پرندہ بننے میں جب اُڑنے کی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے تو اونٹ بن جاتا ہے۔

اسی طرح نفس ہے کہ جب عیش و عشرت کے سامان ہوتے ہیں اور دلچسپیوں کا انتظام ہوتا ہے تو قوی ہو جاتا ہے۔ خوب ہاتھ مارتا ہے۔ دل کھول کر گناہ کرتا ہے اور جب کبھی نماز روزہ کا ذکر ہوتا ہے تو ضعیف بن جاتا ہے، بہانے تراشتا ہے۔ اگر کوئی بیچارا خدا سے بہت کچھ خوف کر کے پچھلی رات کو اُٹھنے کا قصد کرتا ہے تو اسے تھپک کر یہ

اطمینان دلا کر سلاتا ہے کہ ابھی بہت رات باقی ہے۔ ابھی اُٹھ کر پڑھ لیں گے۔ اسی طرح تھپک تھپک کر سلاتا رہتا ہے اور اطمینان دلاتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ صبح ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی خدا کے بندے پر بہت کچھ خوف و خشیت غالب ہوتا ہے ہیبت خداوندی طاری ہوتی ہے۔ گناہوں کی بھیانک صورتیں اس کے سامنے عذاب کو کھینچ کھینچ کر لاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں تو توبہ کا قصد کرتا ہے مگر نفس فوراً سدِّ راہ بن کر عائق ہوتا ہے کہ واقعی ضرور توبہ کرنا چاہیے مگر ذرا ایسا تو ہو کہ اللہ میاں کے ہاں عہد شکن اور بدعہد تو نہ کہلائیں۔ یہ ایک گناہ اور کر لیں تو واقعی ضرور توبہ کریں گے۔ للہ در القائل ما احسن قال ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

روز کہتا ہے کہ کل ضرور توبہ کروں گا آج تک جو کچھ گناہ ہونے تھے ہو گئے اگر ایک آدھ اور کوئی باقی رہے گا تو ہو جائے گا۔ پھر خوب مضبوط توبہ ہو گی۔ پھر جب کل ہوتی ہے تو اس سے اگلی کل پر حوالہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی نفس کا ایک بہانہ ہے کہ حرام مال کھانے کے وقت ہندوستان کو دارالحرب مان لیا اور بے خوف و خطر سُود کھایا اور جب زکوٰۃ دینے کا وقت آیا تو حرام مال بتلا دیا۔ پھر مسئلہ بھی کیسا من گھڑت تراشا ہے۔ بالکل بے اصل اور بے بنیاد کیونکہ زکوٰۃ کا وجوب محض مال کے مملوک ہونے پر ہے۔ اگر کسی کی ملک میں بقدر نصاب مال موجود ہے خواہ وہ حلال ہو یا حرام سے مخلوط ہو تو زکوٰۃ ضرور واجب ہو گی اور اگر مال مخلوط بہ حرام سے زکوٰۃ ادا نہ کی جاوے گی تو دو سزائیں مرتب ہوں گی۔ ایک تو حرام مال کھانے کمانے کی (جس کا اقرار اپنے منہ سے کرتے ہیں) دوسرے زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے کی بخلاف زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت کے کہ اس وقت صرف ایک جرم عائد ہو گا کہ مال حرام کیوں کمایا تھا۔ زکوٰۃ نہ دینے کے جرم میں تو ماخوذ نہ ہو گا۔ اگرچہ عذاب اُخروی کے لیے پہلا جرم بہت کافی ہے مگر خیر کچھ کمی تو ہو جاوے گی۔

حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو باعتبار سفر اُخروی کے مسافر سمجھنا چاہیے تھا۔ اس میں تو مقیم سمجھا کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ اگر اپنی حالت سفر کو مد نظر رکھیں گے تو پھر ان لذائذ سے دلچسپیاں کون لے گا۔ ان عیش و راحت کے سامانوں کا لطف کون

اٹھتے گا) اور اصطلاحِ فقہ کے اعتبار سے اپنے کو مقیم سمجھنا چاہیے تھا۔ وہاں مسافر بن بیٹھے۔ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ یہاں سہولت نظر آتی ہے۔ فریضہ وقتی میں تخفیف ہوتی ہے۔ بجائے چار کے دو ہی پڑھنی پڑتی ہیں حالانکہ جس اعتبار سے ہماری یہ حالت حالتِ مسافرت ہے یعنی انقضاءِ عمرِ دنیا اس کا بالکل خیال ہی نہیں گذرتا کہ وہ کونسی منزلِ مقصود ہے جس پر ہم کو یہ دور و دراز مسافرت قطع کر کے پہنچنا ہے۔

عملی اور دائمی مراقبہ کی ضرورت

یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا کی دلچسپیوں میں سرشار ہیں۔ اسباب عیش و نشاط مہیا ہیں۔ عیش و طرب میں مست ہیں۔ کچھ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ کاش! اگر استحضار اس سفرِ اخروی کا ہو جائے اور اس کا جزم کامل و اعتقاد راسخ ہو جاوے کہ ہم کو اس دنیا سے ضرور کوچ کرنا ہے یا ہم اس دنیا میں ایک غریب مسافر کی طرح کسی منزل کے رہرو اور کسی شاہراہ کے طے کرنیوالے ہیں۔ کوئی عظیم الشان منتہیٰ ہماری اس مسافرت شدیدہ کی ہے جس کے اہتمام شان کے باعث ہم کو انتی کاوشیں اس سفر کے قطع کرنے اور اس تک پہنچنے میں برداشت کرنا ضروری ہیں۔ مگر اس کا تو کوسوں بھی گمان نہیں۔ ہاں چار رکعت کی دو رکعت کرنے کے لئے ہر دم آمادہ ہیں۔ صاحبو! جس وقت ہمارا یہ وظیفہ عملی اور دائمی طور سے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی مراقبہ و معائنہ ہو جائے گا تو اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ دنیا سے طبیعت برداشتہ ہو جائے گی۔ بجائے دلچسپی کے وحشت پیدا ہوگی۔ اسبابِ تنعم و آلاتِ تلذذ استبداد رحمہ کے موحش و مولم بن جاویں گے۔ ہر چیز سے جی گھبرانے لگے گا۔ ایک ساعت بھی دنیا میں ٹھہرنا دشوار ہوگا۔ خواہ مخواہ طبیعت کا اقتضا ہوگا کہ جس طرح بھی ہو چلو۔ جب یہاں دوام و خلود ہی نہیں تو پھر ان چیزوں کا ہم سے ایک نہ ایک دن چھوٹنا ضروری ہے۔ لہٰذا ابھی سے ہم ہی ان کو چھوڑ کر چلیں اور ایسی جگہ چلیں کہ جہاں پر دوام و خلود ہو بسکون و اطمینان سے زندگی بسر کریں۔

یہ تو بالکل موٹی سی بات ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی جرم پر جیل خانہ بھیج دیا جاتا ہے

تو اس کو وہ جیل کی کوٹھڑی سخت ہیبت ناک اور وحشت سے پُر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ساعت بھی جی نہیں لگتا۔ ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے یہاں سے نکل چلو۔ اسی طرح جب اس استحضار کے باعث دنیا سے جی اُچٹ جائے گا تو اس وقت وہی دنیا جو عیش و نشاط کا مرکز و دلچسپیوں کا سرچشمہ، لذائذ کا منبع تھی، اس کی حقیقت بجز ایک وحشتکدہ اور حسرت ناک ہیبت انگیز مجلس کے اور کچھ نہ رہے گی۔ ہر طرف سے مہیب صورتیں نظر آنے لگیں گی۔ اس وقت دنیا یا اس کی کسی دل بہلانے والی چیز سے دل لگانا ناممکن ہو گا۔ ترکِ دنیا کے اسباب و ذرائع کی فکر ہو گی بتحصیلِ آخرت کے وسائط و ذرائع کی طلب ہو گی۔

وعدۂ خداوندی

وعدۂ خداوندی یہ ہے :

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

لہٰذا بموجب وعدہ کے سفرِ آخرت جس کی سعی و کوشش میں تم سرگرداں ہو گے سہل ہو جائے گا۔ راستہ منکشف ہو گا۔ اس شاہراہِ مقصود سے غفلت و لاپروائی کی تاریکی دور ہو جائے گی۔ اس کے بعد کامیابی کی مبارک صورتیں نظر آئیں گی۔ منزلِ مقصود قریب اور سہل الحصول معلوم ہو گی۔ یہ تو نقلی دلیل ہے استلزام مذکور کی۔ نیز جب کہ استحضار فنا و مفارقتِ دنیا ہونے کے بموجب محبّتِ دنیا منقطع ہو گی اس کی ظلمت کے آثار کافور ہوں گے۔ اس انقطاعِ حبِّ دنیا سے وہ ظلمات دنیویہ جن میں اب تک ملوّث تھے دور ہو جاویں گی۔ جہالت کی تاریکیاں یک طرف ہوں گی تو اس وقت لازمی طور پر ایک نور پیدا ہو گا جس سے قلب روشن ہو جائے گا۔ راستہ سفرِ آخرت کا منوّر ہو جائے گا۔ یہ شاہراہِ عمل جگمگا اُٹھے گی جس کے بعد سفر کرنا نہایت آسان اور منزلِ مقصود پر پہنچنا نہایت سہل ہو گا۔ امیدیں قربِ الٰہی کی قوی ہوں گی۔ اس طرح سے کہ اسی نور میں یہ نظر آئے گا۔

کیونکہ مخلوقاتِ خداوندی بے کار و بے فائدہ نہیں۔ ان حوادث کی کوئی غرض و حکمت ضرور ہے۔ منجملہ ان حکمتوں کے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کوئی نفع جلبِ عائدۃ اللہ

اثر سے خالی نہیں رکھا گیا، خواہ عتاب ہو یا ثواب۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی بندہ اس دار المحن میں کوئی فعل یا کوئی عمل کرے اور اس پر ثواب یا عقاب مرتّب نہ ہو۔ اور ہم بعض افعال و اعمال کو دیکھتے ہیں کہ ان پر دنیا میں کوئی ثواب و عقاب مرتّب نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک شخص ہے کہ اس نے آج کوئی مستحسن شرعی فعل کیا تو ہم اس پر کوئی خاص اثر یا کوئی خاص ثواب مرتب ہوتا ہوا نہیں دیکھتے۔ یا کوئی شخص ہے کہ وہ نہایت ہی قبیح امر کا مرتکب ہوتا ہے۔ شراب پیتا ہے یا زنا کرتا ہے۔ اس پر کوئی گناہ کا اثر یا کسی قسم کا عذاب وغیرہ نہیں پاتے۔ پس جب اس عالم میں بعض اعمال پر آثار مرتب ہوتا ہوا نہیں دیکھتے تو معلوم ہوا کہ کوئی نہ کوئی اور عالم ماسوا اس عالم کے ضرور ہے جس میں ان اعمال کے آثار مرتّب ہونگے اور ثمرات ان اعمال کے ضرور ملیں گے۔ یہ استلزام کی عقلی دلیل ہے۔

لیکن میں لزوم عقلی اصطلاحی کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ عقلی بمعنی ترجیح کا مدعی ہوں۔ یعنی ممکن کی دونوں جانبیں وجود و عدم کی مساوی ہیں۔ ان میں سے عقلاً ایک جانب کا راجح ہونا بصورت عدم تحقق مانع کے۔ چنانچہ معاد بھی فی نفسہٖ ایک امر ممکن مساوی الطرفین ہے یعنی عدم وجود اس کے دونوں فی نفسہٖ مساوی۔ نہ وجود ضروری ہے نہ عدم لازمی ہے لیکن عقل اس کے جانب وجود کو ترجیح دیتی ہے تو انعدام مانع کے۔ کیونکہ آج تک کوئی دلیل عقلی قابل اعتماد اس کے امتناع پر قائم نہیں ہوتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ معاد ممکن عقلی بمعنی مذکور ہے اور ترجیح دلیل عقلی مذکور سے ثابت ہے۔ اب ترجیح سے آگے رہا وجوب، سو وہ نصوص قطعیہ شرعیہ سے واجب ثابت ہے لہٰذا معاد کا ثبوت جو ممکن عقلی تھا، مخبر صادق کا قول اس کو وجوب شرعی کی جانب لے آیا۔ پس اب وہ ممکن عقلی واجب شرعی ہو گیا۔ یہی معاد ہے لیکن اس معاد کے ثبوت کی طرف التفات کیوں ہوا۔ محض اس وجہ سے کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اشیائے فانیہ کے مشاہدہ خاص سے اُن سے طبیعت برداشتہ ہوتی۔ پھر جب دنیا سے طبیعت گھبرائی اس وقت دوسرے عالم کی طلب ہوئی۔ (چنانچہ تقریر مذکور یہ امر واضح ہو چکا) لہٰذا

معلوم ہوا کہ مضمون اوّل یعنی اختصار فنا، دنیا کے واسطے معاد و بقا آخرت کا خیال لازم ہے۔ اول چونکہ بدیہی ظاہر و باہر ہے لہٰذا اس کا جو لازم ہے وہ بھی بدیہی اور واضح ہوگا۔ کیونکہ ظاہر کا لازم ظاہر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس لزوم کی تقریر بھی مذکور ہو چکی پس معلوم ہوا کہ فی نفسہ تمام مضمون ظاہر ہے مگر عارض کے سبب جو غفلت ہے اس لئے تنبیہ کی حاجت ہے۔ پس اسی تنبیہ کے لئے اس وقت یہ بیان کیا جاتا ہے۔

دنیا بجز لہو و لعب کے کچھ نہیں

چنانچہ اسی غفلت کے ازالہ کے لئے ارشاد ہے:

وما ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا الا لھو ولعب

یعنی یہ دنیا اور جس قدر اس کے متعلقات ہیں سب من کل الوجوہ لہو اور لعب ہیں بجز اس کے اور کچھ اس کی حقیقت نہیں۔ باری تعالےٰ نے اس مقام پر یعنی مقام اثبات معاد میں اس آیت کو ذکر فرمایا حالانکہ اثبات معاد کا علم اوپر آیت معاد سے بھی ہو چکا اور آگے ــــــــ وان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان۔ سے اور زیادہ ہو جائے گا۔ پھر جو دنیا کے لہو و لعب ہونے کا ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اللہ تعالیٰ کا کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرنا ہے جیسے آیت ما قبل و ما بعد نے ادا نہ کیا تھا اور وہ بھی کہ اگرچہ معاد کا یقین تو:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّھُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ غُرَفًا ــــــ اور ــــــ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ۔

سے بھی ہو گیا ہے اور اعتقاد آخرت کے واسطے تو یہ بھی کافی ہے لیکن مقصود محض آخرت کی خبر دینا اور صرف معاد کا علم کرانا ہی نہیں ہے بلکہ اس یقین و اعتقاد پر جو ثمرہ مرتب ہونا چاہیے وہ معظم مقصود ہے یعنی عمل للآخرہ جس سے شغل دنیا مانع تھا۔ گویا اس جگہ استدلال سبب سے ہے مسبب پر اس طرح سے کہ دنیا و ما فیہا کا جب لہو و لعب میں داخل ہونا مستحضر ہو گیا تو یہ سبب ہو جاوے گا استغنا دِ

للآخرۃ کا۔ پس مسافرِ آخرت سے ہرگز یہ امید نہیں کی جاتی کہ وہ نہیات میں مشغول ہو کر اپنے عزیز سفر اور کٹھن منزل کو کھوٹا کرے جب کہ ایک مسافر اسفارِ دنیویہ میں اس قسم کے افعال سے گریز کرتا ہے تو ایک مسافرِ آخرت کو تو لازمی طور سے اس پر کاربند ہونا اور نہیات سے اعراض کرنا چاہیے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مقصودِ خداوندی اس آیت اثباتِ معاد کے سلسلہ میں بیان کرنے سے یہ ہے کہ جس طرح اعتقاد و یقینِ معاد مطلوب ہے اسی طرح اعراض عن الدنیا بھی مقصود ہے جو مفضی الی العمل ہے۔ گویا مقصود کے دو جزو ہیں۔ اور ان دونوں اجزائے ترکیبیہ سے مل کر وہ مقصود تیار ہوتا ہے۔ ایک علم دوسرا عمل۔ پہلی اور ما بعد کی آیت نے علمِ آخرت کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس آیت میں اعراض عن الدنیا کی تعلیم دے کر عمل للآخرہ پر متوجہ کیا ہے۔ اور خداوند تعالیٰ نے جہاں بھی علوم کا تذکرہ کیا ہے ان سے مقصود محض علوم ہی نہیں ہوتے بلکہ اعمال بھی مقصود ہوتے ہیں جن کے لئے علوم وسیلہ ہوتے ہیں۔

محض اعتقاد کافی نہیں

بہت سے لوگ خوش ہیں کہ ہم آخرت کے قائل ہیں۔ معاد پر ہمارا ایمان ہے ہمیں کس بات کا فکر ہے۔ سو ہوشیار رہو۔ یہ بھی نفس کا ایک دقیق مغالطہ ہے محض اعتقاد مقصود کے اتمام کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ یہ ایمان بدون عمل کے بدرجہ کمال معتبر نہیں اگو کسی درجہ میں مفید ضرور ہے۔ آج کل لوگوں کا عجیب مذاق بگڑا ہے کہ محض اعتقاد ہی کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں عمل کی گویا کوئی ضرورت ہی نہیں۔

اس کا سبب محض غلبۂ جہل ہے اور جہل کا سبب یہ ہے کہ آج کل لوگوں نے علم اور اہلِ علم سے موانست و مجالست ترک کر دی۔ بزرگانِ دین کے پاس جا کر بھی نہیں پھٹکتے جن مجالس میں علومِ دینیہ کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں جی نہیں لگتا جس کا ثمرہ یہی ہے کہ اس قسم کی غلطیوں میں پڑتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں۔ اور اعمال تو اعمال آج کل تو اعتقادات کے اندر بھی جس کو سب ضروری سمجھتے ہیں عجیب گڑبڑ ہے۔ اعتقادات کی تصحیح بھی بدون

مجالستِ اہلِ علم کے دشوار ہے۔ پس اوّل تو اعتقاد محض کافی ہی نہ تھا اور اگر ان کے زعم میں کافی تھا تو حیرت ہے کہ اس کی بھی تکمیل نہیں کرتے۔

چنانچہ اس وقت بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کے اعتقادات موافق اصولِ شریعہ ہوں اور وہ اس فرقۂ اہلِ حق میں داخل ہوں جن کی نسبت آپؐ نے فرمایا ہے کہ میری امّت تہتر فرقوں پر منقسم ہو گی جس میں سے بہتّر فرقے ناری ہوں گے اور ایک فرقہ ناجی ہوگا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ حضور وہ کونسا فرقہ ہے جو ناجی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "ما انا علیہ واصحابی" یعنی جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ"۔ سو اس طریق پر بہت کم لوگ ہیں اور جو تھوڑے سے ہیں وہ بھی اس غلطی میں گرفتار ہیں کہ ان سے بعض لوگوں نے اس ما انا علیہ کو اعتقادات کے اندر منحصر کر رکھا ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ اگر آپؐ کے اور آپؐ کے اصحاب کے ساتھ محض اعتقادات میں بھی مطابقت ہو گئی تو فرقہ ناجیہ میں داخل ہونے کے واسطے یہی کافی ہے حالانکہ یہ ان کی سخت غلطی ہے کہ انہوں نے مطابقت کو صرف اعتقادات میں منحصر کر دیا ہے اور ما کو خاص کر دیا ہے علوم یقینیہ کے ساتھ۔ حالانکہ یہ مطابقت عام ہے۔ جمیع افعال و اعمال کو جس کی بنا یہ ہے کہ ما انا علیہ میں لفظ ما عام ہے۔ اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں پس جس طرح یہ اعتقادات کو شامل ہے اسی طرح عادات، افعال، اخلاق، اعمال کو بھی شامل ہے۔ گویا جس طرح فرقۂ ناجیہ میں داخل ہونے کے واسطے تصحیح عقائد ضروری اور لازم ہے اسی طرح اس کے دیگر تتمات کا ہونا بھی ضروری اور لازم ہے۔ مگر آج کل بہت لوگ اس قسم کے پائے جاتے ہیں جو محض تصحیح عقائد کے بعد اہلِ حق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے کو ما انا علیہ واصحابی کے زمرہ میں داخل کرتے ہیں۔ اور بڑے غضب کی بات یہ ہے کہ یہ نام نہاد خوش اعتقاد لوگ جن بزرگوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے وابستہ ہوتے ہیں وہ بزرگ بھی صرف تصحیح عقائد پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان افعال و اعمال سے اصلاً متعرض نہیں کرتے بلکہ خوش ہو کر فرماتے ہیں کہ بھئی فلاں صاحب بڑے خوش عقیدہ ہیں۔ یہ گویا ان کی بڑی تعریف اور لیاقت کی توصیف ہوتی ہے اور اگر ان کے اعمال کو دیکھا جائے تو خواہ

اہلِ فیشن کے شبہات مع حل

آج کل کے نوجوانوں کی طرح نہ ہوں کہ انھوں نے اپنے اعتقادات میں اس بات کو بھی شامل کر لیا ہے کہ اہلِ حق کا شعار ٹھکرا دینے کے قابل ہے اور جو نیا فیشن ایجاد ہو تو وہ بدل وجان قبول کرنے کے لائق ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اہلِ حق بننے کے واسطے تو اعتقادات کی طرح اور چیزیں بھی ضروری ہیں جن کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور یہ دعویٰ تمھارا اس وقت صحیح ہوگا جب کہ تم اپنے باطن کی طرح ظاہر کو بھی اہلِ حق کے ساتھ ملا لوگے اور ان کے جیسے عادات واخلاق، ان کا سا طرزِ معیشت، اندازِ معاشرت بھی اختیار کروگے۔

تو فوراً بادی النظر میں ایک زبردست شبہ پیش کرتے ہیں کہ جناب! اگر آپ ایسے ہی علوم کے مدعی ہیں تو پہلے اپنی ہی خیر منائیں، ہماری بعد میں خبر لیجیے کیونکہ خیریت سے آپ بھی فرقہ اہلِ حق سے خارج ہوئے جاتے ہیں اور ما انا علیہ واصحابی کے طریق مستقیم سے ہٹے جاتے ہیں ع ———— چاہ کن را چاہ درپیش۔

آپ ہمیں ہٹا ہوا بتلاتے تھے آپ خود ہٹ گئے، بتلایئے کہ ایسی چولی دار اچکنیں اور سینہ کھلے ہوئے انگرکھے آپ نے اور اصحاب نے کب پہنے تھے اور اس قسم کے سلیم شاہی جوتے آپ نے اور آپ کے اصحاب نے کب پہنے تھے صفحات تاریخ اس قسم کے طرزِ معاشرت نبوی کے بیان کرنے سے بالکل معرا بلکہ منکر ہیں۔ یہ آپ کے عرض دار نخنے موہری کے پاجامے اس کا پہننا کون سی احادیثِ نبوی میں آیا یا آثارِ صحابہ سے ثابت ہے۔ بلکہ اوراقِ تاریخ پرزور دار الفاظ کے ساتھ اور احادیث واضح بیان کے ساتھ ہم کو یہ بتلا رہی ہیں کہ بحیثیتِ مجموعی تمام صحابہؓ وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس مبارک میں تین کپڑے ہوتے تھے۔ ایک تہبند اور ایک کرتہ ٹخنوں کے قریب تک اور ایک چادر اور جو لوگ بہت زیادہ غریب ہوتے تھے وہ بے چارے ایک کرتے یا ایک تہبند ہی میں گزر کرتے تھے۔ ہاں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و نیز متمول صحابہ سے عمامہ اور قبا کا بھی ثبوت ملتا ہے اور جوتے وہی تسمہ دار ہوتے تھے۔ بہرحال یہ لباس اور اس قسم کے

جوتے کہیں بھی پہننے ثابت نہیں ہوتے۔ اور حضرت ایہ تو فرمایئے کہ یہ پلاؤ قورمے بریانیاں اور یہ نفیس نفیس کھانے آں حضرتؐ یا صحابہؓ نے کب کھائے تھے۔ اکثر اوقات آنحضرتؐ کی بسر اوقات جَو یا خرما پر تھی۔ شاذ و نادر آپ سے گیہوں کا استعمال ثابت ہے لہذا آپ بھی ما انا علیہ و اصحابی کے طریق پر ہونے کے واسطے ان مرغن کھانوں کو چھوڑ کر نانِ جَو پر بسر اوقات کیجیے اور اس کے بعد اہلِ حق ہونے کا دعویٰ کیجیے۔

لیکن یہ شبہ بھی ہوائے نفس کا ایک پیچیدہ جال ہے۔ حل اس شبہ کا یہ ہے کہ اگرچہ ما میں بحیثیتِ افراد تعمیم ہے اور ہر چیز اس میں داخل ہے لیکن پھر بھی ایک قسم کی تخصیص اس میں موجود ہے جس کے بعد مقصود اس جملہ کا یہ متعین ہوتا ہے کہ حضورؐ کی ہیئت و وضع کو ہر بات میں اختیار کیا جاوے۔ لیکن وضع و ہیئت سے مراد محض وضع متعارف یعنی وضع فعلی ہی نہیں بلکہ اس کے تحت میں اجازتِ قولی بھی (جس کو اگر وضعِ قولی کے نام سے تعبیر کیا جاوے تو بہت مناسب ہے) داخل ہے۔ یعنی جس طرح اس امر کو اختیار کرنا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عملدر آمد رہا ہے ما انا علیہ کا مصداق ہے۔ اسی طرح ہر اس عمل کو اختیار کرنا جس کے اختیار کرنے کی آنحضرتؐ نے اجازت فرمائی ہے اگرچہ حضورؐ نے اس پر عمل نہ کیا ہو نیز ما علیہ کا مصداق ہے اور ہر دو قسم کے اعمال ما انا علیہ یعنی وضعِ نبویؐ کے تحت انا میں داخل ہیں اور اہلِ حق بنانے کے واسطے کافی ہیں۔ لہذا آنحضرتؐ نے اگرچہ اس قسم کے انگرکھے، اچکنیں جوتے نہیں پہنے اور اس قسم کے کھانے پلاؤ زردے نہیں نوش فرمائے لیکن اس قسم کے توسعات کے حاصل کرنے کی آنحضرتؐ نے اجازت دی ہے۔ جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ مسلّم امر ہے کہ صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی ما انا علیہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا بلکہ صحابہؓ نمونۂ عملی نبوی ہیں چنانچہ خود آپؐ نے ان کی اقتداء کو بھی ذریعۂ نجاتِ اُخروی کا قرار دیا۔ اور صفحاتِ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ توسعات و تنعماتِ صحابہ زمانۂ خلافتِ راشدہ و عروجِ اسلامی میں صاف ظاہر ہیں جو کہ زمانۂ ابتدأ اسلام و حیٰوۃِ نبویؐ میں نہ تھے۔ نیز حیٰوۃِ نبوی میں ابتداء زمانۂ اسلام و انتہاء زمانۂ اسلام میں صحابہ کی حالت میں تغیر ہونا اور فقر کے بعد اسبابِ راحت کا اختیار کرنا بالکل ظاہر و

دیا مرسے چہ جائیکہ بعد از حیوۃ نبویہؐ ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر ایک قسم کے تنعمات حاصل کرنے اور خوش عیشی کے اسباب اختیار کرنے کی بشرطیکہ حدود شرعیہ میں داخل ہوں اجازت نبویؐ سنّتِ قولی سے ثابت ہے ۔ لہٰذا اس پر عمل کرنے کے بعد بھی فرقۂ اہل حق میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ اگرچہ سنّتِ فعلی وخاص طریقۂ عمل آنحضرتؐ کا یہ نہ ہو ۔ لہٰذا جو کی رُوٹی کھانا سنّت ضرور ہے اور اس پر عمل کرنا اعلیٰ و افضل اور بہت خوب ہے اگر ممکن ہو اور وسعت میں داخل ہو۔ کیونکہ ہر ایک سنّت پر عمل کرنے کا ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین صاحب نقشبندیؒ کی نظر سے وہ حدیث گزری جس میں طرزِ معیشت صحابہ کا منقول ہے کہ صحابہ جو کو پیستے تھے اور پھونک کر جو کچھ موٹے موٹے چھلکے ہوتے ان کو اڑا دیتے اور بغیر چھلنے ہوتے ویسے ہی گوندھ کر روٹی پکاتے اور تناول کرتے تھے ۔ اگرچہ یہ حدیث سینکڑوں مرتبہ نظر سے گزری ہوگی لیکن اس مرتبہ یہ بات یہ قلب پر اثر کر گئی اور التفات خاص ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ ہماری معیشت معیشت نبویؐ و طریقہ صحابہؓ کے موافق نہ ہو اور ہم پُر تکلف کھانے کھائیں، تو آپ نے تلامذہ سے ارشاد فرمایا کہ ہم آج سے ایسی جَو کی روٹی بلا چھنے آٹے کی کھایا کریں گے۔

چنانچہ مطابق ارشاد دوسرے دن جَو کی روٹی اسی طرح تیار ہوئی اور آپ نے تناول فرمائی چونکہ تمام اناج میں جَو کی بھوسی سخت ہوتی ہے اور بغیر چھانے روٹی پکائی گئی تھی اس وجہ سے سب کے پیٹ میں درد ہو گیا اور ایسی سخت تکلیف ہوئی کہ دوسرے وقت کھانے کی ہمّت نہ ہوئی۔

اللہ اکبر! ان حضرات کے مراتب عالیہ ان مقالات سے منکشف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہم جیسا نفس پرست ہوتا تو معاً یہ خیال ہوتا اور خیال کیا معنی بلکہ بہت سے مُنہ پھٹ زبان سے یہ کہتے کہ میاں اچھا سنّت پر عمل کیا کہ بیٹھے ہی کو پکڑے پکڑے پھرتے ہیں۔ اگر دو چار مرتبہ اور سنّت پر عمل کیا تو شاید دنیا ہی سے چل بسیں ۔ ہم باز آئے ایسی سنّت پر عمل کرنے سے ۔ مگر ان حضرات کا ادب دیکھیے کہ آئندہ کے لئے جَو کے کھانے کو تو چھوڑتے ہیں مگر اس طرح کہ سنّتِ نبویؐ پر ذرا برابر بھی غبار نہ آنے پاتے اور آپ نے

یہ بھی نہیں کہا کہ نفس کش اور سخت پیروں کی طرح سے جو کا کھانا لازم کر لیتے کہ جو چاہے ہو گذرے اگرچہ پیٹ میں درد ہو لیکن جو کھانا نہ چھوڑیں گے بلکہ کمال یہ کیا کہ جو بھی چھوڑ دیا اور سنت پر بھی الزام نہ آیا۔ آپ نے ان دونوں باتوں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جمع کر دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بے ادبی کی کہ من کل الوجوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مساوات کا قصد کیا جو کہ من وجہ مساوات کا دعویٰ ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ مساوات محض غلطی تھی جس کی ہم کو سزا دے دی گئی۔ سنت پر کسی قسم کا الزام نہیں بلکہ درحقیقت ہم میں قصور ہے کہ ان مراتب عالیہ کی تحصیل اور ان کے تحمل سے ہمارا نفس قاصر ہے۔ یہ طریقہ حضرات صحابہ ہی کے مناسب ہے۔ وہی اسی کے متحمل تھے۔ ہم کو اس کی ہوس نہ کرنا چاہیے۔

شیوخ کے فرائض

چنانچہ مولینا ارشاد فرماتے ہیں ؎

چار پا را قدرِ طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدرِ ہمت کار نہ

گو اس شعر میں مولانا تعلیم فرما رہے ہیں شیوخ کو کہ طالبین سے ان کی ہمت و طاقت کے موافق کام لو۔ طاقت سے زیادہ کام نہ لو ورنہ ؎

طفل را گرناں دہی برجائے شیر　　طفل مسکیں را ازاں نامردہ گیر

بچہ کو دودھ کی جگہ روٹی دینا اس کو ہلاک کرنا ہے۔ حافظ شیرازی بھی اس شعر میں اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود　　گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

بعض لوگ حافظ شیرازی پر بے ہودہ حملہ کرتے ہیں کہ صاحب وہ مدہوش شرابی کبابی تھے۔ ان کا کلام عاشقانہ کہاں سے آیا تھا۔ سو یہ کہنا محض ان کی غلطی اور خباثت نفس کی دلیل ہے مگر اس میں کچھ حضرت حافظ کی تخصیص نہیں۔ اس قسم کے اعتراضات اہل کمال پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ اس سے ان کی شان پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آتا بلکہ اور زیادہ کمال ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علوم ایسے عالی ہیں جہاں تک ہر ایک کی عقل نہیں پہنچتی

حضرت حافظ کے کلام سے نہایت اہم مسائل تصوف مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کی لطافت ان کے عرفان اور اہل دل ہونے کی شاہد ہے۔ ان کی عالی دماغی ان کے اعلےٰ مضامین سے ٹپکتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک نا اہل، ورغیر مستعد مدہوش شخص کے کلام سے اس قدر مسائل تصوف مستنبط ہوں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "میاں جو ہوتا ہے وہی نکلتا ہے" (یعنی کسی کے مضمون یا کلام سے اعلیٰ مضامین یا پیچیدہ مسائل علمیہ اسی وقت نکالے جاسکتے ہیں جب کہ اس میں ان مضامین کا اندراج قصداً ہو ورنہ کسی رند کے کلام سے تو تم یہ مسائل نکال دو۔ لہٰذا حضرت حافظ شیرازی کے کلام سے اس قسم کے مسائل تصوف کا مستنبط ہونا ان کے شیخ کامل ہونے کی دلیل ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں

خستگاں را چوں طلب باشد و قوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

یہ بھی تعلیم ہے سخت مزاج شیوخ کو کہ وہ اپنے مریدین پر سہولت کریں اور حسب استعداد قوت ان سے کام لیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی صحت جسمانی میں بھی نقصان واقع ہو اور دل و دماغ بھی خراب ہو جائے، پھر کسی کام کے نہ رہیں۔

اناڑی شیوخ کا طرز عمل

مثلاً کسی بے چارے کا دل شوق محبت سے لبریز ہو۔ خدا کی طلب اعلیٰ پیمانہ پر ہو لیکن ساتھ ہی ضعف و پیری کی یہ حالت ہو کہ کمر جھک گئی ہو۔ تھوڑی دور چلنے سے سانس پھول جاتا ہو۔ اس کو چوبیس ہزار بار ورد اسم ذات شریف کا ورد کرنے کی طاقت نہ ہو۔ وہ بیچارہ کسی شیخ کا مرید ہوا اور شیخ نے فرمایا کہ چوبیس ہزار بار ورد اسم ذات شریف روزانہ کیا کرو۔ اس نے کہا کہ اجی حضرت! چوبیس ہزار بار اسم ذات کر کے میں کہاں کا رہوں گا۔ ایک ہی دن میں مر مٹوں گا۔ فرمایا کچھ حرج نہیں۔ اگر مر گئے تو شہید ہو گے۔ طلب خدا میں مشغول ہو۔ ایسے وقت کی موت شہادت کے ثواب کی مستحق بلکہ اعلیٰ درجہ کا شہید بنا دیتی ہے۔ خوب درست فرمایا۔ واقعی اس بیچارے کی شہادت میں تو کچھ

کلام نہیں۔ یہ تو ضرور شہید ہوگا لیکن آپ بھی ہوشیار رہیں۔ اس کے شہید کرنیوالے تم ہی ہو۔ اس کو تو جام شہادت نصیب ہوا لیکن آپ کے نامہ اعمال میں ایک قتل عمد کا جرم لکھا گیا اور قاتل کا خطاب مل گیا۔

چنانچہ ایک شیخ تھے دہلی میں۔ وہ تمام مریضوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے۔ کسی ضعیف و قوی کا کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ ان کے ہاں جوان بوڑھے سب کا وظیفہ عمل یکساں تھا۔ چنانچہ ایک شخص مرید ہوا۔ اس کو آپ نے صلوٰۃ معکوس تعلیم فرمائی۔ اس نے شیخ کا فرمان ہرگز قابلِ رُو گردانی نہ سمجھا اور بے چارے نے موافق تعلیم شیخ کے صلوٰۃ معکوس پڑھی تو دم نکل گیا۔ تو جب ان سے تذکرہ ہوا تو فرمایا کچھ حرج نہیں۔ اچھا ہوا شہید ہو گیا۔ تزکیہ نفس کامل طور سے ہو گیا۔

اس کی مثال وہی تھی جیسے ایک طبیب تھے مگر خدا کے فضل سے علم سے کورے اناڑی محض تھے۔ ان کے پاس ایک مریض آیا۔ آپ نے اس کے واسطے مسہل تجویز کیا اور نہایت سخت اجزا تجویز کئے اور کہا کہ جا کر کھالو۔ اس سے دست ہوں گے۔ مریض نے ادھر دوا کھائی اُدھر دست آنے شروع ہوئے۔ جب دستوں کی تعداد متعارف سے زائد ہوگئی تو اہلِ خانہ کو تشویش پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب کے پاس گئے اور کہا حضرت، دست بے حد آ رہے ہیں۔ مریض پر ضعف وقتاً فوقتاً بڑھتا جا رہا ہے۔ کہا کہ ابھی کیا ہے۔ میاں آخر مسہل ہے، کوئی ہنسی کھیل تو نہیں۔ دست تو آویں گے ہی اور ضعف بھی ضرور ہوگا۔ تم کیوں گھبرائے جاتے ہو خود بند ہو جاویں گے۔ بے چارے چپکے ہو کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر اور انتظار کیا مگر دست اس بلا کے چھوٹے تھے کہ رُکنے ہی کو نہیں آتے تھے۔ جب دیر ہو گئی اور دست بند نہ ہوئے تو بہت گھبرائے اور پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچے کہ حکیم صاحب اتفاقاً ہو چکا ہے اور مریض کا دم لبوں پر ہے۔ دست ایک منٹ کو بند نہیں ہوتے۔ تو جواب دیا کہ میاں مریض سے پہلے تمہارا دم نکلا جاتا ہے۔ ارے بھائی! اگر دست آ رہے ہیں تو اچھا ہے۔ مادہ فاسد نکل رہا ہے۔ اگر اس وقت رُک گیا تو تمام عمر پریشان کریگا۔ وہ بیچارے پھر چپ ہو کر چلے گئے مگر دست بند نہ ہوئے حتیٰ کہ بیچارہ کا دم نکل گیا۔ لوگوں نے حکیم جی سے

اگر کہا کہ صاحب دست نہ رُکنے تھے نہ رُکے۔ آخر مریض ہی چل بسا۔ آپ نے تعجب سے
فرمایا، اوہ! ارے دست بند ہونے پر تو یہ کیا۔ اگر رُکتا تو جانے کیا حال کرتا۔

اس بے وقوف سے کوئی پوچھے کہ وہ اور کونسا حال تھا جو رکنے کے بعد ہوتا مرنے
سے تو بڑھ کر کوئی اور حالت نہیں۔ انسان کے واسطے انتہائی حالت موت ہے اگر رُک
جاتا تو زائد سے زائد موت آجاتی۔ تو جس طرح اس مریض کی موت کے باعث اور اس بچارے
کے قاتل یہ حکیم صاحب ہوئے اسی طرح اس مرید کو اگرچہ درجۂ شہادت ملا مگر آپ کے
نامۂ اعمال میں ایک قتل ناحق کا بدنما دھبہ لگا جو مٹانے بھی نہیں مٹ سکتا۔

غرض حافظ شیرازی اس شعر میں اس قسم کے درشت مزاج شیوخ کو ظالم اور اس
قسم کے طرز عمل کو بیداد سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور شرط مروت کے خلاف سمجھتے ہیں۔
صاحب واقعی بڑا ظلم ہے کہ یہ حضرات بچارے مریدوں کی حالت پر ذرا غور نہیں کرتے بلکہ سب
کو ایک لکڑی سے ہانکتے ہیں۔ ضعفاء اور اقویاء سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں۔

شیوخِ کامل کا طریق عمل

ہمارے حضرت کا کیا پُرشفقت طرز عمل تھا کہ مریدوں کی حالت کو پیش نظر رکھنا ان کے
ہاں سب سے پہلا اصول تھا۔ اگر کوئی قوی الاعضاء سلیم الصحۃ ہوتا تو اس کو پوری مقدار پر
ورد اسم ذات تعلیم فرماتے۔ کسی کو دس ہزار، کسی کو پانچ ہزار، کسی کو پانچ سو مرتبہ۔ غرض جسقدر
جس میں وسعت ہوتی اس کے موافق اس سے کام لیتے اور اس تشدد کو اچھا نہیں سمجھتے تھے

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو آج کل دیکھا جاتا ہے کہ مساجد میں ہر نماز کے بعد
لوگ سلام پھیرتے ہی تین ضربیں لا الٰہ الا اللہ کی لگایا کرتے ہیں تو حقیقت اس کی یہ ہے
کہ کسی شیخ نے اپنے کسی بہت ہی ضعیف و کمزور مرید کے واسطے ہر نماز کے بعد یہ ذکر
جہر تعلیم فرمایا تھا کہ تم سے زیادہ تو کیا ہوگا بس ہر نماز کے بعد تین ضربیں لگالیا کرو۔ دنیا
کا قاعدہ ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ لوگوں نے اس کو دیکھ دیکھ کر
یہ طریقہ اختیار کرلیا حتیٰ کہ ہر کس و ناکس ہر نماز کے بعد ایسا ہی کرتا ہے۔ گویا ایک رسم

ہے اور دنیا کی اور رسموں کی طرح اس کو بھی پورا کرتے ہیں۔ گویا اس ذکر نے بھی ایک رسم کی صورت اختیار کرلی اور جو اصلی حقیقت اس کی تھی وہ مٹ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا سے اب حقائق مٹ گئے، رسوم باقی رہ گئے۔ مگر ابتداء اس عادت کی ضعفاء کی رعایت تھی۔ اس مذاق کے متعلق ہمارے حضرت ہی کا شعر ہے ؎

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

یعنی وصول کے لئے تو ایک دفعہ بھی اللہ کہہ لینا کافی ہو جاتا ہے کچھ زیادہ ضربیں لگانے ہی پر وصول موقوف نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ تم اپنی ہمت کے موافق طلب ظاہر کرو جتنی جس میں ہمت ہو اس سے زیادہ نہ کرو۔ غرض یہ ہے کہ حضرت کی تعلیم بہت ہی آسان وسہل ہوتی تھی جس سے مرید کو کسی قسم کی گرانی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ نہایت خوشی سے اوراد و اشغال کو انجام دیتے تھے۔ میں تو حضرت کی تعلیم دیکھ دیکھ کر کہا کرتا تھا

برنگ اصحاب صورت را بجو ارباب معنی را بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد

بس کسی کو ہلکا پھلکا کر رکھا تھا۔ وہ ہنستا کھیلتا مقصود پر پہنچتا تھا اور کسی کو خوب جکڑ رکھا تھا۔ وہ احوال و واردات سے مغلوب تھا ؎

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است

کوئی قاعدہ آپ کے یہاں ایسا نہ تھا جس کی پابندی سب پر لازمی تھی۔ کوئی ضابطہ ایسا نہ تھا جس کا اہتمام سب کو ضروری ہوتا بلکہ جس کو جیسا مناسب سمجھا بتلا دیا اور محققانہ شان اس سے ظاہر ہوتی تھی کہ جس کو تھوڑا کام بتلایا اس کو وہ تھوڑا سا بھی اس قدر کافی وافی ہوتا تھا کہ تمام امراض کا دفعیہ اسی سے ہو جاتا کسی اور عمل یا ورد کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ اللہ اکبر! واقعی یہ بڑا دشوار کام ہے اور اس کے لئے بڑے محقق کی ضرورت ہے سب کو ایک لکڑی ہانکنا تو واقعی کی ڈھیل ہے۔

جیسے بعض ڈاکٹر ہوتے ہیں کہ وہ امراض بخار کے واسطے عموماً کونین تجویز کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بخار کس قسم کا ہے۔ فصلی ہے یا وبائی۔ مزاج حار ہے یا بلیس ضعف کس قدر ہے۔ بس ان کی مرغی کی ایک ٹانگ۔ جہاں بخار دیکھا اور کونین دے دی بخلاف

ایک حاذق طبیب یا ماہر ڈاکٹر کے کہ وہ ہر ایک امر کا لحاظ کر لینے کے بعد مناسب دوا دیتا ہے، اگر کونین مناسب ہو گی تو کونین تجویز کریگا ورنہ نہیں یا اس کا مصلح اس کے ساتھ ضرور تجویز کرے گا تاکہ مرض کے اندر شدت نہ ہو اور مریض کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی طرح یہ طرزِ عمل اختیار کرنا بھی ایک بڑے محقق اور باکمال شخص کا کام ہے کہ وہ کافی طور سے اپنے مرید کے حالات سے باخبر ہو جس کو ہر پہلو پر نظر ہو۔

تو اگر کوئی اس قسم کا درشت مزاج پیر اور ایسا ہی سخت مزاج شیخ ہو تا جن کے ہاں مریض کی حالت کی طرف نظر کرنا مخل مقصود شمار کیا جاتا ہے تو وہ یہاں بھی یہی فرماتے کہ خواہ درد ہو یا مرض کچھ بھی ہو مگر جَو کھانا ہرگز نہ چھوٹے سُنّتِ نبوی کو چھوڑنا نا ممکن ہے چاہے جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ اگر مر گئے تو شہید ہو جائیں گے کیونکہ ہمارے واسطے تو عزیمت جَو کھانا اور اُف نہ کرنا ہے۔

جیسے ایک مولوی مولوی صاحب ریل کا سفر کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آیا تو انھوں نے گاڑی سے اُتر کر نماز پڑھنے کا قصد کیا۔ لوگوں نے منع کیا کہ حضرت اس اسٹیشن پر گاڑی زیادہ نہیں ٹھہرے گی، آپ نماز پلیٹ فارم پر نہ پڑھیں بلکہ اندر گاڑی میں آ کر پڑھ لیں۔ انھوں نے فرمایا، واہ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ چلتی گاڑی میں نماز پڑھیں ہم تو یہیں پڑھیں گے چاہے گاڑی چھوٹے یا رہے۔ اس قسم کی تشدد پسند ہستیاں ہمیشہ اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہیں۔ مگر بعضے محقق بھی ہوتے ہیں چنانچہ ایسے مولوی صاحب بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ گاڑی کے اندر ہی گو جگہ تنگ ہی ہو جس طرح سے ممکن ہو نماز ضرور پڑھ لے لیکن اس قسم کی نماز جس میں رکوع یا سجدہ کی بجائے ہجوم کی وجہ سے اشارہ کیا ہو اُس کا اعادہ علیٰ سبیل الاحتیاط کر لینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ اُتر کر ہی پڑھو جیسے اِن مولوی نے کیا تھا۔

اعمال میں عزیمت و رخصت

ان متشدد لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عزیمت پر عمل کرنا اصل حکم شرعی ہے اور محبوب

اجر کثیر ہے اور رخصت پر عمل کرنا موجب تقلیلِ اجر ہے۔ اس لئے وہ رخصت پر عمل نہیں
کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ یہ رخصتیں تو سخت تنگی کے وقت عوام کے لئے ہیں کہ وہ احکام
شرعیہ کی سختی سے تنگ دل نہ ہوں۔ اور ہم تو خواص ہیں۔ ہم خواہ مخواہ کیوں اپنے کو اجر قلیل
کا مستحق بنائیں۔

لیکن یہ ان کی سخت غلطی ہے کہ وہ رخصت کو اصل حکمِ شرعی نہیں سمجھتے۔ نیز اس کو
موجب اجرِ قلیل خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ نصوص فقہیہ صراحتہً اس کے مخالف ہیں یہ مسئلہ
مجمع علیہ ہے کہ رخصت و عزیمت جب کہ اپنے موقع پر ہوں اجر میں برابر ہیں اور دونوں
حکم شرعی ہیں اور ہر ایک حکم اپنی خاص حالت کے واسطے حکم اصلی ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال
ہے کہ خواص کے واسطے عزیمت پر عمل کرنا اولیٰ و انسب ہے بہ نسبت رخصت کے۔
لیکن اپنا تو یہ خیال ہے کہ خواص کو بعض مواقع رخصت پر بہ نسبت عزیمت کے رخصت پر ہی
عمل کرنا اولیٰ و انسب معلوم ہوتا ہے۔

اس وجہ سے کہ خواص کے طرزِ عمل کو عوام اپنے واسطے نقشہ عمل سمجھتے ہیں۔ ان کی پیروی
جمیع افعال و عبادات میں کرتے ہیں تو جب کہ خواص ایسے مواقع رخصت میں عزیمت پر
عمل کریں گے اور عوام کو رخصت پر عمل کرنے کی تعلیم کریں گے تو عوام سمجھیں گے کہ اصلی حکم
شریعت کا یہی ہے جس کو یہ لوگ کرتے ہیں اور یہ سہل احکام بوجہ سہولت اور آسانی کے
ہم کو تعلیم فرماتے گئے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ایک مقدمہ وہ اپنی طرف سے لگا لیتے ہیں کہ
اچھی سہولت ہوئی کہ ایک طرف جس قدر آسانی بڑھائی دوسری طرف اسی قدر ثواب کم کر لیا۔
اب وہ عوام شکنجہ میں ہیں کہ اگر عزیمت پر عمل کرتے ہیں تو دشواری میں پڑتے ہیں اگرچہ اجر
کثیر ملتا ہے اور اگر رخصت پر عمل کرتے ہیں تو اس میں سہولت تو اگرچہ ہے مگر اجر کثیر
ہاتھ سے جاتا ہے تو ان کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ایسی آسانی سے تو وہ سختی ہی اچھی تھی
کہ اس میں یکسوئی اور اطمینان تو ایک جانب پر تھا۔ اگرچہ سختی و تشدد ہی تھا۔ مگر اب
تو ایک گو مگو کی حالت ہو گئی کہ اسے اختیار کریں یا نہ کریں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ
شریعت نے ہماری مصلحت و منفعت کی تکمیل نہیں فرمائی۔ لہٰذا اس قسم کے شبہات سے

بچانے اور اعتقادِ عوام کو صحیح و سالم رکھنے کے واسطے مناسب یہ ہے کہ خواص بھی رخصت پر عمل کریں۔ اور سخت تعجب ہے کہ خواص اپنی خصوصیت کی وجہ سے اپنے واسطے عزیمت کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ اخص الخواص اور احکام خداوندی پر جان دینے والے تھے جن کے نزدیک مشکل سے مشکل کام آسان تھا اور اعلیٰ درجہ کی مشقت بھی سہل تھی آپ نے مواقع رخصت میں رخصت ہی پر عمل کیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے:

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما حتی۔

کہ بعض اوقات صحابہؓ نے رخصت کو سہل سمجھ کر یہ خیال کیا کہ شاید رخصت آپؐ کے ساتھ ہی خاص ہوگی کیونکہ آپؐ کا بڑا درجہ ہے۔ آپ کو زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہیں اور یہ خصوصیت ظاہر ہے کہ ہم میں نہیں۔ کجا ہم اور کجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

لہٰذا ہم اس آسانی اور سہولت کے مستحق نہیں۔ ہم کو زیادہ مجاہدہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے رخصت پر عمل کرنے سے احتراز کیا اور چاہا کہ عزیمت پر ہی عمل کریں تو آپؐ نے ان کا یہ ارادہ معلوم کر کے فرمایا کہ:

ما بال اقوام یتنزھون عن الشئ اصنعہ فواللہ انی
لاعلمھم باللہ واشدھم لہ خشیۃ۔ (متفق علیہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کے ایسے ہی قول و ارادہ کے موقع پر فرمایا تھا:

انتم الذین قلتم کذا و کذا اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکن اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (متفق علیہ)

چنانچہ صحابہ نے آپ کے فرمانے کے بعد رخصت ہی پر عمل کیا۔ تو جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت پر عمل کیا ہے اور صحابہ کو اس پر عمل کرنے کے واسطے امر فرمایا تو یہ خیال کرنا کہ خواص کو مواقع رخصت میں عزیمت پر عمل کرنا مناسب ہے ایک بدیہی غلطی ہے کیا کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ آنحضرتؐ یا صحابہ کرامؓ اعمال شاقہ پر عمل کرنے سے دل تنگ

ہونے والے یا شدائد میں پڑنے سے جان چُرانے والے تھے۔ خیال تو گویا ایسا وہم بھی معصیت ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ مواقع رخصت میں رخصت ہی اصل حکم شرعی ہے۔ لہٰذا ہر زمانہ کے خواص کو مناسب ہے کہ وہ خود بھی مسنون مواقع پر رخصتوں پر عمل کر کے فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی تعلیم کریں کہ وہ بھی ان خداداد سہولتوں سے فائدہ مند ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ رخصت اصلی حکم شرعی نہیں اور نہ اس کا خیال کسی دوسرے کو ہونے دیں۔ نہ کسی اپنے قول سے نہ کسی فعل سے تاکہ لوگوں کی احکام شرعیہ پر عمل پیرا ہونے کی رغبت بڑھے اور نہایت فرحت اور انبساط کے ساتھ احکام کو قبول کریں۔

جیسے دیوبند کے دو بزرگوں کا واقعہ ہے جن میں ایک اکبر تھے دوسرے کبیر۔ وہ اکبر مرض وفات میں وضو کیا کرتے تھے۔ ان سے کبیر نے کہا کہ حضرت آپ وضو ایسی حالت میں کیوں کرتے ہیں۔ آپ کے واسطے تو اس وقت تیمم کرنا جائز ہے۔ آپ تیمم کیجیے تاکہ اس مشقت سے نجات ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں عزیمت پر عمل کرتا ہوں۔ ان کبیر نے کہا کہ مولانا اس وقت آپ کا تیمم نہ کرنا اس خیال سے ناشی ہے کہ آپ تیمم کو وضو کے برابر طہارت کاملہ نہیں سمجھتے ناقص سمجھتے ہیں اور یہ درحقیقت شریعت پر ایک اعتراض ہے کہ شریعت نے ایک عملِ ناقص کو ہمارے لئے تجویز فرمایا اور اس خیال سے عزیمت پر عمل کرنا باعثِ اجر ہی ہوا۔ چنانچہ وہ سمجھ گئے اور پھر رخصت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

تو دیکھیے! تیمم کرنا جائز تھا۔ ان بزرگ نے اس پر عمل نہ کیا اور برابر عزیمت پر عمل کرتے رہے اور وضو کو ہی اصل حکم شرعی سمجھتے رہے حالانکہ قرآن شریف میں خداوند تعالیٰ نے ایسے مواقع تکلیف میں تیمم کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان مواقع میں تیمم وہی کام دیتا ہے جو وضو سے ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح وضو کرنے سے طہارت کاملہ حاصل ہوتی ہے اسی طرح تیمم کرنے سے بھی طہارتِ کاملہ حاصل ہو جاتی ہے۔

شکر کی توفیق اور اس کا طریقہ

چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اجازتِ تیمم کے بعد اس کی علت تطہیر و اتمامِ نعمت بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ

جس سے معلوم ہوا کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل ہو جاتی ہے اور اس میں ایک اور مزید انعام ہے جو اس وقت کے وضو میں نہ تھا یعنی اتمام نعمت (بالتفسیر الآتی) گویا تطہیر کے ساتھ ہی اتمام نعمت بھی مقصود ہے چنانچہ اسی اتمام نعمت پر لعلکم تشکرون کا ترتب فرمایا ہے۔ یہ سب سے بڑا نکتہ ہے رخصت میں اور اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ ہمارا مقصود تم پر انعام واحسان کرنا بھی ہے تاکہ تم کو دل وجان سے شکر کی توفیق ہو۔ اس وجہ سے کہ جب تم تیمم کرو گے اور یہ تیمم ہمارا ایک انعام اور احسان ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی پر احسان کرتا ہے یا انعام دیتا ہے تو منعم علیہ منعم کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ لہٰذا تیمم کر کے بے ساختہ ہمارا شکریہ ادا کرو گے کہ سبحان اللہ! کیسی رحمت اور شفقت ہے کہ حق تعالیٰ ہماری تکلیف کو گوارا نہیں فرماتے۔ قدم قدم پر آسانی کر دی ہے۔ یہ بات وضو کر کے بھلا کہاں حاصل ہوتی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میاں اشرف علی! پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو۔ گرم پانی نہ پیا کرو کیونکہ گرم پانی پیو گے تو اگرچہ زبان سے الحمد للہ نکلے گا لیکن اندر سے دل شریک نہ ہوگا یعنی شکر ادا نہ ہوگا۔ اور اگر ٹھنڈا پانی پیو گے تو ایک زبان ہی سے الحمد للہ نہ نکلے گا بلکہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ دل باغ باغ ہوگا۔ اب جو شکر ادا ہوگا وہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔

تو اسی طرح وضو کرنے میں سخت دشواری ومشقت پیش آنے کا یقین ہے اور دل وضو کرنے سے گھبراتا ہے تو ایسے وقت تیمم کرنے سے کس قدر طبیعت خوش ہوگی اور کس قدر شکر ادا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس رخصت کی بدولت سردی سے بچے۔ طرح طرح کی کلفتوں سے نجات ملی۔ اگرچہ وضو کر لینا بھی ممکن تھا جو کچھ ہوتا دیکھا جاتا لیکن دقت ظاہر اور مرض کا ظن غالب دل کو پریشان کرنے کے واسطے کافی تھا۔ غرض تیمم کے وقت تیمم کرنے سے لازمی طور پر دل سے شکر نکلتا ہے اور ایک شکر نہیں بلکہ ہر رگ وپے اور ہر سانس سے شکر ہی شکر خداوند تعالیٰ کا ادا ہوتا ہے۔

اور یہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ شکر باعثِ ازدیادِ محبت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ شکر کا ترتب نعمت و احسان پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ منعم و منعم علیہ میں ازدیادِ محبت کا اعلیٰ ذریعہ مشاہدہ احسان و نعمت ہوتا ہے۔ لہٰذا شکر بھی دلیل ازدیادِ محبت ہے اور ہر فرد بشر اور ہر رہرو طریقہ کا مقصود محبتِ خداوندی ہے تو رخصت میں اس بارے میں ایک مصلحت یہ ہوئی کہ اس سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے۔

مصائب کی قسمیں

مگر اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ کیا مصائب سے محبت نہیں بڑھتی۔ عارفین اہلِ مصیبت تو مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہم کو تو مصیبت موجب ازدیادِ محبت ہوتی ہے۔ تو سمجھ لو کہ مصیبت بھی زیادتی محبت کا سبب ہوتی ہے لیکن سب مصائب نہیں بلکہ بعض۔ اور بعض مصائب موجب ازدیادِ محبت نہیں ہوتے۔ اب رہا اس کا معیار اور مصائب موجب للمحبۃ و غیر موجب للمحبۃ میں طریقِ امتیاز سو سمجھو کہ مصائب دو قسم کے ہیں:

ایک تو وہ مصائب جو منجانب اللہ نازل ہوتے ہیں جن میں بندے کے کسب کو بالکل دخل نہیں ہوتا بلکہ ان کا منشا محض مشیتِ ایزدی ہوتی ہے۔ اس قسم کے مصائب تو واقعی اہلِ محبت کے لئے ہمیشہ موجب ازدیادِ محبت ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ محبت میں سے بعض لوگوں کے ماں باپ عزیز و اقارب مرتے ہیں اور اس سے ان کو کلفت بھی ہوتی ہے لیکن ان کا جو معاملہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے بحالہٖ باقی رہتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا نقصان نہیں آتا کیونکہ انہیں یقین ہے کہ خدا نے اس کی عمر اتنی ہی لکھی تھی۔ اس کی موت اسی وقت مقرر تھی۔ اپنی موت سے مرگیا۔

اور ایک وہ مصائب ہوتے ہیں جو بندہ پر اس کے کسبِ اختیاری سے آتے ہیں خود وہ یا اس فعل کا نزولِ مصائب کا سبب بنتا ہے۔ اس قسم کے مصائب موجب ازدیادِ محبت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص باوجود تیمم کے جائز ہونے کے وضو کرے اور کہے کہ یہ عمل شاق ہے۔ اس سے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے اس لئے اس سے محبت خداوند تعالیٰ کی بڑھے

گی۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ بھئی اس وقت ہم نے باوجود مشقت کے وضو کیا تھا تو خوب مزہ آیا۔ طبیعت خوش ہو گئی، قلب منور ہو گیا، تو وہ سمجھ لے کہ یہ بھی نفس کا ایک بہت بڑا وسوسہ ہے کہ انسان اس سرور و لطف کو سرورِ محبت خداوندی سمجھتا ہے حالانکہ یہ سرور محض حظِ نفس ہے اور یہ نور محض عجبِ نفس کی روشنی ہے۔ یہ بھی نفس کی ایک زبردست تلبیس اور مکاری ہے کہ وہ اس نور کو نورِ الٰہی اور اس سرور کو سرورِ محبت خداوندی بتلاتا ہے حالانکہ اس سرور کا منشاء صرف اپنی ہمت پر ناز کرنا ہے ورنہ اصل سرور وہ ہے جو انسان کو حدودِ شرعیہ میں رہ کر عمل کرنے سے حاصل ہو اور اس پر فرحت بخش اثر ظاہر ہو۔ وہی ہے نورِ حقیقی جس کو محبتِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کہ مقصودِ سالک ہے۔ اسی طرح یہاں اگر کوئی ایسا ہی نفس کے فریب میں پھنسا ہوا ہوتا تو کہتا کہ جو بھی کھاؤ بجائے مرچی کیوں نہ جاؤ اس میں ایسی لذت ہو گی جو تمام لذائذ حیات سے بہتر ہے اور ایسا لطف آئیگا کہ تمام عمر اس کا سرور نہ جائے گا محبت الٰہی سے سینہ روشن ہو جائیگا۔ مگر یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بس یہی کہ چند روز عمل کرنے کے بعد سنت سے انقباض ہو جاتا ہے۔ سنت کی وہ وقعت جو ابتداء میں بغیر عمل کئے تھی، وہ بھی نہ رہتی۔ گویا عمل بالسنت مفضی ہوتا ترکِ سنت بلکہ انقباض عن السنۃ کی طرف اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہے۔

عزیمت و رخصت کی واضح مثال

اس وقت ایک اور دقیقہ یاد آیا جس سے اس مقام کی توضیح میں کافی بصیرت ہو جائیگی۔ وہ یہ کہ جو شخص کسی فعل عزیمت کو اختیار کرتا ہے اور اعمال شاقہ پر عمل کرتا ہے تو اس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس عمل سے فارغ ہو کر ثمرات کا انتظار شروع کر دیتا ہے اور ثمرات بھی وہ اعلیٰ پیمانہ کے جو اس عمل کے مناسب ہوں یعنی خیال کرتا ہے کہ میری مشقت اور کام کی دشواری تو ظاہر ہے۔ لہٰذا اس مشقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھ کو ثمرہ مساوی ملنا چاہیے۔ بخلاف اس شخص کے جو رخصت اور امرِ سہل پر عمل کرے گا۔ یہ شخص نہ تو اس عمل سے فارغ ہو کر ثمرہ کا منتظر ہو گا اور نہ کسی خاص اثر اور نتیجہ کا طالب ہو گا۔ اس

وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے[1] کہ میں نے عمل ہی کیا کیا ہے میں نے تو خود ہی رخصت پر عمل کیا ہے اور سہولت و آسانی کو تلاش کیا ہے جب کوئی کام ہی نہیں کیا تو ثمرات ہی کیا ملتے۔

مثلاً ایک شخص ہے کہ دس پانچ ہزار بار ورد اسم ذات کرتا ہے لیکن ساتھ میں سوتا بھی ہے کھاتا بھی ہے پیتا بھی۔ دیگر مشاغل دنیوی کو بھی انجام دیتا ہے غرضیکہ وہ عمل کرتا ہے لیکن اس سہولت کے ساتھ کہ نفس پر شاق نہیں گزرتا۔ اور ایک وہ شخص ہے جو کہ اعلیٰ مقدار پر ذکر اسم ذات کرتا ہے اور مجاہدہ بھی کرتا ہے سوتا بھی نہیں۔ کھاتا بھی سد رمق ہی کھاتا ہے۔ مشاغل دنیوی سے احتراز کرتا ہے۔ تعلقات دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ غرضیکہ اعلیٰ پیمانہ پر سلوک کو طے کر رہا ہے۔ جمیع مندوبات اور ضروریات پر نہایت پابندی سے عمل کرتا ہے۔ یہ شخص اپنے ہر ہر فعل اور ہر ہر مجاہدہ کے بعد منتظر ثمرۂ عظیمہ وانعامات کثیرہ کا رہتا ہے اور انتظار ہی نہیں بلکہ وہ خود بخود ہی اپنے اعمال کی مشقت کو دیکھ کر ثمرات و انعامات کا تعین بھی کر دیتا ہے کہ مجھے کشف ہو لیسا ہو واردات ہوں مراتب علیا حاصل ہوں اور جس قدر انتظار کی گھڑیاں زیادہ گزرتی جاتی ہیں اور ان ثمرات مجوزہ کے حاصل ہونے میں دیر لگتی ہے تو یہ شخص منقبض ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس قسم کے ثمرات میرے ان اعمال پر مرتب ہونے چاہئیں تھے جن کا میں مستحق تھا مجھے وہ نہیں ملا بلکہ استحقاق سے کم دیا گیا حق شناسی سے کام نہیں لیا گیا۔

بخلاف اول الذکر شخص کے کہ وہ کسی امر کا منتظر نہیں اور خیال کرتا ہے کہ میں نے کیا ہی کیا ہے جو مجھ کو انعام ملے یا کوئی ثمرہ مرتب ہو۔ اب اس حالت میں اس کو جو کچھ بھی ملے گا اس کو غنیمت سمجھے گا اور انعام ایزدی و فضل یزدانی سمجھے گا اور اس نعمت و احسان پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے گا کہ منعم حقیقی نے مجھ کو نعمت بے کراں عطا فرمائی جس کا میں مستحق بھی نہ تھا۔ غرضیکہ یہ ہمیشہ شاکر رہے گا اور وہ شاکی۔

---

[1] قلت وتصویب ھذا الظن نیاتی بامر فیما قیل ان من بنی امہ الرخصۃ ناقصۃ عن العزیمۃ سقط عن درجۃ اکمال الواجب ان یرلھما متساویین تلیخص۔ ۱۲- ظ۔

قلت لفی النقص عن الرخصۃ کان باعتبار الاجر واثبات النقص لھما انما ھو باعتبار حقیقتھما۔ ۱۲- اشرف

لیا کہ جو کھائے۔ گو ہم نے مساوات شانِ نبویؐ و صحابہؓ کا دعویٰ کیا کہ جو امر اُن کی شایانِ شان تھا اس کو اختیار کیا۔ حالانکہ ہم میں وہ قوت کہاں ہے کہ اس قسم کا مجاہدہ کر سکیں یہ انہیں حضرات کی ہمتیں تھیں جو ہم لوگوں کے واسطے نمونہ عبرت بلیغ کر گئے۔ غرض عمل بالسنۃ کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کے حکم کی مخالفت نہ ہو۔ باقی عمل میں پوری طرح مطابقت لازم نہیں کہ عادات و معمولات کو بعینہا ادا کیا جائے۔

پس ما انا علیہ و اصحابی کے اعوام و اطلاق پر جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ آج کل جس قدر ملبوسات و ماکولات ہیں یہ ترتیب ہی سنتِ نبویؐ و تعامل صحابہ کے خلاف ہیں۔ تو سندھستانی جوتا بھی ما انا علیہ کے تحت میں داخل نہیں جس طرح انگریزی داخل نہیں اور اسی طرح اچکن انگرکھے جس طرح کوٹ پتلون داخل نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس زمانہ کے مولوی ہم کو کوٹ پتلون اتارنے پر مجبور کرتے ہیں اور خود اچکنیں اور انگرکھے نہیں اتارتے۔ سو بفضلہ تعالیٰ اس تقریر سے اس شبہ کا دفعیہ طالبِ حق کے واسطے کافی ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ ما کے تحت میں دو قسم کے امور داخل ہیں۔ ایک فعلی یعنی جس پر تعامل آنحضرتؐ اور صحابہؓ کا رہا ہے اور ایک قولی یعنی جس پر عمل تو آپ کا ثابت نہیں لیکن ان کی اجازت صراحتہً آپ نے دی ہے یا کسی کلیہ کے تحت میں داخل ہیں بشرطیکہ کوئی دلیل شرعی حرمت کی موجود نہ ہو۔ پس اس اصل پر سندھستانی جوتا تو اجازت کے تحت میں آ سکتا ہے بخلاف انگریزی جوتہ کے کہ اس میں تشبیہ بالکفار علت حرمت موجود ہے۔ اس کا جواز کسی طرح ثابت نہیں۔

مگر پھر بھی بعض لوگ اہلِ حق ہونے کا دعویٰ کر کے لباس و وضع میں اہلِ حق کا طرز اختیار نہیں کرتے حالانکہ معیار اہلِ حق ہونے کا اور فرقہ ناجیہ کے زمرہ میں داخل ہونے کا یہی تھا کہ جمیع امور میں ما انا علیہ و اصحابی پر عامل ہوں۔ اس کے جمیع اجزاء کو ضروری اور لازمی سمجھنا چاہیے کسی ایک جزو کو کافی سمجھ کر دوسرے جزو کو نہ چھوڑ دینا چاہیے جیسے ان حضرات نے جملہ امور میں سے اصول اصول اور جزو اعظم یعنی اعتقادات کو کافی سمجھ کر تصحیح اعتقاد ہی کو معیار اہلِ حق ہونے کا بنا رکھا ہے اور اپنی جماعت میں ہر صحیح الاعتقاد شخص کو بلا تعرض افعال و اعمال کے داخل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نص شرعی کے صریح مخالف ہے۔

علم سے مقصود عمل ہی ہوتا ہے

جیسا اوپر مذکور ہو چکا اسی اصل پر اس آیت کا مضمون ہے جس کی تلاوت کی گئی۔ اس میں بتلا دیا گیا کہ محض علم کافی نہیں عمل بھی ضروری ہے۔ اس پر تنبیہ کرنے کے لئے صرف اثباتِ آخرت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی دنیا کی خست و دنائت کو بھی بیان فرمایا تاکہ اس کا استحضار مفضی الی العمل ہو جیسا کہ اس کا ابھی بیان ہو چکا ہے کہ علم سے مقصود عمل ہی ہوتا ہے اور میں یہ دعویٰ ہر علم میں کرتا ہوں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ماھذہ الحیوۃ الدنیا الخ کا بیان کرنا صاف دلیل ہے اس امر کی کہ مقصود محض اعتقادِ وقوعِ آخرت نہیں بلکہ اعراض عن الدنیا و استحضار فناءِ دنیا بھی مقصود ہے ورنہ اگر صرف اعتقادِ معاد ہی مقصود ہوتا تو اس مضمون کے ادا کرنے کے واسطے تو آیت: ان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ بہت کافی تھی باوجود اس کے پھر اس جگہ اس مضمون کو اس آیت کے ذیل میں بیان کرنا میرے دعوے کی روشن دلیل ہے ورنہ لازم آئے گا کہ یہ آیت بلا کسی فائدہ کے طول لاطائل میں داخل ہو حالانکہ اس قسم کا خیال کرنا بھی کلام باری کی نسبت معصیت ہے۔

علوم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا علم فی نفسہٖ بھی مقصود ہے اور دوسری قسم وہ جن کا علم مقصود برائے اعمال ہے۔ ان دو قسموں میں سے ثانی قسم میں تو ہم اور عامہ اہلِ علم دونوں شریک ہیں کہ جس طرح ہم اس جگہ اعمال و علوم دونوں کو مقصود قرار دیتے ہیں اسی طرح وہ بھی ہماری موافقت کرتے ہیں اور دونوں کو مقصود میں داخل کرتے ہیں گو تنقیہ وغیرہ کا فرق ہو۔ مثلاً طریقۂ وضو کا علم حاصل کرنا کہ یہ خود مقصود بالذات نہیں بلکہ اس وجہ سے مقصود ہے کہ یہ طریقہ ادائے فرض کا جو شروطِ صلوٰۃ میں سے ہے۔ لہٰذا صرف وضو کے طریقہ کا جان لینا اتفاقاً کافی نہ ہوگا بلکہ وضو کر کے جب نماز ادا کر لی جاوے گی اس وقت مقصود کی تکمیل ہوگی۔ یہ مسئلہ تو مجمع علیہ و مسلّم ہے۔

رہی پہلی قسم علم کی جس کا علم فی نفسہٖ بھی مقصود ہے اس میں عامّہ اہلِ علم صرف

علوم ہی کو مقصود قرار دیتے ہیں اور ان کو اعمال کے لئے کسی درجہ میں مقصود نہیں سمجھتے جیسا کہ مسئلہ مبحوث عنہ سے واضح ہے۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ گو علوم مقصود اصلی اول مطلوب بالذات ہیں لیکن اعمال بھی مقصودیت میں شرکت رکھتے ہیں۔ اور انکی تعلیم اس لئے بھی کی گئی ہے تاکہ اعمال میں ان سے کام لیا جائے بغیر اس کے تکمیل مقصود نہیں ہوتی۔

مسئلۂ تقدیر

چنانچہ سورہ حدید کی ایک آیت سے اس مضمون کا پتا چلتا ہے۔ خداوند تعالیٰ مسئلۂ تقدیر کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ الخ

یعنی جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے خواہ وہ تصرف نفوس میں ہو یا اس کے ماسوا میں یہ سب کچھ کتاب خداوندی میں قبل از پیدائش خلق لکھا جا چکا ہے۔ لہٰذا کوئی تصرف دنیا میں مخالف مرقوم فی الکتاب کے نہیں ہو سکتا۔ آگے اس کتابت کی غائیت بیان فرماتے ہیں:

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ

یہ لام متعلق ہے اخبر کے یعنی تم کو ہم نے جو یہ مسئلہ تعلیم کیا ہے اور تحریر فی الکتاب کی اطلاع دی ہے۔ اس کی غرض و غائیت یہ ہے کہ اس علم کے بعد اشیاء مفقودہ پر تم کو حزن وملال نہ ہو اور اشیاء حاصلہ و موجودہ پر فرحت بصورت تکبر و غرور نہ ہو۔

اور فقدان اشیاء مرغوبہ پر تاسف و رنج و ملال کا نہ ہونا معنون اول حاصل ہے صبر کا اور صبر ایک مامور بہ ہے۔ لہٰذا اس نہی عن الحزن سے مقصود مراتب صبر کا گویا حاصل یہ نکلا عمل صبر کی تکمیل کی غرض سے ہم نے تم کو مسئلہ قدر کی اطلاع دی ہے تکمیل صبر کے واسطے یہ خبر لازمی ہے کیونکہ بدون مسئلہ قدر کے مسئلہ صبر تام نہیں ہوتا ان دونوں میں اچھا خاصہ علاقہ لزوم ہے۔

چنانچہ اس لزوم کے واسطے مشاہدات مؤید ہیں کہ اگر آج کسی قائل تقدیر اور

کسی مومن بالقدر کا لڑکا مر جاوے اس کو صبر بہت جلد حاصل ہو جائیگا بخلاف ایک منکرِ تقدیر کے کہ وہ ہمیشہ اس اندوہناک حادثہ پر قلق و تاسف میں رہے گا کہ افسوس! علاج میں قصور ہوا۔ فلاں حکیم کا علاج کرتا تو ضرور آرام ہو جاتا۔ فلانے ڈاکٹر کے علاج سے فلاں مریض کو آرام ہوا تھا۔ اگر میں بھی اس کا علاج کرتا تو یقیناً آرام ہوتا۔ غرض یہ حسرت اس کے واسطے لازم غیر منفک ہو جائیگی۔ اور کس طرح زائل ہو سکتی ہے جب کہ خود ارشادِ باری تعالیٰ اس قسم کے باطل العقیدہ لوگوں کے متعلق یہ ہے:

لیجعل اللہ ذلک حسرۃ فی قلوبھم

تقریر مقام کی یہ ہے کہ منافقین جو یہ کہتے ہیں کہ:

لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا۔ الخ

یہ کہنا ان کا محض عدم ایمان علی القدر کی دلیل ہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ اگر تمہارا یہی خیال ہے کہ ان مقتولین کے قتل کا باعث ان کا میدانِ مبارزت میں جنگ کی غرض سے جانا ہے اور اپنے شہروں اور مکانوں میں رہنا موت سے بچا سکتا ہے تو پھر مہربانی کر کے ذرا تم اپنے نفسوں سے تو موت کو روک دو۔ تم تو کہیں میدانِ کارزار میں نہیں جاتے۔ پھر گھروں میں بیٹھے بیٹھے کیوں مر جاتے ہو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ نہ میدانِ کارزار میں جانا موجبِ موت ہو سکتا ہے اور نہ گھر میں رہنا مانع ہو سکتا ہے بلکہ موت تو خدا کے اختیار میں ہے۔ اور مرقوم فی الکتاب ہے جس وقت اجلِ مقررہ تمام ہو جائیگی خواہ مکانوں کی بند کوٹھریوں میں ہوں خواہ میدانِ کارزار میں ہوں موت کے چنگل سے رستگاری ہرگز نہیں ہو سکتی ولو کنتم فی بروج مشیدۃ۔

منکرِ تقدیر بے صبرا ہوگا

لیکن چونکہ یہ منافق منکرین تقدیر ہیں اس وجہ سے ان کو حکمِ خداوندی پر صبر آ نہیں سکتا بلکہ ہمیشہ حسرت ہی میں مریں گے کہ ہمارے عزیز میدان میں نہ جاتے تو مارے نہ جاتے زندہ ہی رہتے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شخص منکرِ تقدیر ہے اس کو کبھی صبر نہیں آئیگا

بلکہ ہمیشہ قلق و اضطراب میں رہے گا اور علاج ہی کی کوتاہی اور تدبیر علاج ہی کا قصور بتلاتا رہے گا۔ بخلاف اس شخص کے جو سچے دل سے تقدیر پر ایمان لایا ہے اور تمام تغیرات و تصرفات احیاء و اماتت کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور مرقوم فی الکتاب ہونے کا قائل ہے۔ گو یہ شخص بھی باقتضاء طبعی وفاۃ ولد و زوجہ وغیرہ پر حزن و ملال کا اثر اپنے قلب میں پائیگا اور اس کا نفس بھی کسی وقت نقص علاج وغیرہ کو سبب بنا کر پیش کریگا لیکن معاً اس کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ درحقیقت اس کا وقت ہی آگیا تھا۔ حیاتِ مستعار ختم ہو چکی تھی۔ اور اسے نفس! جس طرح اس کی عزیز عمر اسی ساعت تک مقدر تھی اور اس کے بعد کوئی سانس اس کے واسطے باقی نہیں رہا تھا اسی طرح نقصِ علاج بھی اس کے واسطے مقدر تھا اور جب اس کی موت کے واسطے خداوند تعالیٰ نے عالمِ ظاہر میں نقصِ علاج ہی کو علت بنایا تھا تو کوئی قوت دنیا میں ایسی نہ تھی جو اس کے نقصانِ علاج کو پورا کر دیتی۔ پس اس کے بعد اس کو صبر آجائیگا اور کسی قسم کا رنج و ملال، قلق و اضطراب کا اثر اس کے قلب پر نہ رہے گا۔

غرض دیکھئے کہ اگرچہ مسئلہ قدر ان مسائل میں سے ہے جن کا علم مقصود بالذات ہوتا ہے اور جن کا علم جزوِ ایمان ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے تکمیلِ صبر کا بھی مقصود ہونا نص سے ثابت ہے جو کہ منجملہ دیگر اعمال کے ایک عمل ہے۔ لہٰذا اس آیت سے تائید ہوتی ہے میرے اس قول کی کہ علوم مقصودہ فی حد ذاتہا بھی تتمیم اعمال میں مؤثر ہیں اور ان کی تعلیم سے اصلاحِ اعمال بھی مقصود ہے۔ پس دراصل صحیح الاعتقاد وہ ہے جس کے اعتقاد کا اثر عمل میں بھی ظاہر ہو گیا ورنہ وہ ناقص الاعتقاد ہے اور اصل معنی میں صحیح الاعتقاد نہیں۔

نیز اس مضمون کی تائید ایک حدیث نبوی ؐ سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خداوند ذوالجلال والاکرام آخر شب میں نزول فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خبر ہے مقصود اس سے نزولِ خداوندی کی اطلاع دینی ہے لیکن اس کو موقع احیاء لیل میں فرمانا دلیل ہے اس کی کہ اس سے محض خبر ہی مقصود نہیں بلکہ مقصود اصل سے ترغیب ہے قیام لیل اور صلوٰۃ تہجد کی۔ حالانکہ یہ علم تجلی حق بھی ان علوم میں سے ہے جو اعتقادی کہلاتے ہیں لیکن اس کی غایت بھی تکمیل ہے ایک عمل کی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جمیع علوم خواہ وہ

مقصود فی حد ذاتہا ہوں یا نہ ہوں ان سے اعمال بھی ضرور مقصود ہیں۔ اسی طرح آیت ہٰتکلوہٗ میں جیسا علم مقصود ہے یعنی اعتقاد آخرت، اسی طرح یہ عمل بھی مقصود ہے یعنی اعراض عن الدنیا۔

اسرارِ خداوندی کا تجسس

مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اعمال سے تعرض ہی نہیں کرتے۔ ہماری تحقیقات کا دروازہ اور ہماری کوششوں کا مرکز صرف علوم ہی ہیں ہمیشہ ذات وصفات کے مسئلہ میں الجھتے رہتے ہیں۔ آج نزول کے مسئلہ کو ثابت کیا ہے تو کل بھی دانیال کے ثبوت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے فرصت ملی تو استواء علی العرش کے مسئلہ کی فکر میں ہیں اور تمام اشکالات و استحالات عقلیہ کو خود ہی وارد کرتے ہیں اور خود ہی ان کے حلّات تجویز کرتے ہیں حالانکہ یہ بحث ومباحثہ اور ان مسائل کے اندر تحقیقات وتدقیقات کا چھانٹنا بر خود خلاف سنّت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان علوم کے اندر گفتگو کرنے کے متعلق فرمایا ہے کہ ابہموا ما ابہمہ اللہ تعالیٰ یعنی جس مسئلہ کو خود خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور واضح نہیں فرمایا تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو تمہارا امتثال امر یہی ہے کہ تم اس کے مبہم کو مبہم سمجھتے ہوئے ایمان لے آؤ۔

ایک بزرگ نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ حضورؐ سے معراج کی شب کیا کیا باتیں ہوئیں اور کیا واقعات پیش آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

یعنی جب خداوند تعالیٰ نے ان واقعات واسرار کو فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ میں مبہم رکھا ہے تو ہماری کیا مجال ہے کہ ہم کچھ لب کشائی کر سکیں۔ جب ان کے ہاں اتنا ابہام مدِ نظر ہے تو ہم ان کے خلاف سنّت کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ جو امور ہمارے سامنے وضاحت وتفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں ان کی مفصل تحقیق کریں اور جن چیزوں کو ہمیں نہیں بتلایا گیا اور ابہام ہی کو مصلحت سمجھا گیا ہے اس

پر ابہام ہی کے ساتھ ایمان لا کر الذین یومنون بالغیب کے مقبول زمرہ میں داخل ہوں نہ یہ کہ ہم اس کی تحقیق و تنقیح کے درپے ہو جاویں اور عقل کے گھوڑے دوڑائیں۔

ہماری مثال تو ایسی ہونی چاہیے جیسے کوئی شخص کسی کے ہاں مہمان ہو اور میزبان نے اس کو اپنا ایک بہت بڑا وسیع مکان قیام کے واسطے جس کے متعدد کمرے عجیب عجیب سامانوں سے مملو ہیں اور نادر نادر چیزوں سے لبریز ہیں لیکن یہ کہہ دیا کہ یہ چار کمرے جن کے دروازے کھلے ہوتے ہیں ان کی سیر و تفریح سے تم اپنا دل بہلاؤ اور جن کمروں کے در بند ہیں ان کو نہ کھولنا۔ اب ہم کو چاہیے کہ جن کمروں کی سیر و تفریح کی ہمیں اجازت دی گئی ہے ان کی سیر و سیاحت سے تو ہم اپنا دل بہلائیں اور جن کمروں کے کھولنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے ان کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اگر ہم ان چاروں دروازوں کے بھی قفل توڑ ڈالیں گے یا اُن کے بند کرنے کی علت دریافت کریں گے کہ یہ کیوں بند ہیں اور یہ کیوں کھلے ہیں تو یہ خلاف تہذیب اور اخلاقی جرم سمجھا جائے گا۔

اسی طرح جن امور کی تحقیق اور غور و خوض کا دروازہ بغرض افہام و تفہیم کے کھول دیا گیا ہے۔ ان میں ہم کو بحث و مباحثہ کرنا چاہیے اور جن امور کے متعلق لب کشائی کرنے سے ہم کو منع کر دیا گیا ہے ان میں ہمارا کلام کرنا دخل در معقولات اور معصیت و نافرمانی سمجھا جائے گا۔ اور انحراف امتثال امر میں داخل ہو گا۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

کیا مجال ہے کسی کی کہ ان اسرار و رموز کی حقیقت کو معلوم کر سکے۔ کیا ہستی ہے ہمارے عقول کی کہ ایسی پرخطر راہ میں قدم رکھ سکے۔ اسرار خداوندی میں قدم رکھنا قوت بشریہ سے خارج ہے۔ ذات و صفات خداوندی کی کنہ معلوم کرنا امکان سے باہر ہے حتیٰ کہ جمیع عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ علم بالکنہ خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات کا ممتنعات سے ہے۔ ہم تو صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ ذات قدوس غیر مدرک بالکنہ ہے ایسا ہی اس کی شان کے شایان اس کا نزول ہے اور ایسے ہی جاعلہا بیٹ میں مجیئی بھی ان کے مرتبہ و عظمت کے مناسب ہے۔ جیسا جانی ویسی ہی مجیئی۔ اس مجیئیۃ کی تعیین ایسے

وقت ہو سکتی ہے جب کہ اس موصوف کی حقیقت معلوم کی جاوے اس وجہ سے کہ تجلی کی کوئی ایسی حقیقتِ متعینہ نہیں جس میں ہر جائی بلا امتیاز شریک ہو اور تجلی سب میں ایک حقیقتِ مشترک ہو۔ بلکہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جہاں اختلاف جائی ہوتا ہے تجلی بھی مختلف ہو جاتی ہے اور اس تجلی رسا کا علم موقوف ہوتا ہے اس جائی کی ادراکِ حقیقت پر۔

چنانچہ دیکھیے جاء زید میں ایک تجلی کا حکم ہے۔ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے واسطے اوّل ذات زید کا علم ضروری ہے حقیقتِ زید معلوم کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تجلی بامشی ہے۔ یعنی یہ ذات چل کر آنے کی وجہ سے متّصف تجلی کے ساتھ ہوئی بخلاف جاء المدینہ کے کہ یہاں پر امکنہ کی حقیقت معلوم کرنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ مدینہ کا آنا اس طرح سے تھا کہ کوئی بات متحرک خود چل کر اس مدینہ میں داخل ہوئی۔ یہ مدینہ اپنی جگہ سے نہیں سرکا۔ اسی طرح قوتِ خیالیہ میں کسی امر کا آنا کہ میرے ذہن میں یہ بات آئی تو یہاں نہ ذہن چلتا ہے نہ بات چلتی ہے بلکہ یہاں افکار کی تجلی بذریعہ تخیّل ہوتی ہے۔ افکار کی گردش سے کسی ایک رائے یا فکر کا متعین کر لینا اس کا نام ذہن میں آنا رکھا ہے۔ ایسے ہی جاء الصبح وغیرہ۔

اب دیکھیے کہ یہ بقول آنیوالے موصوف آنے کے ساتھ میں سکین آنے والوں کی تغایرِ حقیقت سے تجلی کی حقیقت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو گیا کہ ایک تجلی پر دوسری ہرگز صادق نہیں آسکتی۔

لہٰذا جس طرح کہ یہ اشتراط ممکنات میں مشاہد ہے کہ بغیر ذات جائی کا علم حاصل کیے حقیقتِ تجلی کی تعیین نہیں کر سکتے ایسے ہی یہ اشتراط وہاں پر بھی ہے کہ پہلے ذاتِ خداوندی کی حقیقت کا اعتراف کر لو پھر تجلیہ ونزول کی کیفیت ہم بتلا دیں گے اور حقیقتِ خداوندی کا ادراک ناممکن ہے جس سے تم عاجز ہو۔ لہٰذا اس کے افعال کی حقیقت کا ادراک بھی ناممکن جس سے ہم تم دونوں عاجز۔ لہٰذا اس بحث میں پڑنا محض اضاعتِ وقت ہی نہیں تو اور کیا ہے۔ بلکہ خلافِ سنّت مظنّۂ ضلالت بھی ہے۔

اور اسی وجہ سے امام شافعی علیہ الرحمہ متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ بتلایا کرتے تھے۔ ان متکلمین سے وہی مراد ہیں جن کو غلوفی الکلام ہو اور جنھوں نے اعتدال سے

لہ للہ درہ ثم للہ درہ لعمری لقد کشف الغطاء ولم یبق لاحد محل امتراء ۱۲ ط

اے برادر عقل یک دم با خود آر دمبدم در تو خزاں ست و بہار

غرض یہ کہ جب اس عالم فانی کے مصالح کے لئے سموات وارض ہیں تو اس عالم باقی کے مصالح تو اس کے زیادہ مستحق ہیں اور وہ بھی باقی ہیں۔ لہٰذا ما دامت السموٰت والارض خلود و دوام کے منافی نہیں۔

مشیت و مصالح خداوندی

البتہ یہ خلجان ہوتا ہے کہ پھر اس تجدید کی ضرورت کیا تھی جب کہ مومنین و کفار کے لئے دوام و خلود آخرت میں بتلا دیا تو پھر اس خلود کی تجدید کیوں فرمائی گئی۔ اگرچہ اشیاء دائمہ ہی کے ساتھ کی گئی۔ مگر اس میں فائدہ زائدہ ہی کیا ہوا۔ سو اس خلجان کا دفع یہ ہے کہ اس میں ایک عجیب لطیفہ ہے اور مقصود اس سے تاکید ہے خلود کی جو کہ ایک عجیب غریب طریق سے کی گئی ہے جو محض خالدین فیہا سے حاصل نہ ہوتی تھی۔

اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے۔ جیسے کسی شخص کو ایک مکان دیا جائے اور ہمیشہ رہنے کے واسطے دیا جائے تو اس ہمیشگی اور دوام کی تاکید کا کوئی عنوان اس سے بہتر نہیں کہ اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ جب تک یہ گھر باقی ہے اس وقت تک کے واسطے تم کو یہ گھر دیا جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتلایئے اس سے بڑھ کر اور کونسی تجدید یا تاکید ہے جس سے اس دوام کی توضیح اور تاکید ہو جائے تو اسی طرح اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم کو جنت اور اس کے اندر رہنے کی اجازت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے دی جاتی ہے۔ اور کیسی ہمیشگی ہے کہ جب تک جنت قائم رہے اس وقت تک تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی ہے تم کو اس زمانہ قیام قیامت تک نہ نکالا جائیگا اور ظاہر ہے کہ جنت خود دائمی ہے اور ابد الآباد تک کے واسطے ہے۔ تو گویا اس تاکید ــــــ سے ایک ایسا لطیف مضمون ادا کیا گیا کہ ہزار تصریحات ہوں ان سے بھی اس ہمیشگی کے ساتھ یہ مضمون نہیں ادا ہو سکتا۔ بحمد للہ "ما دامت السموٰت والارض"۔ یہ شبہ بالکل رفع ہو گیا۔ اور یہ تحقیق اس مقام پر مقصود نہ تھی تبعاً بیان کر دی گئی مقصود دوسرے سوال کا جواب دینا ہے جو مبنی ہے تغائر و تمائز میں سعداء ممکن

وصفات الواجب پر۔ دوسوال یہ ہے کہ اسی آیت میں آگے چل کر ایک استثناء فرمایا ہے۔ الا ماشاء ربک۔ یہاں پر استثناء بظاہر خالدین فیہا سے معلوم ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مومنین کا جنت میں اور کافرین کا دوزخ میں ہمیشہ رہنا یقینی نہیں مشیت سے اس میں استثناء بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اگر چاہیں گے نکال بھی دیں گے۔ ساری عمر کا وعدہ نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے جنتیوں کی تو کمر ٹوٹ گئی ہوگی کہ ہماری ساری تمناؤں اور آرزوؤں کا مدار یہی خلود اور دوام تھا کہ دنیا کی نعمتوں کو ہم نے اسی مداومت پر قربان کر دیا ہے۔ اپنی امیدوں کا مرکز عالم آخرت کو بوجہ اس کے دوام ہی کے بنایا تھا لیکن قسمت سے وہاں پر بھی دوام سے محروم اور خلود سے ترستے رہے اور دوزخیوں کے غنچہ آرزو کھل گئے ہوں گے کہ کبھی خلود فی النار کو سُن کر تمام دُنیا کے مزے تلخ ہو رہے تھے چلو اس کھٹکے سے نجات ملی۔

سو جواب اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر ما مصدریہ معنی ظرف ہے۔ جیسے آیت حقوق انجم۔ پس ماشاء ربک کے معنی یہ ہیں الا ان یشاء ربک۔ یعنی خلود تو ہمیشہ رہے گا لیکن اگر خدا تعالےٰ کی مشیت اس کے خلاف کے ساتھ متعلق ہو جاوے تو خلود نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ دلائل سے یہ امر یقینی ہے کہ مشیت رب کبھی اس کی مقتضی نہ ہوگی کہ مومنین کو جنّت سے یا مشرکین کو دوزخ سے نکالا جاوے لہٰذا خلود کے خلاف کبھی واقع نہ ہوگا۔ تو خلود ثابت رہا اور کوئی خدشہ خلود میں نہیں رہا۔

باقی یہ کہ نکتہ اس استثناء میں کیا ہوا اور الا ماشاء ربک کے زائد کرنے کا فائدہ کیا ہوا تو وہ فائدہ یہ ہوا کہ اس سے مخلوق کے بقا اور ربّ العزت کے بقاء میں فرق ظاہر ہو گیا ہم کسی غیر محقق کو یہ خیال نہ ہو کہ اوہو! اب تو ہم کو بھی دوام کا سرٹیفکیٹ مل گیا چلو اب تک جو ہم وجوب کے درجہ سے گرے ہوئے تھے اس فرق کی علت یہی گرانمایہ موتی دوام کا تھا۔ جو آج ان کی فیاضی سے ہم کو مل گیا جس کے باعث آج امتیاز کا پردہ اُٹھ گیا اور آج سے ہم بھی واجب بن گئے۔ اور ان تخیلات و توہمات کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لہٰذا اس قسم کے تخیلات موجب للشرک سے بچانے کے لئے الا ماشاء ربک فرمایا

کہ اس عنوان خالدین فیہا کے معنوں دوام سے بھول نہ جانا۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم مساوی واجب کے ہو کر ممکنیت کے پیرا ہن سے خارج ہو گئے۔ نہیں بلکہ تم ممکن ہی ہو اور ہم واجب ہی ہیں۔ دوام اگرچہ تمہارے حصہ میں بھی آگیا لیکن تمہارا یہ دوام تو داخل تحت المشیت ہے۔ ہمارے ارادہ پر موقوف ہے کہ جب تک ہم چاہیں تم کو اس دوام ہی رکھیں اور جب چاہیں کان پکڑ کے نکال باہر کریں گو نکالیں گے نہیں مگر پھر بھی تحت المشیت ہے بخلاف ہمارے دوام کے کہ ہمارا دوام مستقل بالذات ہے کسی کی مشیت پر موقوف نہیں کوئی احتمال اس دوام کے فنا ہونے کا نہیں ہے۔

اس نکتہ کی طرف شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سہل عنوان سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس سے مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ یہ دوام تحت المشیت ہے۔ یہی تھی وہ اصل تمائز و تمائز بین صفات الممکن و صفات الواجب کی جس کا اوپر ذکر تھا۔

اور اس ممکنات کے دوام پر ایک حکایت یاد آئی کہ کسی گاؤں کا ایک گنوار کلکٹر کے پاس آیا اور بہت ادب سے سلام کیا اور نہایت عاجزی سے پیر دبانے لگا۔ کلکٹر نے منع کیا کہ بس رہنے دو مطلب کہو کس واسطے آئے ہو؟ کیا کام ہے؟ مگر اس نے پیر نہ چھوڑے دباتا رہا۔ آخر جب اس نے بہت کچھ منع کیا اور مطلب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں تو تمہارے (تمہارے) سے ایک بات پوچھوں کہ مجھے یہ بتا دے کہ موروثی کسے کہیں (کہتے ہیں) اس نے کہا، جا کسی پٹواری سے جا کر پوچھ۔ اس نے کہا کہ نا صاحب! میں تو تمہارے ہی سے پوچھوں۔ کوئی کچھ بتلادے کوئی کچھ بتلادے۔ اس نے بتلایا کہ موروثی اسے کہتے ہیں کہ کوئی کاشت کار کسی زمیندار کی زمین میں ۱۲ برس تک کاشت کرتا رہے تو اس کے بعد اس زمیندار کو کاشتکار سے زمین لے کر کسی دوسرے کاشت کار کو دینے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اس نے کہا کہ وہیہ وہیہ غضب (غضب) ہو گیا۔ تمہارے تصیلدار (تحصیلدار) کو شاملی کی تصیل میں گیارہ برس تو ہو گئے بس ایک برس میں تصیل اس کی موروثی ہو جاوگی۔ پھر نہ تیرے باپو سے جانہ میرے باپو سے جا۔ غرض اس نے ایسے مزے سے کہا کہ کلکٹر اس کے مطلب کو خوب سمجھ گیا کہ یہ تحصیلدار کی شکایت کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ حالات تحقیق کیے اور وہ تحصیل دار اس تحصیل سے تبدیل کر دیا گیا۔

کبریا اس وقت بھی نہ اٹھے گی اور نہ اس کے بعد اُٹھنے کی امید ہے۔ کیونکہ منشاء اس کا وجوب بالذات ہے۔ جب وجوب منفک نہیں ہو سکتا تو اس کا لازم یعنی امتناع ادراک بالکنہ بھی منفک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ نہ وہ ردا اُٹھے گی اور نہ اس کے اُٹھنے کی امید ہے اور یہ وجوب جس طرح لازم ہے اسی طرح اخص صفات سے بھی ہے۔

اس پر ایک کام کا مضمون یاد آگیا۔ وہ یہ کہ عامہ متکلمین و حکماء میں ایک اختلاف ہو رہا ہے حکماء تو صرف وجوب و قدم بالذات کو خاص کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ کے ساتھ اور قدم بالزمان اور تجرد کو غیر واجب کے لیے بھی مانتے ہیں اور متکلمین ان سب کو خاص کہتے ہیں۔ اسی بناء پر قائلین بالمجردات کی تکفیر کرتے ہیں اور محققین وجوب بالذات و قدم بالذات و بالزمان کو خاص کہتے ہیں اور تجرد کو خاص نہیں کہتے اور خود بھی مجردات حادثہ بالزمان کے قائل ہیں اور ان کو لطائف کہتے ہیں جن میں ایک روح بھی ہے جس کو حادث بھی مانتے ہیں اور مجرد بھی۔ چنانچہ وہ روح کی حقیقت جوہر مجرد حادث قبل البدن بتلاتے ہیں اور اسی تجرد کی بنا پر وہ روح مجرد کو خارج از امکنہ مانتے ہیں اور لامکانی سے تعبیر کرتے ہیں اور اعجاز آ کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ مکان میں رہتی ہے۔ اور صوفیہ نے اسی توجیہ پر لطائف کی نسبت کہا ہے کہ وہ فوق العرش ہیں جن کے معنی یہ نہیں کہ وہ عرش کے اوپر رہتے ہیں جیسا کہ لفظی ترجمہ اور ظاہری معنی سے متبادر ہوتا ہے بلکہ عرش چونکہ منتہی اور محدود ہے امکنہ ثابت بالدلیل کا لہٰذا فوق العرش بمعنی لامکان ہے اور لطائف چونکہ امکنہ سے منزہ اور مجرد ہیں اس لئے فوق العرش کنایہ ہوا غیر مکانی ہونے سے۔ ان کے نزدیک کسی ایسے مجرد کا قائل ہو جانا جو ممکن اور حادث بمعنی مسبوق بالعدم الواقعی ہو موجب تکفیر نہیں۔ البتہ جو شخص وجوب بالذات یا قدم بالذات یا بالزمان کو غیر باری کے لیے ثابت کرے اس کی وہ بھی تکفیر کرتے ہیں کیونکہ یہ اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے۔ یہ استطراداً اس اختلاف کا بیان ہو گیا۔

اب مقصود مقام کی طرف عود کرتا ہوں کہ جب منشاء انتباہ ادراک بالکنہ کا وجوب بالذات ہے جس کا انفکاک محال ہے۔ اس لئے آخرت میں بھی خداوند تعالیٰ کی ذات

صفات کا انکشاف ہونا ناممکن اور محال ہے اور اسی وجہ سے عرفاء نے کہا ہے کہ مسئلہ قدر کا انکشاف آخرت میں بھی نہیں ہوگا جیسا کہ نہیں ہوا۔ اس وجہ سے کہ یہ مسئلہ بھی راجع ہے اور ایک کنہ ذات و صفات کی طرف اور ذات و صفات کا علم بالکنہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے نہ آخرت میں، ہر دو جگہ ناممکن ہے۔ لہٰذا جو اس پر موقوف ہے اس کا علم بھی دونوں جہان میں نہ ہوگا نہ یہاں نہ وہاں۔ تو جب ایسے عرفاء و فضلاء نے اپنی ہمتوں کو قاصر سمجھ لیا اور یقین کر لیا کہ ان مسائل ذات صفات کا حقیقی علم نہیں ہو سکتا تو اب ہم جیسے جاہلوں کا ان مسائل میں لب کشائی کرنا محض بے ادبی اور تضییع اوقات ہے بلکہ خلاف فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام ہے۔ ہم کو ایسے علوم میں تو الہام پر اکتفا کرنا چاہیے اور اعمال کے اہتمام میں لگنا چاہیے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے جس کا سلسلہ دراز ہوتا چلا آیا۔

اور وہ بیان یہ تھا کہ یہ آیت یعنی لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم مؤید ہے اس دعوی کی کہ علوم مقصودہ فی نفسہا سے بھی مقصود محض علوم ہی نہیں ہوتے بلکہ مثل علوم کے اعمال بھی مقصود ہیں۔ لہٰذا جس طرح کے مقصود اس حدیث ینزل ربنا تبارکت تعالیٰ سے اطلاع نزول باری تعالیٰ ہے اسی طرح مقصود ترغیب قیام لیل بھی ہے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم محض علم کو لے سود سمجھ کر تنزل وتجلی وغیرہ کی تحقیق کے پیچھے پڑ گئے اور جو مقصود یعنی قیام لیل تھا اس کو ترک کر دیا۔

اسی طرح آیت ما ھذہ الحیوٰۃ الدنیا صاف دلیل ہے کہ صرف علم و اعتقاد آخرت ہی مقصود نہیں بلکہ اس سے عمل میں کام لینا بھی مقصود ہے یعنی جس طرح ہم کو فنائے دنیا کا اعتقاد و یقین ہے اسی طرح اعراض عن الدنیا و استحضار فنائے دنیا کو بھی اختیار کریں۔ جو اس علم و اعتقاد کا مقصود ثانی ہے۔ گویا اعتقاد فنائے دنیا کی غرض اس وقت تمام ہوگی جب کہ اعراض عن الدنیا بھی ساتھ ساتھ ہو اور اس کا استحضار بھی ہر وقت رہے تاکہ اس علم و اعتقاد کی غرض و غایت مرتب ہو۔ ورنہ یہ علم و اعتقاد درجہ مقصودیت میں کامل نہ ہوگا۔ چنانچہ عنوان اس آیت کا کس خوبی سے اس مضمون کو ادا کر رہا ہے۔

(ماشاء اللہ! کس قدر طویل الذیل اور قابل قدر مضمون اس مختصر سی آیت میں بلا کسی تدقیق و مشقت اور بغیر کسی دلالتِ خفیہ کے بیان فرمایا ہے)۔

یہ نہیں کہ کسی قسم کی تکلیف یا کھینچ تان کے ذریعے سے یا توجیہاتِ بعیدہ کی مدد سے ان مضامین کو اخذ کرنا پڑا ہو۔ بلکہ ان مسائل کا استنباط اس آیت سے ایسا ہی ہے جیسے کنویں میں پانی نہ ہوتا تو کس طرح نکل آتا۔ لہٰذا پانی کا برآمد ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کنویں میں ضرور پانی تھا۔

قرآنِ کریم ایک تجلّی ہے

اسی طرح ان مضامین کا اس وضاحت کے ساتھ اس آیت سے مستنبط ہونا بتلا رہا ہے کہ یہ مضامین فی الواقع اس آیت میں تھے اور حقیقتاً یہ مضامین صرف ایک حصہ ہیں اُن مضامین کا جو اس آیت میں واقع میں رکھے ہوئے ہیں کیونکہ کسی شخص کی قدرت میں نہیں کہ وہ کسی آیت کی تفسیر اور تشریح اس قدر کر سکے جس کے بعد اس کے تحت میں مسائل نہ رہیں نکات و مضامینِ عالیہ قرآن شریف کے ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہی تو اعجاز ہے کلام مجید کا جس نے تمام دنیا سے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کرا دی ہے

چیست قرآن اے کلامِ حق شناس	رونمائے ربّ ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در گیر معنے	معنے در معنے در معنے!

یعنی قرآن شریف کیا چیز ہے وہ ایک خدا کو دکھلانے والا آئینہ اور ربّ العزّت تک پہنچانے والا زینہ ہے کہ اس کی شاہراہ پر پڑ کر انسان کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا مقصودِ حقیقی تک انشاء اللہ ضرور پہنچ جائیگا کیونکہ فی التحقیق قرآن شریف ایک تجلّی ہے تجلیاتِ خداوند تعالیٰ سے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص تجلّیٔ حق کو رہنما بنائے گا وہ کیونکر اس تجلّی کے مبدا یعنی خداوند حقیقی تک نہ پہنچے گا اگرچہ اس قرآن کو متکلمین کلام لفظی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کلام لفظی ہونا تجلّی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ یہ واضح ہے کہ قرآن خداوند تعالیٰ کا کلام لفظی ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا تمہارا کلام لفظی ہوتا ہے کہ اس کو گو ہمارے

ساتھ ایک خاص تعلق اور ایک بلاواسطہ نسبت ہوتی ہے مگر اس کو ہماری ذات سے باہر متکلم کے انفصال ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مبدء لئے ظہور ہماری زبان ہے اور زبان کے ساتھ ساتھ بعدِ متکلم کے کلمات قائم نہیں رہتے۔ یہ وہ نسبت و علاقہ خدا کے کلامِ لفظی کو اس کی ذات سے نہیں اگرچہ متکلمین نے اس پر کلامِ لفظی کا اطلاق کیا ہے اور کلامِ لفظی ہی سے اس کو تعبیر کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی کلامِ لفظی الٰہی کو اپنے کلامِ لفظی پر قیاس کرنا غلط ہے اور گو اس کی کوئی مثالِ حقیقی بیان نہیں ہو سکتی جیسا عارف رومی فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　خاک بر فرقِ من و تمثیل من

مگر تقریب الی الفہم کے لئے میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں کیونکہ بدون مثال کے فرق واضح نہیں ہوتا جیسا مولینا فرماتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویرِ خوشت　　ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

یعنی گو مثال مشابہ ممثل لہ کے نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی شے دنیا میں ایسی نہیں جس کو تشبیہ کافی یا کسی درجہ میں بھی مماثلت واقعیہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہو لیکن تسلی بدون اس کے نہیں ہوتی۔ لہٰذا عوام کو سمجھانے اور خلجان کو رفع کرنے کے واسطے اس کی اس طرح مثال دی جا سکتی ہے:

جیسے ایک تو آفتاب کی ذات ہے یعنی قرصِ آفتاب اور ایک وہ نور ہے جو آفتاب کے ساتھ قائم ہے اور ایک وہ لمبی لمبی تیز شعاعیں ہیں جو دور تک پہنچتی ہیں ہیں اور ایک آئینہ ہے کہ اول اس پر شعاعیں پڑتی ہیں۔ اور ایک زمین ہے جس پر وہ لمبی لمبی شعاعیں آئینہ میں سے آکر پڑتی ہیں۔ تو ذاتِ خداوند تعالیٰ تو بمنزلہ ذاتِ آفتاب کے ہے اور ان کا کلامِ نفسی جو کہ بمرتبہ صفات لازمہ لا عین و لا غیر ہے۔ یہ بمنزلہ نورِ آفتاب کے ہے اور کلامِ لفظی بمنزلہ ان شعاعوں کے ہے جو قرص سے نکل کر دور دور منتشر ہوتی ہیں اور قلبِ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ آئینہ کے ہے اور ہم بمنزلہ زمین کے ہیں۔

غرض اس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ازالہ شبہ کافی طور سے ہو جائے

اور اس کلام نفظی کے انطباق سے ایسا ہی کلام لفظی مفہوم ہوا جیسا ہمارا کلام ہوتا ہے اور فرق واضح ہو جائے۔ اگر شبہ ہو کہ کلام لفظی کو تو مخلوق کہا گیا ہے پھر اس کلام میں اور ہمارے کلام میں کیا فرق ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ فرق مجہول الکنہ ہے۔ اس فرق کا اثر یہ ہے کہ ہم سے جو کلام صادر ہوتا ہے اس کو کلام حق کہنا جائز نہیں اور قرآن کے مرتبہ کلام لفظی کو کلام حق کہنا جائز ہے اور اسی مثال سے یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی جس طرح ہم منتشر عوام زائد خاص نور تجلی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے جس کا سبب ہمارا ضعف استعداد ہے۔

اور اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے سوال کیا اور تجلی کی درخواست کی تو اُن کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ لن ترانی "یعنی تم ہم کو نہیں دیکھ سکتے" یعنی ہم میں تو مرئی ہونے کی قابلیت تام ہے۔ کوئی شے ہماری رویت سے مانع نہیں اس لئے لن اُرَیٰ نہیں فرمایا۔ مگر تم میں اس وقت رائی ہونے کی قابلیت نہیں کیونکہ ہم نور محض ہیں اور تم جسم کثیف سے متلبس ہو جو ہمارے پرتو نور کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ گو بتلا دیا کہ اس وقت تم میں اتنی استعداد نہیں کہ ہم کو دیکھ لینے کے بعد صحیح و سالم رہو۔ ہر چند کہ یہاں بھی نہ ہونے کے سبب کو صاف طور سے بتلا رہا ہے۔ اور اس کے سُن لینے کے بعد ہر ایک مومن کو عقیدہ اپنی عدم قابلیت کا کافی طور سے ہونا لازم ہے چہ جائیکہ موسیٰ علیہ السّلام کا یہ عقیدہ ہو۔ لیکن چونکہ موسیٰ علیہ السّلام عاشق تھے اس لئے گو عقیدہ کے اعتبار سے ان کو اپنی عدم استعداد کا یقین ہو گیا تھا لیکن شوق اور جذبۂ دیدارِ الٰہی کا حد سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کی تیزی اب تک کم نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا آگے خود ہی اُن کی اس حالت کی رعائت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ لیکن اگر تمھیں اب بھی شوق ہے تو ـــــ نظر الی الجبل الایہ ـــــ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو۔ اگر یہ پہاڑ صحیح و سالم رہا اور ہماری تجلی کا متحمل ہو گیا تو تم کو بھی نہ محروم رکھا جائے گا۔ چنانچہ فلما تجلی ربہ۔ الایہ "جب اس پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور موسیٰ علیہ السّلام بیہوش ہو کر گر پڑے" اور اطمینان شافی ہو گیا اور عدم قابلیت کا مشاہدہ بھی ہو گیا کہ جب پہاڑ باوجود اس قدر عظیم الجثۃ اور شدت کے نہ ٹھہر سکا تو میں کیا ٹھہر سکوں گا۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ پہاڑ کو موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی۔ یہ جماد محض اور وہ انسان باکمال صاحب نبوت کلیم اللہ۔ لہٰذا یہ قیاس اور سمجھ میں نہیں آتا جو کہ فان استقر مکانہ فسوف ترانی میں استقرار جبل و رویت موسیٰ کے درمیان ثابت کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی روحانی قوت کی وجہ سے تجلّی کے متحمل ہو جاتے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ جس تجلّی کا موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ سے زیادہ تحمل تھا وہ تو ان کو اس درخواست سے پہلے ہی حاصل تھی یعنی تجلّی بالقلب و بالروح مگر اس وقت تو انہوں نے آنکھ سے دیکھنے کی درخواست کی تھی اور آنکھ سے رویت تجلّی بالروح نہیں بلکہ بالجسم ہے۔ تو اس صورت میں تجلّی خداوند تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ آنکھ کے ہوتی اور آنکھ ایک جسمانی شے ہے مگر نہایت ضعیف اور نازک عضو ہے اور پہاڑ بھی ایک جسم ہے اگرچہ غیر جان دار ہی سہی۔ مگر آخر جسمیت میں آنکھ کا مشارک ہے ہی اور باوجود اس کے نہایت ثقیل و قوی ہے کہ ہر ایک بھاری سے بھاری بوجھ کو سہہ سکتا ہے چنانچہ خود خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں: ——— ءانتم اشد خلقا ام السماء بناها الآیہ

اور فرماتے ہیں: ——— لخلق السمٰوٰت والارض اکبر من خلق الناس

اشدیت و اکبریت سماوات و ارضین کی انسان سے اس آیت سے ظاہر ہے کہ باعتبار مادّہ کے آسمان و زمین انسان سے سخت تر ہیں۔ لہٰذا جلال و جمال خداوندی کے جلوہ کا تحمل جب ایک ایسا جسم سخت و قوی نہ کر سکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آنکھ تو کیا جمال جہاں آرا کی تاب لا سکتی تھی اور وہ خود کیونکر قائم رہ سکتے تھے۔ لہٰذا اپنے ضعف اور پہاڑ کی شدت کو پیش نظر رکھتے ہوتے جب انھوں نے پہاڑ کا یہ حال دیکھا تو اُن کو مشاہدہ سے اطمینان اپنے غیر متحمل ہونے کا ہو گیا اور یہاں بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ تجلّی نہ ہوئی لیکن لفظ تجلّی جو آیت میں واقع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلّی ہوئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تجلّی کے بعد بے ہوش ہوئے چنانچہ آیت میں فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا و خر موسیٰ صعقا الآیہ سے صاف ظاہر ہے کہ اوّل تجلّی ہوئی اور اس کے بعد پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور

موسیٰ علیہ السّلام بھی بے ہوش ہوئے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے لئے ثبوت تجلی اس آیت سے بالکل واضح ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ یہ تو مسلّم ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کا بے ہوش ہونا تجلّی سے مؤخر ہے لیکن تاخر کی دو قسمیں ہیں ایک زمانی دوسرے ذاتی۔ تو موسیٰ علیہ السّلام کا بے ہوش ہونا ذاتاً تجلّی سے مؤخر ہے نہ کہ زماناً بلکہ زماناً بجائے تاخر کے اقتران تھا۔ اگر تاخّر زمانی کا ثبوت ہوجاتا تب تو تجلّی کا ثبوت ہوجاتا مگر محض تاخرِ ذاتی سے اس کا ثبوت دشوار ہے کیونکہ زماناً معیت تھی۔ نیز تجلّی کے معنی ظہور کے ہیں اور ظہور مستلزم ادراک و رویت کو نہیں پس ذات خداوندی کا ظہور تو ضرور ہوا چنانچہ اس کے اثر سے پہاڑ ٹکڑے ہوگیا لیکن اس کا ادراک موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ہوا بلکہ آپ فوراً بے ہوش ہوگئے۔ لہٰذا تجلّی تو خداوند تعالیٰ کی فی نفسہٖ ممکن ہے اور ہوسکتی ہے مگر ہم میں ابھی اتنی قابلیت نہیں کہ ہم اس کے متحمل ہوسکیں۔ بلکہ وہاں تو تجلّی کا خود تقاضا ہے۔ چنانچہ عارف جامیؒ فرماتے ہیں ؎

نکورو تاب مستوری ندارد   چو در بندی سر از روزن برآرد

اور ان الفاظ کا ظاہری مدلول مراد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ادھر سے تو ظہور ہی کا تقاضا اختیاری ہے بوجہ غایت رحمت و رافت کے کہ آؤ اور ہماری تجلّی سے مستفیض ہو مگر کیا کریں ہم مجبور ہیں۔ ہم میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر ہم میں ہمت ہوتی تو ضرور مستفیض ہوتے چنانچہ تجلی کلامی لفظی کے تحمّل کی طاقت ہم میں تھی لہٰذا ہم کو اس سے فیض یاب کیا گیا لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہ ہماری ذاتی قابلیت کے طفیل ہے اور ہمارے اندر بھی کوئی ذاتی جوہر اگرچہ بقدر قلیل ہو رکھا ہوا ہے جس سے ہم خود اس کے متحمل ہوگئے بلکہ درحقیقت یہ قدرت اور طاقت بھی خداوند تعالیٰ ہی نے ہم کو دی ہے یہ بھی انھیں کی عنایات کا ثمرہ ہے کہ آج اس نور کی بدولت ہمارے قلوب روشن ہیں۔

تجلّی کے اثرات

نیز اس تحمل سے یہ بھی نہ خیال کرنا چاہتے کہ اس تجلّی کلامی نے اپنی عظمت کو چھوڑ کر

ثقل اختیار کر لیا ہے جس کی بنا پر ہم متحمل ہوئے بلکہ وہ اپنی اسی شدت وصولت پر باقی ہے جیسے اصل میں تھی جس کا یہ اثر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے زانو پر سر رکھے ہوئے لیٹے تھے کہ نزولِ وحی ہونا شروع ہوا۔ وہ صحابی فرماتے ہیں کہ اس وقت ثقل سے یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ میرا زانو پھٹ جائے۔

نیز ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے کہ آپ پر نزولِ وحی ہوا، اونٹنی اس شدت کو برداشت نہ کر سکی اور بیٹھ گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز تحمل عطا فرمایا گیا تھا مگر پھر بھی آپ پر اس قدر شدید اثر ہوتا تھا۔ مگر ہم جو آج اس کلام مجید کو پڑھتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ شدت ہم کو نہیں ہوتی، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اول اس کے نزول میں جبرائیل علیہ السلام واردہوتے اور اس میں خفت ہوئی۔ اس کے بعد آنحضرت پر اس کا نزول ہوا تو اور خفت ہوگئی۔ اب ان واسطوں کے بعد ہم اس کے متحمل ہو سکے کہ ہم اس کو پڑھ سکیں اور یاد کر سکیں۔ باقی اس کی اصل عظمت کہیں نہیں گئی۔ ان دونوں حضرات نے اس کی صولت کو برداشت کر لیا۔ اب ہمارے واسطے سہل ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ جیسے بچے سے بوجھ اٹھوانا ہو تو ماں باپ سہارا لگا دیتے ہیں تو بچہ اس کو اٹھا لیتا ہے لیکن اب تک بھی اگر موانع مرتفع ہوں تو اس تجلی کا اتنا تو اثر باقی ہے کہ بعض وقت جب نہایت خشوع وخضوع سے تلاوت کی جاتی ہے تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اولیائے کرام تو ان آیات کلام مجید کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اس جہان سے ہی رحلت فرما گئے اور ان حضرات کے قلوب تو اعلیٰ درجہ کے نورانی تھے جو اس سے اس قدر متاثر ہوئے مگر ہم سیاہ کاروں پر بھی اتنا اثر تو ضرور ہے کہ لیا اوقات جب قرآن شریف کو قرآن کی طرح پڑھا جاتا ہے تو ایک عجیب کیفیت اور رقت طاری ہو جاتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کو قرآن شریف پڑھنا ہی نہیں آتا ورنہ اگر حق قرأت ادا کیا جائے اور خشوع وخضوع ہو تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ یہ لذت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ

عرب میں ایک ادنیٰ درجہ کا فقیر یا معمولی آدمی بھی قرآن شریف پڑھتا ہے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ واقعی حق تو وہی لوگ ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک معمّر اور نابینا بی بی ناظمہ بھی جو باب عمرہ پر برابر بیٹھا کرتی تھیں۔ واقعی ان کے پڑھنے میں ایک عجیب لطف آتا تھا کہ ہر وقت سننے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اور صاحب اہلِ عرب ہی پر کیا موقوف ہے جو اہلِ دل ہوتے ہیں ان کے پڑھنے میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک حافظ ایک مسجد میں تراویح پڑھاتے تھے۔ وہ مسجد لب سڑک واقع تھی۔ تمام آنے جانے والے حتیٰ کہ انگریز تک بھی کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا تجلی کا اثر ہوگا کہ اگر معتقد بھی نہ ہو، مگر خالی الذہن ہو۔ اس کے قلب کو بھی نہایت قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ مومن ہو یا کافر اس کی کشش سب پر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مکّہ میں رہنے کے لئے کفّار کی ایک یہ شرط ٹھہری تھی کہ آپ کلام مجید زور سے نہ پڑھا کریں۔ ہماری عورتوں پر اثر پڑتا ہے۔ خدا کی شان کہ جاہل عورتیں وہ بھی دنی الطبع، مگر اس کی تریاقی قوت وہاں بھی رنگ لاتی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ محض قرآن سن سن کر ایمان لائے اور داخل زمرۂ اسلام ہوئے۔

غرض قرآن شریف تجلّیِ الٰہی ہے۔ اس وقت ہم اس قدر تجلّی کے قابل تھے تو حق تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے ہم کو اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ گو اس وقت وہ یوں فرماتے ہیں ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یہ شعر زیب النساء متخلص بہ مخفی کا ہے۔ اور اس کے متعلق ایک قصّہ ہے۔ وہ یہ کہ شاہِ ایران کی زبان پر ایک دفعہ یہ مصرعہ بے ساختہ موزوں ہو گیا تھا ؏

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود

بادشاہ نے شعرائے ایران سے درخواست کی کہ اس کا دوسرا مصرعہ لگاؤ۔ کسی سے بھی دوسرا مصرعہ نہ بن سکا تو بادشاہ نے شاہ ہندوستان کو لکھا کہ شعرائے ہند سے درخوا ست

کی جائے کہ اس مصرع پر مصرع لگا دیں۔ اس کی اطلاع زیب النساء کو بھی ہوئی۔ یہ بھی بڑی شاعرہ تھی اس لئے اس کو بھی فکر ہوئی۔ ایک دن اتفاق سے صبح کے وقت سرمہ لگا رہی تھی۔ سرمہ کچھ آنکھ میں لگا اور اس کے اثر سے ایک قطرہ سرمہ آلود ٹپکا تو فوراً اس کا ذہن اس شعر کی طرف منتقل ہوا اور کہا ؎

در ابلق کسے کم دیدہ موجود
مگر اشک بتان سرمہ آلود

اس نے شاہ ہند کو اطلاع دی کہ مصرع ثانی بن گیا۔ آپ شاہ ایران کو اطلاع کریں۔ چنانچہ وہاں یہ مصرع پہنچا تو شاعر کی بڑی تعریف ہوئی مگر یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ شاعر عورت ہے۔ شاہ ایران نے وہاں سے بہت کچھ انعام و خلعت بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ شاعر کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ شاہ ہند نے زیب النساء سے کہا کہ ایران سے تیرا بلاوا آیا ہے۔ بتاؤ میں کیا جواب دوں؟ اس نے کہا کہ آپ جواب میں میری طرف سے یہ شعر لکھ بھیجیے کہ شاعرہ نے یہ جواب دیا ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چنانچہ یہ شعر لکھ دیا گیا اور شاہ ایران سمجھ گیا کہ شاعر عورت ہے۔ بہر حال اس شعر میں مخفی نے یہ کہا ہے کہ جس کو میرے دیدار کا شوق ہو وہ مجھے میرے کلام میں دیکھ لے۔ تو کیا مخفی کا کلام متکلم کو دکھا دے اور خدا کا کلام خدا کو نہ دکھائے یہ نہیں ہو سکتا پس حق تعالیٰ بھی گویا اس وقت یہی فرماتے ہیں کہ جو مجھے دیکھنا چاہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس — رونمائے رب ناس آمد شناس

واقعی قرآن مجید رونمائے حق ہے۔ حاصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ کلام مجید بڑی عجیب چیز ہے۔ خدا کا عجیب و غریب لذیذ و پر اسرار کلام ہے جس کی تہ کو پہنچنا اور اس کے جمیع نکات و معنی کو سمجھنا قوت بشریہ سے خارج ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ خداوند تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کی قدر کریں اور اس کی تلاوت کی طرف خاص توجہ کریں

سکیں گے۔ تو دیکھئے کہ آرام پہنچنا اور دل کا خوش ہونا بھی منافع کی فہرست میں داخل ہے لیکن پھر وہ کس قدر مضرت رساں اور نقصان رساں ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک ضروری اور نافع منفعت سے غافل بنا دیا۔

دُنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں

اسی طرح دنیا کی ہر چیز فی نفسہٖ حکم و مصالح و منافع سے لبریز ہے۔ عبث و فضول کوئی نہیں مگر جب وہ مقصودِ اصلی سے مانع ہو جائے تو اس وقت بھی فائدہ جس کو ہم نے منافع دنیوی کا اصل اصول سمجھ رکھا ہے اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں کو لہو و لعب سے تعبیر کیا جاویگا۔ یعنی جس صورت سے تم دنیا کے ساتھ استفادہ اور اشتغال رکھتے ہو اسی صورت میں وہ تمہارے لئے لہو و لعب سے زیادہ نہیں گو فی نفسہٖ اس میں بہت مصالح و منافع ہیں مگر وہ منافع ایسے نہیں جن میں پڑ کر منافعِ آخرت کو بھلا دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن منافع کے لئے یہ اشیاء وضع کی گئی ہیں اُن کے اعتبار سے اس سے عبثیت و باطلیت کی نفی کی گئی ہے اور جو منافع اہل ہوا نے خود تراشے ہیں جو کہ واقع میں مضار ہیں ان کے اعتبار سے انکو لہو و لعب فرمایا ہے۔ بہر حال یہ دنیا اگر آخرت سے اعراض کا سبب بن جائے تو یہ لغو و عبث ہے چنانچہ مقابلہ میں اس کے فرماتے ہیں کہ:

ان الدار الآخرة لھی الحیوان

اس طرف تو دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر فرمایا اور اس طرف دارِ آخرت کو حیوان سے تعبیر کیا۔ کیونکہ لہو و لعب باعتبار اپنے ثمرات کے مثل مردہ ہیں اور موت ثمرات دلیل ہے موت اصل کی بخلاف دارِ آخرت کے کہ اس کو حیوان بمعنی حیوٰۃ مراد زندہ سے تعبیر کیا کیونکہ اس کے ثمرات باقی اور زندہ رہنے والے ہیں۔ اور حیات ثمرات دلیل ہے حیاتِ اصل کی لہٰذا آخرت خود بھی زندہ ہے۔ باقی فوائدِ دنیویہ درحقیقت فانی و مردہ ہی ہیں تو زندہ فوائد کو چھوڑ کر مردہ فوائد کو کیا کریں۔ کار آمد چیز کو چھوڑ کر بیکار شے کے پیچھے پڑنا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

چنانچہ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ: لو کانوا یعلمون کہ کاش کہ یہ لوگ اپنی دینی

منفعتوں کا احساس کرتے اور دنیوی مضرتوں کو جان لیتے اور سمجھتے کہ یہ دنیا اور اس کے لواحق سخت مضرت رساں ہیں اور آخرت اور اس کے متعلقات نفع رساں اور راحت بخش ہیں۔ یہاں پر استعمال کیا گیا ہے حرف "لو" کا جو کہ تمنا کے واسطے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی ہیں۔ تو اس سے انتہا درجہ کی شفقت و رحمت مترشح ہوتی ہے کہ جیسے ایک شفیق باپ اپنے بچے سے پیار کی باتیں کرتا ہے اور محبت میں خود بھی توتلا بن جاتا ہے۔ بلاشبہ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ذات سے کسی امر کی تمنا کرنا بالکل مستبعد اور ان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ آرزو ہمیشہ اسی چیز کی جاتی ہے جو حاصل نہ ہو اور خود اس کے نفع کا محتاج ہو اور خداوند تعالیٰ قادر قیوم اور مالک کل شئی ہے۔ اس کے واسطے کوئی شے ایسی نہیں جو حاصل نہ ہو۔ دوسرے وہ نفع کا محتاج نہیں۔ پھر آرزو کیسے کرتے لیکن باوجود اس کے محض اپنے بندوں کی دلدہی کی خاطر ان کے مذاق کے موافق ان سے معاملہ فرمایا جس سے غرض و مقصود محض تقریب و تفہیم ہے۔ اور تفہیم کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ، دوسرے یہ کہ خیر ہم ہی تمہارے موافق ہو جائیں۔ لیکن چونکہ تم میں اتنی قابلیت و استعداد نہیں کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ یا ہم سے قریب ہو سکو لہٰذا ہم ہی تمہاری خاطر تمہارے موافق ہوئے جاتے ہیں۔

لہٰذا جن مواقع پر قرآن شریف میں الفاظ تمنا و ترقی مستعمل ہیں اُن سے تمنا و ترقی حقیقی مراد نہیں ہوتی۔ ایسے ہی جہاں کہیں قرآن شریف میں تعجب کے صیغے مستعمل ہیں اُن سے بھی تعجب حقیقی مراد نہیں ہوتا۔ یعنی خداوند تعالیٰ کسی امر پر تعجب نہیں کرتا کیونکہ تعجب کے واسطے متعجب فیہ سے جہل ہونا لازم ہے۔ مثلاً کسی شخص کو معلوم نہ ہو کہ میرا بھائی آئیگا اور وہ اتفاقاً بغیر کسی اطلاع کے آجائے تو اس پر تعجب ہوگا کہ ہائیں! تم کیسے پہنچ گئے۔ غرض کہ تعجب کے واسطے ہمیشہ جہل لازم ہے اور خداوند تعالیٰ جہل سے منزہ و مبرا ہیں۔ اُن کی ذات عالم جمیع جزئیات و کلیات ہے۔ اس کا علم محیط ہے جمیع اکوان کو۔ لہٰذا اس کے واسطے کوئی امر یا کوئی واقعہ موجب تعجب یا حیرت نہیں ہو سکتا بلکہ مراد اس سے تعجب ہوتی ہے (یعنی تعجب دلانا) یعنی یہ امر اس قابل ہے کہ

تم لوگ اس پر تعجب کرو اور متحیر ہو۔ ہم تو کیا تعجب کریں ہماری نظروں میں کوئی شے عجیب نہیں۔ اسی طرح تمنا ہے کہ ہمارے پاس تمام اشیاء موجود ہیں۔ تمام کائنات ہماری مخلوق اور مملوک ہیں۔ لہذا ہمیں تو کیا آرزو ہوتی۔ ہاں بیشک یہ امر تم لوگوں کی آرزو اور تمنا کے قابل ہے اللہ! اللہ! کیا شان ابزدی ہے اور کیا رحمت خداوندی ہے کہ جب دیکھا کہ یہ اتنے بے حس ہو گئے کہ انکو اپنے نفع رساں اور مفید اشیاء کے ملنے کی آرزو بھی نہیں رہی تو خود اپنی طرف آرزو کو منسوب کر کے متنبہ کر دیا کہ یہ امر قابل تمنا ہے۔ جیسے ایک شفیق باپ کہتا ہے کہ کاش! یہ میرا بچہ پڑھ جاتا۔ حالانکہ اس کے پڑھ جانے سے اس کو کچھ بھی نفع نہیں، مگر مقصود اس کا یہ ہے کہ میرے بیٹے کو احساس ہو کہ پڑھنا بھی کوئی قابل تمنا چیز ہے۔

استغناء حق تعالیٰ کی حقیقت

اسی طرح اگر ہم لوگوں کو یہ متمنیٰ یہ علم بھی حاصل ہو جائے تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو ہمارے اس علم سے کسی قسم کا نفع پہنچے گا۔ نعوذ باللہ من ذالک، وہ تو مستغنی ہیں۔ احتیاج سے مبرا ہیں۔ صرف ہمارا ہی نفع ہے۔ اور میں نے جو حق تعالیٰ کو مستغنی کہا ہے اس استغناء کے وہ معنی نہیں جو آج کل جاہلوں میں مشہور ہیں کیونکہ آج کل لوگوں نے استغنا۔ کے معنی بے توجہی اور لاپرواہی کے سمجھ رکھے ہیں چنانچہ یہ کتنا گندہ محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص جوان دو چار بچے چھوڑ کر مرجاتا ہے تو جہاں دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو ان میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ کیا جوان موت ہوئی۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہاں بھئی! کیسے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ مرا ہے۔ بیچارے بالکل بے وارث رہ گئے۔ تیسرا بولتا ہے کہ ہاں میاں! اللہ پاک کی ذات بڑی بے پرواہ ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہاں چارہ دم زدن نہیں غضب خدا کا اس موقع پر بے پرواہ کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے سکہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ! خداوند تعالیٰ کو اپنے بندوں کے مصالح پر بالکل توجہ نہیں۔ ان کے حالات سے غافل اور لاپرواہ ہیں۔ ان کے یہاں کوئی انتظام نہیں، سو یہ کتنی لغو ۔۔۔ بے ادبی ہے

اگر آپ کسی غلام کو اس کی مصلحت کے لئے دو لئے مسہل پلادیں اور اس لئے اس کے گھر والوں سے جُدا کر کے خلوت گاہ میں رکھیں تاکہ طبیعت یکسو ہو کر مادہ کو دفع کرے اور کوئی صاحب اس پر افسوس کریں کہ دیکھو میاں ایسے لاپرواہ آدمی ہیں کہ بے چارے غلام کو گھر والوں سے الگ کر دیا۔ تو کیا آپکو اس شخص کا کہنا بُرا نہ معلوم ہوگا اور کیا آپ نہ کہیں گے کہ میاں ہم نے اس کو اسی کی مصلحت سے گھر سے الگ کیا ہے۔ اب عنقریب گھر والوں میں رہنے سہنے لگے گا۔

سو جب آپ کو اتنا سا کہنا ناگوار گزرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کو جو کہ ہر وقت اپنے بندوں کی راحت رسانی اور فلاح میں ہیں اور باوجود ان کے عصیان اور نافرمانی کے بھی عنایت فرماتے ہیں تو ان کو اپنے بندوں کی یہ احسان فراموشی اور یاوہ گوئی ناگوار نہ گزرے گی؟ تم کو کیا خبر ہے کہ جس کو تم نے بے توجہی سمجھا ہے وہی ان کے حق میں عین توجہ اور عنایت ہو۔ خدا تعالیٰ کی حکمتوں سے کوئی شخص مطلع نہیں ہو سکتا۔

غرض کہ استغناء کے معنی لے التفاتی و لے توجہی کے کرنا سخت غلطی ہے اور منشاء غلطی کا محض یہ ہے کہ لفظ استغناء عربی اور اردو دونوں میں مستعمل ہے مگر عربی میں اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں۔ اسی معنی میں یہ خدا کی صفت ہے اور اردو محاورہ میں بے پروائی کے معنی بھی آتے ہیں۔ بس آپ لوگوں نے قرآن میں غنی اور استغنی اللہ کا دیکھ کر اردو محاورہ سے ترجمہ کر لیا اور استغناء کو یہ لوگ لاپروائی سمجھ بیٹھے، مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ جیسے خداوند تعالیٰ نے اپنے آپ کو غنی حمید کہا ہے ایسے ہی رؤف رحیم سے بھی تو متصف کیا ہے۔ تو اگر استغناء کے معنی بے توجہی اور عدم رعایت و لے التفاتی کے ہیں تو پھر رؤف کے کیا معنی ہونگے رافت و عدم مراعات میں تو تناقص ہے۔ رافت کے معنی تو عنایت شفقت اور رحمت کے ہیں اور عدم مراعات و بے توجہی ایک سخت دل اور غیر منصف شخص کا کام ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ استغنی کے یہ معنی نہیں بلکہ استغناء خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے افعال یا اعمال ہمارے واسطے مضرت رساں یا نافع نہیں ہو سکتے

ہم تمہارے کسی فعل کے محتاج نہیں اور نہ تم ہمیں کسی قسم کا نفع یا ضرر پہنچا سکتے ہو۔

چنانچہ ان اللہ لغنی عن العلمین کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ من جاھد فانما یجاھد لنفسہ جو کوئی محنت کرتا ہے اور حسنات پر عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے۔ ان تکفروا فان اللہ غنی عن العالمین۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہوا کہ جو شخص کفر و شرک کرتا ہے وہ اپنے آپ کو غارِ ذلت میں ڈالتا ہے اور مخلد فی النار بنتا ہے جیسا کہ حسنہ کا خدا تعالیٰ محتاج نہیں تھا اسی طرح کفر اس کے لئے باعثِ نقصان نہیں۔ یہ معنی ہیں استغنا کے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ صاحب ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں جن کی ماں مر گئی ہے اور خداوند تعالیٰ ان کے باپ کی بھی روح قبض کر لیتا ہے تو یہ کس طرح رافت میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا عدم رعایت اور بے انتظامی ہو گی؟

تو حضرت! آپ کی سمجھ پر پڑیں پتھر۔ آپ کو کیا خبر ہے حقیقت حال کی۔ بچے بھی انہیں کا ہے ان کا باپ بھی انہیں کا ہے۔ دونوں ان کے مملوک ہیں۔ اُن کی مصلحتوں کا آپ زیادہ خیال کر سکتے یا وہ۔ جس طرح اس نے اس باپ کو اتنا بڑا کر دیا ہے ایسے ہی وہ ان کی بھی پرورش کرے گا۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں دخل دینے والے اور رائے زنی کرنے والے۔ غضب خدا کا کس قدر اصرار ہے اور لوگ کیونکر بے اتفاقی اور عدم مراعات کے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ وہاں کے آداب کا حال یہ ہے کہ اثبات کمال میں بھی سلیقہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ حمد و ثنا کے اندر بھی ادب کے ملحوظ رکھنے کی سخت تاکید ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بارش ہونے لگی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ پانی کو لوگ ترس رہے تھے۔ ایسے موقع پر جو بارش ہوئی تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ! آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے۔ فوراً بارگاہِ صمدیت سے ان پر عتاب ہوا کہ بے ادب! بے موقع کون سے روز ہوئی تھی جو موقع کو آج کے ساتھ مقید کرتا ہے۔

غرض کہ اس بارگاہ میں اثبات کمال کے واسطے بھی سلیقہ چاہیے اور حق یہ ہے کہ ہم تو کسی طرح بھی ان کی مدح نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ان کی رحمت ہے کہ حمد و ثنا کا طریقہ

بھی خود دیکھا دیا ورنہ ہماری شاعری تو یہ حقیقت ہے سے

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

سبحان اللہ ان بزرگ نے تو تعریف ہی کی تھی مگر چونکہ عنوان غیر مہذب الفاظ ہیں اس وجہ سے اس قدر عتاب ہوا۔ وہاں پر بڑا سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور واقعی بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جو بظاہر کچھ سخت معلوم نہیں ہوتے مگر موقع ومحل سے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے اور نیز مخاطب کی شان کے اعتبار سے وہ الفاظ سخت بے ادبی اور گستاخی میں داخل کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان بزرگ پر محض لفظ آج کی بنا پر اتنی سختی ہوئی۔ حالانکہ ظاہر میں ہمارے خیال سے یہ لفظ کچھ گستاخانہ نہ تھا تو جب اس ذرا سے طرز بدل جانے اور الفاظ کے محاورہ کے خلاف ہونے پر اس قدر عتاب ہوا تو اثبات نقص پر تو جو کچھ عتاب بھی ہو تھوڑا ہے کیونکہ شان خداوندی میں اثباتِ نقص ایک بہت بڑا جرم اور گستاخی ہے۔ ایسے موقع پر لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ لو صاحب ایک ذرا سی بات پر کس قدر سخت گرفت ہوئی ایسی بھی کیا سختی ہے حالانکہ وہ لوگ غور وتامل سے کام نہیں لیتے ورنہ وہ سمجھ جائیں کہ ان کا یہ کہنا بھی جہالت کی علامت ہے کیونکہ یہ باتیں ذرا سی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ باتیں ہیں جن پر عام طور سے ہمارے محاورات میں بھی گرفت ہوتی ہے۔

مثلاً آپ کچہری روزانہ وقت پر جاتے ہیں اور وقت معینہ پر پہنچ جاتے ہیں کسی روز آپ کا حاکم کہہ دے کہ صاحب آج تو آپ بہت ٹھیک وقت پر آئے تو آپ کو کس قدر ناگوار معلوم ہوگا کہ لو صاحب روز تو ہم صحیح وقت پر یہاں پہنچ جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ آج تو آپ بہت صحیح وقت پر پہنچے گویا اور کسی دن صحیح وقت پر آئے ہی نہیں ایسے ہی اگر کوئی آقا اپنے کارگزار ملازم کو کسی کام کے واسطے بھیجے اور جب وہ کام کر آئے تو کہے بھئی! آج تو خوب کام کیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس ملازم کے دل کو کس قدر سخت تکلیف ہوگی۔

تو جب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ اس ہی محاورہ سے ہم اس قدر تنگ دل

ہوتے ہیں اور اس قدر یہ الفاظ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں تو اللہ میاں کو یہ الفاظ کیوں نہ ناگوار گزریں گے اور ان کے ہاں کیوں نہ ان پر گرفت ہوگی۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کبھی قید اتفاقی بھی ہوا کرتی ہے۔ مگر نہیں چونکہ محاورہ ہی سخت ہے اس وجہ سے یہ باتیں ضرور کھٹکتی ہیں۔ تو جب ایک ادنیٰ انسان کا یہ حال ہے تو احکم الحاکمین کے دربار کا تو کیا ٹھکانہ ہے۔ یہ گفتگو تو لفظاً "لَو" پر سے چلی تھی کہ لفظ تمنی کے استعمال سے اس طرح شفقت کا اظہار ہوگیا کہ ہمارے علم سے انکو کچھ نفع نہیں مگر پھر بھی صیغہ تمنی سے اس کو ظاہر فرمایا۔

دنیا و آخرت کی حقیقت سمجھنا

اب لو کانوا یعلمون کو سنیئے۔ قرآن کے نکات اور مضامین لطیفہ بھی کیسے کیسے عجیب ہیں کہ لفظ لفظ میں ایک علم کا دریا ہے۔ اس آیت میں لو کانوا یعلمون سے ایک دقیق اور لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ یہ دنیا باوجود اس میں اس قدر منہمک ہونے کے اس دنیا کی حقیقت سے ہی بالکل بے بہرہ ورنا واقف ہیں۔ دین سے تو کورے تھے ہی دنیا سے بھی جاہل ہیں۔ اسی لیے ایک آیت میں آخرت کے ساتھ دنیا کی حقیقت سمجھنے کی بھی ترغیب دی ہے۔

کذلک یبین اللہ لکم الاٰیت لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاخرۃ۔

"یعنی اللہ تعالیٰ اس آیت کو اس لیے بیان کرتے ہیں کہ تم دنیا و آخرت کی حقیقت میں خوب غور و فکر کر لو۔" اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ دنیا جس پر تم جان دیتے ہو تماشا ہے کہ تم اس کی حقیقت سے بھی جاہل ہو۔ لو آؤ اس کی حقیقت ہم سے سن لو اور اس کے قبائح و نقائص پر غور کرو۔ اس کے ساتھ ہی آخرت کی بھی حقیقت معلوم کرو جس سے تم بالکل غافل ہو اور اس کے محاسن و محامد میں تامل کرو اور پھر دیکھو کہ اب تک تم ایسی نفع رساں اور مفید شئے سے غافل اور ایک عبث شے کے پیچھے سرگرداں تھے۔ لہٰذا اب اس دنیا سے اعراض کرو اور اس کی دلچسپیوں کو ٹھکرا دو اور اس آخرت یعنی دار البقا کی طرف رغبت کرو اور اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اسی واسطے لعلکم تتفکرون فرمایا۔ دوسرے دنیا کی حقیقت بتلانے میں

یہ بھی فائدہ ہے کہ و بضدہا تتبین الاشیاء یعنی آخرت کی حقیقت کامل طور پر جبھی واضح ہوسکتی ہے جب دنیا کی حقیقت بھی آشکارا ہو۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی بدصورت عورت کو برقعہ پہنے ہوئے دیکھے اور اس کے ظاہری تناسب اعضا اور رفتار گفتار کو دیکھ کر دل وجان سے شیفتہ و فریفتہ ہو جائے تو جس طرح اس کا ایک کارگر علاج یہ ہے کہ اس کی نوعروس بیوی کا چہرہ جو کہ اس سے بدرجہا حسین وخوبصورت ہے، نقاب اٹھا کر دکھلا دیا جائے، اسی طرح اس کا تتمہ علاج یہ بھی ہے کہ اس بدصورت عورت کا چہرہ بھی نقاب اٹھا کر دکھلا دیا جائے تاکہ مقابلہ میں پھر اس کو احساس ہو کہ واقعی میری بیوی اس سے بدرجہا خوبصورت وحسین ہے۔ ورنہ تو تذبذب ہی میں رہتا کہ نہ معلوم اس کے جہاں سوز حسن کی کیا کیفیت ہوگی اور اس کے جمال کا کیا عالم ہوگا۔ غرضیکہ برقع پہنے ہوئے کافی طور سے استیصال اس مادۂ عشق کا نہ ہوگا اور نقاب اٹھاتے ہی حقیقت حال واضح ہو جائے گی اور پھر بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے الفت کے کلفت ہوگی۔

اسی طرح عروس آخرت کی قدر اس وقت ہوگی جبکہ اس ڈائن دنیا کی مکروہ صورت بھی اچھی طرح دیکھ لو اور اس کے قبائح معلوم کر لو۔ اگر دنیا کا کچا چٹھا کھول کر نہ دکھا دیا جاتا اور محض آخرت کی ہی خوبیاں بیان کی جاتیں تو اس قدر اہمیت آخرت کی نہ ہوتی اور دنیا کا خیال دل سے نہ نکلتا۔ اسی لئے حکیم مطلق نے دنیا اور اس کے نقصانات کی بھی شرح کی اور آخرت اور اس کے مفاد کو بھی بیان کیا تاکہ حب دنیا قلب سے کافی طور پر منقطع ہو کر اس میں رغبت آخرت کی پیدا ہو جائے۔ یہ بھی خدا کی خاص رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے محض ہمارے نفع کے لئے اس مبغوض دنیا کا ذکر بھی فرمایا۔ حالانکہ بظاہر اس کا کلام معجز نظام میں اشیائے مبغوضہ کا تذکرہ مستبعد ہے۔

اس استبعاد پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصریؒ کی مجلس میں کچھ بزرگ دنیا کی مذمت اور اس کے نقائص وعیوب بیان کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ تو معلوم ہوا یعنی فانکم تحبون الدنیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو دنیا کی مذمت کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ من احب شیئاً اکثر ذکرہ۔ تمہارا اس کے تذکرہ میں مشغول ہونا گو بصورت ذم

نے کہا، اے شخص تو نے ایک کلمہ ریا سے اپنے دونوں حج کا ثواب باطل کر دیا۔
لغزشیں تو سب ہی سے ہوا کرتی ہیں کیونکہ عصمت بجز ملائکہ و انبیاء کے اور کسی کے واسطے ثابت نہیں لیکن لغزشوں کا ادراک یہ بھی ایک اہم مرحلہ ہے ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جن کو اپنی لغزشوں پر تنبیہ ہو جایا کرے۔ لہٰذا کیا تعجب ہے کہ یہ حضرات رابعہؒ کی مجلس والے بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں اور اسی وجہ سے اُن کی زبان سے یہ مذمتِ دنیا صادر ہوئی ہو اور حضرت رابعہ بصریؒ کو اس مرض کا احساس ہو گیا ہو۔

اسی طرح بوجہ انقباض ذکر مبغوض کے یہ شیطان پر لعنت بھی نہ کیا کرتی تھیں کہ کون اتنی دیر شیطان کے پیچھے پڑے۔ ذکرِ محبوب ہی میں کیوں نہ پڑیں اور یہ بھی ہے کہ عدم لعنت پر تو مواخذہ نہ ہوگا نہ کسی قسم کی بازپرس بخلاف ترکِ ذکر کے کہ اس پر بازپرس ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ جتنی دیر ہم شیطان پر لعنت کریں اس سے بہتر یہ ہے کہ اس وقت کو ذکرِ الٰہی میں گزاریں تاکہ خدا کے ہاں کی بازپرس سے بچیں۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح انھوں نے ان حضرات کو تذکرہ دنیا سے منع کیا ہو کہ اس میں چنداں فائدہ نہیں جس قدر ذکرِ الٰہی میں نفع ہے۔ لہٰذا کیوں وقت کو عبث ضائع کرتے ہو۔

تو جب خدا کے مقبول بندے دنیا کو اس قدر بُرا سمجھتے ہوں کہ اپنی مجلس میں اس کی مذمت کو بھی گوارا نہ کریں۔ نام تک لینا اضاعتِ وقت سمجھیں تو پھر یہ خداوند تعالیٰ کے کلام میں تو کیونکر قابلِ ذکر ہوگی۔ مگر مع ہذا پھر خدا نے تذکرہ دنیا کا کیا تاکہ ہم لوگوں کو تنبیہ ہو اور ہوش میں آجائیں۔ یہ کمال رحمت ہے کہ اپنے بندوں کی خاطر ایک ایسے اَمر کے ذکر کو اختیار کیا جائے جو کہ مبغوض ہے۔ غرض یہ ہے کہ اتنی سی تو آیت اور اس میں کس قدر عنایات و احسانات کہ ہر پہلو سے بیدار کیا اور ہر جانب سے ہوشیار فرمایا۔

تزکیۂ نفس کے طریقے

خلاصہ تمام آیت کا یہ ہے کہ ہر وقت اپنا وظیفہ اور مطمع نظر صرف دو چیزوں کو رکھے۔ اوّل تنفر و انقباض عن الدنیا مع استحضار فنائے دنیا اور دوسرے رغبت اور طلب

آخرت اور اس کی تحصیل کے ذرائع و اسباب کی تلاش۔ اور یہ مطلق استحضار تو ہر وقت اور ہر ساعت ہی کا وظیفہ ہے لیکن خاص استحضار کے لئے بھی کم از کم ایک دن میں ایک مرتبہ ضرور وقت مقرر کر لینا چاہیئے۔ وہ اس طرح کہ روزانہ سوتے وقت چارپائی پر لیٹے تو اپنے تمام دن کے افعالِ حسنہ و سیئہ، طاعات و معصیت کو پیش نظر رکھ کر ان میں سے سیئات و معصیات کو علیحدہ کرے اور حسنات کو علیحدہ اور پھر جو نافرمانیاں کی ہیں اُن پر جو وعیدیں ہیں اور ان پر جو سزائیں و عذاب وارد ہیں اُن کا تصور کرے اور یہ سمجھے کہ گویا میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں اور حساب و کتاب ہو رہا ہے اور اتنے میرے گناہ ہیں جن پر یہ عذاب میرے واسطے تجویز ہوا ہے۔ یہ خاص استحضار ہے دُنیا و آخرت کا۔

اور استحضار کے بعد دو کام اور کرے۔ ایک تو توبہ اور خداوند تعالیٰ سے وعدہ کہ آئندہ پھر ارتکاب معاصی سے بچوں گا۔ اور دوسرے اس وعدہ پر باقی رہنے اور توبہ پر ثابت رہنے کی دُعا کرے کہ خدایا مجھ کو توفیق دے کہ میں اس توبہ پر قائم رہوں۔ توبہ کی ضرورت تو ظاہر ہے اور دعا کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسان کی قدرت سے یہ باہر ہے کہ خود وہ کسی وعدہ کو پورا کر دے یا کسی دعویٰ کو نباہ دے بدون خدا کی عنایت و اعانت کے۔ نیز اس استحضار کا تتمہ یہ بھی ہے کہ جس قدر دن بھر میں خدا کے احسانات ہوئے ہیں اُن پر بھی ایک تفصیلی نظر ڈالے۔ اُفوہ! باوجود اس قدر نافرمانیوں کے پھر خداوند تعالیٰ نے مجھ پر اس قدر انعامات فرمائے تو اگر میں ان نافرمانیوں سے بچوں گا تو نہ معلوم کس قدر احسانات و انعامات ہوں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اگلے ہی دن رغبت طاعت کی طرف بہت زیادہ ہو جائے گی۔ یہ دستور العمل ہمیشہ کے واسطے مقرر رکھے اور پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔

نیز اس کے ساتھ ہی کوئی خاص وقت مقرر کرنا چاہیئے جس میں کچھ ذکر کر لیا کریں تاکہ قلب تازہ رہے اور رُوح کے اندر ایک حیاتِ روحانی باقی رہے لیکن یہ واضح رہے کہ محض ذکر ہی کافی نہیں بلکہ کسی بزرگ سے تعلق اور نسبت بھی ضرور رکھنی چاہیئے تاکہ تزکیہ نفس بھی ہو جائے اور اس کی مدد سے ہر قسم کی لغزشوں سے بھی بچتا رہے۔ بدون اس

کے کامیابی دشوار ہے بلکہ احتمال ہے کہ جادۂ استقامت سے نہ ہٹ جائے اور افراط و تفریط میں مبتلا ہو جائے۔ اگر زندہ بزرگوں میں سے کسی کے ساتھ عقیدت نہ ہو تو ان بزرگانِ دین کے تذکرے اور کتابوں ہی کا مطالعہ کیا کرے جو وفات پا چکے ہیں۔ اول وہی نافع ہوں گی اور اگر نہیں تو پھر رغبت و تلاش پیدا ہو گی۔ اور ضرور کسی پیر طریقت کے ساتھ عقیدت ہو جائیگی اور کامیابی کی صورتیں مہیا ہو جائیں گی۔

باقی سب سے بڑا مراقبہ وہی ہے جس کو میں اوّل بیان کر چکا ہوں اور مکرر عرض کرتا ہوں کہ ہر وقت یہ خیال پیش نظر رکھے کہ میں اس وقت سفر کر رہا ہوں، آخرت کی دور دراز منزل میرے سامنے ہے جس کی شاہراہ بہت کٹھن ہے۔ اس میں بہت سے موانعات پیش آیا کرتے ہیں اور منزلیں کھوٹی ہو جایا کرتی ہیں۔ لہٰذا جس قدر امور معاون اور مقصود میں مددگار ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے اور جو امور مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں ان کو چھوڑنا چاہیے۔

لیکن یہ سب کچھ موقوف ہے خدا کی عنایت پر، جب تک اللہ میاں کی نظر رہیگی اس وقت تک تمام مشکل سے مشکل کام سہل ہو جاویں گے اور سب دقتیں آسان ہو جاویں گی اور جہاں اس فیض سے محروم ہو گئے تو پھر آسان سے آسان کام بھی دشوار اور ناقابل برداشت ہوں گے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ امداد خداوندی کی دعا ضرور کرے یہی امداد وہ چیز ہے کہ سالکین کو اس کی بہت فکر رہتی ہے اُن کی آنکھیں روشن ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بدون اس کی عنایت کے ہم اس شاہراہ پر نہیں چل سکتے۔

شیوخ کے حلقہ و توجہ کی حقیقت

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ — بے عنایاتِ خدا ہیچیم و ہیچ!
بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق — گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق

دوسرے شعر میں مولانا نے حصولِ عنایاتِ حق کی صورت بتلائی ہے کہ خدا کے خاص بندوں کی عنایت حاصل کرو۔ اس کو فضول نہ سمجھو اور یہ نہ خیال کرو کہ ایک آدمی کی

عنایت سے کیا ہوتا ہے۔ صاحبو! یہ بھی بہت مفید ہے اور بہت سی مضرتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور اُن کی عنایات اور توجہ یہی ہے کہ وہ اپنے متعلقین اور مریدین پہ توجہ رکھیں۔ ہر وقت ان کا خیال رکھیں اور اُن کو مضرتوں سے بچنے کی ہدایت کریں منافع حاصل کرنے کی تدبیریں بتائیں۔ غرضیکہ ہر وقت ان کو اپنی زیر نظر رکھیں۔ اگر سامنے آکر بیٹھیں تو خاص تفقد رکھیں یہی عنایت ہے یہی توجہ ہے۔

ہمارے شیوخ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات مریدین پر توجہ نہیں ڈالتے نہ کوئی حلقہ باندھتے ہیں نہ کوئی خاص وقت مقرر کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ناواقف ہیں نہیں سمجھتے کہ ہمارے شیوخ کی توجہ ہم پر ہر وقت رہتی ہے۔ جو لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں اور خاص اوقات میں توجہ ڈالتے ہیں ان کی توجہ ان خاص اوقات ہی میں رہتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کی توجہ ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ فی الحقیقت توجہ کے واسطے حلقہ باندھنے یا کسی خاص انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی توجہ صحابہ کرام ؓ پر نہ تھی۔ حالانکہ نہ وہاں پر کوئی حلقہ باندھا جاتا تھا نہ توجہ کا کوئی خاص وقت مقرر تھا نہ کوئی اس کا خاص اہتمام و انتظام تھا۔ مگر باایں ہمہ آپ کی توجہ ان کے ساتھ ہر وقت لازم غیر منفک تھی کسی وقت آپکی توجہ سے خالی نہیں رہتے تھے۔ اسی طرح ہمارے حضرات اپنے معتقدین کو خلوت میں ہوں یا جلوت میں کبھی توجہ سے خالی نہیں رکھتے۔ برابر ان کا خیال کرتے ہیں۔

جس طرح ایک شفیق اُستاد اپنے شاگرد کا ہر وقت خیال رکھتا ہے کہ وہ اگر سامنے بیٹھا پڑھ رہا ہے تب بھی اس کی حرکات و سکنات کا خیال ہے اور اگر گھر چلا جاتا ہے اور دیر میں آتا ہے تب بھی اس سے پوچھتا ہے کہ اتنی دیر میں کیوں آیا کہاں گیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ استاد کو گھر جانے سے پہلے اور عدم موجودگی میں بھی اس شاگرد کا خیال تھا۔ چنانچہ مولانا اسی مضمون کو اس شعر میں ادا فرماتے ہیں ؎

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست　　قبضہ اش جز قبضۂ اللہ نیست

غرض کہ عنایات و توجہ شیخ کا ہونا ضروری ہے اور اس قسم کے تعلقات

شیخ سے رکھنے چاہئیں جن سے اس کی تمام عنایات کو اپنے حق میں مبذول کرے اور اس کی رغبت کو اپنی طرف کھینچ لے لیکن یہ رغبت وعنایت شیخ کی خدمت کرنے پاپیر دبانے، ہدایا بھیجنے سے نہیں حاصل نہیں ہوتی۔

جس طرح ایک شاگرد اپنے بے غرض استاد کے پاس روزانہ مٹھائیاں لے جاتے۔ دوسرے تیسرے روز نذرانہ دیتا ہے۔ آٹھویں دسویں دن دعوت کرتا ہے مگر پڑھنے لکھنے سے کورا ہو محنت سے بھاگتا ہو تو ایسے شاگرد سے ایسے استاد کو ہرگز محبت نہ ہوگی بخلاف اس شاگرد کے جو نہ مٹھائی لاتا ہے نہ دعوتیں کرتا ہے نہ نذرانے پیش کرتا ہے لیکن سبق خوب محنت سے یاد کرتا ہے۔ ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا ہے۔ کھیل کود سے نفرت کرتا ہے۔ ایسے طالب علم سے استاد کو خالص محبت ہوگی ہے اور اس کے دل میں پڑھانے لکھانے کی امنگیں پیدا ہونگی۔ خود بھی محنت کریگا اس سے بھی محنت لیگا۔ اسی طرح مشائخ محققین کا حال ہے کہ وہ اس شخص سے کبھی خوش نہیں ہوتے کہ جو ان کو تحفہ تحائف بھیجا کرے، نذرانے خوب پیش کیا کرے مگر کام کچھ نہ کرے۔ تو نہ ان کو ایسے لوگوں کی طرف توجہ ہوتی ہے نہ اُن کی اصلاح کا خیال ہوتا ہے۔ ہاں ان کی توجہ ان لوگوں پر مبذول ہوتی ہے جو اس وقت طلب حق میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کا التفات ان لوگوں کی جانب ہوتا ہے جن کے دلوں میں خدا کی محبت ہوتی ہے اور سچی دھن ہوتی ہے۔

غرضیکہ ان دونوں مراقبوں میں یہ بھی لازم ہے کہ ان مراقبوں کے فائدہ تامہ حاصل کرنے کے لئے کسی شیخ کا دامن پکڑا جائے اور اس کے ساتھ تعلق خاص اتباع رکھا جائے خواہ بیعت ہو یا نہ ہو۔ زمرۂ مریدین میں داخل ہو کہ نہ ہو محض تعلق اتباع بھی کافی ہے۔ انشاء اللہ اس طرز عمل کرنے کے بعد نجات یقینی ہے۔ فلاح دارین اور نجات کونین حاصل کرنے کی صورت میں صرف یہی ہے کہ موافق مذکورہ بالا طلب حق کی کوشش کی جائے اور سعی سے کسی وقت قدم نہ ہٹایا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی ہوگی اور مقصود حاصل ہوگا۔

چنانچہ اسی رکوع کے آخر میں وعدۂ خداوندی ہے:

والذین جاھدو فینا لنھدینھم سبلنا

یعنی جو لوگ طلب حق کی کوشش کرتے ہیں اور ہم سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں ہم ان کے واسطے اپنے راستے کھول دیتے ہیں اور چلنے میں ان کی رہبری کرتے ہیں۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ لیا اوقات انسان محنت کرتا ہے مگر لے کا ثابت ہوئی ہے سعی ہوتی ہے مگر بجائے کامیابی کے ناکامیابی کی صورتیں نظر آتی ہیں بخلاف اس کے ہمارے یہاں یہ قاعدہ نہیں کہ ہم کسی کی محنت کو بیکار کریں۔ ہمارے ہاں تو جو کوئی اس کورس میں محنت کریگا کوشش کریگا اسکو ملازمت ضرور مل جائیگی چاہے کتاب آئے یا نہ آئے۔ ہاں محنت کرنا شرط ہے۔

غرضیکہ خداوند تعالےٰ نے ہمارے متعلق صرف سعی و مجاہدہ سپرد کیا ہے۔ اب اس پر ثمرات کا مرتب ہونا یہ منجانب اللہ ہے۔ وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے وعدہ دیا ہے کہ تم ہمارے لئے کوشش کرو ہم اس کا ثمرہ تم کو ضرور دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کوشش محض ہمارے واسطے ہو۔ جیسا فینا کا مفہوم ہے۔ طلب دنیا کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیے ورنہ پھر اگر ترتب ہدایات سبل نہ ہو تو کچھ بعید نہیں کیونکہ ہمارا وعدہ تو اسی وقت تک ہے جب تک طلب حق کے واسطے مجاہدہ و سعی کرتے رہو گے اور ہم سے ملنے کی کوشش کرتے رہو گے۔ اگر تم دنیا طلب کرتے ہو تو تم جانو اور تمھارا کام۔ ہم سے کچھ واسطہ نہیں۔ دنیا کے طلب کرنے میں ہم تمھارے معاون و مددگار نہیں کیونکہ دنیا ایک قبیح شے ہے اس کی طلب بھی قبیح۔ لہٰذا ہم ایک عمل قبیح کے حاصل کرنے میں تمھاری معاونت کا وعدہ کیسے کر سکتے ہیں اور مراد اس دنیا سے جس کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے دنیائے مذموم ہے دنیائے محمود نہیں۔

دُنیا کی قسمیں

کیونکہ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک محمود اور ایک مذموم۔ پس مذموم کو آخرت سے بُعد ہے کہ اسکو آخرت سے کوئی تعلق ہی نہیں مگر محمود کو آخرت سے بُعد نہیں اور

یہاں سے ایک شبہ کا حل ہو گیا جو میری تقریر پر وارد ہو سکتا تھا وہ یہ کہ مذکورہ بالا تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبِ دنیا مذموم ہے حالانکہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جو غزوۂ اُحد میں پہاڑ کے مورچہ پر سے غنیمت حاصل کرنے کو چلے آئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت وہاں سے ہٹنے کی نہ تھی مگر جب انھوں نے دیکھا کہ لشکرِ عدو بھاگ گیا ہے۔ اب یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے چلو غنیمت کو کیوں چھوڑا جائے۔ یہاں پر بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ان کی نسبت ارشاد فرمایا: منکم من یرید الدنیا جس سے انکا طالبِ دنیا ہونا معلوم ہوتا ہے تو کیا صحابہؓ کو فعلِ مذموم کا مرتکب کہا جائیگا

اس شبہ کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ دنیا کی دو قسمیں ہیں جیسا بیان کیا گیا ہے۔ ایک مذموم او اس کی طلب بھی مذموم۔ وہ طلب الدنیا لِلدنیا ہے اسی کا نام لہو ولعب ہے اور ایک دنیائے محمود اس کی طلب بھی محمود۔ وہ دنیا للآخرت ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف ارادہ دنیا کی نسبت کی گئی ہے وہ طلب للدنیا نہ تھی بلکہ طلب الدنیا للآخرت تھی کہ مالِ غنیمت حاصل ہوگا تو آلاتِ حرب تیار کر کے دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کریں گے۔ اپنے حال کو درست کر کے شوکتِ اسلامی بڑھائیں گے اور قرآنِ شریف میں صرف یرید الدنیا فرمایا ہے اور انکے حال سے للآخرت کی قید معلوم ہوئی پس اشکال رفع ہو گیا۔

اور اگر اس پر یہ شبہ ہو کہ پھر عتاب کیسا، حالانکہ یہ طلبِ دنیائے مذموم نہ تھی ——!

اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد پر کیوں عمل کیا۔ لہٰذا اس بناء پر یہ عتاب ہوا۔ نہ یہ کہ فی نفسہٖ وہ دنیائے قبیح کے مرتکب ہوئے تھے ——!

حاصل آیت کا یہ ہے کہ تم ہمارے واسطے محنت کرو، مجاہدہ کرو تو ہم تمھارے پہنچنے کے واسطے اپنے راستے کھول دیں گے اور رہبری کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور ان اللہ لا یخلف المیعاد۔ دیکھئے! خدا کی شان کہ اتنا بڑا وعدہ کیا کہ تم محض کوشش کرلو مطلوب دینے کے ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر ہماری بدگمانی کی طرف نظر فرما کر کہ شاید اپنی تنگ دلی کی وجہ سے اتنے بڑے وعدہ کو سن کر مطمئن نہ ہوں کس قدر تاکیدات فرمائیں کہ اول میں لامِ تاکید لائے آخر میں نونِ ثقیلہ لائے تاکہ وعدہ خوب مؤکد ہو جائے۔ نیز صیغہ لائے جمع متکلم کا لنھدینھم

نہیں فرمایا تاکہ ہمارے مذاق کی پوری پوری رعایت ہو جائے کیونکہ ہمارے محاورہ میں وعدۂ مغفرت قدرت کو صیغۂ جمع ہی ظاہر کرتے ہیں۔

اور ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ہم وہ کام کر سکتے ہیں جو ایک جماعت مل کر بھی نہیں کر سکتی۔ کبھی تم کو یہ خیال ہو کہ مجاہدہ وسعی کرنیوالے تو سینکڑوں ہونگے۔ خدا کیونکر ان سب کو ہدایت کریگا۔ اگرچہ ایک مسلمان کی قوتِ ایمانیہ ہرگز تقاضا نہیں کر سکتی کہ وہ ایسا خیال کرے لیکن توہمات کے درجہ میں ایسے وساوس پیدا ہو جاتے ہیں اُن کے رفع کرنیکی غرض سے صیغہ جمع متکلم اختیار کیا کہ اگرچہ ہم تنہا ہیں لیکن ہم وہ کام کر سکتے ہیں کہ تمام دُنیا مل کر بھی نہیں کر سکتی۔

اور آیت میں لفظ سبلنا سے ایک مسئلہ تصوف کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ ہے وہ مسئلہ یہ ہے کہ طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق کیونکہ یہاں پر لفظ سُبل میں صیغہ جمع اختیار کیا اور دوسری طرف فہدین کا مفعول بھی جمع کی ضمیر ہے۔

طریق وصول الی اللہ

پس مقابلہ جمع بالجمع سے معلوم ہوا کہ ہم تک پہنچنے کا طریقہ صرف ایک ہی نہیں بلکہ بہت سے طریقے ہیں یعنی ہر شخص کے لئے جدا ہے جس طرح کہ اصلی اجزاء نسخہ کے ایک ہی ہوتے ہیں لیکن طبیب خصوصیات طبائع پر نظر کر کے کمی بیشی کے ساتھ یا اختلاف ترکیب کے ساتھ کسی مریض کے واسطے کسی طرح تجویز کرتا ہے اور کسی مریض کے واسطے کسی دوسرے طریقہ پر تجویز کرتا ہے اور کسی مریض کے واسطے انہی اجزاء کے نسخہ کے ساتھ بدرقہ بھی تجویز کرتا ہے اور کسی کو محض نسخہ ہی لکھ دیتا ہے۔ غرضیکہ اصلی اجزاء ایک ہی ہیں لیکن طبیب مریضوں کی کیفیت کو ملحوظ رکھ کر اس کے موافق نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح اصل شریعت غراء واحد ہے مقصود محض وصول الی اللہ ہے لیکن بعض اعمال کے اعتبار سے ان کے طریق متفرق ہیں۔

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بیمار شخص آیا اور اس نے

عرض کیا کہ حضرت میں بیمار ہو گیا تھا اور افسوس ہے کہ میں مسجد حرام میں نماز نہ پڑھ سکا۔ آپ نے اس کے واسطے دعائے صحت فرمائی اور رخصت کیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جب عرفا کا مجمع رہ گیا تو فرمایا کہ یہ شخص عارف ہوتا تو ہرگز قلق نہ کرتا کیونکہ جس طرح وصول کی یہ صورت ہے کہ عذر سے گھر میں نماز پڑھ کر حرم کو ترستے رہو۔ اس لیے عارف کی نظر میں دونوں حالتیں وصول کا سبب ہیں اور ایک سی ہیں۔ عارف تو ایک بندۂ رضا جو ہے۔ اس کا مقصد ادائے صلوٰۃ ہے۔ اگر مسجد حرام میں ہو سکتا تو وہاں ادا کرتا اور اگر عذر یا بیماری کی وجہ سے وہاں ادا نہ کر سکتا تو اپنے گھر پر ادا کرتا۔

لہٰذا شیخ اور حکیم استعداد کے موافق کوئی طریقہ خاص کر دیتے ہیں جو اس کو منزل مقصود پر پہنچانے کا سہل طریقہ ہوتا ہے جس طرح مکہ شریف کے جانے کا راستہ بمبئی سے ہے ایسے ہی ایک راستہ کراچی سے بھی ہے۔ راستے اگرچہ متفاوت ہیں لیکن جس جگہ پہنچنا ہے وہ ایک ہی ہے وصول الی الحق سے جاؤ چاہے اُدھر سے جاؤ۔ اسی طرح مقصود ایک ہی ہے وصول الی الحق کا اور طرق متفاوت ہیں۔

اب شیخ کے پاس ایک شخص آتا ہے اس کے نفع کی صورت کثرت تلاوت ہے تو اس کے واسطے کثرت تلاوت قرآن شریف تجویز کریگا اور ایک دوسرا شخص آتا ہے۔ اس کے اندر مرض کبر ہے۔ اس کے واسطے وہ ایسی تجویزیں اختیار کرتا ہے جس سے کبر رفع ہو جائے۔ پھر اس میں بھی تعدد ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے اس مرض کبر کے ازالہ کی صورت جیسے یہ ہے کہ اس سے لٹرک پر جھاڑو دلوائی جائے اسی طرح یہ بھی علاج ہے کہ اس سے نمازیوں کے جوتے اٹھوائے جائیں مقصود دونوں صورتوں سے اور دونوں علاجوں سے مرض کبر کا دفع کرنا ہے۔ غرض کہ طرق اگرچہ متفاوت ہیں لیکن مقصود ایک ہی ہے

پھر آگے اس پر جزا مرتب فرمائی ان اللہ مع المحسنین۔ تو اس پر نظر کر کے خلاصہ آیت یہ ہوا کہ تم ہمارے بتلائے ہوئے طریقہ کے موافق عمل کئے جاؤ۔ مجاہدہ وسعی سے ہمت نہ ہارو۔ اس سے تم محسن بندوں میں شامل ہو جاؤ گے اور پھر اس پر یہ جزا مرتب ہوگی کہ ہم اس طائفہ محسنین کو اپنی محبت کی دولت عطا فرمائیں گے اور معیت کا

وعدہ اس صیغہ سے فرمایا؟ ان اللہ مع المحسنین یوں نہیں فرمایا ان المحسنین مع اللہ
اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تک پہنچنے کی اگرچہ ایک محتمل صورت یہ بھی ہے کہ تم ہم
سے آکر مل جاؤ مگر یہ تمھاری قدرت سے باہر ہے

بگرد و قطع ہرگز جادۂ عشق از دو یدنہا — کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

لہذا ہم نے دوسری صورت اختیار کرلی ہے کہ ہم محسنین کے ساتھ مل جائیں گے۔

اب محسنین کی حقیقت سمجھئے جس کو اوپر والذین جاھدوا سے تعبیر فرمایا ہے۔
احسان کی حقیقت حدیث شریف میں یہ آئی ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ یعنی خدا
کی عبادت اس طرح خوبی و ادب و توجہ سے کرو کہ اگر تم اس کو دیکھتے ہوتے اس وقت
جس طرح کرتے۔ اس پر یہ شبہ ہوگا کہ جب ہم دیکھتے نہیں تو اس حالت کا اثر ہم کیسے
لے سکتے ہیں؟ اس کا جواب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ساتھ ہی دیدیا ہے:

فان لم تکن تراہ فانہ یراک

اگر تم خدا کو نہیں دیکھتے تو وہ تو یقیناً تم کو دیکھ رہے ہیں اور رؤیت حاکم للمحکوم
پر وہی ہوتا ہے جو رؤیت محکوم للحاکم کا اثر ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ایک محکوم اپنے
حاکم کو دیکھ کر اس کے سامنے نہایت ادب و متانت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور
تمام کام نہایت ہوشیاری سے کرتا ہے ایسے ہی تم بھی اپنے خدا کے سامنے کھڑے
ہو کر جو احکم الحاکمین ہے نہایت خشوع و خضوع سے عبادت کرو۔ یہ پہلے جملے کا مطلب ہوا۔
لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حاکم دنیا اگر ہمارے سامنے اس طرح کھڑا ہو کہ ہم اس کو
دیکھتے ہوں تو اس کے رعب و ادب کی وجہ سے کام نہایت خوش اسلوبی سے ہوتے
ہیں اور خدا چونکہ ہمیں نظر نہیں آتا تو ہم وہ رعب و داب کہاں سے لائیں؟
دوسرے جملہ میں اس کا جواب ہے کہ تمھاری عبادت و اطاعت کے سنوارنے اور
ادب و قاعدہ کے ملحوظ رکھنے کے لئے مثل طریقہ مذکورہ کے ایک دوسرا طریقہ یعنی محض
خداوند تعالےٰ کا تم کو دیکھنا اور تمھارا اس پر یقین کر لینا بھی کافی ہے کہ وہ تم کو ہر حال
میں دیکھ رہا ہے اور اس کے تم معتقد ہو ہی کہ ہم کو خدا ہر وقت دیکھتا ہے اور ہم

اور ہم انکی نظروں کے سامنے ہیں۔ لہٰذا جب ہمیں اس کے دیکھنے کا یقین ہے تو ہم اگرچہ نہیں دیکھتے لیکن جس کو ہمیں اپنی عبادت دکھانی مقصود ہے وہ تو دیکھ رہا ہے لہٰذا سنوارکر اور متانت کے ساتھ ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک خادم کو معلوم ہو کہ آقا میرے تمام کاموں کو چلمن کے پیچھے بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اب اگرچہ یہ اس کو نہیں دیکھ رہا لیکن یہ سارا کام اسی احتیاط سے کریگا جیسا کہ وہ نظروں کے سامنے ہوتا تو اس وقت کرتا اور وہی رعب داب بھی ہوگا جو کہ سامنے کھڑے ہوئے ہوتا۔ یہ حاصل ہے احسان کا اور اس کو مجاہدہ سے تعبیر فرمانا اشارہ ہے اس کے طریق حصول کی طرف کہ وہ مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کے وہ متعارف معنی نہیں کہ مدتوں خاک چھاننے۔ کیونکہ احسان کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ بفضلہ تعالیٰ اوّل ہی روز میں حاصل ہوسکتی ہے اور یقیناً حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ ــــــــــ ان اللّٰہ بصیر بما یعلمون کا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے۔ صرف اس کے استحضار کی ضرورت ہے اور یہی انتفضا ہے جو نفس کی آزادی کے خلاف ہونے کے سبب اس پر قدرے شاق ہے اور یہی مجاہدہ ہے۔

پس افسوس اسی کا ہے کہ ہم لوگوں نے عقائد کو محض علم و دانستن کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اعمال میں ان سے کام نہیں لیتے۔ اسی لئے یہ کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ ان سے عمل میں کام لو تو کیفیت حاصل ہو۔ پھر اس کیفیت میں رسوخ پیدا ہو کر ایسا ذوق میسر ہو کہ پھر کبھی عمل نہ چھوٹے اور نہ کبھی سیری ہو اگرچہ وصول الی الحق بھی ہو جائے بمقتضائے شعر ؎

دل آرام در بر دل آرام جوے ۔۔۔ لب از تشنگی خشک بر طرف جوے
نہ گویم کہ بر آب قادر نیند ۔۔۔ کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں اور خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ نادرِ قیوم مجھے اور آپ لوگوں کو توفیق عطا کرے کہ ہم آپ سب اس پر عمل کریں۔ آمین ثم آمین۔

الحمد للّٰہ رب العالمین

ھَمُّ الآخرۃ

فِکرِ آخرتُ

انہماک فی الدنیا وفقدان ھمّ فی الآخرت کے متعلق یہ وعظ ۵ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ
کو حضرت نے اپنے مکان پر ۳۰ کے قریب جمع شدہ افراد کے مجمع میں بعض
مستورات کی فرمائش پر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا۔ جو چار گھنٹوں میں ختم ہوا

اور

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے قلم بند فرمایا۔

محض حرصِ دنیا مذموم نہیں بلکہ اس کے مقتضا پر عمل کرنا مذموم ہے۔ اسی طرح حبِّ مال بھی مطلقاً مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ اس کا مطلوب بھی ہے مثلاً اتنی محبّت جس سے مال کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے مطلوب ہے کیونکہ مال کا ضائع کرنا حرام ہے۔ اگر اتنی محبّت بھی نہ ہوگی تو یہ مال کی بے قدری کریگا اور اس کو ضائع و برباد کردے گا جس کی شرعاً ممانعت ہے

سے تم اکو خود ہی نفرت ہو جائے گی اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھے گی۔ یہی مطلوب ہے اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ ہم کو توفیقِ عمل نصیب ہو۔

وصلی اللہ علیٰ سیّدنا ومولانا
محمّد و علیٰ آلہ واصحابہ
اجمعین ؕ

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلّم۔ امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یعلمون ظاھرا من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون ٥

عظیم الشان پیشین گوئی

یہ ایک آیت ہے سورۂ روم کی اس سے قبل حق تعالٰی نے ایک پیشین گوئی بیان فرمائی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق رسالت میں۔ کیونکہ پیشین گوئی کا ایسے شخص کی زبان سے نکلنا جس نے اس کے اسباب کو حاصل نہ کیا ہو اور دعوی نبوت کا کرتا ہو۔ پھر پیشین گوئی

تو اس سوال کا منشا محض فرض و تقدیر تھا ایسے ہی اس سوال کا مبنی ہے اور ایسے احتمالات قابل التفات نہیں ہوتے۔ اور بفرض محال اگر اس کو فرض بھی کرلیا جائے تو جواب یہ ہے کہ یہ علامت اس وقت ہے جب کسی نص قطعی سے نبوت ثابت نہ ہوچکی ہو ورنہ ایسا واقعہ علامت نہ ہوگی۔

اللہ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا

حاصل آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس جگہ بہت بڑی پیشین گوئی فرماکر ارشاد فرماتے ہیں کہ

وعد اللہ لا یخلف اللہ وعدہ

"یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتے" تو یہ پیشین گوئی ضرور واقع ہوگی۔ اور پیشینگوئی کے صحیح طور پر واقع ہونے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ لوگ آپ کی نبوت کو مان لیتے مگر بہت لوگ پھر بھی منکر رہے حق تعالیٰ اس آیت میں اسکی وجہ اور سبب بتلاتے ہیں چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

وعد اللہ لا یخلف اللہ وعدہٗ ولکن اکثر الناس لا یعلمون

اس کے جملہ اخیرہ شکایت ہے کہ لوگوں کو اس کی خبر ہی نہیں (کہ معجزات علامات نبوت ہیں اور پیشینگوئی بھی بوجہ اخبار عن الغیب ہونے کے معجزہ ہے) اور خبر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اس کا عقیدہ نہیں یا عقیدہ تو ہے مگر اس کے موافق علم نہیں اور چونکہ علم کے واسطے عمل لازم ہے گو درجہ التزام ہی میں ہو جب عمل نہ ہوا تو اس سے علم کی بھی نفی ہوتی ہے اس لیے لا یعلمون فرمایا اور میں نے جو یہ قید بڑھائی ہے کہ گو درجہ التزام ہی میں ہو اس سے دفعہ دخل مقدر ہے۔ ایک اشکال کو میں نے رفع کیا ہے وہ یہ کہ بہت سے مسلمان نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے حالانکہ وہ ان کی فرضیت کے معتقد ہیں تو کیا عدم عمل سے یہاں بھی علم کی نفی کی جائیگی؟

جواب یہ ہے کہ التزام عمل بھی عمل کا ایک درجہ ہے اور یہ لوگ گو عمل نہیں کرتے مگر فرضیت عمل کے ملتزم تو ہیں اور کفار تو التزام بھی نہ کرتے تھے۔ غرض جس کا یہ عقیدہ ہوگا کہ پیشینگوئی معجزہ ہے اور معجزہ علامت نبوت ہے وہ پیشینگوئی کے موقع پر

عہدِ الست اور اس کا اثر

اس معرفتِ اضطراریہ کی ایسی مثال ہے جیسے دھوپ کو دیکھ کر ہر شخص اعتقادِ ضیا پر مضطر ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والے آپ کی معرفت میں مضطر تھے مگر اختیار سے تصدیق سب نے نہیں کی اور اعتقادِ توحید میں تو ہر شخص مضطر ہے۔ کوئی دہری کوئی ملحد کوئی کافر اس سے خالی نہیں اور یہ اثر ہے عہدِ الست کا کیونکہ حق تعالےٰ نے اس عہد کی حکمت میں خود فرماتے ہیں:

ان تقولوا یوم القیمۃ انا کنا عن ھذا غافلین

کہ یہ عہد ہم نے اس واسطے لیا تاکہ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ معلوم ہوا کہ اس عہد کے بعد توحید سے بے خبر کوئی نہ رہا سب کو اس کا اصل مضمون یاد ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہم کو تو وہ عہد یاد نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یاد کے یہ معنی نہیں کہ تمام تفاصیل خصوصیات بھی یاد ہوں کہ عہد کس وقت اور کس جگہ لیا گیا تھا اور اس وقت ہمارے دائیں بائیں کون تھا۔ بلکہ یاد کے معنی یہ ہیں کہ اصل مضمون یاد ہو۔

دیکھیے! آمدن کے معنی آنا سب کو یاد ہیں جس نے بھی آمد نامہ پڑھا ہے مگر خصوصیات، وقت، علم یاد نہیں کہ کس استاد نے پڑھایا تھا اور کہاں کس جگہ کس دن پڑھایا تھا اور اگر شاذ و نادر کسی کا حافظہ بہت ہی قوی ہو اور اسے سب خصوصیات بھی یاد ہوں تو ایسی مثالیں عہدِ الست کے بارے میں بھی مل سکتی ہیں چنانچہ عارفین میں بعض اہلِ کشف کو عہدِ الست کی خصوصیات یاد تھیں۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم کو عہدِ الست کا لیا جانا خوب یاد ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے الست بربکم فرمایا ہے اس وقت تمام روحیں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تک رہی تھیں کہ پہلے آپ جواب دیں تو پھر ہم بھی جواب دیں چنانچہ سب سے پہلے حضورؐ نے فرمایا بلیٰ اس کے بعد سب نے کہا بلیٰ۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ حدیث میں جو وارد ہے:

الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف

کہ روحیں لشکروں کی طرح جمع کی گئی تھیں جن میں باہم وہاں تعارف ہو گیا ان میں یہاں

در بلا یاری مخواہ از ہیچ کس — زانکہ نبود جز خدا فریاد رس

ایسا شخص غافل کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ان کا قول ہے اثمان توحید یہ ۔ مگر کہیں

اور عقائد میں ان کا یہ قول ہے کہ — قول اور اکثر نے آواز نے

جو بالکل اہل سنت کا مذہب ہے پھر ان کو غافل کیسے کہا جا سکتا ہے۔

اللہ کا کلام صوت سے منزّہ ہے

غرض انھے بڑے عارف کا یہ قول ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام صوت سے منزّہ ہے اور ائمہ متکلمین نے بھی اس پر اتفاق کیا ہے۔ پھر حضرت سلطان جی کے ارشاد کے کیا معنی؟

تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت حق تعالیٰ کے کلام کی تجلّی مثالی ہوئی تھی۔ اس تجلّی مثالی میں کلام الٰہی صوت سے مقترن تھا اور یہ ایسی ہی تجلّی تھی جیسے شجرہ طور پر تجلّی مثالی ہوئی تھی جس کی وجہ سے درخت سے آواز آنے لگی۔ وہ صوت بھی کلام الٰہی کی نہ تھی بلکہ کلام الٰہی کی تجلّی مثالی کا اثر تھا کہ شجرہ میں آواز پیدا ہو گئی۔ مگر ظاہر ہے کہ گو تجلّی مثالی عین صفت نہیں مگر اس کو صفت الٰہی سے بہ نسبت دوسرے حوادث کے ایک خاص تعلق ضرور ہے تو اس کو مجازاً کلام الٰہی کہنا صحیح ہے۔ اور اس میں بہت سے آثار حقیقی کلام الٰہی کے موجود ہوتے ہیں منجملہ ان کے یہ اثر بھی ہے کہ اس میں لذت بے حد ہوتی ہے کیونکہ اس کو کلام الٰہی حقیقی سے غایت درجہ قرب ہے۔ بہر حال اب کوئی اشکال نہیں تو حضرت سلطان جی کو وہ صوت اب تک یاد تھی۔ سبحان اللہ! ایسے ہی حضرات کی نسبت شیخ شیرازؒ فرماتے ہیں

الست از ازل ہمچنان شان بگوش — بفریاد قالوا بلیٰ در خروش

غرض شاذ و نادر یہاں بھی بعض افراد ایسے موجود ہیں جن کو عہد الست کی خصوصیات یاد ہیں مگر سب کو یہ خصوصیات یاد نہیں کیونکہ سب کا صاحب کشف ہونا ضروری نہیں اور جیسے شاذ و نادر صحیح علم کی خصوصیات بعض کو یاد رہ جاتی ہیں اسی طرح غلط علم کی بھی یاد رہ جاتی ہے۔

بچوں کے لئے متبحر عالم ہونا چاہیے

کانپور میں ایک طالب علم نے ضرب کے مثال وادن کے معنی میں آنے کا انکار کیا۔ میں نے کہا کہ تم ضرب کے یہ معنی پڑھ چکے ہو۔ کہا کس کتاب میں؟ میں نے کہا منشعب میں۔ اس پران کو بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ منشعب میں یہ معنی ہرگز مذکور نہیں۔ میں نے منشعب منگائی اور ان سے کہا کہ اس میں ضرب کے جو معنی لکھے ہیں پڑھو۔ انھوں نے پڑھا الضرب زدن۔ زدن بر روے زمین و پدید کردن۔ یہاں آکر وقف کردیا۔ میں نے کہا کہ پدید کردن پر ٹھہر کیوں گئے؟ آگے پڑھو۔ تو وہ آگے پڑھتے ہیں مثل تصرفہ ضرب یضرب فہو ضارب الخ۔ میں نے کہا یہ کیا۔ یہ مثل تصریفہ کیسا؟ کہنے لگے۔ مجھے تو فلاں مولوی صاحب نے یونہی پڑھایا تھا میں نے کہا بندۂ خدا! آخر تم نے یہ بھی دیکھا کہ اور سب جگہ تو تصریفہ ہے یہاں مثل تصریفہ کیوں ہو گیا؟ کہنے لگے، ہاں اب خیال ہوا ہے کہ واقعی بڑی غلطی تھی۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ بچوں کی تعلیم کے لئے متبحر اور لائق عالم کو تلاش کرنا چاہیے ورنہ بہت باتیں غلط جانیں گی، اور بچپن کی غلطیاں ذہن میں مرکوز ہو جاتی ہیں گی۔ یہ حال اتنا در کالمعدوم۔ باقی اکثر تو خصوصیات یاد نہیں رہتیں مگر کسی کے نزدیک بھی یاد کے لیے سب خصوصیات کا یاد ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اصل مضمون کا یاد ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔

اضطراری اعتقاد معتبر نہیں

بعد ... رمضـ ... سب کو یاد ہے۔ ملحد بھی گو زبان سے وجود ... چنانچہ بعض ملحدوں نے بعد میں اقرار کیا۔ ... نفی کرنا شروع کی کہ اپنے ذہن سے ہر چیز کی ... چیزیں سب ہی پر قادر ہو گیا اور ہر چیز سے اپنے ذہن کو خالی کر لیتا تھا (اور یہ محض مشق سے کچھ کمال نہیں) پھر وہ کہتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اور تو سب چیزوں کی نفی کر لیتا ہوں مگر ابھی اپنی ہستی کی نفی پر قادر نہیں ہوا۔ تو

میں نے عرصہ تک اس کی مشق کی اور اس میں بھی کامیاب ہو گیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ابھی ایک چیز اور باقی ہے جس کی نفی نہیں ہوئی اور وہ ہستی صانع عالم کا اعتقاد ہے۔ میں نے عرصہ دراز تک اس کی نفی کی کوشش کی مگر اس کی نفی پر قادر نہ ہو سکا۔ بالآخر مجبور ہو کر میں نے صانع عالم کے وجود کا اقرار کیا مگر توحید کا منکر ہونا چاہا۔ سو عرصہ تک میں نے توحید صانع عالم کی نفی میں کوشش کی۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر توحید کا بھی قائل ہونا پڑا۔ تو دیکھئے! عہد الست کا مضمون ایسا یاد ہے کہ انسان ذہن سے اپنے وجود کی نفی پر قادر ہو سکتا ہے مگر وجود صانع اور توحید صانع کی نفی پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اس سے بڑھ کر یاد اور کیا ہوگی۔

مگر یہ اعتقاد اضطراری ہے۔ یہ ایمان کے لئے کافی نہیں۔ ایمان اعتقاد اختیاری ہے کہ اپنی طرف سے بھی دل کو اس طرف مائل کرے۔ کفار مکہ و اہل کتاب میں معرفت اضطراریہ ہی تھی جس کو ادلم یعرفوا من سولھم وبعرفونہ کما یعرفون ابناءھم۔ میں ظاہر کیا گیا ہے اعتقاد اختیاری نہ تھا۔ اسی لئے ان کو کافر کہا گیا اور اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ ولکن اکثرھم لا یعلمون کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو پیشین گوئی کا معجزہ ہونا اور معجزہ کا علامت نبوت ہونا معلوم نہیں۔ یا علم تو ہے مگر عمل نہیں اور علم کے واسطے عمل لازم ہے گو درجۂ التزام ہی میں ہو۔ اس درجۂ التزام ہی کا نام اعتقاد اختیاری ہے اور یہی شرط ایمان ہے

حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ یہاں اس بات کا سبب بتلاتے ہیں کہ یہ لوگ باوجود دلائل و معجزات قائم ہونے کے پھر حضورؐ کی رسالت کو کیوں نہیں مانتے۔

معجزات کی ضرورت وحقیقت

صاحبو! یہاں ایک بات اور سمجھو کہ معجزات کی ضرورت عوام کے لئے ہے۔ اہل فہم کے لئے تو سب سے بڑا معجزہ اور تھا وہ کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی حالت۔ اہل فہم وبصیرت کے لئے صرف حضورؐ کی ذات والاصفات ہی کافی معجزہ تھی۔ حضرت عبداللہ

اللہ تعالیٰ کفار کا منہ بند کرنے کے لئے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ نو سال کے اندر اندر رومی فارسیوں پر غالب آئیں گے اور یہ پیشین گوئی بہت بڑی پیشینگوئی ہے معمولی بات نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق دو سلطنتوں سے ہے۔ پھر پیشینگوئی بھی ظاہر حالت کے خلاف ہے جو کسی کی عقل میں نہیں آسکتی کیونکہ روم کی سلطنت فارس کے مقابلہ میں چھوٹی بھی تھی اور جدید حادث بھی تھی اور فارس کی سلطنت بڑی بھی تھی اور پرانی بھی تھی۔ ابتدا میں ایک ہی خاندان میں چلی آ رہی تھی کیونکہ مورخین کا قول (اور واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے) کہ کیومرث جو آدم علیہ السلام کا پوتا یا پرپوتا ہے وہ اس سلطنت کا اول بادشاہ ہے اور اس وقت سے اخیر تک ایک ہی سلسلہ میں سلطنت رہی کسی غنیم سے اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اسی لئے اس کے خزائن بہت زیادہ تھے۔ ہزاروں برس کی بادشاہت میں ظاہر ہے کہ کس قدر خزائن ہو گئے اور اس کی فوجیں بھی بہت شائستہ اور مستحکم تھیں۔ ان میں بڑے بڑے بہادر موجود تھے۔ پھر وسعت رقبہ کی وجہ سے اس کی رعایا بھی زیادہ تھی اس لئے اس کی فوجیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ تو ایسی سلطنت کے متعلق یہ پیشین گوئی کہ وہ ایک چھوٹی اور نئی سلطنت سے مغلوب ہو جائے گی، بہت بڑی پیشین گوئی ہے۔

پھر قرآن کی باتیں صاف صاف ہوتی ہیں۔ گول مول پیشینگوئی نہیں ہے۔ جیسے آج کل نجومی پیشینگوئی کیا کرتے ہیں۔ اول تو وہ کثیر الوقوع واقعات بیان کیا کرتے ہیں کہ اس نے کہیں راستہ میں کچھ کھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بچا ہوا کون ہے۔ راستہ میں کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو پانی ہی کھا لیتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ اس نے جنگل میں ایک جگہ پیشاب کیا ہے۔ ایسا بھی سفر میں اکثر ہو جاتا ہے۔ پھر پیشینگوئی بھی کرتے ہیں تو مجمل اور مبہم۔

چنانچہ ایک نجومی سے جب کوئی پوچھتا کہ میری بیوی کو حمل ہے، بتلاؤ کیا ہوگا؟ تو وہ زبان سے کچھ نہ کہتا بلکہ ایک پرچہ پر یہ عبارت لکھ دیتا "لڑکا نہ لڑکی"۔ اگر لڑکا ہوا تو کہہ دیتا کہ ہم نے کہا نہ تھا کہ "لڑکا ہوگا نہ کہ لڑکی"۔ اور لڑکی ہوتی تو کہتا کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا "لڑکا نہ بلکہ لڑکی ہوگی"۔ اب یہ "نہ" پہلے کے ساتھ لگ گیا۔ اور جو اسقاط ہو گیا اور کچھ نہ ہوا تو اب وہ "نہ" دونوں سے لگ گیا کہ نہ لڑکا نہ لڑکی۔ کتابت میں لہجہ ہوتا نہیں اس لئے وقوع کے بعد وہ جس طرح چاہتا لہجہ بدل کر اسے اپنے موافق کر لیا کرتا لہجہ کو بھی

مسجد میں آپڑا اور نماز روزہ کرنے لگا۔ اتفاق سے لڑکوں کو کھیتی میں نقصان پہنچا، کچھ مویشی مرگئے اور کھیت برباد ہوگیا تو وہ یہ کہنے لگا کہ یہ ساری نحوست اس بڈھے کی نماز کی ہے (نعوذ باللہ) سب مل کر اس کے پاس آئے کہ ہم آج سے تیری خدمت کیا کریں گے۔ تو گھر پر رہ اور نماز نہ پڑھا کر۔ اس نے کہا، اچھا! مگر دیکھو! وعدہ خلافی نہ کرنا، ورنہ میں پھر بوریا بندھنا لے کر نماز شروع کردوں گا سب نے پکّا وعدہ کیا اور بڈھے نے نماز چھوڑ دی اور خوب گھی دودھ کھانے لگا۔ پھر جب کبھی لڑکے اس کی خدمت میں کمی کرتے، وہ کہتا کہ اسے لائیو میرے اوجو کا کلٹا اور وضو کا لوٹا۔ لڑکے پھر ڈر جاتے اور خوشامد کرتے کہ تم نماز نہ پڑھو، اب سے خدمت میں کمی نہ ہوگی، تو اس بڈھے نے نماز کے ڈراوے سے ان سے خوب خدمت کروائی۔

مگر ایسے احمق تو مسلمانوں میں آج کل بہت کم ہیں اور جو ایسے ہوں اُن سے گفتگو ہی نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہیں جو نماز روزہ کو منحوس سمجھتے ہیں۔ جو مسلمان نماز روزہ کو برکت کی چیز بھی سمجھتے ہیں ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ہر شخص جس درجے میں ہے اسی پر قانع ہے، اس سے آگے بڑھنے کی نہ فکر ہے نہ کوشش ہے۔ امام غزالی نے اس کے متعلق خوب مضمون لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اریٰ الملوک بادنی الدین قد قنعوا	وما اراھم رضوا بالعیش بالدون
فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما	استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

یعنی میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ دین میں تو ادنیٰ درجہ پر قانع ہیں مگر عیش دنیوی میں ادنیٰ حالت میں قانع نہیں ہیں۔ آگے دین داروں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم بھی بادشاہوں کی دنیا سے ویسے ہی مستغنی ہو جاؤ جیسے وہ دُنیا کو لے کر دین سے بے پروا ہوگئے۔ تم دنیا میں ان کو نہیں گھٹا سکتے تو دین میں تو نیچا دکھا دو۔ یہ تو غفلت کے متعلق کلام تھا۔

اب توجہ الی الدنیا کو سُنیئے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو بہ نسبت آخرت کے دنیا کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ گو کفار جیسا انہماک نہ ہو۔ ان کو تو مروقت اسی میں انہماک

ہے۔ آخرت کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ تو ہم کو گو ایسا انہماک نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ انہماک کا ایک درجہ ہمارے اندر بھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ آخرت سے زیادہ دنیا کی طلب ہے اور اس کے لئے آخرت سے زیادہ کوشش کیجاتی ہے۔ اور میں بھی افیون کی مثال سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہلکا مرض کبھی اشد ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس وجہ سے کہ ہلکا سمجھ کر اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا، زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نیچا ہلکا ہلکا زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تو رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے اور پتہ نہیں لگتا۔ یاد رکھو حُبِّ دنیا کفر کی اصل ہے۔ اس کو معمولی مت سمجھو۔ اور یہ بات کہ حبّ کو معمولی نہ سمجھا جائے، میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ بزرگوں کے اقوال میری تائید کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

علّتِ ابلیس انا خیر بدست ۔۔۔ ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

اس میں تصریح ہے کہ ابلیس کے مردود ہونے کا اصلی سبب تکبّر تھا اور یہ مرض ہر شخص کے اندر موجود ہے گو اس کا درجہ نہ ہو مگر جب شہر میں آگ لگتی ہے تو اس کی ابتدا ہمیشہ معمولی سی بات سے ہوتی ہے بعض دفعہ ایک دیا سلائی سے گھر میں آگ لگ گئی بعض دفعہ ایک چنگاری نے چھپر کو جلا دیا۔ پھر اس سے کڑیوں میں آگ لگ گئی۔ پھر ہوا نے دوسرے گھروں تک آگ پہنچا دی اور بستی کی بستی جل گئی۔

کسبِ دنیا و حُبِّ دنیا کا فرق

صاحبو! جب حق تعالیٰ کے کلام سے سببِ کفر معلوم ہو گیا تو اس کو خفیف نہ سمجھو اور اس کے ادنیٰ درجہ سے بھی نکلنے کی پوری کوشش کرو اور میں کسبِ دنیا سے منع نہیں کرتا بلکہ حبِّ دنیا سے منع کرتا ہوں کیونکہ یہی جڑ ہے تمام جرائم کی حب الدنیا رأس کل خطیئۃ۔ آج کل تو تعلیم یافتہ جماعت کسبِ دنیا و حبِّ دنیا میں فرق نہیں کرتی جس کی وجہ سے وہ دو غلطیوں میں مبتلا ہیں:

ایک تو علماء کے کلام میں دنیا کی مذمت دیکھ کر ان پر طعن کرنے لگے کہ یہ لوگ کسب

دُنیا سے منع کرتے ہیں حالانکہ نصوصِ شرعیہ میں اس کی اجازت صراحۃً موجود ہے، علماء اس کو کیسے منع کرسکتے ہیں۔ دوسرے جن نصوص میں کسبِ دنیا کی اجازت تھی انکو ان ظالموں نے حبِّ دنیا پر بھی محمول کرلیا حالانکہ جس پیغمبر کا یہ ارشاد ہے : کسب الحلال فریضۃ بعد فریضۃ اُنہی کا یہ ارشاد بھی ہے : حب الدنیا رأس کل خطیئۃ اور یہ ارشاد بھی ہے : تعس عبد الدنیا تعس عبد الدرہم تعس عبد الخمیصۃ ان اعطی رضی وان منع سخط تعس وانتکس واذا شیک فلا انتقش۔ اس میں حضورؐ نے بددعا دی ہے کہ دینار و درہم کا بندہ ہلاک ہوجائے ذلیل ہوجائے اور اگر اس کے کانٹا لگے تو خدا کرے نکلنا نصیب نہ ہو۔ شاید کوئی ذہن یہاں یہ اشکال پیدا کرے کہ حضورؐ کی بددعا بھی دعا ہوکر لگتی ہے پھر اس کا کیا ڈر؟ کیونکہ حضورؐ نے خود حق تعالےٰ سے دعا کی ہے کہ :-

اللّٰھم انما بشر فایما رجل اذیتہ او شتمتہ او لعنتہ فاجعلہا لہ صلوٰۃ و زکوٰۃ و قربۃ تقربہ بہا الیک۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اُس بددعا کا ہے جو حضورؐ نے بشریت کے اقتضاء سے غلبۂ غضب میں فرمادی ہو۔ تشریعی بددعا کا یہ حکم نہیں۔ اور اس جگہ جو عبد الدنیا والدرہم کو بددعا دی گئی ہے وہ بشریت کی راہ سے نہیں ہے بلکہ تشریعی بددعا ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب اس بددعا سے بہت ڈرنا چاہیے کیونکہ حضورؐ کی دعا اور تشریعی بددعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں انی اریٰ ربک یسارع فی ھواک کہ میں دیکھتی ہوں کہ جو آپؐ چاہتے ہیں حق تعالیٰ ویسے ہی کردیتے ہیں

اب میں حبِّ دنیا کی حقیقت حق تعالیٰ ہی کے کلام سے بتلانا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں بہت لوگ غلطی کرتے ہیں۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں :-

قل ان کان اٰباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہٖ۔

دُنیا کی محبت اور حرص کا درجہ

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کیسے رحیم ہیں کہ دنیا کی محبت سے بھی منع نہیں فرماتے بلکہ احبیت سے منع فرماتے ہیں کہ دنیا کی محبت اللہ و رسولؐ کی محبت سے زیادہ نہ ہو جس کی علامت یہ ہے کہ جہاد فی سبیلہ میں کمی ہو جائے یعنی اطاعت احکام میں اختلال ہو جائے میرے نزدیک وجہاد فی سبیلہ تفسیر ہے ماقبل کی جس میں احبیت من اللہ و رسولہ کی حقیقت بتلائی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ احبیت بھی مطلقاً مورد ملامت نہیں اگر دنیا کی احبیت طبعی ہو تو مذموم نہیں بلکہ عقلی احبیت نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ احبیت عقلیہ اللہ و رسولؐ کے ساتھ ہونا چاہیے اور احبیت عقلیہ کا معیار یہ ہے کہ اطاعت احکام وجہاد فی سبیلہ میں کمی نہ ہو۔ اگر یہ معیار محفوظ ہے تو پھر طبعی محبت اگر دنیا سے یا بیوی سے یا اولاد سے زیادہ بھی ہو تو کچھ ضرر نہیں۔

اگر ایک شخص اپنے بیٹے کے مرنے پر زیادہ روئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعہ کو سن کر زیادہ نہ روئے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ مواخذہ اس پر ہوگا کہ تزاحم دین و دنیا کے موقع پر دنیا کو دین پر ترجیح دے۔ اور اگر یہ نہ ہو بلکہ دنیا کی محبت و حرص کو دبا کر دین پر فدا کر دے۔ گو ترک دنیا سے حزن بھی ہو اور دل بھی دُکھے تو اس پر مواخذہ تو کیا ہوتا اس سے تو ثواب بڑھے گا۔ کمال تقویٰ یہی ہے کہ دنیا کی حرص و محبت ہوتے ہوئے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن ست　　　　کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست

فرشتے اگر رشوت نہ لیں تو کیا کمال ہے۔ ان کو مال کی حرص ہی نہیں۔ کمال اُس سب جج کا ہے جس کے مدعی و مدعا علیہ دونوں نے الگ الگ سوا دو لاکھ روپے رشوت کے پیش کئے اور اُن سے ایک پیسہ نہ لیا اور غصے سے دونوں کو نکال دیا۔ مگر بے علمی کے سبب ایک جہالت بھی کی کہ آپ نے دونوں پر غصہ ظاہر کر کے مقدمہ کو ایسا خراب کر دیا کہ دونوں پر ظلم ہو گیا۔ ظالم پر بھی مظلوم پر بھی۔ اور یہ بات اُن سے اوّل

کہہ دی تھی کہ اگر تم رشوت پیش نہ کرتے تو میں مقدمہ کو انصاف سے فیصل کرتا۔ مگر اب چونکہ دونوں نے رشوت سے مجھے تکلیف دی ہے میں ایسا فیصلہ کروں گا کہ دونوں کو یاد رہے گا۔ یہ نوابی کی جہالت تھی مگر ہوا دو لاکھ روپیہ کا واپس کر دینا واقعی اس شخص کے حوصلہ کی بات تھی اگر وہ لے لیتا تو اس پر کیا جرم قائم ہوتا۔ کچھ بھی نہیں کیونکہ ایک فریق رشوت دیتا دوسرا نہ دیتا جب تو یہ احتمال تھا کہ شاید دوسرا مخبری کر دے اور جب دونوں رشوت دے رہے تھے تو یہ احتمال بھی نہ تھا۔ اور کوئی مخبری کرتا بھی تو ثبوت کہاں سے لاتا کیونکہ رشوت کی رسید ہی نہیں ہوتی۔

اس پر مجھے مولانا غوث علی صاحب پانی پتی کا لطیفہ یاد آیا کہ ایک شخص نے اپنے بھائی کے واسطہ سے مولانا کے پاس دس روپے ہدیہ بھیجے اور بھائی سے کہہ دیا کہ رسید لیتے آنا۔ شاید بھائی پر اطمینان نہ ہوگا۔ اس نے مولوی صاحب کو دس روپیہ دے کر کہا کہ ان کی رسید لکھ دیجئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اپنے روپے واپس لیجاؤ کہیں رشوت کی بھی رسید ہوتی ہے۔ اس نے پوچھا حضرت! رشوت کیسی، یہ تو ہدیہ تھا۔ فرمایا کہ بلا غرض کسی کو کون دیتا ہے۔ تم لوگ ہم کو صرف اس خوشامد میں دیتے ہو کہ دنیوی حاجات میں اللہ میاں سے کچھ سفارش کر دیں تو یہ رشوت ہوئی یا ہدیہ ہوا۔ اس میں لطافت تو تھی مگر یہ بھی بتلا دیا کہ ہدیہ وہ ہے جس میں سوائے تطییب قلب مہدی لہ کے اور کچھ مطلوب نہ ہو۔

میں کہہ رہا تھا کہ صرف حرص دنیا مطلوب نہیں بلکہ اس کے مقتضاء پر عمل کرنا مذموم ہے۔ غیر محقق شیخ اس میں غلطی کریگا۔ اگر اس سے کوئی شخص حرص دنیا کی شکایت کرے گا تو وہ کوئی وظیفہ یا مراقبہ تجویز کر کے بتلا دیگا مگر محقق فوراً تسلی کر دے گا کہ حرص کا ہونا مضر نہیں بلکہ اس سے تو اجر بڑھتا ہے جب کہ عمل اس کے خلاف ہو بلکہ شرعاً وہ حرص حرص ہی نہیں جس کے مقتضاء پر عمل نہ ہو، حرص شرعی وہی ہے جس سے دنیا کو دین پر ترجیح ہونے لگے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی حقیقت کو خوب واضح فرمایا۔ جب آپ کے پاس خزائن کسریٰ فتح ہو کر آئے تو بڑا بھاری خزانہ تھا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہزاروں برس سے یہ سلطنت قائم تھی اور ابتداء سے اس وقت تک ایک

ہی سلسلۂ خاندان میں چلی آرہی تھی۔ تو ایسی قدیم سلطنت کا خزانہ خود سمجھ لیجیے کہ کیا ہوگا۔ تو حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھ کر دُعا کی اور عرض کیا اے اللہ! ہم یہ تو دعا نہیں کرتے کہ ہم کو مال کی محبت نہ ہو اور نہ یہ عرض کرتے ہیں کہ اُس کے آنے کی ہم کو خوشی نہ ہو کیونکہ آپ کا ہی ارشاد ہے: زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث۔

جب آپ نے اس کو ہمارے لئے مزیّن کر دیا ہے تو ہم کو اس سے محبت بھی ہوگی اور اس کے آنے سے خوشی بھی ہوگی۔ بلکہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اس کی محبت کو اپنی رضا کا وسیلہ بنا دے۔ حضرت عمرؓ نے جو بات فرمائی ہے واقعی یہ وہی کہہ سکتے ہیں۔ غیر محقق مشائخ بلکہ محققین بھی بہت سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ جب مال مطلقاً مذموم ہے اور بعضے جاہل تو ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو کیا پروا ہے سلطنت کی، کیا پرواہ ہے روپیہ پیسہ کی اور بعضے جنّت سے بھی استغناء ظاہر کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں اس وقت تک ہیں جب تک کھانے کو روٹی مل رہی ہے ورنہ حقیقت معلوم ہو جائے ان دعووں کی۔ بس کمال وہ ہے جس کو حضرت عمرؓ نے ظاہر فرمایا کہ مال کی احتیاج بھی ظاہر کی، اس سے مسرت بھی ظاہر کی مگر اس کے ساتھ یہ دُعا بھی کی کہ اے اللہ! اس کی محبت کو اپنی رضا کا ذریعہ بنا دیجیے۔

پس محبت مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ اس کا مطلوب بھی ہے۔ مثلاً اتنی محبت جس سے مال کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے مطلوب ہے کیونکہ مال کا ضائع کرنا حرام ہے۔ اگر اتنی محبت بھی نہ ہوگی تو یہ مال کی بے قدری کریگا اور اس کو ضائع و برباد کرے جس کی ممانعت اس حدیث میں آئی ہے ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کی محبت سے ہم کو انکار نہیں نہ یہ دعویٰ ہے کہ ہم کو اس کے آنے سے خوشی نہیں ہوتی۔ طبعاً محبت بھی ہے اور خوشی بھی ہے۔ مگر عملاً و عقلاً دعا یہ ہے کہ اس کو اپنی مرضیات کا وسیلہ بنا دیجیے۔

حُبِ رسولؐ کا معیار

اسی سے لا یومن احدکم حتی یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما

کا بھی حل ہو گیا کہ مراد احبیت عقلیہ ہے جس کی تفسیر اُوپر جہاد فی سبیلہ میں گذر چکی ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضورؐ کے ساتھ حُبِ عقلی سب سے زیادہ ہونا چاہیے جس کا معیار یہ ہے کہ احکام میں حضورؐ کی اطاعت ہو اور تعارض کے وقت حضورؐ کے حکم کو دوسروں کے احکام پر ترجیح دی جائے۔ گو حبِ طبعی بھی کم ہو۔ اور غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طبعی محبت بھی ہر شخص مسلم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ماں باپ و اولاد وغیرہ سب سے ہی زیادہ ہے مگر اس کا ظہور خاص مواقع پر ہوتا ہے۔

چنانچہ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو ایسا شبہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ مجھے اپنے والد کی محبّت ہے مولانا نے اس وقت تو یہ جواب دیا کہ ہو گی۔ اس کے بعد عملاً اس شبہ کا یوں جواب دیا کہ باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور کمالات وفضائل بیان کرنا شروع کئے جس سے اہلِ مجلس بہت محظوظ ہو رہے تھے اور وہ رئیس صاحب بھی بہت مزے لے لے کر سُن رہے تھے کیونکہ حضورؐ کا ذکر تو ہر مسلمان کو لذیذ معلوم ہوتا ہے اور جو جو ظالم کسی مسلمان کو یہ کہے کہ یہ ذکرِ رسول سے منع کرتے ہیں اس سے بڑھ کر مفتری کوئی نہیں۔ ارے! ذکرِ رسولؐ سے کوئی منع نہیں کرتا، بلکہ ضدِ رسولؐ سے منع کرتے ہیں کہ حضورؐ کا ذکر اس طرح نہ ہو جس میں حضورؐ کی منی لفت ہو۔

جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب بہت مزے لے کر حضورؐ کے حالات سُن رہے ہیں تو درمیان میں دفعتہً فرمانے لگے کہ اچھا اس قصّہ کو تو رہنے دیجیے، اب میں کچھ آپ کے والد صاحب کے کمالات ومحاسن بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے صاحبِ کمالات تھے اس لفظ کے سُنتے ہی رئیس کا رنگ بدل گیا اور کہا مولانا تو بہ تو بہ ایسے والد بھی کوئی چیز ہیں جن کا تذکرہ حضورؐ کے ذکر کو قطع کر کے کیا جائے۔ نہیں آپ پہلا ہی بیان جاری رکھیے۔ تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ آپ کو حضورؐ کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ کیوں ناگوار ہوا؟ آپ تو کہتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے والد کی محبّت معلوم ہوتی ہے۔ اب جو رئیس صاحب نے مواذنہ کر کے غور کیا تو بے ساختہ کہنے لگے کہ مولانا جزاکم اللہ تعالیٰ! آج آپ نے

میرا شبہ حل کر دیا۔ واقعی مجھے حضورؐ ہی کے ساتھ محبت زیادہ ہے اور والد کے ساتھ اس محبت کے مقابلہ میں کچھ بھی محبت نہیں۔

بہرحال طبعی محبت بھی ہر مسلمان کو حضورؐ ہی سے زیادہ ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ طبعی محبت اگر کم بھی ہو تو مضائقہ نہیں عقلی محبت سب سے زیادہ حضورؐ کے ساتھ ہونا چاہیے کہ بدون اس کے صرف محبتِ طبعیہ بھی کافی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت تو زیادہ ہوتی ہے کہ آپ کی نعت میں قصیدے پڑھتے ہیں اور مولود کی مجلسیں قائم کرتے ہیں اور ان کو حضورؐ کے نام و ذکر سے مزا بھی آتا ہے مگر محبتِ عقلیہ سے کورے ہیں کہ حضورؐ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں تو اُن کی حالت اچھی نہیں۔ ان کو اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔

اور بعض لوگوں کو حضورؐ کے ساتھ محبتِ عقلی تو ہوتی ہے کہ احکام کی مخالفت نہیں کرتے مگر محبتِ طبعی ان کو اپنے اندر کم معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ پریشان ہوتے ہیں۔ ہم ان کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اول تو انکو محبت طبعی بھی حاصل ہے ورنہ اس کے فقدان کا رنج ہی کیوں ہوتا اور یہ فقدان کا گمان اس لئے ہوتا ہے کہ ابھی ان کو حضورؐ کی محبت کا دوسری محبتوں سے موازنہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ موازنہ کے وقت معلوم ہو جائے گا کہ واقعی طبعی محبت بھی حضورؐ ہی سے زیادہ ہے جیسا کہ ان رئیس کے واقعہ میں ابھی میں نے بتلایا ہے۔ دوسرے یہ کہ طبعی محبت معلوم نہیں تو غیر مطلوب میں کمی ہونا کچھ مضر نہیں۔ ضرر تو یہ ہے کہ محبت مطلوبہ میں کمی ہو یعنی محبتِ عقلیہ میں۔ اور تم بحمد اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ ہو پھر کیوں پریشان ہوتے ہو۔

اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو محض محبتِ طبعیہ کو کافی سمجھے ہوئے ہیں چنانچہ بریلی میں ایک دفعہ بعد نماز جمعہ میرا بیان ہوا جس میں یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ و کونوا مع الصّٰدقین کا بیان تھا اور تکمیلِ ایمان کی تاکید اور اہلِ کمال کی صحبت اختیار کرنے کی ترغیب تھی۔ مگر رات کو اسی جگہ اس کے خلاف بیان ہوا اور یہ کہا گیا کہ اے لوگو! تقوے کی ضرورت نہیں نہ نماز روزہ کی ضرورت ہے صرف محبتِ رسولؐ کی ضرورت ہے پھر چاہے شراب پیو چاہے کچھ کرو تم ضرور جنت میں جاؤ گے اور یہ وہابی بڑے ہرگز ناجی نہیں۔

ان لوگوں نے میرے جلانے کو یہ بیان کیا تھا مگر احمقوں نے میرے جلانے کے لئے رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کی اور حضورؐ کی روحِ اطہر کو ایذا دی۔ بھلا مجھے اس سے جلنے کی کیا ضرورت تھی اگر جلیں گے تو وہی جہنم میں جلیں گے۔ میں نے جو مضمون بیان کیا تھا اپنی طرف سے تھیں بیان کیا تھا بلکہ قرآن و حدیث سے بیان کیا تھا اس کی مخالفت کرنے سے میرا کیا نقصان ہوا۔ اگر نقصان ہوا تو انھی کا ہوا۔

بس یہ حالت البتہ افسوسناک ہے کہ محض محبت کا نام یاد کرلیا اور اطاعت کا وقت آیا تو احکام نبویہ کی صریح مخالفت کرنے لگے۔ غرض جو شخص احکام کا مطیع ہو اس کو محبت مقصودہ حاصل ہے۔ اب اگر بعض آثار میں کمی بھی ہو تو پریشان نہ ہونا چاہیے بعض لوگوں کو اپنی نسبت محبت نہ ہونے کا ایک اور واقعہ سے بھی وہم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اُن کو حضورؐ کی طرف زیادہ کشش نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف کشش زیادہ ہوتی ہے اور بعض کو اس کے برعکس بات سے خدا تعالیٰ کی محبت نہ ہونے کا وہم ہو جاتا ہے۔ سو یاد رکھو کہ یہ محض محبت طبعیہ کی کیفیات میں تفاوت ہے اور محبت عقلیہ اللہ و رسولؐ دونوں کی دونوں شخصوں کو حاصل ہے یعنی جس کو اللہ تعالےٰ کی کشش زیادہ ہے اور رسولؐ کی طرف کم اور اس کو بھی جس کو حضورؐ کی طرف کشش زیادہ ہے اور اللہ کی طرف کم اور یہ دھوکا حضرت رابعہ کو بھی ہوا تھا انھوں نے بھی محبت طبعیہ و عقلیہ کے فرق کی طرف التفات نہیں کیا تھا۔

اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو خجلت کی وجہ سے آنکھیں نیچی کرلیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے میرے دل پر اتنا غلبہ کیا ہے کہ آپ کی محبت کی بھی جگہ نہیں چھوڑی۔ حضورؐ نے ان کی تسلی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اے رابعہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنا عین میرے ساتھ محبت کرنا ہے کیونکہ خدا تعالےٰ سے محبت کرنے کا آپؐ نے حکم دیا ہے تو اس میں حکم رسول ہی کی اطاعت ہے اور یہی محبت عقلیہ ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن سے کفر کا سبب دو امر معلوم ہوتے ہیں ایک غفلت عن الآخرت۔ دوسرے حُبّ دنیا۔ پھر اس پر میں نے یہ کہا تھا کہ میں کسبِ دنیا سے منع نہیں کرتا بلکہ حُبّ دنیا سے منع کرتا ہوں۔ پھر ترقی کر کے یہ کہا تھا کہ مطلق محبتِ دنیا سے

بھی منع نہیں کرتا بلکہ احبیتِ دنیا سے منع کرتا ہوں۔ پھر اور ترقی کر کے کہا تھا کہ احبیتِ
دنیا سے بھی مطلقاً منع نہیں کرتا بلکہ احبیتِ عقلیہ سے منع کرتا ہوں اگرچہ طبعاً کسی کو دنیا
سے زیادہ محبت ہو تو کچھ حرج نہیں مگر عقلاً ایسا نہ ہونا چاہیے اس پر محبتِ طبعیہ و
عقلیہ کی حقیقت بیان کرنے میں کلام طویل ہو گیا۔

بہر حال حبِ دنیا اور انہماک فی الدنیا سبب ہوا ہے اہل کفر کے کفر کا۔ یہود اسی واسطے
ایمان نہ لا سکے کہ ان کو اندیشہ تھا کہ اب تو ہم پیر بنے ہوئے ہیں مسلمان ہو کر مرید ہو جائیں
گے اور یہ ہدایا و نذرانے جو اب ملتے ہیں بند ہو جائیں گے۔ حالانکہ حضورؐ کے مریدوں کو
بعد میں اتنا کچھ ملا کہ ان پیروں کے باپ دادا کے خواب میں بھی نہ آیا ہو گا۔ حضرات صحابہؓ نے
کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے اور دنیا ان کے پیروں کی غلام باندی ہو گئی تو جس دنیا کی
محبت نے ان کافروں کو ایمان سے روکا وہ بھی ایمان کی بدولت ان کو پہلے سے زیادہ مل
جاتی۔ اور نہ بھی ملتی تو ان سے خدا تعالیٰ تو راضی ہو جاتے اور رضائے الٰہی وہ چیز ہے جس
کے سامنے ساری دنیا کی بھی کوئی ہستی نہیں مگر اس کو تو وہ سمجھے جس کو آخرت کی فکر ہو۔
خیر کفار تو رضائے الٰہی کی اس لئے قدر نہ کر سکے کہ وہ آخرت سے غافل اور منکر تھے مگر ہم
مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ باوجود اعتقادِ آخرت کے پھر دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں اور
رضائے الٰہی کی بے قدری کرتے ہیں۔

اس وقت اس بیان کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بیان مستورات کی فرمائش سے ہو رہا ہے۔

عورتوں پر حبِ دنیا کا غلبہ

عورتوں پر حبِ دنیا کا بہت غلبہ ہے ان میں زیور اور کپڑے کی حرص بہت زیادہ ہے
پھر حالت یہ ہے کہ جب چار عورتیں جمع ہو کر بیٹھیں گی تو صبح سے شام تک دنیا ہی کا چرچا
رہے گا دین کا ذکر ہی نہیں آتا۔ عورتیں خود غور کر کے دیکھ لیں گی کہ ان کی مجلسوں میں سے
کتنی مجلسیں ایسی ہیں جن میں دین کا ذکر ہوتا ہو۔ اور گو دنیا کا زیادہ تذکرہ کرنا بھی مباح
ہے جب کہ کوئی بات معصیت کی نہ کی جائے مگر اس مباح کی سرحد گناہ سے ملی ہوئی ہے

جو شخص زیادہ مشغلہ دنیا کے تذکرہ کا رکھے گا وہ ضرور گناہ میں مبتلا ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے: الا ان لکل ملک حمی وان حمی اللہ محارمہ ومن یرتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ۔ اور بزرگوں کا ارشاد ہے کہ مباحات بھی حول الحمی میں داخل ہیں چنانچہ یہ بھی ہے۔ اس لئے مسلمان کو چاہیے کہ زیادہ تر طاعات میں مشغول رہے مباحات میں بھی زیادہ انہماک نہ کرے۔ اس لئے دنیا کا زیادہ تذکرہ کرنا کہ ساری مجلس میں اول سے آخر تک یہی ذکر ہو مقدمۂ معصیت ضرور ہے اور اس کا منشا وہی حبِّ دنیا ہے جو آجکل عورتوں میں غالب ہے اسی لئے عورتیں بہت کم دیندار ہوتی ہیں اور جن مقامات کی عورتوں میں دینداری ہے وہ صرف اسی وجہ سے کہ ان میں حبّ دنیا کم ہے۔

ہمارے قرب میں پانی پت کی عورتیں بہت دیندار سنی جاتی ہیں۔ اُن میں بعض لڑکیاں قرآن کی حافظ ہیں اور بعض سبعہ قرأت کی ماہر ہیں اور قرآن پڑھی ہوئی تو قریب قریب سب ہی ہیں۔ نمازی بھی بہت زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ دنیا کے اعتبار سے بھی خوشحال ہیں۔ ہر شخص کے یہاں تھوڑی بہت زمین ضرور ہے۔ کھانے پینے کی طرف سے سب بے فکر ہیں مگر یہ خوشحالی اسی بات کی بدولت ہے کہ ان میں دنیا کی حرص زیادہ نہیں۔ وہاں کی مستورات جہاں تک سنا گیا ہے بہت سادگی سے رہتی ہیں یہاں تک کہ ان کی دلہنیں بھی گیروں کے کپڑے پہن لیتی ہیں اور قیمتی کپڑوں کی زیادہ حرص نہیں کرتیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ساری زمینداری زیور اور کپڑوں ہی میں نیلام ہو جاتی۔ چنانچہ جن قصبات کی عورتوں پر یہ مرض ہے وہاں افلاس آچکا ہے۔ گھر اور زمین تک بنیئے کے پاس رہن ہو چکا ہے۔ بھلا ایسے زیور اور کپڑے سے کیا خوشی ہو جس کے بعد گھر ہی برباد ہو جائے۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ چاہے کھانے کو گھر میں کچھ بھی نہ ہو مگر برادری میں نکلنے کے لئے اطلس اور کمخواب کے کپڑے اور سونے کا زیور ضرور ہو تاکہ برادری میں عزت کی نظر سے دیکھی جائیں حالانکہ غریب آدمی قیمتی کپڑے پہن کر کچھ معزز نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقت حال سب کو معلوم ہے۔

کانپور میں ایک صاحب مجھ سے ملے جو لیس دار مغرق ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور باقی لباس بھی نہایت شان دار تھا میں سمجھا کہ شاید کوئی نواب یا بڑے درجہ کا رئیس ہوگا بعد

ہیں معلوم ہوا کہ میاں غالباً کنسٹبل ہیں اور کل دس بارہ روپیہ تنخواہ ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تنخواہ معلوم ہوتے ہی وہ شخص میری نظروں سے گر گیا اور وہی لباس جس کی وجہ سے پہلے کچھ وقعت ہوئی تھی اس کی ذلت کا سبب بن گیا اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کو اہل دنیا بھی محسوس کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک موقع پر ایک غریب آدمی بڑی شان و شوکت کا لباس پہن کر کلکٹر کے پاس ملازمت کی تلاش کو گئے اور ایک رئیس کو سفارش کے لئے ساتھ لے گئے۔ کلکٹر کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ لیاقت کچھ بھی نہیں۔ اس نے صاف کہا کہ بڑی نوکری کی لیاقت نہیں اور چھوٹی نوکری آپکی شان کے خلاف ہے اس لئے نہایت حقارت کے ساتھ جواب دے کر نکال دیا۔

افسوس! ان لوگوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ جس چیز کے لئے یہ اپنی زمین اور جائیداد کو برباد کرتے ہیں وہ اس کو کھو کر حاصل نہیں ہو سکتی۔ زمیندار خوشحال آدمی چاہے کیسے ہی معمولی لباس میں ہو اس کی عزت ہوتی ہے اور زمین و جائیداد کھو کر چاہے کوئی کتنا ہی قیمتی لباس پہن لے اس کی عزت نہیں ہوتی۔ ہاں! اگر کوئی دوسرا عزت کا سبب پیدا ہو جائے تو اور بات ہے۔ مثلاً ملازمت بڑے عہدہ کی مل جاتے یا اس کو کوئی کمال حاصل ہو جائے۔ مگر مسلمانوں کو آج کل ملازمت کا ملنا تو شرائط ملازمت حاصل نہ کرنے سے دشوار ہو گیا اور کوئی کمال بھی حاصل نہیں کرتے۔ پھر محض لباس سے عزت کیونکر ہو سکتی ہے اور ملازمت کسی کو ملتی بھی ہے تو وہ اس میں بھی ذلت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ نوکری تو میاں کی پچاس روپیہ کی اور شان بناتے ہیں پانچ سو روپیہ کے ملازم کی سی اور اگر کہیں تنخواہ کی قلت کی قلعی کھل جائے تو اس پر دوسری قلعی چڑھا کر حقیقت کو چھپایا جاتا ہے۔

چنانچہ عورتوں کی ایک کمیٹی میں اپنے اپنے شوہروں کی تنخواہ کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ میرے میاں کی تنخواہ سو ہے کسی نے کہا دو سو ہے۔ ایک غریب عورت بھی وہاں موجود تھی جو زیور اور لباس میں کسی سے کم نہ تھی۔ اس سے جو پوچھا تیرے میاں کی تنخواہ کیا ہے؟ تو وہ یہ کہتے ہوئے شرمائی کہ بیس روپیہ ہے اور جھوٹ بولنے میں بھی رسوائی کا اندیشہ ہوا۔ تو آپ کیا کہتی ہیں کہ تنخواہ تو بیس ہی روپیہ ہے مگر ماشاء اللہ

اُوپر کی آمدنی بہت ہے۔ ایک عورت نے کہا، کم بخت توبہ کر، حرام کی آمدنی پر ماشاءاللہ کہتی ہے۔ کفر ہو جائے گا۔ ایمان جاتا رہے گا۔

تفکر کی ضرورت

میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ دنیا کے طالب اور اس میں منہمک ہیں وہ اس کی صحیح حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ حقیقت معلوم نہ ہونے سے ہی اس پر فریفتہ ہوئے ہیں۔ اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے پاخانہ پر چاندی کے ورق لگے ہوئے ہیں۔ اور کوئی اس کو حلوا سمجھ کر ناک میں بیٹھا ہو۔ کسی چڑیل بڑھیا کو لال ریشمی لباس پہنا دیا گیا ہو اور نقاب سے منہ ڈھانک دیا گیا ہو اور کوئی اس کو حسین خوبصورت سمجھ کر محبت کا دم بھرنے لگے۔ مگر جب برقع اُٹھے گا اس وقت اس محبت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی ؎

بس ندامت خورش کہ زیر چادر باشد
چوں بازکنی مادر مادر باشد

کسی کا قطعہ ہے ؎

عارفے خواب رفت در نکرے	دید دنیا بصورت بکرے
کرد از وے سوال کاے دلبر	بکر چونی بایں ہمہ شوہر
گفت یک حرف با تو گویم راست	کہ مرا ہر کہ بود مرد نخواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا	زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

یعنی ایک عارف نے دنیا کو خواب میں دیکھا کہ بڑھیا ہے مگر ابھی تک باکرہ۔ اُنھوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تو نے اتنے خصم کئے اور اب تک کنواری ہی رہی۔ کہا جو مرد تھے انھوں نے مجھے منہ نہیں لگایا اور جو میرے عاشق تھے وہ نامرد تھے ان کو میں نے منہ نہیں لگایا اس لئے اب تک کنواری ہی ہوں۔ واقعی دنیا تو اس وقت بوڑھی ہوگی جوان کہاں سے رہی۔ ہزاروں برس کی عمر ہو چکی ہے مگر ہم لوگ اس پر جان دے رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی حسین نوجوان ہے۔

صاحبو! آپ تو دنیا کو بُرقع کے اوپر سے دیکھ کر اس کے عاشق ہو گئے ہو اور اہل اللہ نے بُرقعہ اٹھا کر اسے دیکھا ہے اس لئے وہ نفرت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک تفسیر ہے اس آیت کی: لعلکم تتفکرون فی الدنیا والآخرۃ۔ کہ دنیا و آخرت کی حقیقت میں تفکر کرو۔ دونوں کو بُرقع کھول کر دیکھو تو تم کو دنیا سے نفرت اور آخرت کی طلب ہو جائے گی۔ دنیا ظاہر میں محاسن سے مزین ہے مگر اندر گوہ موت اور سانپ بچھو بھرے ہوئے ہیں اور آخرت ظاہر میں مکارہ و مصائب سے گھری ہوئی ہے مگر اندر سے نہایت حسین دلفریب محبوبہ ہے جس کی ایک نگاہ کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم بھی کوئی چیز نہیں۔ ہم کو الزام دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واللہ! ہم تم سے زیادہ دنیا سے واقف ہیں کیونکہ ہم کو تو تفکر فی الدنیا کا امر ہے۔ ہم تو اس میں خوب غور و تامل کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کی حقیقت سے بھی واقف ہو گئے۔ تم خاک واقف ہو کہ محض برقع کے اوپر سے زینت دیکھ کر عشق کا دم بھرنے لگے۔

پس ہم دنیا سے بے توجہی کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی حالت پر ضرور توجہ کرو مگر کامل توجہ کرو جس سے حقیقت منکشف ہو۔ ناتمام توجہ نہ کرو کہ ظاہر ہی تک رہ جاؤ چنانچہ اس آیت میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے جس کو میں نے بیان کے لئے اختیار کیا ہے حق تعالیٰ نے اس میں سبب کفر بھی بتلایا ہے: یعلمون ظاھرا من الحیوۃ الدنیا کہ کفار کو دنیا کی صرف ظاہری حالت کا علم ہے اس لئے وہ ایمان سے رکے ہوئے ہیں یعنی اگر حقیقتِ دنیا کا علم ہو جاتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ تو یہاں بھی ظاہر دنیا کے علم کو مذموم کہا گیا ہے حقیقت کے علم کو مذموم نہیں کہا گیا۔ اور حقیقتِ دنیا کا علم اہل دنیا کو حاصل نہیں صرف اہل دین ہی کو حاصل ہے۔

اور یہ مضمون اس مضمون کی نظیر ہے جو میں نے لکھنؤ کے ایک وعظ میں بیان کیا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ علماء ترقی سے منع کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اور ہم پر بہتان ہے۔ ہم ترقی سے کیونکر منع کر سکتے جب کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے ہم کو ترقی کا حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے ——— فاستبقوا الخیرات کہ خیر میں باہم سبقت کرو۔

اور یہی ترقی کا حاصل ہے پس ترقی تو ہمارے نزدیک فرض ہے۔ اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ علماء تم سے زیادہ ترقی کے حامی ہیں کیونکہ تم نے آج تک اس کو فرض شرعی نہ کہا تھا نہ اس کی فرضیت کو قرآن سے ثابت کیا بلکہ تم محض اقتصادی اور تمدنی مصالح کی بناء پر اس کے حامی ہو پس ترقی کے ضروری ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہ رہا صرف اختلاف اس بات میں ہے کہ ہم ترقی کے لئے اتنی قید بڑھاتے ہیں کہ خیر میں ترقی ہونا چاہیے اور آپ قید نہیں بڑھاتے، مگر اس قید کے ضروری ہونے سے آپکو بھی انکار نہیں ہو سکتا

اول تو یہ قید خود نص میں موجود ہے یعنی فاستبقوا الخیرات۔ دوسرے خیر کا مقابل شر ہے اور ترقی فی الشر کو کوئی عاقل مطلوب نہیں کہہ سکتا۔ اب اختلاف صرف اس میں رہا کہ جس ترقی کے آپ حامی ہیں وہ خیر ہے یا نہیں؟ آپ ترقی درہم کے حامی ہیں خواہ دین سلامت رہے یا نہ رہے اور ہم بدون سلامت دین کے ترقی درہم کو ترقی ورم سمجھتے ہیں۔ جس شخص کے بدن پر ورم ہو جائے ظاہر میں وہ بھی ترقی یافتہ ہے مگر حقیقت میں وہ تنزل کی طرف جا رہا ہے یہی حال بدون دین کے ترقی درہم کا ہے۔ پس یوں نہ کہو کہ علماء ترقی سے مانع ہیں بلکہ یوں کہو کہ وہ خاص صورت کی ترقی کے مانع ہیں جو ترقی ورم کے مشابہ ہے ورنہ فی نفسہ مطلق ترقی کے تو وہ تم سے زیادہ حامی ہیں۔

اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ ہم توجہ الی الدنیا سے منع نہیں کرتے بلکہ دنیا کی طرف ناتمام توجہ سے منع کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی حالت میں کامل توجہ کرو۔ جس سے اس کی حقیقت واضح ہو جائے اور ہم توجہ الی الدنیا سے کیونکر منع کر سکتے ہیں جب کہ نص میں تفکر فی الدنیا کا امر ہے۔ چنانچہ اہل اللہ نے دنیا کی حالت میں کامل توجہ کی ہے اور اس کی حقیقت سمجھ کر اس کو بتلایا۔

چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے حلالھا حساب وحرامھا عذاب کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کا حلال حصہ تو حساب سے خالی نہیں اور حرام پر عذاب ہوگا۔ تو کوئی جزو کلفت سے خالی نہ ہوا۔

اور حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں ماکولات و مشروبات و ملبوسات و

نسا ر میں منحصر ہیں اور ماکولات میں سب سے افضل شہد ہے اور وہ ایک مکھی کی قے ہے اور مشروبات میں سب سے افضل پانی ہے جس میں خنزیر تک بھی آدمی کا شریک ہے اور ملبوسات میں سب سے بہتر حریر ہے جو ایک جانور کا لعاب ہے۔ اور نسار کی یہ کیفیت ہے کہ متزھن لاحسن مواضعھا و یقصد منھا انتن مواضعھا۔ یہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے سے دنیا کی حقیقت دوسری پر بھی واضح ہوتی ہے۔

اور ایک بزرگ کا ارشاد امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں تو قابلِ نفرت ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ خود اپنی حالت ذاتیہ پر نظر کرکے بھی قابلِ نفرت ہے کیونکہ طالب دنیا کو کوئی راحت ملتی نہیں ہے۔

دنیادار پریشانی سے خالی نہیں

صاحبو! تم دنیا داروں کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو نہ دیکھو بلکہ ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس رہ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھی پریشانی سے خالی نہیں اور طالب آخرت سب سے سب راحت میں ہیں چنانچہ ان کی یہ حالت ہے ؎

نہ بر اشترے سوارم نہ چو اشتر زیر بارم   نہ خداوندِ رعیت نہ غلام شہر یارم

دنیا والوں کو کہیں بچہ کا غم ہے کہیں بیوی کا کہیں تنگدستی کا کہیں مقدمہ بازی کا کہیں زمینداری کا کہیں شادی اور غمی کی رسموں کا۔ اور اہل اللہ کو کچھ بھی غم نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو بیوی بچہ کا یا تنگدستی کا حادثہ پیش نہیں آتا۔ ان کو بھی یہ واقعات پیش آتے ہیں اور ان کے منہ سے بھی آہ نکلتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اندر سے خوش بھی ہوتے ہیں۔ شاید تم کہو کہ یہ دونوں باتیں کیونکر جمع ہو سکتی ہیں تو میں کہونگا کہ ان دونوں باتوں کو تو ایک معمولی مریض شفا خانہ میں جمع کرکے دکھلا دیتا ہے کسی مریض کے دمل ہو اور ڈاکٹر کسی مصلحت سے بغیر کلوروفارم سنگھائے اس کا اپریشن کرے تو وہ اس وقت روئے گا بھی، چلائے گا بھی، آہ بھی کرے گا مگر بعد میں ڈاکٹر

لے یہ مضمون نسار کے متعلق مستورات کے حاضر ہونے کے سبب بیان نہ کیا تھا۔ نظر ثانی میں بڑھا دیا گیا ۱۲ منہ

کو یہ پس رپیہ نذرانہ اور انعام کے بھی دیگا - تو دیکھیے اس شخص نے آہ بھی کی اور رویا چلایا بھی اور دل سے ان سب باتوں پر خوش بھی تھا جبھی تو ڈاکٹر کو فیس اور انعام دیا۔ اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے - یہ زندہ مثال ہے تکلیفِ ظاہری اور محبتِ حق کے جمع ہو جانے کی محقق دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیتا ہے اور بیچارہ غیر محقق ایسے موقع پر گھبرا کر یوں کہنے لگتا ہے

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ　　بازمیگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

یہ شعر اصل میں ایک عربی شعر کا ترجمہ ہے ؎

القاہ فی الیم مکتوفا وقال لہ　　ایاک ایاک ان تبتل بالماء

علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ حضرت حق سبحانہ کی شان میں اس شعر کا پڑھنا حرام ہے کیونکہ حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے جیسا اس شعر میں تکلیف مالا یطاق کا الزام دیا گیا ہے اور محقق تو تکلیف و رضا کو جمع کر لیتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عقلاً خوش ہوتا ہے اور طبعاً متالم ہوتا ہے ۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود برجانِ من　　دل فدائے یار دل رنجانِ من

تکلیف کی بات سے طبعاً تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر عقلاً اس وجہ سے کہ :

ع　　ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

شیریں ہو جاتی ہے پس یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ طالبانِ دنیا پریشانی میں ہیں اور طالبانِ آخرت راحت میں ہیں -

مطلوبیتِ دنیا کے درجات

صاحبو ! تم بھی ان حضرات کی طرح باطن دنیا میں تامل کرو ۔ اس آیت میں بھی ظاہر کی قید بڑھا کر باطن پر نظر کرنے کی طرف اشارہ ہے اور خلاصہ اس نظرِ باطن کا یہ ہے کہ دنیا میں اس کی مطلوبیت کی دو حیثیتیں ہیں ۔ ایک مطلوبیت اس کے صفات کے اعتبار سے ، دوسرے مطلوبیت اس کی غائیت کے اعتبار سے ۔ تو صف کے اعتبار سے تو دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ فانی ہے اور آخرت فانی ہے اور پائیدار کے مقابلہ میں ناپائیدار قابلِ رغبت نہیں ہوا کرتا ۔ اور غائیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم

ہوگا کہ جس چیز کے لئے لوگ دنیا کو طلب کرتے ہیں وہ بھی دنیا سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ وہ بھی دین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اب سمجھیے کہ دنیا کو کس چیز کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عیش و آرام کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ عیش و آرام کس چیز کا نام ہے بعض لوگ عمدہ لباس عمدہ مکان اور عمدہ غذا کو عیش و آرام سمجھتے ہیں مگر یہ تو اسبابِ آرام ہیں اور عیش و آرام کی حقیقت کچھ اور ہے۔

دیکھیے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہوجائے اور یہ سب اسباب بھی اس کو میسر ہوں تو کیا اس کو ان اسباب سے کچھ خوشی ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر کسی بے آئین سلطنت میں اس کو اجازت دی جائے کہ چاہے تم اپنا کوئی عوضی پھانسی کے لئے دے دو خواہ خود پھانسی پر لٹک جاؤ۔ اور یہ شخص اعلان کردے کہ جو شخص میری طرف سے پھانسی پر لٹکنا منظور کرے میں اس کو اپنی تمام جائیداد اور مال دیدوں گا۔ تو بتلاؤ کیا کوئی غریب سے غریب بھی پھانسی کو گوارا کرلے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں کرے گا۔

پس معلوم ہوا کہ یہ اسباب حقیقتِ دنیا نہیں بلکہ صورتِ دنیا ہے اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی راحتِ قلب۔ اور ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ راحتِ قلب طلبِ دین ہی سے حاصل ہوتی ہے، طلبِ دنیا سے حاصل نہیں ہوتی۔ اہل اللہ میں جو حضرات محبوبانہ شان میں رکھے جاتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے شاہانہ لباس و غذا سے اور کثرتِ معتقدین سے نوازا ہے میں ان کا ذکر نہیں کرتا بلکہ جن دینداروں کی یہ حالت ہے کہ مدفوع علی الابواب ہیں۔ جوتے بھی درست نہیں لباس بھی شکستہ ہے میں ان کی نسبت دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ بھی راحتِ قلب میں دنیا داروں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہے کہ رب اشعث، اغبر مدفوع علی الابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ۔ ان کو خدا پر ایسا ناز ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں کہ یہ اس طرح ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کردیتے ہیں اسی کو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

وہ اپنی ایسی حالت شکستگی میں خوش اور مگن ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ جب کوئی فقر و فاقہ کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ تم اس دولت کی قدر کیا جانو تم کو مفت میں یہ دولت مل گئی ہے۔ اس کی قدر ابراہیم بن ادہم سے پوچھو جس نے سلطنت کو چھوڑ کر فقر و فاقہ خریدا ہے۔ وہ دنیا کی تکالیف کو تکلیف ہی نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من — دل فدائے یار دل رنجانِ من

دیکھیے! سب سے بڑی کلفت دنیا میں موت کی ہے مگر وہ اس کے عاشق ہیں۔ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم — راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

اب بتلائیے جو موت سے بھی ایسا خوش ہو وہ دوسری کسی کلفت سے کیا پریشان ہوگا۔ پھر یہ محض باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی موت کے وقت ان کی حالت یہی ہوتی ہے۔ ایک بزرگ جو نقشبندی ہیں جن پر سکون غالب ہوتا ہے چشتی بھی نہ تھے کہ مغلوب ہوں انھوں نے مرتے ہوئے یہ وصیت کی کہ ہمارے جنازہ کے ساتھ ایک خوش آواز یہ قطعہ پڑھتا ہوا چلے ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بر دست و بر بازوئے تو

اگر کوئی چشتی ایسی وصیت کرتا تو غلبہ کی تاویل بھی ہو سکتی تھی کیونکہ سوختن افروختن انکا حصہ ہے۔

اہل اللہ موت سے نہیں گھبراتے

مگر حق یہ ہے کہ اس بات میں اہل اللہ سب ہی کا یہی مذاق ہے کہ وہ موت سے نہیں گھبراتے۔ آخر کچھ تو بے فکری تھی جو ایسی وصیت سوجھی۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مرنے کے بعد ان کو کسی کے شعر پڑھنے سے کیا مزہ آیا ہوگا تو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مرنے کے بعد بھی مزہ آتا ہے چنانچہ حضرت سلطان نظام الدینؒ کے

جنازہ کے ساتھ ایک مرید فرطِ حزن میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا ؎

سرو سیمینا بصحرا می روی　　سخت بے مہری کہ بے ما می روی

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو　　تو کجا بہر تماشا می روی

شیخ کے انتقال پر مریدین کی جو حالت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس شخص نے اسی حالت میں یہ اشعار پڑھے تھے۔ دفعتہً حضرت سلطان جی کا ہاتھ کفن میں بلند ہوگیا۔ جیسا کہ وجد کی حالت میں ہوا کرتا ہے۔ لوگوں نے اس مرید کو روکا کہ اشعار پڑھنا بند کرو۔ نہ معلوم کیا سے کیا ہوجائے گا۔ پھر کچھ دیر کے بعد ہاتھ کفن میں سیدھا ہوگیا۔ یہ تو موت سے پہلے اور موت کے بعد متصل کی حالت تھی اور برزخ کی حالت کے بارے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست　　گویم آں کس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

ان حضرات کو پھر غم کیوں ہو اور بعض تفاسیر پر موت کے قریب کی حالت خود نص میں مذکور ہے:

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملئکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیاؤکم فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم فیہا ما تشتھی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون نزلا من غفور رحیم۔

کہ فرشتے ان کو بشارتیں سناتے ہیں اور مطمئن و بے فکر کردیتے ہیں۔ اس کے بعد قیامت ہے سو ان کے حق میں وہ بھی فکر کی چیز نہیں۔ چنانچہ منصوص ہے لا یحزنھم الفزع الاکبر و تتلقاھم الملئکۃ۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ سے میں نے اسی معنی میں ایک شعر سنا ہے۔ فرماتے تھے ؎

عاشقاں را با قیامت روزِ محشر کار نیست　　عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

اب بتلائیے جس کے نزدیک روزِ محشر جلوۂ دیدارِ محبوب کا دن ہو اس کو قیامت سے کیا پریشانی ہوگی؟ کچھ بھی نہیں۔ مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے کہ اہل اللہ جب جہنم کے اوپر سے پار ہوکر جنت میں پہنچ جائیں گے تو باہم کہیں گے کہ ہم نے سنا تھا کہ پل صراط جہنم کے اوپر ہے مگر ہم کو تو راستہ میں جہنم نظر نہیں پڑا۔ تو فرشتے کہیں گے کہ تم نے راستہ میں ایک باغ دیکھا تھا وہ کہیں گے ہاں! باغ تو دیکھا تھا۔ فرشتے کہیں گے کہ وہی جہنم تھا۔ تمہارے اعمال کی

برکت سے وہ باغ کی صورت میں تم کو نظر آیا۔ تو ان کے لئے تو جہنم بھی آتش خلیل کی طرح گلزار ہو جائیگا۔ پھر ان سے زیادہ راحت میں کون ہو گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمان پل صراط پر سے گزریں گے تو جہنم مومن سے کہے گا:

جز یا مومن فان نورک اطفاء ناری

اے مسلمان! جلدی سے آگے بڑھ جا۔ تیرے نور نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا۔ اس کی تفسیر میں بعض نے فرمایا ہے کہ جیسے مومن جہنم سے پناہ مانگتا ہے ایسے ہی جہنم بھی مومن سے پناہ مانگتا ہے۔ تو جس سے جہنم بھی پناہ مانگے جو راس الغموم ہے اس کی خوشی کی کیا حد ہوگی۔ اور واقعی جہنم کو مومن سے پناہ مانگنا چاہیے کیونکہ مومن میں اور جہنم میں کوئی مناسبت نہیں اور جہاں مناسبت نہ ہو وہاں تو طرفین سے اعراض ہی ہوگا۔ اس مضمون کو ایک شاعر نے دوسرے رنگ سے بیان کیا ہے ؎

میں جو ہوں قابل دوزخ تو گناہوں کے سبب ... لیک دوزخ نے کیا کیا جو مرے قابل ہے

یعنی جہنم نے کیا قصور کیا جو مجھے اس کے اندر بھیج گیا۔ واقعی مسلمان بھی عجیب چیز ہے کہ دوزخ سے وہ بعد چاہتا ہے اور دوزخ اس سے بعد چاہتی ہے۔

دولتِ ایمان قابلِ قدر ہے

صاحبو! اس دولتِ ایمان کی قدر کرو۔ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ اہل اللہ سے بڑھ کر راحتِ قلب کسی کو حاصل نہیں اور یہی روح ہے دنیا کی۔ تو معلوم ہوا کہ طالبان دنیا کو دنیا سے کچھ بھی حصہ نہیں ملا۔ وہ تو محض ظاہری اسباب کو لئے بیٹھے ہیں اور روح دنیا ان ہی لوگوں کو حاصل ہے جن کو تم تارک دنیا کہتے ہو۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روحِ دنیا طلبِ دنیا سے نہیں ملتی بلکہ ترکِ دنیا سے ملتی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ ایسی چیز کے عاشق ہیں جس کے ملنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس سے نفرت کی جائے، محبت نہ کی جائے۔

یہ تو اس کا اثبات تھا کہ دنیا کی راحت اہل اللہ ہی کو میسر ہے۔ باقی رہا یہ کہ کیا ہے راز ان کی اس راحت کا؟ سو وہ یہ ہے کہ اہل اللہ اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہیں کرتے

کیونکہ تجویز کرنا دعویٰ ہے ہستی کا کہ ہم بھی کچھ ہیں اور ہماری تجویز بھی کوئی چیز ہے اور ان کا مذاق فنا محض ہے وہ اپنے کو مٹا چکے یعنی اپنے ارادہ اور تجویز کو فنا کر چکے ہیں جیسا فرماتے ہیں ؎ خود ثنا گفتن ز من ترک ثنا ست — این دلیل ہستی و ہستی خطا ست

وہ تو اپنی طرف سے ثنا بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی ہستی کی دلیل ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی ثنا کریں۔ ہم ہیں کیا چیز جو اُن کی ثنا کر سکیں۔

رہا یہ شبہ کہ پھر اہل اللہ کے کلام میں حق تعالیٰ کی ثنا کیوں ہے اور حضورؐ نے کیوں ثنا کی ہے۔ اس کا جواب اہل اللہ نہیں دے سکتے۔ صوفیہ نے اس کا جواب حدیث سے دیا ہے کہ عارف بی یسمع وبی ینطق وبی یبصر کے درجہ میں ہوتا ہے اس لئے وہ ثنا اس کی طرف منسوب نہیں ہوتی بلکہ حق تعالیٰ ہی ثنا کرتے ہیں جیسے شجرۂ طور سے آواز آتی تھی انی انا اللہ رب العلمین تو کیا شجرہ اپنے آپ کو رب العلمین کہہ رہا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ کوئی اس سے کہلوا رہا تھا اور کہنے والا دوسرا تھا۔

کاش اگر اہل افتاء منصورؒ کے انا الحق کو بھی شجرۂ طور کے انا اللہ پر قیاس کرتے تو وہ بے چارے دار پر نہ کھنچتے۔ مگر علماء یہ سمجھے کہ شجرۂ طور غیر عاقل تھا اور منصور عاقل ہیں حالانکہ وہ محض ناقل تھے۔ جیسے عدالت کا اردلی مقدمہ والوں کے پکارنے میں محض ناقل ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے رئیس کا نام لے کر پکارتا ہے کہ فلاں ولد فلاں حاضر ہے۔ اس وقت کوئی اس کی بات سے ناراض نہیں ہوتا کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ خود نہیں کہہ رہا بلکہ نقل کر رہا ہے اور دوسرے وقت میں اس کو کیا مجال ہے جو رئیس کے سامنے آ بھی سکے اور بول بھی سکے اور نام لینا تو درکنار اور نام لے کر پکارنا تو بڑی بات ہے۔

ایسے ہی اہل اللہ ثنائے الٰہی کے وقت ناقل ہوتے ہیں خود ثنا نہیں کرتے نہ اپنے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فانی محض ہوتے ہیں۔ جب فانی ہیں تو پھر یہ حضرات تجویز کہاں کر سکتے ہیں اگر ان کا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے تو وہ دوا اور دعا سب کچھ کرتے ہیں مگر دل سے ہر پہلو پر راضی ہوتے ہیں۔ اگر مر گیا تو وہ اوّل ہی سے اس پر راضی تھے۔ گو طبعی رنج ہو اس کا مضائقہ نہیں مگر دل سے وہ اس پر راضی ہوتے ہیں اور تمام کلفتوں کی جڑ یہی تجویز اور توقع ہے۔

اور جو شخص تجویز اور توقع کو فنا کر دیگا وہ ہر حال میں راحت ہی سے رہیگا بلکہ اگر کوئی دنیادار شخص اہل اللہ سے ناتمام تشبہ بھی حاصل کرلے وہ بھی دوسروں سے راحت میں رہے گا۔

چنانچہ ایک جنٹلمین تھے وہ ملاّنے جنٹلمین تھے یعنی آزاد دنیادار۔ اُن کی حالت یہ تھی کہ ہیٹ بھی لگائے ہوتے ہیں اور لنگی بھی پہنے ہوتے ہیں۔ لوگ بہت ہنستے کہ ہیٹ اور لنگی کا کیا جوڑ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ لباس راحت کے لئے پہنا جاتا ہے اور پتلون میں راحت نہیں ہے بلکہ آدمی اس میں جکڑ بند ہو جاتا ہے اس لئے لنگی باندھ لی۔ اور ہیٹ میں راحت ہے کہ اس سے دھوپ وغیرہ سے نگاہ کی حفاظت ہے اس لئے میں راحت کی چیز اختیار کرتا ہوں خواہ جوڑ ہو یا نہ ہو۔ جب ان کے والد صاحب کے انتقال کا تار آیا تو باورچی نے کھانا نہیں پکایا کہ آج کیا کھائیں گے۔ وقت پر کھانا مانگا۔ اُس نے کہا، میں نے تو آج اس خیال سے کہ والد صاحب کا صدمہ ہوگا کھانا نہیں پکایا۔ تو اس پر پانچ روپیہ جرمانہ کیا (یہ تو واہیات حرکت تھی) اور کہا، سبحان اللہ! وہ تو اپنی موت سے مرے اور تم ہم کو زندگی میں بھوکا مارنا چاہتے ہو۔ ایک بات عقل کی تھی اور حقیقی آزادی کی جس میں سرتاسر راحت ہے۔

تو حضرت اصل دنیادار تو اہلِ دین ہی ہیں کہ دنیا کی رُوح یعنی راحتِ قلب تو ان ہی کے پاس ہے اور دنیاداروں کے پاس بجز ٹیپ ٹاپ کے راحت خاک بھی نہیں اور اگر کسی کو کچھ راحت ہے بھی تو وہ بھی اہل اللہ کے تشبہ کی برکت ہے۔ یہ تو طریقہ تھا دنیا سے بے توجہی کا کہ دنیا کی حقیقت میں غور کیا جائے۔

توجہ آخرت کا طریقہ

اب آخرت کی طرف توجہ کا طریقہ سنیئے۔ وہ بھی یہی ہے کہ آخرت کی حالت میں غور کرو کہ اسکی ایک حالت تو یہ ہے کہ وہاں رنج وغم کا نام نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طلبِ آخرت کا دنیا میں یہ نتیجہ ہے کہ طالبِ آخرت کو یہاں بھی راحتِ قلب حاصل ہو جاتی ہے تو خود آخرت میں پہنچ کر کیا حال ہوگا۔

دوسری حالت یہ ہے کہ آخرت باقی ہے اس کی نعمتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔

تیسری حالت آخرت کی یہ ہے کہ جتنی اس کی طلب کی جائے اس سے زیادہ ملتی ہے

بلکہ جتنی تم چاہ بھی نہیں سکتے اتنی ملتی ہے اور دنیا کی یہ حالت ہے کہ جتنی مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں اتنی بھی نہیں ملتی ہے

(وما قضی احد منھا لبانتہ لا ینتھی ارب الی ارب)

مشاہدہ ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ جتنی دنیا چاہتا ہے اتنی نہیں ملتی اور آخرت کی یہ حالت ہے کہ اس کے طالب کے سب مطلوبات اس کو ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ راحت کا طالب ہے، جنت کا طالب ہے، رضائے حق کا طالب ہے، دوستوں کی ملاقات کا طالب ہے۔ یہ سب باتیں مع شے زائد اس کو ملیں گی اور بہت سی چیزیں تو اس کو دنیا ہی میں مل جاتی ہیں مثلاً راحت قلب و رضائے حق۔ البتہ یہاں تغیر کا کھٹکا لگا رہتا ہے وہاں اس سے بھی اطمینان ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلھا مذموما مدحورا۔ کہ جو شخص حیات عاجلہ یعنی دنیا کا طالب ہے اسکو ہم جتنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں یہاں ہی دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں ذلت و رسوائی کے ساتھ داخل ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جو پکا دنیا دار ہے جو محض دنیا ہی کا طالب ہے یعنی کافر۔ جو آخرت کو جانتا ہی نہیں دنیا ہی میں منہمک ہے تو اس کو بھی جتنی وہ چاہتا ہے اتنی نہیں ملتی اور نہ ہر ایک کو ملتی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:

ومن اراد الاخرۃ وسعی لھا سعیھا فاولئک کان سعیھم مشکورا۔

اور جو آخرت کو طلب کرے اور اس کیلئے کماینبغی کوشش کرے۔ یہاں وسعی لھا سعیھا جو بڑھایا گیا ہے یہ اراد الاخرۃ کی تفسیر ہے اور یہ اس واسطے بڑھایا گیا تاکہ موسناکوں کی ہوس کو قطع کر دیا جائے کیونکہ بہت لوگ ارادۂ آخرت کے بارے میں اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ زبان سے یوں کہہ لیا جائے کہ نیت کرتا ہوں میں طلب آخرت کی۔ اللہ اکبر! یعنی بہت لوگ محض تمنائے آخرت کو طلب آخرت سمجھتے ہیں اور اس کے اسباب کو اختیار نہیں کرتے اور یہ حالت آخرت ہی کے ساتھ ہے دنیا کے ساتھ کسی کا یہ برتاؤ نہیں کہ محض تمنا کو کافی سمجھ لے۔ اسی واسطے من کان یرید العاجلۃ کے بعد

وسعی لہا سعیہا نہیں بڑھایا گیا کیونکہ وہاں تو ارادہ کے معنی ہی عام طور پر یہ ہیں کہ خوب سعی کی جاوے پس یہ شبہ نہ رہا کہ ارادہ عاجلہ میں تو سعی کی قید نہیں اور یہاں سعی کی قید ہے۔ تو آخرت کی فضیلت دنیا پر پوری طرح واضح نہ ہوئی۔ اگر یہاں بھی محض ارادہ سے بحث ہوتی تو مقابلہ کامل ہوتا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ سعی لہا سعیہا دونوں جگہ مراد ہے مگر وہاں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں ارادہ کے معنی میں لوگوں نے غلطی نہیں کی اور یہاں بیان کی ضرورت تھی کیونکہ یہاں معنی ارادہ میں غلطی کا وقوع ہو رہا ہے ۱۲ ظ) ـــــ اور سعی لہا سعیہا فرمایا سعی لہا سعیہ نہیں فرمایا کہ آخرت کے لئے اپنی سی کوشش کرے کیونکہ اس میں کم ہمتوں کو موقع مل جاتا کہ ہر شخص ذرا سا کام کر کے کہہ دیتا کہ بس میری ہمت تو اتنی ہی ہے۔ تو ان کم ہمتوں کے بہانے قطع کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ آخرت کے لئے آخرت کے مناسب کوشش کرے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کرے جیسا کہ ظاہر میں شان آخرت کی عظمت سے مفہوم ہوتا ہے بلکہ مطلب وہی ہے کہ اپنی سی کوشش کرے اور اپنی ہمت کے موافق سعی کرے۔

چنانچہ دوسری جگہ اس کی تفسیر فاتقوا اللہ ما استطعتم سے کی گئی ہے پس حاصل سعی لہا سعیہا ـــــ وسعی لہا سعیہ کا ایک ہی ہے لیکن سعی لہا سعیہا کے بعد سعی لہا سعیہ کا مفہوم جو ذہن میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ اپنی سی کوشش ختم کر دے اور اس کے بغیر کم ہمتوں کو بہانہ کا موقع مل جاتا خوب سمجھ لو۔ چنانچہ اسی حکمت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے فاتقوا اللہ ما استطعتم کو اول نازل نہیں فرمایا بلکہ اول فاتقوا اللہ حق تقاتہ کا نزول ہوا جس سے صحابہ گھبرا گئے کہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے، تب تسلی کے لئے فاتقوا اللہ ما استطعتم نازل ہوا اور یہ اس کے لئے ناسخ نہیں بلکہ مفسر ہے کہ فاتقوا اللہ حق تقاتہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو۔ اور سلف کے کلام میں اگر اس کو کہیں ناسخ کہا گیا ہے تو اس سے بھی مراد تفسیر ہی ہے لیکن سلف

کے کلام میں بیان تبدیل وبیان تفسیر سب کو نسخ سے تعبیر کردیا جاتا ہے۔ بہرحال مقصود تو تقویٰ بقدر استطاعت ہے لیکن اس کو فاتقوا اللہ حق تقاتہ کے بعد اس کی تفسیر میں بیان فرمانے سے کم ہمتوں کے بہانے قطع ہو گئے۔ اور اول ہی اس کا نزول ہو جاتا تو کم ہمتوں کو بہانہ ڈھونڈھنے کا موقع مل جاتا۔ ایسا ہی یہاں سمجھو کہ سعی لہا سعیہا کو فاتقوا اللہ ما استطعتم سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا حاصل سعی لہا سعیہ کی طرف لوٹتا ہے مگر سعی لہا سعیہ نہ فرمانے میں وہ حکمت ہے جو ابھی بیان ہوئی۔ واللہ اعلم باسرار کلامہ۔

بہرحال ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آخرت کا طالب ہو تو اس کی جزا یہ ہے کہ اولئک کان سعیھم مشکورا ان کی سعی کی قدر کی جائیگی۔ بظاہر یہاں کچھ انعام کا ذکر نہیں۔ مگر قرآن شاہی کلام ہے اس میں شاہانہ محاورات کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے اور شاہی محاورہ میں یہ لفظ بہت بڑا ہے۔ یہ ہزاروں تفاصیل سے بڑھا ہوا ہے۔ جب بادشاہ کسی سے کہہ دے کہ ہم نے تمہاری خدمت کی قدر کی ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ بہت کچھ ملے گا اور امید سے زائد ملے گا۔ اب سمجھ لو کہ جس کی سعی کی احکم الحاکمین قدردانی فرمائیں اسکو تو کیا کچھ ملے گا۔

ایسے ہی قرآن میں جو بعض جگہ لعلکم تتقون وغیرہ آیا ہے یہ بھی شاہانہ محاورہ ہے۔ بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ انہی لفظوں کے ساتھ وعدہ کیا کرتے ہیں کہ امیدوار باشید۔ اور یہ لفظ اُن کے کلام میں دوسروں کی قسموں سے زیادہ مؤکد ہے۔ پس ایک بات تو آخرت کی یہ قابلِ رغبت ہے کہ اس کی طلب بیکار نہیں جاتی بلکہ ثمرہ ضرور مرتب ہوتا ہے بخلاف دنیا کے کہ وہاں اس کا وعدہ نہیں۔ پھر یہ کہ طالبِ آخرت کو طلب سے زیادہ ملتا ہے چنانچہ ایک عمل کا دس گنا ثواب تو ہر شخص کے لئے مقرر ہے: من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا۔

اور بعضوں کو سات سو گنا بھی ملے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ۔

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: فیضاعفہ لہ اضعافا کثیرۃ۔

اب تو کچھ حد ہی نہ رہی کیونکہ دوسری آیت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب پہلی آیت کے نزول پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی اللھم زد فی (کذا ذکر فی التفسیر المظہری من عدۃ کتب الحدیث)۔ تو یقیناً اس میں پہلی آیت سے زیادہ ہی تضاعف ہے۔

اور مفسرین نے اس کے ضعف کو سات سو کہا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کثرت کثیرہ میں تو شبہ ہی نہیں۔ وہ تو منصوص ہے۔

اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کے راستہ میں ایک چھوارہ کوئی دے تو حق تعالیٰ اس کو یہاں تک بڑھاتے ہیں کہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔ اس سے اور بھی حد بڑھ جاتی ہے کیونکہ چھوارہ کے برابر احد پہاڑ کے اجزا کرنے بیٹھو تو اجزا کرنے ہی میں سو دو سو برس لگ جائیں گے گویا اتنا بے حساب ملے گا بعض جاہل لوگ تو اتنی جزا کو سن کر ہی گھبرا گئے۔ چنانچہ ایک جاہل آریہ نے لکھا ہے کہ جزا کا جو قاعدہ مسلمانوں میں ہے وہ ٹھیک نہیں کیونکہ ہمارے اعمال تو محدود ہیں اُن پر جزائے غیر محدود کا مرتب ہونا ایسا ہے جیسا کہ پاؤ بھر کی غذا والے کو ایک من کھلا دیا جاتے۔ وہ تو مر جائیگا۔ پس محدود کو جزائے غیر محدود کی طاقت کہاں!

اس جہالت کی بات کا جواب ظاہر ہے کہ پاؤ بھر کی غذا والا ایک من کھلانے سے اس وقت مرے گا جب کہ اس کو ایک وقت میں ایک دم سے کھلا دیا جاتے۔ اور اگر جزائے غیر محدود کے ساتھ عمر بھی غیر محدود ہو اور عمر غیر محدود میں غیر محدود غذا کھلائی جائے تو بتلائیے اس میں کیا اشکال ہے۔ اس جاہل نے جزا کو تو غیر محدود رکھا اور عمر کو محدود لے لیا اور خواہ مخواہ اعتراض کر دیا۔ یہ نہ دیکھا کہ مسلمان عمر دار الجزاء کو بھی غیر محدود کہتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ آریہ خود نجاتِ ابدیہ کے بھی قائل نہیں۔ ان کے نزدیک جو آدمی نیک ہوتا ہے وہ عالمِ ارواح میں ایک محدود مدت تک رہ کر تناسخ کے طور پر عالمِ اجسام میں آجائیگا۔ اس لئے اس نے مدتِ جزا کو حاصل کر لیا اور اشکال کر دیا۔ مگر حقیقت میں تو یہ اشکال اس کے مذہب پر ہے اسلام کی تعلیم پر کوئی اشکال نہیں مگر تعصب سے عقل مسخ ہو جاتی ہے اس لئے جو جی میں آیا ہانک دیا۔ تو آخرت میں جزا اتنی ملے گی جس کو سن کر ایسے جاہل تو گھبرا ہی گئے۔

غرض وہاں یہ حال ہے ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را

اور جب ان کی طرف سے ایسی جاں بخشی کا برتاؤ ہے تو ہم کو بھی حق تعالیٰ کے ساتھ جان دادن کا یہ برتاؤ کرنا چاہیے ؎

ہمچو اسماعیل پیشش سربنہ   شاد وخنداں پیش تیغش جاں بدہ

حدیث میں ہے کہ جنّت میں سب سے اخیر میں جو شخص داخل ہوگا۔ حق تعالےٰ اس سے فرمائیں گے کہ جا جنّت میں جا۔ وہ جائے گا تو وہاں ہجوم اور مجمع دیکھے گا۔ حق تعالیٰ سے عرض کرے گا کہ یہاں تو جگہ بھی نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تجھ کو دُنیا سے دس گنا زیادہ رقبہ جنّت میں دیا۔ وہ کہے گا اتستھزی بی وانت رب العٰلمین۔ کیا آپ رب العٰلمین ہو کر مجھ سے ہنسی کرتے ہیں۔ یہاں تو ذراسی بھی جگہ نہیں اور آپ دنیا سے دس گنا بتلاتے ہیں۔ یہ شخص جاہل جنّتی ہوگا گنوار اسی واسطے ایسی بے باکانہ گفتگو کریگا کیونکہ جنّت میں جاہل بھی ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک نے نماز کے بعد بہت لوگوں کو مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا خوش ہوئے اور فرمایا نعم حشوا لجنۃ ھم کہ الحمدللہ یہ سب جنّت کی بھرتی ہیں مگر کام کے آدمی ان میں دو تین ہی ہوں گے۔

جنّت اور دوزخ کی وُسعت

صاحبو! تم جنّت کے طالب ہو تو جنّت تو انشاءاللہ تم کو ملے ہی گی جنّت تمہارے ہی واسطے ہے۔ کفّار کے واسطے تھوڑا ہی ہے۔ اس سے تو بے فکر ہو۔ بس ذرا بُرے بُرے کام چھوڑ دو۔ مگر جی یوں چاہتا ہے کہ جنّت کی بھرتی نہ بنو بلکہ کام کے آدمی بنو۔ تو جنّت میں اتنی وسعت ہے کہ سب سے ادنیٰ مسلمان کو بھی دنیا سے دس گنا رقبہ جنّت میں ملیگا

اس پر بعض نیچریوں نے اعتراض کے طور پر کہا ہے کہ ہم نے تو سارا جغرافیہ پڑھا ہے ہم کو تو جنّت کا کہیں پتہ نہیں لگا۔

اس کا جواب میں نے یہ دیا ہے کہ تم نے جغرافیۂ ارضی پڑھا ہے جغرافیۂ عالم نہیں پڑھا ہے۔ وہ ہمارے پاس ہے۔ اگر تم جغرافیۂ عالم پڑھتے یعنی قرآن تو تم کو جنّت کا پتہ چل جاتا۔ اور جن لوگوں نے یہ جغرافیۂ عالم پڑھا ہے ان کو جنّت کا بھی علم ہے اور دوزخ کا بھی اور پلصراط کا بھی اور عرش و میزان کا بھی اور بعض کو تو ان میں دنیا ہی کے اندر سب کا انکشاف ہو گیا ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالکریم جیلی بڑے صاحب کشف ہیں۔ انھوں نے تو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کرلی ہے کیونکہ دونوں باوجود وسعت کے ہیں تو محدود ہی اور محدود کی پیمائش ممکن ہے لیکن اگر جواس جسم سے پیمائش کی جاتی تو پھر بھی عرصہ دراز لگتا۔ جب توی روحانیہ سے پیمائش کی گئی تو عرصہ دراز کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کیونکہ روح کی قوت بہت زیادہ ہے۔ نیز شیخ عبدالکریم جیلی کو ایک دریا بھی منکشف ہوا ہے جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ اس کی ایک ایک لہر آسمان وزمین سے دس گنا زیادہ ہے مگر فرشتے اس کی لہروں کو روکے ہوتے ہیں ورنہ آسمان وزمین سب غرق ہو جاتے۔

پھر بعض جاہلوں نے یہ شبہ کیا ہے کہ جنت جب اتنی بڑی ہے کہ عرضھا السموٰت والارض تو وہ سماتی کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو اس شبہ کا حق نہیں کیونکہ تمہارے مقتدا اہل سائنس اس بات کے خود قائل ہیں کہ فضا ء الجو غیر متناہی ہے پھر اس غیر متناہی میں اگر جنت بھی ہو تو کیا حرج ہے ممکن ہے جس طرح مریخ میں تم آبادی کے قائل ہو اسی طرح کوئی کرہ جنت بھی ہو اور وہاں بھی آبادی ہو مگر بوجہ بُعد کے وہ کرہ تم کو نظر نہ آتا ہو کیونکہ مریخ کی آبادی کا علم تم کو اس لئے ہوا ہے کہ تم اس کو زمین سے قریب مانتے ہیں اور یہ جواب بطور الزام کے ہے ورنہ جنت کو ہم اس فضاء الجو سے باہر ساتوں آسمانوں سے اوپر مانتے ہیں چنانچہ قرآن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جنت آسمانوں سے آگے ہے ...... حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تفتح لھم (ای للکفار) ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط۔

اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سموٰت سبعہ سے اوپر اور عرش سے نیچے ہے اور عرش ان سب سے بڑا ہے اس سے بڑی کوئی مخلوق نہیں۔ شیخ عبدالکریم جیلیؒ کو جو دریا منکشف ہوا ہے جس کی ایک لہر آسمان وزمین سے بھی دس گنی ہے عرش کے وہ بھی اس کو نیچے لکھتے ہیں اور عرش کو سب سے بڑا ہے مگر وہ بھی محدود ہے اور حق تعالیٰ کی ذات حد سے منزہ ہے۔ وہ غیر محدود ہے۔

تو یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو عرش کو حق تعالیٰ کا مکان سمجھے

ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ عرش پر ایسے مستقر ہیں جیسے ہم اپنے مکان میں ہیں۔ بھلا غیر محدود کو محدود کیونکر محیط ہو سکتا ہے اور مکان کے لئے مکین پر محیط ہونا لازم ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر استوی علی العرش کے کیا معنی ہیں؟

اس کے جواب میں سہل طریق تو سلف کا ہے کہ اس میں سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ اس کے معنی ہم کو معلوم نہیں۔ جو بھی مراد ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اگر تاویل کی ٹھہرے تو وہ تاویل سہل ہے جو میں نے بارہا بیان کی ہے کہ استوی علی العرش شاہی محاورہ ہے جیسا کہ فارسی میں تخت نشینی ہے اور تخت نشینی کنایہ ہے تصرف و تدبیر مملکت اور تنفیذ امر و نواہی سے ورنہ حقیقتہً معنی تو بعض جگہ مقصود ہوتی ہے کہ بادشاہ فرش پر بیٹھ کر احکام جاری کرتا ہے اور آج کل تو کرسیوں کی نشست کی رسم عام ہونے سے معدوم ہی ہے مگر یہ محاورہ اب بھی موجود ہے۔ تو جو معنی تخت نشینی کے آج کل ہیں یعنی متصرف فی الامور ہونا وہی استوی علی العرش کا مفہوم ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ بعض آیات میں استوی علی العرش کے ساتھ یدبر الامر بھی وارد ہے۔

اور اگر کوئی وسعتِ جنت پر یہ شبہ کرے کہ اتنی بڑی جنت میں کیونکر رہیں گے جی نہ گھبرائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں خدام اور اسباب تنعم بھی بہت سے ملیں گے جن سے تمام مکان پُر ہوگا جن سے جی لگ جائے گا۔

بہر حال جنت کے ان حالات کو سوچو۔ اس سے طلبِ آخرت و توجہ الی الآخرت پیدا ہوگی کہ حق تعالیٰ ہماری ذرا سی طلب پر اتنی بڑی جنت دیں گے اور طلبِ دنیا پر کچھ بھی وعدہ نہیں۔ شاید یہاں کسی طالب علم کو شبہ ہو کہ ایک آیت میں تو طلبِ دنیا پر بھی ترتیبِ ثمرہ کا وعدہ ہے۔ فرماتے ہیں:

من کان یرید حرث الاخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا ______ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں وعدہ ہے تو منھا کے ساتھ ہے جس میں من تبعیضیہ ہے تو کل کا وعدہ کہاں ہوا جزوِ قلیل کا وعدہ ہوا۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ایک آیت میں آخرت کے متعلق بھی منھا آیا ہے۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منہا ومن یرد ثواب الاخرۃ
نؤتہ منہا وسنجزی الشکرین۔

جواب یہ ہے کہ وہاں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ من ابتدائیہ ہے تبعیضیہ نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے نحو وصرف کی بھی ضرورت ہے۔

آج کل ہر جاہل مجتہد ہے

مگر آج کل بہت لوگ بدون صرف و نحو کے قرآن وحدیث کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نئے مجتہدین تو بہت جلدی حدیث کا ترجمہ پڑھنے لگتے ہیں بس دو چار رسالے اردو کے پڑھے اور مشکوٰۃ بخاری کا ترجمہ شروع کر دیا اور لگے ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ پر اعتراض کرنے۔

ایک جاہل کہتا تھا کہ حدیث میں تو آیا ہے کہ خداجؒ کہ خداجؒ اور ابوحنیفہؒ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا ہرج نہیں۔ واقعی یہ بھی عجیب زمانہ ہے جس میں ہر جاہل بھی مجتہد ہے۔ مگر تعجب نہیں آج کل مسلمان تو مسلمان انگریز بھی اسلام میں اجتہاد کرنے لگے ہیں۔ ایک انگریز رام پور میں مسلمانوں کے ایک مجمع میں کہہ رہا تھا کہ قرآن سے ثابت ہے کہ طاعون لگتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے نہ جاؤ۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ اس نے اپنی طرف سے لگا لیا کہ جانے کی ممانعت کا سبب یہی ہے کہ طاعون لگتا ہے۔ اس لئے منع فرمایا کہ یہاں کا طاعون وہاں نہ پہنچ جائے بس دعویٰ ثابت ہوگیا۔ تو یہ انگریز بھی اسلام میں مجتہد ہونے کا مدعی تھا جبھی تو اپنی طرف سے ایک مقدمہ لگا لیا۔

اور اس سے بڑھ کر یہ بھی ہندو بھی دینِ اسلام میں مجتہد ہونے لگے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ایک ہندو کی نسبت اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ وہ قید خانہ میں قرآن کا مطالعہ کر رہا ہے اور مسلمانوں کے لئے قرآن سے راہِ عمل تجویز کریگا۔ پھر اس نے قید خانہ سے نکل کر یہ فتویٰ بھی دیا کہ ہم کو قرآن میں گائے ذبح کرنے کا حکم نہیں ملا اب لیے مسلمان اس طریقہ کو چھوڑ دیں۔ تو اگر ایک جاہل مسلمان آج کل مجتہد ہو جاتے تو کیا تعجب ہے مگر ان جہالتوں سے اسلام کو انشاء اللہ تعالیٰ کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد — چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد
اوست — چراغے راکہ ایزد بر فروزد — ہر آں کس تف زند ریشش بسوزد

اگر یہ دین انسانوں کے اختیار میں ہوتا تو آج تک کبھی کا مٹ چکا ہوتا جبکہ ایسے ایسے جاہل اور کافر تک مجتہد بننے کے مدعی ہیں مگر اس کو تو خدا نے اپنے قبضہ میں رکھا ہے اور خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے :

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۔

اور اسی واسطے مسلمان تبلیغ اسلام کی طرف سے بے فکر ہیں کہ بس اللہ میاں نے اس کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ اس لئے یہ اللہ تعالےٰ پر اپیل ہیں۔ مگر اتنی بے فکری تو اچھی نہیں اس سے دین کا تو نقصان نہیں مگر خود ہمارا نقصان ہے کہ ہم خادمانِ دین کی فہرست سے نکل جائیں گے پس نہ اتنی بے فکری چاہیے اور نہ اتنی فکر کی ضرورت ہے جتنی خیر خواہانِ قوم مثل ڈوم کے گاتے پھر رہے ہیں۔

تبلیغ کے آداب

میں نے دیوبند کے مدرسہ میں ایک وعظ کہا تھا جس کا نام آداب التبلیغ ہے جو گویا علماء کا مصدقہ اور رجسٹری شدہ ہے اس میں میں نے تبلیغ کے آداب بیان کئے ہیں اس کا مطالعہ اس باب میں بہت نافع ہوگا۔ اس میں میں نے بتلایا ہے کہ تبلیغ کی فکر کا کون سا درجہ مطلوب ہے اور کونسا درجہ غیر مطلوب ہے جس میں ایک مضمون یہ ہے کہ تبلیغ میں ثمرات کا انتظار نہ کرو یعنی یہ تجویز نہ کرو کہ ہماری سعی سے شدھی بند ہی ہو جائے یا دس ہزار ہندو مسلمان ہو جائیں کیونکہ اس تجویز و انتظار کا نتیجہ یہ ہے کہ چند دن کے بعد جب اس ثمرہ کے ترتب میں دیر ہوگی تو ہمت پست ہو جائے گی۔ اس میں راز یہ ہے کہ مبالغہ فی العمل ہمیشہ تقلیل عمل کا سبب ہوتا ہے۔

صوفیہ نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکثیر فی العمل سے منع کیا ہے وہاں حقیقت میں تکثیر عمل سے ممانعت نہیں بلکہ

آگے اس کے بعید اور اس کے قریب ہونے کا سبب بتلاتے ہیں ۔

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاک باز دیدم ۔ چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

یعنی اہل عشق میں امراضِ قلب تکبر، ریا وغیرہ نہیں ہوتا کیونکہ عشق سب کو جلا پھونک کر راکھ کر دیتا ہے اور زاہدانِ خشک میں تکبر و عجب وریا وغیرہ بہت ہوتا ہے ۔ آگے فرماتے ہیں ۔

بطوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند ۔ کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بزمیں چوں سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد ۔ کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

پس طریقِ عشق کی ضرورت ہے کہ خدا کے ساتھ دھن اور دھیان لگا رہے اور یہ بات کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کا طریقہ وہ ہے جو ایک دنیادار جج کہتا ہے ۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا ۔ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس کے لئے صحبتِ عشاق کی ضرورت ہے ۔

اب میں ختم کرتا ہوں چونکہ یہ مضمون ضروری تھا اور مستورات کے مناسب تھا ۔ کیونکہ سہل مضمون ہے جس میں کچھ زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا، اس لئے میں نے اس کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے ۔ گو دیر زیادہ ہوگئی جس سے بعض لوگوں کو دھوپ کی تکلیف ہوئی اور مستورات محبوسات کو گھٹن کی اور کھانا پکانے میں دیر کی تکلیف ہوئی مگر تکلیف ہی سے راحت ہوتی ہے کچھ مضائقہ نہیں اور جس وقت مضمون کی آمد ہوتی ہے اس وقت میں مضمون کو روک نہیں سکتا ۔ اس لئے میں مجبور تھا ۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائے ۔

آمین ۔ والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

تجارتِ آخرت

طاعاتِ بدنیہ ومالیہ کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد سہارن پور میں تقریباً دو ہزار کے مجمع میں ہوا جس پر ۲ گھنٹے ۲۲ منٹ لگے۔ اسے مولوی سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

ترقّی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اِس وقت اس کا حاصل محض طولِ امل و حرص ہے جب کی شریعتِ مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابہؓ کے یہاں طولِ امل اور طولِ حرص کا نشان بھی نہیں تھا۔ اُن کے پیشِ نظر صرف ترقّیِ دین تھا اور اسی کے تحت اُن حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقّی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

خُطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امّا بعد

فقد قال اللّٰہ تعالیٰ: ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنّۃ۔

مسلمانوں کی ایک کوتاہی

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں خداوند تعالیٰ نے مجملاً ان تمام وظائف ضروریہ کو جو بندہ کے ذمہ ضروری ہیں، بہت مختصر لفظوں میں ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم لوگوں میں منجملہ بہت سی کوتاہیوں کے ایک کوتاہی وہ بھی ہے جس کی اصلاح کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم میں بہت سی کوتاہیاں ہیں۔ بہت سی باتوں میں اہل اسلام مرکزِ اسلام سے

جکڑے ہوئے اور اپنی مختر عدمن سمجھوتیوں میں پھنسے ہوتے ہیں اور اہلِ اسلام کی تخصیص قید احترازی نہیں یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ کوتاہیاں صرف اہلِ اسلام ہی میں ہیں دوسری قوموں میں نہیں جیسا کہ بعض اہلِ مذاق جدید کا یہ خیال ہے۔ اسی لئے وہ جس وقت اہلِ اسلام کی مذمت بیان کرتے ہیں تو دوسری قوموں کی مدح کرتے ہیں کہ فلاں قوم میں فلانی صفت نہایت اچھی ہے مگر مسلمانوں میں نہیں۔ اور اس میں بھی بعض تو وہ مدائح ہیں کہ وہ فی نفسہٖ مدح کے قابل ہیں۔ نیز ان کے ذکر کرنے سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہوتی ہے کہ جن لوگوں سے دین کا تعلق بھی نہیں ان میں تو یہ مدائح موجود ہیں اور جن لوگوں میں بوجہ دین کے ہونا چاہیے وہ بالکل معریٰ ہیں۔ اس کا تو مضائقہ نہیں۔ قابلِ افسوس تو یہ امر ہے کہ یا تو غیر قوموں کی وہ صفات بیان کی جاتی ہیں کہ جو واقع میں قابلِ مدح ہی نہیں یا اگر قابلِ مدح ہیں تو ان سے مقصود صرف مسلمانوں پر طعن اور ان کا دل توڑنا اور عیب کھولنا ہوتا ہے۔ یہ امر مسلمانوں کے لئے سخت محلِ تشکا ہے اور اگر واقعات کا مشاہدہ کیا جاوے تو اس کا ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ واقعی اکثر اہلِ اسلام کا یہ شیوہ ہو سکتا ہے۔ ہر عاقل آدمی کو قرائن سے، ان کے لب و لہجہ سے، اس نفرت سے جو کہ ایسے لوگوں کو مسلمانوں سے ہے ان سب کے مجموعہ سے اس کا اخذ کر لینا بعید نہیں کہ ان لوگوں کا مقصود محض اہانت ہوتی ہے مسلمانوں کی۔

پھر لطف یہ کہ جن مدائح کی مسلمانوں سے نفی کی جاتی ہے وہ واقع میں مدائح بھی نہیں یعنی شریعتِ مطہرہ کے نزدیک مطلوب نہیں ہیں اگرچہ دنیا میں کسی درجہ میں مطلوب ہوں لیکن مسلمان من حیث المسلمان کے منہ سے ان مدائح کا نکلنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص ہاتھی کی یہ تعریف کرنے لگے کہ وہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کو وزن کیا جاوے تو پچاس من کا اترے۔ کہ یہ صفت اگرچہ واقعی صفت ہے لیکن اس کو تہذیبِ نفس اور قابلِ مدح ہونے میں کچھ دخل نہیں۔

پس اسی قسم کے وہ مدائح ہیں کہ جن کو آج کل مدائح سمجھا جاتا ہے کہ اگرچہ ان میں کسی درجہ میں منفعت ضرور ہے جیسے ہاتھی کے اس قدر وزنی ہونے میں کیونکہ حکیم مطلق نے ہاتھی کو اتنا بڑا جثہ بلا وجہ نہیں عطا فرمایا لیکن حکیم مطلق نے اس کمال کو قابلِ مداح نہیں

ٹھہرایا۔ چنانچہ انھی مخترعہ مدائح میں ایک مدح ترقّی کرنا بھی ہے کہ اسکو بہت بڑی مدح سمجھا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا خودداری وغیرہ سو غور کر کے دیکھ لیجیے کہ شریعت نے انکو مدح کے قابل سمجھا ہے یا نہیں۔

تاریخ اور حدیث کا فرق

ترقّی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا ماحصل محض طولِ امل و حرص ہے جس کی شریعتِ مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچّے نمونہ تھے۔ انھوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی جنابِ رسولِ مقبول نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی حضورؐ کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون معنی جمع ہے اس کو دیکھ جائیے۔ ابتدا سے انتہا تک آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی رہے تاریخی واقعات سو اُن کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ حدیث سے مطابق ہوں تو قابلِ اخذ ہیں ورنہ ہیچ محض کیونکہ مورخین میں یہ بڑا مرض ہے کہ وہ واقعات میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں پھر اس رائے کو بصورتِ واقعہ بیان کرتے ہیں۔

زمانۂ حال کے بعض خود رو مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہ الرحمۃ نے کس تدین سے کام لیا ہے۔ البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مورخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔

صاحبو! محدثین کا تدین اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اگر ایک حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس کا معارض صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مقصود محض نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا یا اس پر زور دینا کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے صورۃً معارض ہے، موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی تو بصورتِ ایراد معارض کوئی خاص رائے کیونکر مقصود ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو انتہا

اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔

ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مورخ نے اپنے خیال کے مؤید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیال کے مؤیدات کو پس جب حدیث و تاریخ میں تعارض ہے تو حدیث قابلِ وثوق ہوتی اور اس کے مقابل تاریخ قابلِ وثوق نہ ہوتی۔ تو جو واقعات تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی وہ محض ہیچ ہیں۔ ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

ترقی دین صحابہؓ کا مطمح نظر تھا

غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ آپؐ کا طرزِ زندگی کیا تھا اور وہی طرز بعینہٖ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ تو صحابہؓ کے یہاں طولِ حرص اور طولِ امل کا نشان بھی نہیں تھا۔ ان کی ترقی ترقیٔ دین تھی۔ اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں لیکن مطمح نظر صرف ترقیٔ دین تھا۔ چنانچہ ان حضرات کی اسی شان کو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

"کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیدیں تو یہ لوگ اس وقت بھی نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بُری باتوں سے روکیں"

یہ ہے ان کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے اور انطباق کیجئے۔

واللہ! ایسا دشوار انطباق ہے جیسے خطِ مستقیم پر خطِ منحنی کو منطبق کرنے لگیں کہ جب تک اس میں استقامت اور انحنا باقی رہے گا کبھی انطباق ممکن ہی نہیں تو ہمارے خیالات خطِ منحنی کی طرح ہیں اور ان حضرات کے خیالات کی مثال خطِ مستقیم ہے۔

بحمد اللہ! یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی کیونکہ خطِ منحنی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مجھ سے ایک طبیب نے بیان کیا کہ ایک زمانہ میں جب ان کے قصبہ میں مرض طاعون پھیلا تو ۶۲ مریض اُن کے زیرِ علاج رہے جن میں سے ۵۲ تندرست ہو گئے اور دس مریض انتقال کر گئے۔ کہتے تھے کہ ان ۶۲ میں ایک مریض ایسا بھی تھا کہ جب اس کی نبض کو میں نے دیکھا ہے تو شدتِ حرارت کی وجہ سے میری انگلی پر چھالا پڑ گیا لیکن پھر بھی اس کی تدابیر میں مصروف رہے۔ غرض جو طبیب مریض سے نفرت کرے گا وہ مریض کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

آج دیکھ لیجیے کہ ان مدعیانِ طبابتِ اخلاق کا کیا برتاؤ قوم کے ساتھ ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کو ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں۔ اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا۔ کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی خیر خواہی جو کرتا ہے اس میں اپنی خیر خواہی مضمر بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ پس جو شخص اپنا ہمدرد نہ ہوگا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہوگا۔ یہ لوگ اوّل اپنی تو اصلاح کریں پھر دوسروں کی اصلاحِ حقیقی کی فکر کریں۔

آج یہ حالت ہے کہ اظہارِ ہمدردیٔ اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ انجمنیں قائم ہوتی ہیں مگر نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کا خیال ہے۔ مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو بھی ساتھ لے جا سکیں لیکن محبتِ اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وضع کو دیکھیے تو سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف گفتگو کو دیکھیے تو وہ مذہب سے بالکل جدا۔ تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہلِ زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آج کل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیلِ شہرت یا تکمیلِ شہرت کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کیے جائیں۔ کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے کوئی سیکرٹری کوئی کچھ کوئی کچھ۔ اور اس سے عام و خاص میں اُن کو ایک امتیاز ہو جاوے۔

پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی کیونکہ وہ اس انطباق

کی برکت سے ایک دن مبدل بحقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعۃ بھی نہ ہو تو سراسر مضر اور سم قاتل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکماء امت نے عوام الناس سے صرف اسی قدر کو کافی سمجھا ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جائیں کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن مبدل بحقیقت ہو جائے گی۔

چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عبادت میں ریا بھی ہو تو اس کو کئے جاؤ کیونکہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتا۔ چند روز میں عادت ہو جاتی ہے۔ پھر عادت سے عبادت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ذریعہ قرب بن جاتی ہے۔ اس کو مولانا رومؒ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

از صفت و از نام چہ زاید خیال
واں خیالت ہست دلاّل وصال

یعنی اسم سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ خیال ہی رہبر ہو جاتا ہے وصال کی طرف۔ مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ صورت شریعت پر منطبق ہو۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اصلاح کی کوئی سبیل نہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر رسم ہوتی اور منطبق ہوتی تو اس کے مبدل بحقیقت ہو جانے کی امید تھی۔ مگر انطباق ہوتا کیونکہ اس لئے کہ انطباق کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ شریعت کی وقعت دل میں ہو اور یہاں وہ ہی ندارد ہے۔

علماء پر اعتراض کی حقیقت

آج کل عقلاء شریعت مطہرہ کو مولویوں کے خیالات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور ان پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ہم کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو ان لوگوں نے اعتراض سے بچالیا اگرچہ واقع میں اثر اس قول کا آپ ہی پر ہوگا۔ لیکن تاہم مورد عتاب تو صرف مولویوں کو بنایا۔ ہم اس کے بھی شکرگزار ہیں مگر ان معترضین کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ درحقیقت ان کے

اعتراضات کا اثر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی پر پڑتا ہے کیونکہ ضرب الغلام اھانۃ المولیٰ اگر کوئی شخص کسی کے غلام کو مارے اگرچہ اس نے بظاہر آقا کو کچھ نہیں کہا، مگر واقع میں یہ آقا کی بھی اہانت ہوگی۔ کیونکہ آقا اور غلام میں اس قدر تغائر نہیں ہے جس قدر یہ شخص سمجھ رہا ہے۔ بلکہ اس میں ایسا تغائر ہے جیسا کہ احول کے مرئیات میں ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کو کہا کہ فلاں طاق میں ایک بوتل رکھی ہے وہ اٹھا کر لے آؤ۔ شاگرد چونکہ احول تھا وہاں جو پہنچا تو ایک بوتل کی دو نظر آئیں۔ استاد سے کہنے لگا کہ یہاں دو بوتلیں رکھی ہیں ان میں سے کونسی لاؤں؟ استاد نے کہا کہ دو نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔ کہنے لگا کہ میں خود مشاہدہ کر رہا ہوں۔ آپ میرے اس مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہیں اس پر استاد نے غضبناک ہو کر کہا کہ ایک بوتل توڑ دو اور دوسری میرے پاس لے آؤ۔ شاگرد نے ایک بوتل کو توڑا تو وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔ کہنے لگا اب تو یہاں ایک بھی نہیں رہی۔

مولانا نے اس قصہ کو کلام مجید کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: لا نفرق بین احد من رسلہ۔ تو ایک کی تکذیب کرنے سے سب رسولوں کی تکذیب ہوتی ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی تکذیب بھی ہو جاتی ہے۔ پس نائب کی تکذیب منیب کی تکذیب ہو جاتی ہے پس علماء کی تکذیب سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تکذیب ہوگی اور اس سے خدا تعالیٰ کی تکذیب ہوگی مگر لوگ اس پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک اس پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آجکل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلا معنی ہیں اور صورتاً بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے ان کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ یہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے ہیں تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں۔

ایثار کی حقیقت

اور اگر کہیے کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے اس لیے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں یعنی اگر کوئی ہمارا دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جاوے تو اس کو ایثار کہیں گے اور اگر ہمارا دین تباہ ہو کر دوسرے کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے گا۔ ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا تو باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور انکو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہیے۔ کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے کہ انھوں نے اپنی جان بھی دے دی اور تمام منافع جو اطاعت سے ان کو پہنچے وہ دوسری رعایا کے لئے چھوڑ دیے۔

صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا۔ دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی۔ اس کی ایک حکایت ہے کہ مصر کی زراعت کا مدار رودِ نیل کے جوش پر تھا۔ ایک سال اس کو جوش نہیں ہوا۔ لوگ فرعون کے پاس آئے اور کہا کہ تو مدعیٔ الوہیت ہے۔ ہم لوگ قحط میں مرے جاتے ہیں۔ یہ تیری الوہیت کب کام آوے گی۔ اس نے کہا کہ کل رودِ نیل کو جوش ہوگا۔ رات کو دعا کی کہ اے اللہ! اگرچہ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ میری کوئی معروض قبول ہو لیکن میری ہمت تو دیکھئے کہ میں نے آپ کو چھوڑا، جنت کو چھوڑا، ابدالآباد کے عذاب کو گوارا کیا۔ ان سب کے بدلے صرف ایک التجا کرتا ہوں کہ میری ایک دعا کو قبول فرما لیجیے کہ جب میں رودِ نیل کو حکم دوں تو اس کو جوش ہو جاوے۔ چنانچہ اس کی یہ دعا قبول ہو گئی اور ایسا ہی ہوا۔

اور اس دعا کی قبولیت سے کوئی اپنے دل میں شبہ نہ کرے کہ اس کافر ملعون کی دعا کیونکر قبول ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ سب کی سنتے ہیں حتیٰ کہ شیطان جو کہ سب سے زیادہ ملعون ہے اس کی درخواست بھی قبول ہو گئی اور پھر درخواست بھی خاص عتاب کے وقت کہ علی العموم اس وقت کی درخواست پوری نہیں ہوتی اور درخواست بھی ایسی عجیب جو کسی نے آج تک نہ کی تھی اور نہ وہ ظاہر منظوری کے قابل تھی کہ:

انظرنی الی یوم یبعثون

گویا خداوند تعالےٰ کی طرف سے تو یہ عتاب تھا کہ ان علیک لعنتی الی یوم الدین اور شیطان کی طرف سے یہ درخواست رب انظرنی الی یوم یبعثون۔ تو جب اس کی ایسی عجیب درخواست ایسے عجیب وقت میں قبول ہوگئی تو فرعون کی درخواست قبول ہونے میں کیا استبعاد ہو سکتا ہے۔ شیطان کے اس واقعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول تو اس کی بے حیائی کہ جوتیاں سر پر پڑ رہی ہیں اور اس کو درخواست کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ دوسرا اس کا وثوق کہ باوجود اس حالت کے بھی اس کو پورا الیقین تھا کہ ضرور درخواست قبول ہوگی۔ تیسرے خدا تعالیٰ کا فضل وکرم کہ درخواست کے ساتھ ہی انک من المنظرین ارشاد ہوا۔ اور جب دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ ہے [illegible] کو کب محروم کیا جا سکتا ہے۔

دوستاں را کجا کنی محروم ۔۔۔ تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ قصہ مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کا ہے کہ جب اس بارگاہ میں دشمن کی دعا قبول ہوئی تو ہماری دعا کیوں قبول نہ ہوگی مگر یہ ضرور ہے کہ شیطان کے برابر اڑیل ہو جاویں۔ غرض جیسے فرعون کی ہمت تھی ویسی ہی آج کل کے ایثار والوں کی بھی ہمت ہے۔ اور اگر فرعون کی وہ ہمت ہمت کہنے کے قابل نہیں تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں ہے تو جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ صفات جن کو مدائح قرار دیا جاتا ہے ان کا مسلمانوں سے نفی کرنا اور دوسری قوموں میں مدائح کے شمار میں ثابت کرنا کہاں تک قابل قدر ہو سکتا ہے۔ ہم لوگوں کی زبانوں پر وہ الفاظ ہیں جو کہ جدید ملا زح ہیں کہ رات دن ان کو دہرایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کی برابر کوئی دلسوز ہی نہیں لیکن جیسے حدیث میں آیا ہے لا یجاوز حناجرہم قلب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اور جب متکلم کے قلب پر اثر نہیں تو سامعین کے قلب پر کیا خاص اثر ہو سکتا ہے۔ غرض مسلمانوں کی کوتاہیوں کا بیان جو اس انداز تحقیر پر ہو وہ بے شک مذموم ہے اس سے تو احتراز واجب ہے۔ لیکن اگر برائے شفقت ہو تو ضروری ہے اور اسی شفقت کی راہ سے خاص مسلمانوں کی شکایات ان کوتاہیوں کے متعلق بھی مضائقہ نہیں پس مراتخصیص کے ساتھ یہ کہنا کہ مسلمانوں میں

کوتاہیاں ہیں۔ تخصیص کی نظر سے ہے کہ ہمارا خطاب اس وقت خاص مسلمانوں سے ہے اور اس موقع پر انہیں کی اصلاح مہتم بالشان ہے۔ اس مضمون کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنے کا قصد نہ تھا۔ اتفاقاً اس میں تفصیل ہوگئی جو ان شاء اللہ تعالیٰ مفید ہوگی۔

دین کے تجزیہ کی صورتیں

اب اصل کوتاہی کو جو بیان مقصود بالذکر ہے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ منجملہ ان موجودہ کوتاہیوں کے ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزا کو متفرق کر دیا۔ یعنی دین میں انتخاب کر لیا ہے جیسے کوئی چیز تقسیم ہوا کرتی ہے مثلاً انعام کی گھڑی رومال وغیرہ میں سے ایک نے گھڑی لے لی، دوسرے نے رومال تیسرے نے کچھ اور چوتھے نے کچھ اور۔ اسی طرح یہ عمل ہمارے بھائیوں نے اس وقت مذہب میں کیا ہے کہ ایک نے دین کے ایک جزو کو لے لیا اور دوسرے نے دوسرے جزو کو۔ اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے جعلوا القرآن عضین اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

اس تفریق کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ایک منجملہ ان کے یہ ہے کہ کچھ حصہ پر ایمان لایا جاوے اور کچھ پر انکار کیا جاوے۔ مسلمان اس سے تو بری ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ اس کی بہت صورتیں ہیں۔ ایک کو اس وقت بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نے تو صرف اعمال بدنیہ کو دین سمجھا اور اعمال مالیہ کو دین سے خارج سمجھا اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ دیندار کہلاتے ہیں کہ انہوں نے دین کا مدار زیادہ تر اعمال بدنیہ کو سمجھا اور بعض نے تو فقط مالیہ کو اختیار کر کے دوسرے اجزا کو خیرباد کہہ دیا۔ چنانچہ اس وقت دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ بعض رؤسا کہ ان کو مشقت اٹھانا دشوار ہے۔ انھوں نے تو یہ تجویز کر لیا کہ چار روپے کسی رفاہ عام کے کام میں دے دو بس کافی ہے اور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ نفع متعدی نفع لازمی سے زیادہ نافع ہے۔

صاحبو! یہ بالکل وہی بات ہے کہ کلمۃ حق ارید بہ الباطل۔ کیا اعمال مالیہ پر کاربند رہ کر اعمال بدنیہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ ان کا وجوب ساقط ہو جائیگا۔ ذرا قرآن کو دیکھئے جہاں آتوا الزکوٰۃ ہے وہیں اقیموا الصلوٰۃ بھی موجود ہے۔ قرآن میں تامل کرنے

کے بعد کسی کو ذرا بھی گنجائش اس کی نہیں مل سکتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ اگر قرآن میں کسی کو یہ گنجائش نہیں ملتی تو یہ ۷۲ فرقے کیونکر پیدا ہو گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب گنجائش قبلِ غور ہے جب تک غور نہ کیا جائے اس وقت تک قرآن کو ان حضرات مردوں نے مجمل سمجھ رکھا ہے کہ معاذ اللہ اس سے اپنے توہمات کو ثابت کر رہے ہیں اور تعدیہ اپنے توہمات کو مجسمہ اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتے ہیں، اور مطلب اپنے دعوے کا لیکن غور کرنے کے بعد سوائے مذہب حق کے کسی ایک کے مذہب کی کچھ گنجائش کلام مجید میں ہرگز نہیں رہتی۔

آیہ یتدبرون القرآن کے معنی

ارشاد ہے ——— افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا

معلوم ہوا کہ یہ بات تدبر کے بعد نظر آتی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں، تو جو کچھ اختلاف ہے وہ بوجہ غور نہ کرنے کے ہے اور تدبر بھی اس شخص کا معتبر ہوگا جس کے پاس سامان تدبر بھی ہو، ہر کس و ناکس کا تدبر معتبر نہیں۔ آج کل کے عقلاء کا تدبر ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ایک شخص نے گلستان کے اس شعر میں تدبر کیا تھا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست ۔۔۔ در پریشاں حالی و درماندگی

کہ ایک مرتبہ ان کے ایک دوست پٹنے لگے اور خود بھی کچھ ہاتھ چلاتے تھے۔ انھوں نے وہاں جا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ پٹائی ہوئی۔ کسی نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ میں نے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس قول پر عمل کیا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست ۔۔۔ در پریشاں حالی و درماندگی

تو جیسا اس نے گلستان کو سمجھا ویسا ہی ہمارے بھائی بھی قرآن میں تدبر کرنے والے موجود ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو سلامت رکھے مگر باطنی سلامتی کے ساتھ کے ساتھ۔

ایک صاحب پنجاب میں مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ تحقیقاتِ جدیدہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تخم میں ایک نر اور ایک مادہ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں خیر یہی ہو لیکن یہ کیا ضرور

ہے کہ قرآن میں بھی یہ مسئلہ موجود ہو مگر وہ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ قرآن میں بھی کہیں اس کا ذکر ہے یا نہیں۔ کئی مہینے تک سوچتا رہا لیکن کہیں نہ ملا۔ سبحان اللہ! صاحبو! قرآن میں اس مسئلہ کو ڈھونڈنا ایسا ہے جیسے کوئی طب اکبر میں جوتے بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے لگے کیوں صاحبو! اگر کوئی ایسا کرنے لگے تو عقلاء وقت اس کی نسبت کیا فتویٰ دیں گے۔ وہی فتویٰ اس کی نسبت بھی دینا چاہیے۔ غرض کہنے لگے کہ مدت کے بعد ایک روز اتفاق سے میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی جب اس نے یہ آیت پڑھی:

سبحان الذی خلق الازواج کلها مما تنبت الارض

تو میں بہت خوش ہوا کہ قرآن میں یہ مسئلہ صریح موجود ہے۔

تو وہ بزرگ ازواج کے معنی خاص میاں بیوی اور نر مادہ سمجھے۔ حالانکہ ازواج کے لغوی معنی جوڑ کے ہیں خواہ کسی چیز کا جوڑ ہو حتیٰ کہ زوجی الخف والنعل بھی کہتے ہیں۔ زوج کے معنی وہی ہیں جس کو فارسی میں جفت اور اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔ میاں بیوی کو بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی باہم جوڑا ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہر جگہ میاں بیوی ہی کے معنی ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری جفت پاپوش اٹھا لاؤ یا یہ کہے کہ میرے جوتے کا جوڑا اٹھا لاؤ تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میرے جوتے کی میاں بیوی اٹھا لاؤ۔ بس معنی آیت کے تو یہ ہیں کہ ہم نے نباتات کے جوڑے پیدا کئے کہ اگر ایک انار کھٹا ہے تو دوسرا میٹھا علیٰ ہذا۔ لیکن ان مجتہد صاحب نے ازواج کا ترجمہ زن و شوہر کیا اور قرآن میں اپنے نزدیک اس مسئلہ کو بھی داخل کر دیا۔ تو اگر ایسے لوگ قرآن میں تدبر کریں گے تو قرآن کی جو گت ہوگی ظاہر ہے اور اس قسم کے تدبر کرنے والے اس سے پہلے بھی لوگوں میں ہوتے آئے ہیں۔

میرے ایک استاد بیان کرتے تھے کہ ان کے پاس ایک لڑکی پڑھا کرتا تھا۔ اس نے اول یہ پڑھا: آمنت باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر والقدر خیرہ وشرہ والبعث بعد الموت۔

پھر ایک سرد آہ کھینچی اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آبادلوں کی بھی موت ہے۔ یہ گت بعد الموت کی بنائی کہ عین کی جگہ الف پڑھ کر اس کی یوں تحلیل کی کہ ابعد الموت۔

بہت لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھنی شروع کر دیں لیکن وہ تفاسیر اسی قسم کی ہیں۔ وجہ یہ کہ ان کے پاس سامانِ تدبّر یعنی علم و تقویٰ نہیں ہے معلوم ہوا کہ یہ تدبّر بھی ضروری ہے جس کو اس آیت میں فرمایا افلا یتدبرون القرآن۔ اور پھر تدبّر کے لئے سامانِ تدبّر بھی ضروری ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ پس اس آیت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن میں غور کرنے کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اور جہاں بالکل صریح دلالت ہو وہاں تو تدبّر کی بھی ضرورت نہیں۔

عباداتِ بدنیہ و مالیہ میں تفریق

چنانچہ عباداتِ بدنیہ و مالیہ کی تفریق کی غلطی پر اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ صاف دال ہے کہ جہاں اٰتوا الزکوٰۃ کا حکم ہے وہاں اقیموا الصلوٰۃ بھی ہے۔ یہ تو دنیادار امراء کا بیان تھا۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن پر دینداری کا بہت ہی غلبہ ہے۔ انھوں نے اپنے مذاق کے موافق ایک اور مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دینداری جو کچھ ہے وہ جان سے کام لینے میں ہے۔ ان لوگوں نے طاعاتِ مالیہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میری سوانحعمری لکھنے لگے تو اس کا آسانی سے پتا بھی نہ لگے گا کہ فلاں جگہ دس روپے دیئے۔ اسی طرح ہم میں اکثر کی یہ حالت ہے۔ غرض اس تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزا کو تقسیم کر رکھا ہے کہ ایک جزو کو ایک نے اختیار کر لیا اور دوسرے کو دوسروں نے۔ یہ ایک کھلی کوتاہی ہے۔ پھر اس کے تحت میں اور بہت سی جزئیات داخل ہیں۔

یعنی پھر خود عباداتِ بدنیہ میں بھی ایک تفریق کی ہے۔ مثلاً کسی نے وظیفہ کو لے لیا کسی نے صرف قرآن کو لے لیا۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے مرشد کی تعلیم پر اس شدت سے پابند ہوں کہ نماز چاہے قضا ہو جائے لیکن مرشد کی تعلیم کبھی قضا نہیں ہوئی۔ اسی طرح اعمال میں بھی تفریق کی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ جب مرنے لگتے ہیں

تو چونکہ کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لئے وہ مسجد بنانا تجویز کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ نمازیوں کی تعداد سے مسجدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ قصبہ آنور کی نسبت سنا ہے کہ وہاں بہت مسجدیں ہیں اور غضب یہ ہے کہ باوجود اس کثرت کے اب بھی اگر کسی کو اس طرف توجہ ہوگی تو اپنی مسجد الگ ہی بنانے کی سوجھے گی اور مزا یہ کہ نئی مسجد شروع کر کے پرانی کا سامان لینے پر نگاہ دوڑتی ہے۔ کیونکہ چندہ تو اس قدر ہو نہیں سکتا۔ کام آدھا رہ جاتا ہے اور اس وقت مولویوں سے اجازت لینے کی فکر کرتے ہیں کہ حضرت پرانی مسجد بالکل ویران ہے۔ آباد ہونے کی امید نہیں۔ کیا اس کا ملبہ نئی مسجد میں خرچ کر لیں۔

میں نے اپنے قصبہ میں دیکھا ہے کہ لوگوں نے ایک پرانی مسجد کو چھوڑ کر دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر ایک نئی مسجد بنائی۔ اب چند روز سے لوگ اس پرانی کی درستی پر بھی متوجہ ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ یا ایک پھر ویران ہوگی یا دونوں کی جماعتیں ٹوٹیں گی۔

کانپور میں ایک شخص نے مسجد بنائی۔ دوسری برادری کے بھائی نے اس کے مقابلہ پر ایک دوسری مسجد تیار کی۔ جب دونوں بن کر تیار ہوئیں تو نمازیوں کی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز کیا گیا کہ نماز کے بعد شیرینی تقسیم کی جایا کرے تاکہ نمازی بڑھیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ مسجد بنانا زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد کے کام میں روپیہ صرف کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔

اکثر ایسا ہوا کہ ایک شخص تیل لایا اور اس سے پوچھا گیا کہ اس کو طالب علموں میں صرف کر دیا جائے یا مسجد میں تو وہ مسجد ہی تجویز کرتا ہے۔ بلکہ اکثر عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ مسجد میں تیل جلنے سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اگر کوئی مرجائے اور اس کا ثواب پہنچانا ہو تو کھانا مسجد ہی میں بھیجتے ہیں۔ دوسری جگہ دینے کو ایسا ثواب نہیں سمجھتے۔

اور اس میں ایک اور قید تراشی ہے کہ وہ کھانا بھی رات کے وقت بھیجا جاوے۔ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ دن کو تو آفتاب نکلا ہے۔ اس کی کم و بیش روشنی تو ضرور ہی قبر میں پہنچتی ہوگی برخلاف رات کے کہ اس میں بالکل تاریکی ہوتی ہے اس لئے اس وقت اس طعام اور چراغ کے ذریعہ سے روشنی پہنچے گی۔ اور دن کو بھیجا رات کے وقت ناغہ ہونے کی توقع پر شاید اس لئے پسند نہیں کرتے ہوں گے کہ خدا جانے وہاں کا انتظام کافی ہوگا یا نہیں۔ تو ایسے

وقت پہنچاؤ کہ فوراً ہی پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہ کارکنانِ قضا و قدر کہیں رکھ کر بھول جائیں اور وہ مُردہ ساری رات تاریکی میں رہے۔

اسی کے قریب قریب گڑ دینے کی رسم ہے یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ سکرات موت کی تلخی اس سے دُور ہوگی۔ حالانکہ اگر گڑ تو وہاں پہنچتا نہیں اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ میٹھی چیز کا ثواب بھی میٹھا ہوتا ہے۔

غرض اس قسم کی بہت سی خرافات لوگوں میں ہیں اور ان سب کے لیے مسجد ہی کو تجویز کیا ہے کیونکہ ان کے اعتقاد میں مسجد میں بھیجنے سے زیادہ ثواب ہوتا ہے اور مسجد میں بھی زیادہ تر ثوابِ خاص منبر پر رکھنے سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بھی اس وقت کہ جب اس پر نیاز بھی دی جائے۔ ورنہ ان کے خیال میں اتنا مال ضائع ہی گیا۔

کانپور میں ایک مرتبہ چند عورتیں کچھ مٹھائی لے کر عشاء کے بعد جامع مسجد میں آئیں۔ وہاں جو مدرسہ کے طلباء رہتے تھے ہیں اس وقت مکان پر جا چکا تھا۔ صرف طلباء مسجد میں موجود تھے۔ طالب علموں کا نفقہ آزاد ہوتا ہی ہے۔ وہ ان سے مٹھائی لے کر نیاز دیئے بغیر ہی سب کھا گئے۔ اس پر ان عورتوں نے بے حد شور و غل کیا۔ ان کی آواز سن کر ان کے گھر کے مرد بھی جمع ہو گئے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر ایک طالب علم میرے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ مسجد میں اس قسم کا ہنگامہ برپا ہے اور یہ اس کی وجہ ہے۔

میں نے مسجد میں آ کر دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ آخر میں نے اس وقت با قتضائے مصلحت طالب علموں کو بُرا بھلا کہا۔ ایک آدھ کو مارا بھی اور مٹھائی کی قیمت پوچھ کر طالب علموں سے سب قیمت دلوائی اور عورتوں کو سمجھا دیا کہ یہاں نہ لایا کرو۔ قیمت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ صرف اڑھائی آنے کی مٹھائی تھی۔ حالانکہ یہ مقدار کوئی ایسی مقدار نہ تھی جس سے اس قدر ہنگامہ کی نوبت آتی۔ نیز وہ اُنھی طالب علموں کے لئے لائی گئی تھی لیکن محض اس وجہ سے کہ نیاز نہ ہوئی ان عورتوں کے خیال میں ثواب نہ پہنچا تھا اور یہاں تک نوبت پہنچی۔ حالانکہ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر دس دفعہ بھی نیاز دیدی جائے لیکن کسی کو کھلایا یا دیا نہ جائے تو کچھ بھی ثواب نہیں پہنچا۔ اور ایک دفعہ بھی نیاز نہ دی جائے اور کسی مستحق کو دے دیا جائے تو ثواب پہنچ جاتا ہے۔

ایک ظریف درویش نے بیان کیا کہ ایک مقام پر نیاز تھی۔ ہم کو بھی بلایا گیا۔ کھانا چنا گیا تو فاتحہ شروع ہوئی۔ فاتحہ خواں نے حضرت آدم علیہ السلام سے نام گنوانے شروع کیے بہت دیر ہوگئی تو میں نے کہا کہ صاحب! ساری دنیا کے نام تو شمار کیے جاتے ہیں مگر ہمارا نام بھی تو لے لو۔ کیونکہ جب تک ہم نہ کھاویں گے ان میں سے ایک کو بھی ثواب نہ پہنچے گا۔ اس پر وہ لوگ خفا تو بہت ہوئے کہ یہ وہابی ہے لیکن فاتحہ کا سلسلہ جلدی ختم ہوگیا۔ غرض عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بدون نیاز کے ثواب نہیں ہوتا۔ نیز اس میں قوانین بھی ایجاد کیے گئے ہیں چنانچہ مجھ سے ایک شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ گیارھویں اٹھارہ تاریخ تک جائز ہے اس کے بعد جائز نہیں۔ گویا یہ نماز کا وقت ہے کہ فلاں گھنٹے تک رہے گا اس کے بعد نہ رہے گا۔ صاحبو! یہ عقائد رکھنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے تو بھولے لوگ تم کو دیکھ کر یہ عقائد پیدا کرلیں گے۔

شریعت سے دوری

صاحبو! عوام الناس اس قدر حد سے نکل گئے ہیں کہ شریعت سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ غضب ہے کہ بعض مقامات پر خدائی رات منائی جاتی ہے اور صبح کو اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے گیت گاتے ہوئے مسجد میں آتے ہیں اور جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ غرض مسجدوں کی بابت یوں سمجھتے ہیں کہ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعض نے اموال کا مصرف مسجد ہی کو قرار دیا ہے بعض لوگوں نے انجمنوں یا مدارس کو لیا خواہ وہ مدارس دینی ہوں یا دنیوی لیکن ان میں جنھوں نے مدارس دنیوی کو لیا وہ تو کبھی اٹھ کر بھی مسجد کی طرف نہیں کرتے۔ پس انھوں نے مدرسہ سنبھال کر مسجد کو چھوڑ دیا۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ قوم سے جس طرح ہو چندہ جمع کیا جائے خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا شریعت کے مخالف ہو یعنی یہ لوگ دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں جو کہ شریعت سے بالکل ہی حرام ہے اور غضب یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی غریب آدمی چار آنے دے دے تو ان کی نہایت قدر اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کو سلام کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ

تو یہی حالت ہماری مساجد کے ساتھ ہے کہ خدمت کا بار تو دوسروں پر اور چیزیں بیچنے والے یہ حتیٰ کہ بعض لوگ تو تختے بھی لیجاتے ہیں اور یہ تو دیندار ہی کی مرض ہے کہ مسجد کا گرم پانی گھر منگا لیتے ہیں۔

غرض میں نے اُن سے کہا کہ مسجد کی یہ حالت تو تمہاری ہی بدولت ہے۔ کہنے لگے کہ مولوی تو مسجد میں فرشی پنکھا لگانے سے منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اجازت دیتا ہوں تم لگا لو۔ کہنے لگے کہ لوگ شور و غل کریں گے اور مجھ پر اعتراض کریں گے میں نے کہا انشاء اللہ تعالیٰ چار دن ہی جب نماز کی برکت سے قلب پر عبدیت کا اثر ہو گا تم خود ہی اس مخدومیت کو چھوڑ دو گے کسی مولوی کو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

حاصل یہ کہ اسی قسم کے لوگ دین صرف اسی کو ہی کہتے ہیں کہ کچھ روپیہ خیرات کر دیا جائے اور بعضے ان سب سے نرالے وہ لوگ ہیں کہ وہ نہ اعمال بدنیہ کریں نہ مالیہ۔ اگر ان کے پاس کچھ سرمایہ ہوا تو اس کو بنک میں جمع کر دیا۔ ان لوگوں کو منع کیا جاتا ہے تو منع کرنے والوں کو یہ لوگ نادان خیال کرتے ہیں۔

ایک شخص نے اسی قسم کے ایک صاحب سے کہا کہ ہم نے سنا ہے تم سود لیتے ہو تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ تم میری ذاتیات پر حملہ کرتے ہو۔ سبحان اللہ! امر بالمعروف ذات پر حملہ کرنا ہو گیا۔ آخر جب انھوں نے سمجھایا تو کہنے لگے کہ بھائی! یہ وقت جائز ناجائز کی تحقیق کا نہیں ہے۔ اس وقت تو جس طرح ہو سکے روپیہ کمانا چاہیے۔

یہ مذکورہ بالا تو ان لوگوں کی حالت تھی جو دنیا کے مدارس قائم کرتے ہیں اور جو دین کے مدارس کے حامی ہیں انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب ہم نے وعظ یا خطاب خاص سے دوسروں کو ترغیب دی تو ہم کو خود روپیہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ الدال علی الخیر کفاعلہ کا ہی ثواب بہت ہے۔ الحاصل ہر ایک فرقہ نے اپنے خیال کے موافق دین کا ایک خلاصہ نکال رکھا ہے۔ تو صاحبو! یہ کتنی بڑی کوتاہی ہے۔

کوتاہی متعلق انفاق

مگر میں اس وقت ان مذکورہ اقسام میں سے بضرورت مقام اسی کوتاہی کو بالخصوص بیان

کرتا ہوں جو کہ غالب ہے۔ وہ یہ کہ مال کے خرچ کرنے کو مشکل سمجھتے ہیں۔ ہاں معلوم ہوا
کہ اب چار پیسے خرچ کرنے پڑیں گے انھوں نے فوراً اپنی جان بچا کر اس موقع سے بھاگنے کی
کوشش کی لیکن ہے کہ اس خاص کوتاہی کے بیان کرنے سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ محض چندہ مانگنے کے
واسطے یہ وعظ کہا جاتا ہے۔ اگر تم تحریک چندہ کو پسند نہیں کرتے تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں
کہ بیشک اس وقت ترغیب چندہ ہی کے لئے وعظ کہنا زیادہ مقصود ہے اور میں طلب ترغیب
کو ناپسند نہیں کرتا۔ ترغیب کو خدا تعالیٰ کے کلام مجید میں جگہ جگہ موجود ہے البتہ اس کو ایک
خاص حد تک کلام مجید میں رکھا گیا ہے یعنی اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک بذل نفس اور ایک بذل
مال۔ تو جو نسبت اس کو کلام مجید میں ہے اگر وہی نسبت کسی شخص کے وعظ میں بھی ہو تو
اس کا کیا مضائقہ ہے۔ اور اس نسبت کے محفوظ رہنے کا یہ طریقہ ہے کہ یا تو ایک ہی وعظ
میں دونوں مضمونوں کو بیان کر دیا جائے اور یا کسی ایک وعظ میں بذل نفس کے متعلق بیان کر
دیا جائے۔ چنانچہ اس وعظ سے زیادہ مقصود ترغیب ہے انفاق فی سبیل اللہ کی۔ اور اگرچہ
اکثر واعظین کی یہ عادت ہے کہ جب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں تو شروع سے ترغیب کا مضمون
بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو موجب وحشت عامہ سمجھ کر یوں کرتے ہیں کہ بیان شروع دوسرے
مضمون سے کرتے ہیں اور اس کو کسی جگہ جوڑ لگا کر اسی وعظ میں شامل کر دیتے ہیں۔ اور میں اس
طرز کا مخالف تو نہیں ہوں کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے مگر اس میں اتنا ضرور ہے کہ ایسے
شخص کے ہر وعظ میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید اب چندہ کا ذکر چھڑ جاوے اس لئے
میں نے شروع ہی سے اس مضمون کو لیا اور یہ کہے دیتا ہوں کہ اس وقت محض چندہ کا بیان
ہوگا جس کا جی چاہے سنے اور جس کا جی چاہے چلا جاوے جو سنے گا اپنے نفع کے لئے سنے
گا۔ ہمارا اس میں کوئی نفع نہیں۔ اور نفع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وقت سننے والوں کو کوئی
گٹھڑی انعام میں مل جاوے گی مگر قرآن میں صاف ارشاد ہے:

وما تنفقوا من خير فلانفسكم وما تنفقون الا ابتغاء
وجه الله وما تنفقوا من خير يوف اليكم وانتم لا تظلمون.

ان آیتوں میں غور کیجیے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے بس یہ شبہ کہ ہم نے تمھاری ہی زبان سے

متعدد مرتبہ چندہ مانگنے کی ممانعت سنی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مطلقاً ممانعت ہی سمجھ جانا یا تمام مضمون سننے سے ناشی ہوا ہے۔ آیتِ بالا میں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مضمون بھی دین کا ایک جزو ہے۔ البتہ چندہ مانگنے کی متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے جو صورت شریعت پر منطبق نہ ہوگی وہ بیشک مذموم ہوگی باقی مذموم نہ ہوگی۔ اور یہ قاعدہ کچھ چندہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نماز روزہ میں بھی یہی قاعدہ ہے مثلاً جو نماز شریعت پر منطبق ہوگی وہ محمود ہوگی ورنہ مذموم مثلاً اگر کوئی شخص بے وضو نماز پڑھنے لگے یا قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنے لگے تو وہ نماز مذموم اور ناجائز ہوگی۔ اسی طرح یہ قاعدہ طاعاتِ مالیہ میں بھی ہے کہ چندہ دینے کے جواز کے لئے کچھ شرائط ہیں اگر وہ پائی جائیں گی تو جائز ہوگا ورنہ ناجائز۔ پھر وہ کچھ چندہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہدیہ وغیرہ میں بھی وہی شرائط ہیں۔

اس وقت اکثر کمی یہ ہے کہ ان شرائط کا لحاظ نہیں کرتے اور کمی زیادہ تر لینے والوں میں ہے، دینے والے تو چونکہ حتی الامکان دیتے ہی کم ہیں اس لئے وہ اکثر ان خرابیوں سے بچے ہوئے ہیں۔ البتہ لینے والے بہت زیادہ مبتلا ہیں اور یہ کوتاہی دو جگہ ظاہر ہوتی ہے۔

قبولیتِ ہدیہ کی شرائط

کیونکہ معاملہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ جو کہ بالعوض ہو، دوسرے وہ جو کہ بلا عوض ہو۔ پہلی قسم میں بھی اگرچہ خرابیاں آجکل بہت ہیں مگر پھر بھی ایک حد تک اس میں جواز کی صورتیں بھی بکثرت معمول بہا ہیں لیکن بلاعوض میں تو بہت ہی بے احتیاطی کی جاتی ہے اور بلاعوض کی صورتیں دو ہیں ہدیہ یا چندہ۔ ان دونوں میں سراسر بے احتیاطیاں ہوتی ہیں۔

چنانچہ ہدیہ میں ایک تو یہ بے احتیاطی کر رکھی ہے کہ کبھی کسی کا ہدیہ واپس ہی نہیں کیا جاتا۔ جو شخص بھی ہدیہ پیش کرے اس کو فوراً قبول کر لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص واپس کرتا ہو تو اس کو برا کہتے ہیں اور اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ صاحبو! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ہدیہ لینا بھی ناپسندیدہ ہے۔ ارشاد ہے: ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ وما لا فلا تتبعہ نفسک۔

کہ جو بلا انتظارِ نفس آوے اس کو لے لو اور جو نہ آوے اس کی فکر میں نہ پڑو۔ اسی حدیث میں حضورؐ نے ہدیہ قبول کرنے کے متعلق ایک قید بتلائی ہے اس کو ادب سے تعبیر کیا جاوے یا شرطِ واجب سے ۔ یعنی اس وقت اس سے خالی الذہن ہوں ۔ جو کچھ بھی ہو حضورؐ نے بتلا دیا کہ اشراف نفس سے بچنا چاہیے ۔ میں نے اس سے ایک امر مستنبط کیا ہے ۔ اگر استنباط غلط ہو تو اس کی اصلاح کر دی جائے ۔ سو میں نے اس سے یہ قاعدہ سمجھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس آمد و رفت رکھو تو ہمیشہ ہدیہ لیجانے کے پابند نہ ہو بلکہ کبھی ہدیہ لیکر جائے جاؤ کیونکہ تجربہ بتلا رہا ہے کہ پابندی کی صورت میں جب اس شخص کی صورت نظر پڑیگی تو طبعاً ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ خدا جانے کچھ لایا ہے یا نہیں ۔ یہی اشراف ہے ۔ تو اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ نفس ایسا ہو جائے کہ اس میں اشراف ہی نہ ہو یا یہ کہ پابندی سے منع کر دیا جائے چنانچہ میں نے اپنے لئے یہی تجویز کیا ہے بلکہ نہ لانا اکثر ہو تو زیادہ بہتر ہے ۔

دوسری حدیث میں ہے : **تھادوا تحابوا** ۔ تو ہدیہ دینے کی مصلحت حضورؐ نے ازدیادِ محبت کو قرار دیا ہے اور ازدیادِ محبت اس وقت ہوتا ہے کہ ہدیہ لیکر جی خوش ہو اور جی اس وقت خوش ہوتا ہے کہ جب اشرافِ نفس نہ ہو ، ورنہ مسرت نہیں ہوتی بلکہ انتظار کی جو کلفت تھی وہ رفع ہو گئی ۔ تو اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ہدیہ میں اشراف کی نوبت نہ آنی چاہیے ۔ دوسرے اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ بیعت کے وقت ہدیہ نہ لینا چاہیے کیونکہ اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے ۔

جیسا کہ حضرت مولینا گنگوہی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بھائی آج کل کے پیروں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر کوئی دیہاتی اُن کے سامنے سر کھجانے لگے تو پیر صاحب کو خیال ہوگا کہ شاید یہ پگڑی میں سے روپیہ نکال کر دیگا واقعی بالکل سچ ہے ۔

پیرانِ باطل کی تمثیل

حرص و طمع نے ہماری وہ حالت بنا دی ہے کہ جیسے ایک مرید نے اپنے مرشد سے ایک خواب بیان کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ میری انگلیاں نجاست سے بھر رہی ہیں

اور آپ کی انگلیوں پر شہد لگا ہے۔ پیر صاحب سن کر کہنے لگے کہ اس کی تعبیر تو ظاہر ہے تو دنیا کا کتا ہے اور ہم اللہ والے ہیں۔ مرید نے کہا کہ حضور ابھی خواب پورا نہیں ہوا میں نے اسی میں یہ دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اس پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔

غرض یہ خواب صحیح ہو یا غلط لیکن اس خواب سے مرید نے جس حالت کا فوٹو کھینچا ہے وہ بالکل مطابق واقع ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنے کے لئے تعلق رکھتا ہے اور پیر مرید سے دنیا مردار سمیٹنے کی فکر میں ہے۔

اسی قسم کے ایک پیر کے کوئی مرید تھے۔ اُن سے کسی نے پوچھا کہ میاں تم کو پیر سے کچھ فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ مرید نے کہا کہ میاں جب وہ ہی تقا نہ کچھ نہ ہو تو لوٹے میں کہاں سے آوے۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں ایک بزرگ تھے۔ ان کے پاس ایک شخص پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے حسب معمول ایک دن وہ پڑھنے کے لئے آئے تو دیکھا کہ اُستاد صاحب کے چہرہ پر ضعف کے آثار نمودار ہیں دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج شیخ کے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے یہ دیکھ کر پڑھنے سے عذر کر دیا اور گھر واپس گئے اور وہاں سے کھانا پکوا کر لائے جب کھانا پیش کیا تو شیخ نے کہا کہ کھانا تو عین حاجت کے وقت آیا ہے لیکن اس کے لینے سے ایک عذر شرعی مانع ہے۔ وہ یہ کہ جب تم واپس گئے تو مجھے اسی وقت یاد آیا کہ تم میرے لئے کھانا لینے کو جاتے ہو۔ تو یہ کھانا اشراف نفس کے بعد آیا ہے اور اس کا لینا حدیث کے خلاف ہے۔ وہ مرید بھی کیسے مؤدب تھے کہ اصرار نہیں کیا اور سنتے ہی فوراً اٹھ کر چل دیئے اور تھوڑی دور پہنچ کر پھر لوٹے اور آکر عرض کیا کہ حضرت! اب تو اشراف نفس نہیں رہا ہوگا کیونکہ میرے واپس لیجانے کے بعد آپکو یقین ہو گیا ہوگا کہ اب وہ کھانا گیا لہٰذا اب تو اسکو قبول فرما لیجئے چنانچہ آپ نے قبول فرما لیا۔

سبحان اللہ! جب دل میں محبت ہوتی ہے خدمت کا طریقہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے بقول شخصے ع ——— شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست

برخلاف آج کل کے اگر کوئی شیخ انکار کر دے تو مرید پھر بھی اس کو پریشان کرتا ہے۔

ہدایا کے آداب

اور ایک ادب ہدایا کا یہ ہے کہ دنیاوی حاجت کی آمیزش اس میں نہ ہو بعض لوگوں

کی عادت ہوتی ہے کہ وہ آکر ہدیہ دیتے ہیں اور پھر تعویذ لکھ دینے کی فرمائش کرتے ہیں ایسے
ہدیہ کو فوراً واپس کر دینا چاہئے

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کو ایک اونٹ دیا۔ آپ نے اس کے عوض بہت سے
اونٹ اس کو دیئے مگر وہ شخص راضی نہ ہوا۔ اس پر حضور کو سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ فلاں فلاں
خاندان کے سوا کسی سے ہدیہ نہ لوں گا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ اس شخص نے دنیوی غرض سے ہدیہ دیا تھا۔ اور اسی حدیث سے
یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ اکثر لوگوں سے اوّل ملاقات میں ہدیہ نہ لینا چاہیئے کیونکہ اول ملاقات
میں یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ہدیہ دینے والے کی کیا نیت ہے۔ اسی لئے میں نے اپنا معمول
مقرر کر لیا ہے کہ جو نیا شخص آتا ہے اس سے میں ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص
ثابت ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ رسم پرست لوگوں نے اس ہدیہ لینے لانے کی وجہ یہ نکالی ہے
کہ اگر پیر کے پاس خالی ہاتھ جاویگا تو وہاں سے بھی خالی ہاتھ آویگا۔ چنانچہ اس کی نسبت
مثل بھی مشہور ہے کہ خالی جائے خالی آوے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جاتے ہی پیر جی کی
مٹھی گرم کر دو، اور اس مٹھی گرم کرنے کے محاورہ کی ایک اصل ہے۔ وہ یہ کہ پیرزادوں
نے اپنا راز چھپانے کے لئے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ مصافحہ میں ہدیہ دیا کریں تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔

صاحبو! اوّل تو مصافحہ ایک مستقل عبادت ہے اس میں دنیا کے انضمام کے کیا معنیٰ
دوسرے اس کی کیا خبر ہے کہ کوئی دوسرا شخص مصافحہ نہ کریگا۔ تو اگر کسی دوسرے نے بھی
مصافحہ کر لیا تو اس کو معلوم ہوگا کہ پیر صاحب کو ہدیہ دیا گیا ہے۔ پھر اخفا کہاں رہا۔ اور
اگر دوسروں کو مصافحہ سے روکا جاوے پھر تو خواہی نخواہی دال میں کالے کا شبہ ہوگا
کیونکہ بعض احتیاط بے احتیاطی بن جاتی ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ ایک شخص کا نکاح ہونے والا تھا۔ اس نے کسی دوسرے
سے ایک دوشالہ مستعار لے لیا۔ جب بارات گئی تو لوگ دولہا کو دیکھنے کے لئے آئے۔
ایک شخص نے پوچھا کہ دولہا کون ہے؟ تو صاحب دوشالہ دولہا کی طرف اشارہ کر کے فرماتے
ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں لیکن دوشالہ میرا ہے۔ دولہا نے کہا کہ یار تم بھی عجیب آدمی ہو

اسے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگے کہ اب ایسا نہ کرونگا۔ تھوڑی دیر میں اور کسی نے آکر پوچھا تو آپ فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ میرا نہیں۔ اس پر دولہا اور بھی جھلایا کہ بندۂ خدا تم کو اس کے ذکر ہی کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگا کہ اب انشاء اللہ تعالیٰ ایسا نہ ہوگا۔ کچھ دیر میں ایک اور صاحب نے آکر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ دولہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ کا کچھ ذکر نہیں۔ آخر دولہا نے غصہ میں آکر دوشالہ اسکے اوپر پھینک دیا۔ تو جیسے اس شخص کا یہ کہنا کہ دوشالہ میرا نہیں یا دوشالہ کا ذکر ہی نہیں بظاہر احتیاط تھی مگر باعتبار اثر کے پوری بے احتیاطی تھی۔ اسی طرح دوسرے سے مصافحہ نہ کرنا بھی اظہار ہوگا۔ ہدیہ کا جب اظہار ہوگیا تو پھر اخفا کہاں رہا۔ نیز جب دوسروں کے بھی مصافحہ کا احتمال ہے تو مرید صاحب کو یہ ڈر بھی تو ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص پیر کے ہاتھ سے لے کر بھاگ جائے تو کیا کرلیں گے کیونکہ جب اخفا کر دیا گیا ہے تو ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ تھا اور اگر کہتے کہ ہم دوسرے کے مصافحہ کرنے سے پہلے جیب میں رکھ لیں گے تو میں کہوں گا کہ مصافحہ میں لینے کی مصلحت تو فوت ہو گئی کیونکہ جب جیب میں رکھا گیا تو بھانڈا تو پھوٹ گیا۔ اور اگر میری یہ رائے غلط ہے تو اس کی غلطی ظاہر کر دی جاوے۔

غرض بعض لوگ یہ تعلیم کرتے ہیں کہ جب پیر کے پاس جاؤ تو کچھ لے کر ضرور جاؤ ورنہ جو خالی جاوے وہ خالی آوے۔ یہ کلمہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا مطلب اس کا یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاویگا وہ خالی آویگا اگرچہ پیر کو روپیہ بھی کیوں نہ دیا ہو غرض خلوص نہ ہونے سے تو فیض سے بھی خالی رہا اور روپیہ دے کر اس سے بھی خالی ہو گیا۔

ایک اور بات بھی ہدیہ کے متعلق کہنی ضروری ہے کہ بعض اوقات جو چیز ہدیہ میں دیجاتی ہے وہ مقدار میں اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا لینا گراں معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک شخص نے دس روپیہ لاکر پیش کئے تو بعض دفعہ کسی وجہ سے ان کے لینے سے طبیعت پر گرانی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق میں مدت سے سوچا کرتا تھا

کہ اگر ہم واپس کرنا چاہیں تو کسی شرعی قاعدہ کے تحت میں اس واپسی کو داخل کریں۔ مگر الحمد للہ یہ بھی حدیث سے سمجھ میں آ گیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے لا یرد الطیب فانہ خفیف المحمل۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کرنے کی علت طیب کے خفیف المحمل ہونے کو قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ علت نہ پائی جاوے بلکہ اس کے خلاف طبیعت پر گرانی اور بار گذرے تو ایسی چیز کا واپس کر دینا جائز ہوگا۔ میں نے اس کا ایک تخمینی معیار قائم کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخص سے اس کی ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہ لیا جاوے گو یا اگر کسی شخص کی تنخواہ ۳۰ روپیہ ماہوار ہے تو اس سے مہینہ بھر میں صرف ایک روپیہ ہدیہ میں لینا مضائقہ نہیں اور اگر کوئی کہے کہ جب ایک شخص جوش طبیعت سے اس سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو انکار کی کیا ضرورت۔ تو سمجھو کہ جس جوش میں مصالح کی رعایت نہ ہو وہ جوش نہیں بلکہ جنون ہے جس کی اصلاح کرنا واجب ہے۔ اور اسی موقع پر ایک اور امر کو بھی جو کہ ہدیہ صدقہ وغیرہ سب میں مشترک ہے سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہدیہ، صدقہ، چندہ، قرض غرض جو طریقہ داد و ستد کا ہو حرام مال میں نہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی حرام میں دینا چاہے تو صاف انکار کر دے۔ یہ تو ضروری امور ہدیہ کے متعلق تھے۔

چندہ کی تحصیل کی شرائط

دوسرا امر جس میں بے احتیاطی کی جاتی ہے وہ چندہ ہے۔ اس میں ایک تو یہ ضروری ہے کہ وسعت سے زیادہ نہ لے۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے وسعت سے زیادہ نہیں لیا سوائے ان لوگوں کے جن پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورا اطمینان تھا کہ ان کی قوت توکل کی کامل ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضور نے ان کا کل سرمایہ قبول فرما لیا ہے۔ ایک شرط یہ ہے کہ چندہ دینے والے کی طبیعت پر گرانی نہ ہو یعنی ان طرق سے بچے جن میں دینے والے کی طبیعت پر بار پڑنے کا احتمال ہو کیونکہ حدیث میں ہے: الا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہ۔

ایک شرط یہ ہے کہ اپنی ذلت نہ ہو کیونکہ بعض طریقے ایسے بھی چندہ لینے کے ہیں کہ

اُن میں دینے والے پر بار تو نہیں ہوتا مگر لینے والا نظروں سے گر جاتا ہے۔ حدیث شریف میں جو سوال کی ممانعت آئی ہے وہ اسی بناء پر ہے اور اسی وجہ سے جہاں نہ گرانی ہو نہ مذلّت وہاں حاجت کے وقت طلب کرنا درست ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اگر مانگو تو صلحاء سے مانگو۔ ہم لوگ جو مدعی اصلاح میں اس حدیث کو سُن کر بہت متفکّر ہوں گے کہ خدا خیر کرے۔ اب سائلین کا ہجوم ہوگا۔ اور فرمایا کہ یا بادشاہ سے مانگو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یا تو اہل اللہ سے مانگو یا بہت بڑے امیر سے۔ اس کا راز یہ ہے کہ سوال کی حُرمت کی وجہ دو ہیں۔ ایک ذلّت، دوسرے مخاطب کی گرانی طبع کا احتمال۔ لیکن یہ علی سبیل منع الخلو ہیں علی سبیل منع الجمع نہیں اور جب علّت مرتفع ہوگی معلول بھی مرتفع ہوگا۔ تو جب بادشاہ سے مانگا تو نہ ذلّت ہوئی نہ گرانی۔ گرانی تو اس لئے نہ ہوگی کہ جس کے پاس کروڑوں موجود ہیں وہ اگر دس پانچ دے دے تو اس کے خزانہ میں کیا کمی آتی ہے۔ اور ذلّت اس لئے نہیں کہ بادشاہ خود اتنا بڑا رتبہ رکھتا ہے کہ یہ اس کی نظر میں چھا ہی کب تھا کہ آج نظروں سے گر گیا۔ اور بزرگوں سے مانگنے کی اجازت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے مانگنے میں مذلّت تو اس لئے نہیں ہو سکتی کہ وہ سب سے کم اپنے کو سمجھتے ہیں دوسرے ترحم ان میں بہت ہوتا ہے۔ ہر ایک پر انکو ترحم ہوتا ہے وہ کسی کو کیوں ذلیل سمجھنے لگے۔ اور گرانی اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ ہر چیز سے بالکل آزاد ہیں۔ اگر ان کو نہ کرنا ہوگی وہ آزادی سے جواب دے دیں گے کسی سے وہ کیوں دبیں گے۔ اس لئے گرانی اُن کے پاس بھی نہیں آتی۔ ان کی سادگی و آزادی کی وہ حالت ہے کہ ؎

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند
دلبرِ ماست کہ باحُسن خداداد آمد

زیر بارند درختاں کہ ثمر ہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

اور اُن کی یہ حالت ہے کہ ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلفِ آں نگارے دلبرم

یعنی بجز احکامِ خداوندی کی قید کے اور کوئی قید بھی اُن کو مقیّد نہیں کر سکتی۔ بڑی قید ننگ ناموس کی ہوتی ہے اس کو وہ مٹا ہی چکے جس کا طریقہ وہ ہے جو اس شعر میں مذکور ہے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما

دیگرے

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد — او ز حرص و عیب کلی پاک شد

اس سے ان کی یہ حالت ہے ؎

ساقیا برخیز در دہ جام را — خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمی خواہیم ننگ و نام را

غرض وہ بالکل آزاد ہیں۔ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں پڑسکتا۔ یہ ہے وجہ کہ تیس کے سبب ان دونوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا لیکن جب یہ علت معلوم ہوگئی اور یہ اجازت اسی بنا پر ہے تو اگر ان دونوں میں بھی کہیں اس کا احتمال ہو تو ان سے بھی مانگنا جائز نہ ہوگا۔ اور یہی وجہ تھی میری ممانعت کی چندہ سے ورنہ مطلق ممانعت ہرگز مقصود نہ تھی اور یہ سمجھ لیجیے کہ دین تو ہر وقت با عزت ہے لیکن ظاہر نظر میں اس کی عزت علماء کی عزت سے سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ لوگ نظروں سے گر گئے تو سمجھئے کہ دین نظروں سے گر گیا۔ اور اس وقت جو دین نظروں سے گر گیا ہے یہ ساری ہی بدولت اور محض ہماری صورت احتیاج بنانے کی وجہ سے ہے۔ اگر لوگ ہماری اس حالت کو دیکھ کر خود دین کی تعلیم کو موجب ذلت سمجھنے لگے اور ہم کو بھی اس احتیاج نے یہ نوبت پہنچائی۔ بقول شخصے ؎

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج — احتیاج است احتیاج است احتیاج

مگر بعض ایسے صاحب ہمت بھی ہیں کہ وہ باوجود احتیاج کے بھی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ ایک شاہزادہ ایرانی کسی حادثہ سے آوارہ ہو کر لکھنؤ آیا۔ وہاں ایک رئیس مسافر وارد تھے شاہزادہ نے انکی دعوت کی۔ دوسرے کسی موقع پر وہ حالت سفر میں پریشان ہو کر اتفاقاً ان رئیس کے گھر پہنچے۔ ایک مریل ٹٹو پر خستہ و زار سوار تھے۔ رئیس صاحب نے اس کی صورت دیکھ کر براہ تاسف کہا ؎

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج — احتیاج است احتیاج است احتیاج

شہزادہ بگڑ گیا اور فی البدیہہ یہ جواب دیا کہ ؎

شیر نر کے می شود روبہ مزاج — میزند بر کفش خود صد احتیاج

اور کہا کہ تم ہم کو غربت کی وجہ سے ذلیل سمجھتے ہو اور یہ کہہ کر چل دیا۔

تو جو لوگ مقتدا کہلاویں ان کے لئے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ وہ نظروں سے نہ گریں اور یہ امر قابل ہونا ہے استغناء رہے۔ البتہ جب کبھی چندہ کی ضرورت ہو تو تحریک عام کا مضائقہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی ذلت نہیں ہے۔ رہی تحریک خاص، اس میں اگر یہ یقین ہو کہ نہیں ذلیل ہوں گا اور نہ مخاطب پر گرانی ہوگی تب تو جائز ہے اور اگر ان میں سے ایک کا بھی احتمال ہو تو ناجائز۔ اور میں جو ہمیشہ ممانعت کیا کرتا ہوں وہ اسی تحریک خاص کی بعضی صورتوں میں۔ یہ تو تحقیق ہے اس کی جو میں سمجھتا ہوں۔

رہا عمل، تو عمل کرنے میں اپنی اپنی رائے ہے۔ میں نے اپنے لئے یہ تجویز کرلیا ہے کہ تحریک عام میں تو کبھی رُکا نہ جاوے اور تحریک خاص کو مع دونوں قسموں کے ترک کردیا جائے۔ اس لئے میں تحریک عام کررہا ہوں۔ اس میں بحمدللہ کوئی مضائقہ نہیں اور نہ یہ سوال ہے بلکہ دعوت الی الدین ہے۔

چندہ مشروعہ کی ترغیب

اس کے متعلق اس آیت میں کافی فیصلہ موجود ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم

یہ تو سوال کرنے کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے مانگے اور مبالغہ سے مانگے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے کینے کو ظاہر کردے۔ آگے فرماتے ہیں:

ھاانتم ھؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ واللہ الغنی وانتم الفقراء وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔

دیکھئے! سوال کی تو نفی کرتے ہیں اور دعوت الی الانفاق کا اثبات فرماتے ہیں اور سوال کرنے پر بخل کرنے میں زیادہ مذمت نہیں فرماتے بلکہ ایک گونہ اس میں معذور رکھتے ہیں چنانچہ فیحفکم تبخلوا میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور دعوت الی الانفاق میں بخل کرنے کی

مذمت فرماتے ہیں کہ من یبخل عن نفسہ کہ خداتعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم کہ اگر روگردانی کروگے تو خداتعالیٰ تمہارے بجائے دوسری کسی قوم کو پیدا کر دیگا جو کہ تمہاری طرح بخیل اور جان چرانے والے نہ ہوں گے اور تم سے ہر طرح افضل ہوں گے۔ دیکھئے ترغیب پر بخل کرنے سے کس قدر دھمکایا ہے کہ تمہارے تان گاڑی نہیں چلتی۔ دوسرے بھی ہزاروں خدمت گزار موجود ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

خداتعالیٰ ہی کا ہم پر احسان ہے کہ ہم سے یہ کام لے لیا۔ تو اسی آیت میں خداتعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ سوال اور چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ جس میں احفاء ہو اور احفاء دو قسم کا ہے ایک صوری دوسرا معنوی جیسے وجاہت سے وصول کرنا کہ یہ بھی احفاء کی ایک فرد ہے۔ غرض جس میں ایلام قلب ہو وہ احفاء ہے۔ اور اس پر تبخلوا کا ترتب کچھ بعید نہیں اور ایک ہی ترغیب اس میں بخل کرنا مذموم ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو صورتیں غیر مشروع ہیں وہ تو سوال میں داخل ہیں اور جو مشروع ہیں وہ ترغیب ہیں۔

حب دین کی تمثیل

غرض میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں اور مجھے اس ترغیب کے متعلق بہت سے مضامین محرکہ یاد نہیں ہیں۔ ہاں صرف یہ یاد ہے کہ:۔

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف من یشاء واللہ واسع علیم۔

اور اس مقام پر خداتعالیٰ نے بہت دور تک انفاق فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا ہے یعنی یہ ربع سیپارہ اس انفاق کی فضیلت میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ بہت بڑی ضروری چیز ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری حالت یہ ہے۔

گر بجاں طلبی مضائقہ نیست ور زر طلبی سخن دریں است

ہم لوگوں کو دین سے جو کچھ محبت ہے اس کا خلاصہ وہی ہے جو کہ مولانا نے

مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص سفر میں چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک کتا پڑا ہوا سسک رہا ہے اور ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔ مسافر نے اس شخص سے رونے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ یہ کتا میرا بہت بڑا رفیق تھا آج یہ مر رہا ہے۔ میں اس کے غم سے روتا ہوں۔ پوچھا کہ اس کو کیا بیماری ہے۔ کہا کہ صرف فاقہ۔ یہ واقعہ سن کر مسافر کو اس کی اس سسکنے کی حالت پر رحم آیا۔ قریب ہی ایک بورا بھرا ہوا رکھا تھا۔ مسافر نے پوچھا کہ میاں! اس میں کیا چیز ہے؟ اس شخص نے کہا کہ اس میں روٹیاں بھری رکھی ہیں۔ مسافر نے کہا ظالم! کتا تو مرنے پر بیٹھا رو رہا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ اس بوری میں سے ایک روٹی نکال کر اس کو دیدے۔ کہنے لگا کہ جناب مجھے اس قدر محبت نہیں ہے کہ اس کے لئے روٹیاں بھی خرچ کرنے لگوں۔ روٹیوں کے دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں۔

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کا لڑکا بیمار ہوا کسی نے ختم قرآن کی رائے دی اور کسی نے خیرات کا مشورہ دیا۔ تو اس نے قرآن تو پڑھوایا لیکن خیرات کا ایک پیسہ نہیں دیا۔ اسی طرح ہم لوگ محبت کے لمبے مدعی تو ہیں مگر پیسہ خرچ کرنے میں سب ختم ہو جاتی ہے۔

اور میں جو اس وقت ترغیب دے رہا ہوں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم ضرور ہی دو۔ کیونکہ دین کا کام تو انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے نہ دینے کی صورت میں بھی ضرور ہی چلے گا۔ میں صرف اس لئے ترغیب دے رہا ہوں کہ یہ بھی ایک شریعت کا مسئلہ ہے جس کا بتانا ضروری ہے لیکن اس ترغیب کے ساتھ ہی محل صرف کا بتلانا بھی ضروری ہے۔

مگر اس کے بتلانے سے قبل ہی یہ ظاہر کئے دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے کسی کے کہنے سے نہیں کہا نہ آگے کسی کا کہا ہوا کہوں گا۔ ہاں! اس کی مجھے خبر نہیں کہ کسی نے تصرف باطنی سے میرے دل میں ڈالا ہو۔ مگر میں یقین کے ساتھ اس کی بھی نفی کرتا ہوں کیونکہ بحمد للہ ہمارے بزرگ ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس قسم کے تصرفات سے کام لیں بالخصوص ایسے موقع پر کہ جہاں ان حضرات کو خلاف مرضی ہونے کا احتمال ہو۔ ہاں خدا تعالیٰ نے دل میں ڈالا اور میں نے بیان کیا

تو اتفاق مالی مصارف کا فیصلہ یہ ہے کہ مفید انجمنیں، مدرسے، مسجدیں وغیرہ ہیں سب ضروری مگر جس وقت جو مصرف زیادہ ضروری ہو وہ زیادہ قابل توجہ ہے۔ میرے خیال میں

اسی مقام پر اس وقت میں مدرسہ مظاہر العلوم کے متعلق دارالطلبہ میں بڑی ضرورت سے کما حقہٗ کہیں کیفما کیفی بلا مناسب ہو کہ لوگ اس کو دیکھ بھی لیں لوگوں کے دیکھنے میں انشاء اللہ تعالیٰ برکت ہوگی

دارالطلبہ کے فضائل

اس دارالطلبہ کے باب میں حدیث میں ہے: ادبینا لابن السبیل بنالہ یعنی اگرچہ وہ ابن السبیل فاسق ہو، پھر بھی اس کے لئے گھر بنانے میں ثواب ہوگا چہ جائیکہ وہ طلبہ علم ہوں جو کہ اضیاف ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور پھر یہ بھی نہیں کہ یونہی سکونت رکھیں بلکہ قال اللہ اور قال الرسول کا شغل رکھیں کہ اس کے برابر کوئی شغل ہی نہیں۔ حدیث میں ہے:

الدنیا ملعون وما فیہا ملعون الا ذکر اللہ وما والاہ او عالما او متعلما

تو علم دین ذکر اللہ بھی ہے اور اس میں عالم و متعلم بھی جمع ہیں اور دوسرے متعلقین ما والاہ بھی غرض ذکر اللہ اور ما والاہ اور عالم و متعلم تو لعنت سے مستثنیٰ ہوئے۔ باقی سب موجب بُعد عن الرحمۃ ہیں۔ اس سے بعض مخلصین کو اسباب دنیا کی نسبت سخت تشویش ہونا ممکن تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کیسی تدبیر فرمائی گویا ایک پاکیزہ کیمیا سکھلائی کہ اس دنیائے ملعون کو اگر ما والاہ میں داخل کر دیں تو پھر وہ سبب قرب ہو جاوے گی۔ تو اس سے زیادہ کیا کیمیا ہوگی کہ واسطہ لعنت کو قرب بنا دیا اور وہ بھی ایک ذرا سی آنچ میں، مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎

عین آں زہر آب را شربت کنند   عین آں تخییل را حکمت کنند
آں گمان انگیز را سازد یقیں   مہرہا رویا ندا ز اسباب کیں

صدقہ جاریہ کے فضائل

لوگ مغرور نہ ہوں کہ ہم تو ان کاموں میں نبٹتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی مدرسہ میں دیا ہے۔ لہٰذا ہم پہلے ہی داخل ہیں۔ سو جتنا دیا ہے وہ تو اس ترغیب سے نہیں دیا۔ اس پر دینا تو جب ہی سمجھا جائے کہ جنھوں نے مدرسہ میں کچھ دیا ہے وہ اسی قدر دارالطلبہ میں اور دیں اور جنھوں نے اب تک کچھ نہیں دیا وہ بھی حسب ہمت دیں اور جو نہیں لائے وہ وعدہ

کرلیں مگر اس کا خیال رہے کہ نری زبان ہی نہ ہو بلکہ پورا بھی کریں۔ کوئی صاحب قلیل کثیر کا خیال نہ کریں۔ یہ صدقہ جاریہ ہے۔ جتنا ہو سکے اس کی شرکت کو غنیمت سمجھیں، اور صدقہ جاریہ وہ چیز ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے اور ذرہ ذرہ نیکی کو ترستا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش اس وقت کوئی ایسی سبیل ہو کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ہی کہہ کر بخش دے کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی احتیاط ظاہر کرتے ہیں۔

اے کہ برما می روی دامن کشاں　　　از سر اخلاص الحمدے بخواں

کہ اگر اور کچھ نہیں تو ایک دفعہ الحمد ہی پڑھتے جاؤ۔ آج جس الحمد کو ہم ہزار بار خود پڑھ سکتے ہیں بعد مرگ اس کو ایک مرتبہ دوسرے کی زبان سے پڑھنے کے لئے ترسیں گے تو یہ صدقہ جاریہ اس وقت کام آویگا۔ نیز جس وقت قیامت کے روز اعمال پیش کئے جائیں گے اور دیکھے گا کہ میرے پاس کافی نیکیاں نہیں۔ اس وقت جب ورق الٹا جائے گا تو دیکھے گا کہ کسی جگہ بخاری شریف کا ثواب لکھا ہوا ہے کسی جگہ مسلم شریف کا ثواب لکھا ہوا ہے۔ کہیں قرآن شریف پڑھنے کا ثواب لکھا ہے۔ علیٰ ہذا۔

صاحبو! اگر آج سے ہزار سال کے بعد قیامت آوے تو اس وقت تک اس مکان میں یا اس مکان کی تعلیم یافتہ والوں کے سلسلہ میں جتنی مرتبہ بخاری کا ختم ہوگا اور جتنی مرتبہ مسلم شریف پڑھائی جاویگی برابر اس کی روح کو ثواب ملتا رہے گا اور قیامت کے روز اس کی غایت پریشانی کے وقت ان شاء اللہ تعالیٰ کہا جاویگا کہ تم نے جو دار الطلبہ میں مثلاً مدد کی تھی آج یہ پوٹ کی پوٹ ثواب کی اس کی بدولت تم کو مل رہی ہے۔ اس وقت خوش ہوگا اور زبان حال سے کہے گا۔

بحمد للہ زہے ارزاں خریدم　　　بہائے چند دادم جاں خریدم

اور اس وقت معلوم ہوگا کہ ایک روپیہ یا دو روپے دینے سے کیا نفع عظیم حاصل ہوا صاحبو! خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اتنی بڑی دولت مفت میں ہاتھ آتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض وہمی خیال مزاجوں کو شبہ ہو کہ جب اس مکان میں یہ کام یا خود یہ مکان نہ رہے گا تو کیسے ثواب ملے گا۔ تو اول تو اس کا گمان کرنا ہی برا ہے۔ یاد رکھو کہ نیک کام کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا کرتا۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　　چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

غرض اس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا اور بالفرض ہو بھی تو یہ قاعدہ مقرر ہے کما انما الاعمال
بالنیات تو جنّت تو دینے والوں کی ہمیشہ ہی کے لئے اس کی اعانت کرنے کی ہے۔ اور اگر
اسی پر مدار ہے کہ جتنے دن کام ہو اتنے ہی دن کا ثواب ملے تو جنّت دائمی کا استحقاق بھی نہ
رہے گا کیونکہ جب سو برس تک نیکیاں نہیں کیں تو سو برس سے زیادہ جنّت میں کیوں رہیں،
حالانکہ جنّت میں ابدالآباد رہنا ثابت ہے۔ تو اس نیت کی بدولت ہے کہ مسلمان کی نیّت
کہ اگر قیامت تک زندہ رہیں گے تو اس دین پر رہیں گے اسی لئے جزائے مؤبد ملتی ہے
اسی طرح یہاں بھی نیّت تائید کی ہے۔ پس یہ وسوسہ غلط ٹھہرا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ اس
آیت میں خدا تعالیٰ نے اس تقسیم اور تجزیہ کا غلط ہونا ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں
کہ خدائے تعالیٰ نے تمہارے نفسوں اور جانوں کو خرید لیا ہے۔ تو دونوں کو جمع فرمانے
سے یہ بتلا دیا کہ نہ صرف بذل مال کرنیوالے مغرور ہوں اور نہ صرف بذل جان کرنیوالے بلکہ
جب دونوں کا بذل ہوگا تو جنّت کا استحقاق ہوگا۔ تو صاحبو! جنّت ایسی سستی نہیں ہے
ہے خوب سمجھ لو کہ اَلا اِنّ سلعۃ اللّٰہ غالیۃ الا اِنّ سلعۃ اللّٰہ ھی الجنۃ۔

اب میں طالب علموں کے کام کی بات بتلاتا ہوں کہ اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ
بذل نفس تو خاص خاص کاموں میں ہوتا ہے یعنی قتال جس کا آگے ذکر بھی ہے یقاتلون
فی سبیل اللّٰہ تو بذل نفس عام کیسے ہوا؟ تو سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے خود آگے چل کر فرما
دیا ہے التائبون العابدون السائحون الراکعون الساجدون الخ۔ یہ آیت اس
شبہ کو زائل کر کے بتلا رہی ہے کہ یہ سب کام بذل نفس ہی میں داخل ہیں اور اس سے بھی
بڑھ کر یہ دلیل ہے کہ آگے ارشاد ہوتا ہے وبشر المومنین۔ یہ المومنین الّتی عن المومنین
سابق کا اعادہ ہے پس ان اعمال کے بعد یہ حکم دینا کہ اے محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم ان
مومنین مذکورین کو بشارت مذکورہ دے دیجئے صریح طور سے دال ہے کہ جس اشترائے نفس و
اموال کا اوپر ذکر تھا وہ یہ اعمال ہیں پس یہ سب بذل نفس ہو گیا۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا
کہ تمام شریعت مطہرہ بذل نفس اور بذل مال کی تفصیل ہے یہ تھا میرا مقصود اس وقت بیان سے۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ پانچ روپے میری طرف سے بھی مدرسہ میں قبول ہوں
اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ برکت دے۔ آمین یا رب العالمین!!

یہاں سے حالت معلوم ہوئی ہوگی آج کل کی ترقی کی ہیں ترقی سے منع نہیں کرتا بلکہ ترقی کو پسند کرتا ہوں لیکن اسی طرح جس طرح کہ ایک نیک اور مسلمان کو ترقی کرنی چاہیے۔ ایسا نہیں کہ ترقی ہی دین ہی کو بھول جائیں اور خدا کا خیال بھی نہ آئے۔ جو لوگ خدا کو جان لیتے ہیں وہ دنیا سے زیادہ محبت تو کیا، بالکل محبت نہیں رکھتے ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

دُنیا عارف کی نظر میں

دنیا کا وجود اُن کی نظر میں کاہ سے زیادہ نہیں چھوٹے چھوٹے بچے مٹی کے گھروندے کھلونے بناتے ہیں۔ عقلاء اُن پر ہنستے ہوئے گزرتے ہیں اور بچوں کو بلا کر دکھاتے ہیں کہ ان دیوان خانوں میں آؤ اور ان کو دیکھو۔ اسی طرح عرفان اور اہل اللہ آپ کے بلند قصروں اور محلوں کو دیکھ کر آپ کو دارِ آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور جب آپ کو ملتفت نہیں پاتے تو وہ آپ پر ہنستے ہیں اور آپ کی حالت پر یہ کہتے ہوئے افسوس کرتے ہیں ؎

دلا تاکے دریں کاخِ مجازی کنی مانند طفلاں خاک بازی
توئی آں دست پرورِ مرغِ گستاخ کہ بودت آشیاں بیرون ازیں کاخ
چرا زاں آشیاں بیگانہ گشتی چو دوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

پس اس سامان کو قبلہ و کعبہ مت بناؤ اور ان علماء کو جو خستہ حالت میں ہوں، میلے کچیلے ہوں، حقارت کی نظروں سے نہ دیکھو۔ وہی لوگ خاصان خدا اور خدا کو پہچاننے والے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ دُنیا چھوڑ دو اور تمام تعلقات کو ترک کر دو۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر منہمک رہو کہ خدا کو بھی بھول جاؤ بلکہ دنیا کو نظرِ حقارت سے دیکھو اور خاصانِ خدا کی عزت کرو۔ اہل اللہ سلطنتوں اور حکومتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور انکو وبالِ جان خیال کرتے ہیں قصہ مشہور ہے کہ حضرت غوث پاک کی خدمت مبارک میں سلطان سنجر نے خط لکھا جس میں تحریر کیا کہ ایک حصہ ملک کا آپکے خدام کیلئے آپکو دیتا ہوں۔ آپ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ؎

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد در دل اگر بود ہوسِ ملکِ سنجرم

اکبر شاہ سے جنگل میں ایک گنوار کی دوستی ہوگئی۔ اکبر نے گنوار کو گھر بلایا کہ اگر تمہیں کچھ ضرورت پیش ہو تو ہمارے پاس آنا۔ گنوار کو ایک مرتبہ کچھ ضرورت پیش آئی اور وہ اکبر شاہ کے پاس آیا۔ دیکھا کہ اکبر شاہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ نماز پڑھ کر دُعا کی۔ گنوار نے دیکھا کہ جب یہ خود خدا سے مانگتے ہیں تو کیا میں نہیں مانگ سکتا۔ اکبر شاہ سے کہا کہ تمہارے احسان کی ضرورت نہیں ہم خود اس سے مانگ لیں گے جو تم کو لاکھوں دیتا ہے وہ کیا مجھے نہ دیگا۔ توحید کا یہ اثر ہوتا ہے کہ

موحد چہ برپائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس ۔۔۔ ہمیں است بنیادِ توحید بس

اگر غور کیا جائیگا تو تمام مسائلِ اعتقادیہ میں علاوہ غایت نجات کے اور بھی بہت سی غایاتِ عملی نکلیں گی۔ پس جب علم کا عمل سے یہ تعلق ہے تو ضرور ہے کہ مسئلہ اثباتِ آخرت کے ساتھ جس کا بیان مولوی شبیر احمد صاحب نے کیا ہے اس کے اہتمامِ عمل کا مضمون بھی بیان کیا جاوے۔

صحبتِ علماء کی ضرورت

اس لئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے کہ یہ عمل کو بھی ضروری بتلا رہی ہے۔ پس اس آیت (آیت مذکورۃ العنوان) میں حق تعالیٰ نے شکایت کی ہے محبتِ دُنیا کی اور آخرت کے چھوڑ دینے کی۔ اور حبِ دنیا سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کو دین پر ترجیح دی جاوے اور آخرت کا خیال مطلقاً نہ رہے تو بعضے محبّینِ دنیا اس کو مطلق کسبِ دنیا پر محمول کر کے اس تعلیم پر مضحکہ کرتے ہیں اور تعلیم کنندوں کی یہ مثال دیتے ہیں۔

ایک بادشاہ کے ہاں علماء کا دخل تھا۔ بادشاہ ان کی مرضی پر چلتے تھے مولوی صاحبان نے کہا کہ بادشاہ سلامت! یہ تمام افواج وغیرہ جو فضول جھگڑا لگا رکھا ہے اس سے کیا فائدہ بیکار مصارف ہیں۔ مناسب ہے کہ تمام فوج موقوف کر دی جاوے۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور تمام فوج کو موقوف کر دیا۔ غنیم کو معلوم ہوا کہ فلاں بادشاہ نے فوج کو برخاست کر دیا ہے، فوراً لشکر کشی کی اور سرحد کے قریب آ پہنچا۔ بادشاہ نے مولوی صاحب سے کہا کہ دشمن حملہ کر کے آ پہنچا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہم جا کر فیصلہ کئے دیتے

جیسا ایک گنوار کا واقعہ ہے کہ ایک گنوار سے کسی مولوی نے کہا کہ اگر تو چالیس دن نماز پڑھ لے تو تجھ کو میں ایک بھینس دوں۔ گنوار نے کہا بہت اچھا جب چالیس دن گزر گئے تو گنوار آیا اور کہا مولوی صاحب! میں نے چالیس دن نماز پڑھ لی بھینس دلوایئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تو بھینس دینے کو صرف اس واسطے کہا تھا کہ تجھ کو نماز کی عادت ہو جائے۔ گنوار نے کہا تو جاؤ، ہم نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی تھی۔

اگر مولوی صاحب کی خدمت میں رہیں تو روٹی کھانے کی غرض سے نہیں بلکہ روٹی اپنے اپنے گھر سے کھائیں تاکہ کچھ قدر بھی ہو۔ ایک مفید عام رسالہ میں نے حضرت کے حکم سے چھپوایا تھا اور میں چاہتا تھا کہ مفت دوں لیکن حضرت نے حکم دیا کہ مفت نہیں بقیمت دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی۔ غرض اخلاص و عقیدت اور فراغت کے ساتھ کام کرنا چاہیے تاکہ کچھ مفید نتیجہ نکل سکے۔

کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں ایک شخص کو ایک تحصیلدار صاحب نے پیش کیا اور کہا کہ انکو بڑے شبہے ہیں۔ اگر آپ کچھ فرمائیں تو انکی تسکین ہو جائے۔ میں نے کہا کہ یہ میرے ساتھ چلیں اور چند روز وہاں رہیں شبہات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ عارف شیرازی اسی چالیس دن کے لئے فرماتے ہیں ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے ہمیں گفت ایں معمار با قرینے

پس چالیس دن تو شیشۂ قلب میں محبت الٰہی کی شراب کبھا تو تمہارے قلب کا اطمینان ہو جائیگا۔ اگر بڑوں کے پاس رہنے کی ہمت نہ ہو تو خدا کے لئے تم چالیس روز میرے ہی پاس رہ کر اس سستے نسخہ سے فائدہ اٹھا کر دیکھ لو۔ غرض صحبت ہی سے یہ شبہ جاتا رہیگا کہ مولوی لوگ کسب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ حب دنیا سے روکتے ہیں جسکی مذمت اس آیت میں ہے اور اس حدیث حب الدنیا راس کل خطیئۃ کی بھی تصریح ہو گئی۔

کسب دنیا اور حب دنیا

غرض ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا۔ تو کسب دنیا تو جائز ہے اور حب دنیا ناجائز۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو پاخانہ میں بضرورت طبیعت بیٹھ جانا

اور ایک پاخانہ کو پیارا سمجھ کر اس ہی جی لگا کر بیٹھنا۔ اوّل صورت جائز دوسری ناجائز اسی
طرح دنیا کو کمانا تو جائز لیکن دنیا کو محبوب و مرغوب سمجھنا حرام۔ قرآن شریف میں ان
ہی الفاظ سے تصریح کی گئی ہے:

کلا بل تحبون العاجلۃ وتذرون الاخرۃ

یعنی عاجلہ کو محبوب سمجھتے ہو اور آخرہ کو چھوڑے بیٹھے ہو۔ اور اس خصوص میں ایک شبہ کا احتمال
ہے۔ وہ یہ کہ بعضے آدمی یہ سن کر کہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے۔ کہنے لگتے ہیں کہ کفار کے متعلق
آیات سے ہم کو کیا تعلق ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی ترجمہ قرآن میں دیکھ لیتے ہیں کہ یہ آیت مکی نہیں
تو وہ خیال کر لیتے ہیں کہ غیر مکی آیت سے ہم کو کیا تعلق۔ اسی لئے اس موقع پر اس کے متعلق بھی کچھ
بیان کر دینا ضروری ہے۔

خداوند تعالیٰ کو کسی کی ذات سے محبت و عداوت نہیں ہے بلکہ اس کی بنا اعمالِ خاصہ
ہیں اور گو بعض احکام کا مورد اگرچہ خاص ہوتا ہے لیکن الفاظ کے عموم سے حکم ہوتا ہے۔ اس لئے
کفار کی شان میں جو جو آیات اتری ہیں وہ اگرچہ باعتبار مورد کے خاص ہیں لیکن ان کا حکم عام
ہے پس جس عمل پر کفار کی شکایت ہے اگر وہ عمل ہم میں بھی ہے تو ہم کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیئے

دوسرے اگر پھر بھی خاص ہی مانا جائے تب اور بھی زیادہ افسوس ہے ہم پر کہ ہم مسلمان
ہیں اور پھر کافروں کی خصلتیں ہم میں پائی جاویں۔ پس ایسی حالت میں یہ شبہ کہ کفار کے متعلق
آیات سے ہمیں کیا واسطہ کسی طرح گنجائش نہیں رکھتا بلکہ کفار کی شان میں جو آیات ہوں
ان کا اثر ہم پر زیادہ ہونا چاہیئے۔ غرض کفار پر جو طعن و ملامت اور شکایت ہے وہ ان
کی ذات کی وجہ سے ہے یا فعل کی وجہ سے۔ یہ امر سب جانتے ہیں کہ ان کی شکایت ذات کی
وجہ سے نہیں ہے بلکہ فعل کی وجہ سے ہے۔ اگر تم مسلمان ہو تو ان آیات کو دیکھ کر جو کفار کی
شان میں ان کے فعل کی وجہ سے ہیں، عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ جو خصائل کفار کے تھے
وہ آج ہم میں پائے جاتے ہیں۔ افسوس! کس قدر بُری بات ہے۔

اس کی شان ایسی ہے کہ کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے اس کو بہت بُرا معلوم ہوگا
لیکن اگر چمار کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو خیال بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح کفار کو کافر کہہ کر خطاب

کرنے سے جتنا انہیں خیال ہو سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ:

مَن ترکَ الصلوٰۃَ متعمداً فقد کفر

میں بھی یہ بات سمجھنا چاہیے کہ تاویل بہ نسبت عدم تاویل کے اس خاص اعتبار سے زیادہ موجب
ہے تغلیظ کو اور اس سے زجر و توبیخ اور بڑھ گئی ہے اور اشتداد کم نہیں ہوا۔
ایک اور شبہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ترکِ آخرت پر جو ملامت ہے مراد اس سے ترکِ اعتقاد
ہی ہے یعنی انکار۔ اور ہم خدا کے فضل سے آخرت کے قائل ہیں پس خود لفظ ہی عام نہیں
اور اس لئے اس کا مصداق ہم نہیں ہو سکتے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اوّل تو یہ قید بلا دلیل ہے
دوسرے اگر تسلیم بھی کیا جائے تو دوسری بعض آیات عموم میں محکم ہیں۔ تیسرے ظاہر لفظ سے تو
شبہ اطلاق کا ہے اور جس دل میں درد ہوتا ہے وہ تو تھوڑے سے لفظی التباس سے بھی
بے چین ہو جاتا ہے خفیف سے خفیف التباس بھی ان کی جان پر بنا دیتا ہے ع

عشق است و ہزار بدگمانی

لیکن اس کے لئے طلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ معترض خالی الذہن طلب سے دور ہیں:
حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک کنجڑا اُن کے سامنے سے گزرا اور آواز
لگائی "الخیار العشرۃ بدانق" یعنی دس ککڑیاں ایک دانگ میں۔ یہ آواز سنتے ہی آپ کا ذہن
"اخیار" کے دوسرے معنی کی طرف منتقل ہوا یعنی خیر کی جمع۔ آپ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے
اور فرمانے لگے جب دس نیکیوں کی قیمت ایک دانگ ہے تو ہم بُروں کی کیا قیمت ہے۔ واقع
میں کسی چیز کی فکر میں یہی حال ہوتا ہے۔ خوب کہا ہے ؎

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

ایک اور واقعہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ایک دفعہ جمعہ
کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ پریشان پھر رہے تھے۔ آپ نے ان کے بٹھلانے
کے لئے ارشاد فرمایا اجلسوا۔ اس وقت ایک صحابی دروازہ پر تھے جس وقت آپ کی
زبان مبارک سے اجلسوا کا لفظ اُن کے کان میں پہنچا اسی وقت دروازہ ہی پر بیٹھ گئے۔
ہر چند یہ حکم ان کے لئے نہ تھا لیکن شدتِ اطاعت غالب آگئی اور گوارا نہ ہوا کہ آپ

ایک حکم فرمایا ہیں خواہ کسی کو سہی اور اس کی تعمیل نہ کی جائے۔

مسلمانو! تم میں ذوق اور محبت نہیں۔ طلبِ صادق تم میں نہیں پائی جاتی۔ اگر محبت و طلب ہوتی تو ہرگز ایسے شبہات و اعتراضات پیش نہ آتے۔ حق یہی ہے کہ اس آیت (مذکورۃ العنوان) میں خداوند تعالیٰ کا مقصود مطلقاً حُبِّ عاجلہ اور ترکِ آخرت پر شکایت کرنا ہے۔ اور اس کے مختلف مراتب ہیں جس درجہ کی حُبِّ دنیا ہوگی اسی درجہ ترکِ آخرت ہوگی اور ویسی ہی ملامت ہوگی۔ اگر حُبِّ دنیا و ترکِ آخرت مرتبہ اعتقاد میں ہے یعنی آخرت کا انکار ہے تو ابدالآباد تک جہنم میں رہیگا۔ کیونکہ کفر ہے۔ اور اگر آخرت کا اعتقاد تو ہے لیکن عمل نہیں تو فسق ہے اور عذاب محدود کا استحقاق۔ غرض جس طرح عقیدہ ضروری ہے اسی طرح عمل بھی۔ اور یہ عقیدہ مرجیہ کا ہے کہ عقیدہ درست ہونا چاہیے عمل کی ضرورت نہیں ہے اور ایمان اپنے درجہ پر ہے۔ ہم چونکہ اہلِ سنت وجماعت ہیں اس لئے دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔

صغیرہ گناہ پر جرأت کا اثر

ہر چند کہ دوسرا مرتبہ اور اس کی شکایت اول کے درجہ پر نہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن یہ مرتبہ بھی چھوٹا نہیں خاطر جمع نہ ہوجئے بلکہ اگر یہ صغیرہ بھی ہوتا تب بھی بے فکری کی چیز نہ ہوتا۔ خیال کیجیے کہ چھوٹی سی چنگاری کیا گل کھلاتی ہے۔ صغیرہ گناہ پر بھی جرأت کرنا بڑا زیاں ہے۔ اگر صغیرہ کوئی بڑی بات نہیں ہے تو جو صاحب یہاں سے جائیں وہ اپنے گھر جاکر چھت میں ذرا سی چنگاری آگ کی رکھ دیکھیں کہ وہ تھوڑی دیر میں کیا اثر دکھاتی ہے۔ اسی طرح چھوٹا سا گناہ بھی تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے جس طرح کہ چھوٹی سی چنگاری سارے گھر کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے اور دوسرا درجہ ترکِ آخرت کا۔ اگرچہ معصیت ہے کفر نہیں اور معصیت کا درجہ کفر سے کم نہیں لیکن اس پر عمل کرنا بھی تو سخت ظلم ہے اور کفر کے مقابلہ میں کم ہونے سے اس کا فی نفسہٖ صغیرہ ہونا لازم نہیں آتا مولانا کی ایک مثال مجھے یاد آئی۔ فرماتے ہیں ؂

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود

یعنی آسمان گو عرش سے چھوٹا ہے مگر زمین سے تو بڑا ہے۔ اگر کوئی شئے درجہ چھوٹی ہو تو یہ لازم نہیں کہ وہ فی نفسہٖ چھوٹی ہو۔ اور بعضے مدعی توہیں اعتقاداً ماننے کے مگر واقع میں وہ من حیث المذہب نہیں مانتے بلکہ قومیت کی حفاظت کے لئے مانتے ہیں۔ مذہب چونکہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام افراد کو متحد بنا دیتا ہے اس لئے اس کو اختیار کر لیا ہے۔ اگر ان کی یہ غرض کسی اور مذہب سے حاصل ہوتی تو وہ ہرگز مسلمان نہ ہوتے۔

مذہب اور ترقی

ایک اخبار میں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ اب چونکہ ترقی کا زمانہ ہے اس لئے وحشیانہ خیالات کو چھوڑ دینا چاہیے اور سب کو ایک ایسے نکتۂ خیال پر قائم ہو کر ایک مذہب اختیار کر لینا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ توحید کو اختیار کر کے اس کو اصل مذہب قرار دیں اور اعتقاد رسالت کی ضرورت کو بھی چھوڑ دیں۔ افسوس! مسلمان اور یہ رائے ؎ ~~~~~~~~ از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد

ایک ایسے ہی شخص کے جواب میں میں نے کہا کہ خدا کی توحید کو تو تسلیم کرتے ہو اور توحید یہی ہے کہ اس کی ذات و صفات میں کامل اور متوحد خیال کیا جائے اور منجملہ خیالات کے صدق بھی ہو جھوٹ بولنا بڑا نقص ہے۔ پس اعتقادِ کذب منافی توحید ہوگا اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے محمد رسول اللّٰہ پس جو شخص رسالت کا منکر ہوگا وہ توحید ہی کا منکر ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ توحید کا قائل ہونا لازم ہے کہ رسالت کا بھی قائل ہو۔ مگر ایسے قوم پرست رسالت ہی کا خاتمہ کئے دیتے ہیں۔ اور ایسے لوگ اگرچہ بعض اوقات اسلام کی خدمت بھی کرتے ہیں لیکن خدمت ہمارے نزدیک اس لئے قابلِ قدر نہیں کہ ان کا مقصود خود خدمت مذہب نہیں ہے بلکہ محض ترقی قوم مقصود ہے۔ اور اگر اسلام کو سچا سمجھ کر اس کی خدمت کی جاتی تو ان کے آثار سے اس کی جھلک معلوم ہوتی لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔ چنانچہ عقائدِ اسلام پر جرح کی جاتی ہے۔ اہلِ دین کو حقیر سمجھا جاتا ہے مسائلِ اسلام میں شبہات پیدا کئے جاتے ہیں۔ اگر حق سمجھ کر دین و مذہب کی خدمت کی جاتی تو ان باتوں

کی کہاں نوبت آتی۔ ان کی غرض تو صرف قومیت کا بڑھانا اور قومیت کو نشوونما بخشنا ہے۔
جس طرح دوسری قومیں ترقی اور نشوونما حاصل کر رہی ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں سب سے آخر میں
مسلمان جا لگے لیکن ایسے چل گئے کہ سوتے ہی رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ غرض ترک آخرت کے مراتب
مختلف ہیں اور اس کے اعلیٰ درجے سے آج کل چند قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

پرانی وضع کے لوگ جو عام قسم کی برائیوں میں مبتلا پائے جاتے ہیں گرچہ آسائشی زندگی نے
انھیں ایسا بنا دیا ہے کہ ان کی عملی زندگی بہت خراب ہے لیکن وہ باایں ہمہ جب علما و صلحا کو
دیکھتے ہیں تو دل سے تعظیم بجالاتے ہیں اور جھک جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں ان کا
ادب کرنا چاہیے ادب کرتے ہیں حتیٰ کہ محض درویش صورتوں تک سے دبتے ہیں۔ خدمت کرتے
ہیں اگرچہ وہ رہزن ہی کیوں نہ ہوں اور واقع میں یہ دنیادار لوگ ان درویشوں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔

میرے ایک عزیز بیان کرتے تھے کہ فلاں جگہ کے امرا تمام جنتی ہیں اور فقرا دوزخی۔
کیونکہ امرا تو فقرا سے دین کے لئے تعلق رکھتے ہیں اور فقرا امرا سے دنیا کا تعلق رکھتے ہیں۔

ایک حکایت کسی پیر و مرشد کی مشہور ہے کہ مرید نے پیر سے خواب بیان کیا، دیکھتا ہوں
کہ میری انگلیاں پاخانہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپکی انگلیاں شہد میں۔ پیر جی نے کہا، ہاں ٹھیک
تو ہے، اس میں شک ہی کیا ہے۔ ہم ایسے ہی ہیں اور تو ایسا ہی ہے۔ مرید نے کہا، ابھی خواب
پورا نہیں ہوا۔ یہ بھی دیکھا کہ میں تمھاری انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور تم میری انگلیاں چاٹ رہے ہو۔
پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔ اس حکایت کا یہی حاصل ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنا چاہتا ہے
کہ وہ مشابہ شہد کے ہے اور پیر مرید سے دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے کہ مشابہ پاخانہ کے ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے دل میں اسلام کی وقعت و عظمت ہی نہیں۔ پہلی قسم کے
لوگوں کا علاج موت کو یاد کرنا ہے۔ علم و اعتقاد تو تھا ہی عمل کی کمی تھی اس وجہ سے موت
کی یاد ان کے لئے عبرت بخش ہوگی۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

اکثروا ذکر ہاذم اللذات

موت کو اکثر یاد کیا کرو۔ موت کے خیال اور مراقبہ سے بہت جلد اصلاح ہو جائے گی۔

علاوہ ازیں فرمایا گیا ہے کہ اگر بیس مرتبہ موت کو روزانہ یاد کیا کرے تو شہادت کا مرتبہ حاصل

ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرو بلکہ غرض یہ ہے کہ موت کو اس طرح یاد کرو کہ گناہوں سے بچانے کا سبب بن جائے۔

دوسروں کا علاج یہ ہے کہ وہ کسی محقق کی خدمت میں رہیں۔ خدا کے لئے مسلمانو رحم کرو۔ تم نہایت خطرناک حالت میں ہو، تمھاری اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اب معلوم کرنا چاہیے کہ جس طرح اہلِ دنیا کی یہ قسمیں ہیں اسی طرح اہلِ دین باعتبار ترکِ آخرت کے دو قسم ہیں: اہلِ ظاہر و اہلِ باطن۔

دین داروں کی کوتاہی

ظاہری دینداروں میں یہ کمی ہے کہ بعض اعمالِ آخرت کے جن کے ترک کو وضع کے خلاف نہیں سمجھتے انھوں نے چھوڑ رکھے ہیں اور مضراتِ آخرت میں مبتلا ہیں۔ مثلاً غیبت کرنا جو ملائے عام ہونے کے سبب مخلِ تقویٰ ہی نہیں سمجھا جاتا جیسا بی تمیزہ کا وضو تھا کہ فسق و فجور سے بھی نہ ٹوٹتا تھا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو　　پیش مردے کاملے پامال شو

اور بدوں اس کے تو اکثر حالت یہ رہتی ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

یہ تو خرابی واعظوں میں ہے۔ ایک خرابی تارکینِ وعظ میں اس سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہ بعضے لوگ اس لئے خود وعظ نہیں کہتے کہ خود عامل نہیں۔ اس میں دو گناہ ہیں۔ ایک تو خود عامل نہ ہونا اور عمل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ دوسرے اور لوگوں کو بھی تبلیغ نہ کرنا۔

بعض اہلِ علم دولتمندوں کے پاس پڑے رہتے ہیں اور لالچی و طامع ہو جاتے ہیں۔ یہ بری بات ہے۔ جو لوگ اچھے ہوتے ہیں وہ دولتمندوں سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں۔

بئس الفقیر علی باب الامیر ونعم الامیر علی باب الفقیر

اسی لئے وہ حق نہیں کہہ سکتے کیونکہ طمع ان کو مانع ہوتی ہے ع

طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگو

شاہ سلیم کا واقعہ ہے کہ شاہجہان ان کے پاس آئے تو انھوں نے پاؤں بھی نہ سمیٹے جو کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ جب سے ہاتھ سمیٹے پاؤں پھیلا دیا۔

مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے لکھنؤ کے ایک شاہزادہ حاضر ہوئے اور زمین سلام کیا۔ آپ نے انگوٹھا دکھا دیا۔ اس نے اشرفی نذر دی۔ آپ نے منھ چڑا دیا مولانا نے ایسا قصداً کیا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اہلِ دنیا تنگ نہ کریں اور غیر مہذب سمجھ کر وہ پاس نہ آئیں تاکہ دنیا داروں کے جھگڑوں سے نجات ہو۔ یہ سب بے طمعی کے سبب تھا۔

پس حبِّ مال کا علاج ایسے اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا ہے۔ اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنے سے مال و دولت سے محبت دور ہو جاتی ہے اور غنائے باطنی حاصل ہوتا ہے۔ یہی بھی اہلِ ظاہر ہیں۔ اس سے اہلِ باطن خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم میں کوئی کمی نہیں اور نہ کوئی خرابی ہے لیکن ان کو واضح رہنا چاہیے کہ لطیف عذاب بگڑتی ہے تو سب سے ہی زیادہ گندی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیوں کا بگڑنا ہے۔ ان میں جو بگڑتے ہیں ان میں بدخلقی بدمزاجی وغیرہ ایسی بری باتیں پائی جاتی ہیں حالانکہ درویشوں میں ان امور کا پایا جانا نہایت ہی منکر ہے

حضرت قبلہ و کعبہ کی تعلیم بتلاتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ بعض درویش امراء کی تحقیر کرتے ہیں یہ ہمیں پسند نہیں۔ جب امیر تمہارے دروازہ پر آگیا تو حسبِ قول نعم الامیر علی باب الفقیر وہ نعم الامیر میں داخل ہو گیا اس لئے اس میں اخلاق برتنا چاہیے۔ حضرت حاجی رحمۃ اللہ علیہ سب سے ملتے اور سب کی تعظیم کرتے تھے۔

انزلوا الناس منازلهم ہمارے لئے حکم ہے یعنی لوگوں کو ان کے مرتبوں کے موافق بٹھاؤ۔ میرا خیال ہے کہ خدا جس کو بڑا بناتے جیسے امراء اس کو تم بھی بڑا سمجھو۔ البتہ خوشامد و طمع سے دور رہو اور خوش اخلاقی برتو مگر افسوس ہے کہ جو خوش اخلاق بنتے ہیں وہ امراء سے خود ملتے نہیں، امراء کے گھروں پر جاتے نہیں تو ایسوں سے بھلا ان کی اصلاح کیوں کر ہو بس حد تو خود ان کے گھر جائیں اور نہ انکو اپنے آنے سے روکیں بلکہ اگر وہ آئیں تو ان سے ملنے میں عذر نہ کریں کیونکہ ان کی اصلاح بھی تمہارا فرض ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بعض امراء اور دنیا دار علماء کی جو شکایت کیا کرتے ہیں کہ وہ خود ہماری اصلاح کے لئے

ہمارے پاس کیوں نہیں آتے۔ یہ شکایت بیجا ہے۔ انھیں غور کرنا چاہیے کہ پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے۔ کنواں پیاسوں کے پاس نہیں آیا کرتا۔ علما کو تمھاری ضرورت نہیں، تم کو علما کی ضرورت ہے۔ تم اُن کے پاس جاؤ۔ کیا کبھی سول سرجن بھی بغیر بلائے اور فیس لیے تمھارے گھر آیا ہے۔ اس خیال سے اگر میری رائے میں مولوی بھی اپنی فیس مقرر کر دیں تو اچھا ہے لیکن ابھی مولوی جلدی نہ کریں کہیں میری رائے ظاہر ہوتے ہی فیس لگا دیں بلکہ ابھی کچھ انتظار کریں۔ ابھی اس کا موسم نہیں آیا ہے۔ یہ عیب مذکور زیادہ تر تو زیادہ تر رئیسوں میں ہے

صوفیوں کی کوتاہی

دوسرا عیب جو سچے صوفیوں میں نحبون العاجلہ کا ہے وہ دقیق ہے۔ وہ یہ کہ ذرا سا کام کر لینے کے بعد اس امر کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی کیفیت پیدا ہو اور جب کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو پیر صاحب سے شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ذکر و وِرد پڑھا، سب کچھ کیا لیکن ابھی تک کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ بھی حبّ عاجلہ میں داخل ہے کیونکہ کیفیتیں ثمرۂ عاجلہ ہے جو موعود بھی نہیں۔ اصل موعود و مقصود ثمرۂ آخرت کا ہے کہ وہ نجات اور رضا ہے پس یہ بھی بڑی کمی ہے جس پر نظر ہی نہیں ہے۔ اس کا علاج نقل کرتا ہوں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اگر کوئی آکر یہ کہتا کہ حضرت اللہ کے نام سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ آپ جواب میں فرماتے کہ یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہو۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　ویں نیاز و سوز و درد ل پیک ماست

نیز حضرت نے فرمایا کہ تم کسی امیر کے گھر جاؤ جو تمھارا آنا پسند نہ کرے تو وہ کان پکڑ کر نکال دیگا۔ پس جب مسجد میں جاتے ہو اور وہاں سے نہیں نکالے جاتے تو سمجھو کہ حاضری مقبول ہے۔ چنانچہ غیر مقبولین کو حاضری کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔

ایک واقعہ ہے کہ کسی امیر کے غلام نے نماز کے وقت مالک سے اجازت چاہی۔ مالک نے کہا اچھا۔ غلام مسجد میں چلے گئے اور مالک دروازہ پر بیٹھے رہے۔ غلام کو بہت دیر ہوگئی اور مالک نے مجبور ہو کر پکار کر دریافت کیا کہ اتنی دیر سے کیا کر رہے ہو؟ غلام نے کہا کہ مجھ

آنے نہیں دیتا۔ مالک نے کہا کون باہر آنے نہیں دیتا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا۔

ذکر و شغل کی ضرورت

ایک شخص نے ایک محقق سے کہا کہ اتنے دن ہوتے ذکر و شغل کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ جواب میں فرمایا کہ اگر نفع نہ بھی ہو تو کچھ پروا نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ مالک کسی غلام سے کوئی کام لے اور وہ مالک سے کہے کہ کیا ملے گا۔ کیا غلام کا یہ جواب گستاخی نہ ہوگا؟ اسی طرح ہم خدا کے غلام ہیں۔ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اس سے کچھ معاوضہ مانگیں۔

بوستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص عبادت کرتا تھا آواز آئی کہ قبول نہیں ہوتی مگر وہ عبادت میں مشغول رہا۔ ایک مرید نے پیر سے کہا کہ ایسی عبادت سے کیا فائدہ جو مقبول نہیں ہوتی۔ پیر نے کہا، اے برخوردار ؎

توانی ازاں دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اگر دوسرا دروازہ ہوتا تو میں وہاں چلا جاتا۔ دروازہ ہی ایک ہے اس سے علیحدہ ہو کر کہاں ٹھکانا ہے۔ اس پر فوراً آواز آئی ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہِ دیگر نیستت

بیعت کی حقیقت

کانپور میں ایک بزرگ تھے شاہ غلام رسول رسول نما۔ وہ اپنی توجہ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے لوگ گزرے ہیں۔ وہ لکھنؤ اپنے مرشد کے پاس گئے بیعت ہونے کے لئے مرشد نے استخارہ کے لئے فرمایا۔ شاہ صاحب وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر جا بیٹھے پھر حاضر ہو گئے۔ مرشد نے کہا، یہ کیسا استخارہ تھا؟ کہا کہ میں نے بیعت ہونے کے لئے نفس سے کہا کہ بیعت بک جانے کو کہتے ہیں، تو آزادی کو چھوڑ کر غلام بنتا ہے کیوں بیوقوف ہوا ہے۔ نفس نے جواب دیا کہ، جانے کے بعد خدا تو ملے گا۔ میں نے کہا کہ کیا تیرا جاتا ہے اگر نہ ملا نفس نے کہا اگر نہ ملیگا تو بلا سے۔ مگر اسے خبر تو ہوگی کہ ہم کو کسی نے طلب کیا تھا

مگر ہم نہ ملے سے

ہمیتم بس کہ داند ما ہرویم — کہ من نیز از خریداران اویم

مولوی صاحب نے فرمایا، جزاک اللہ! ایسا استخارہ کسی نے نہیں کیا۔
ہر کام میں مقصود کام ہی ہونا چاہیئے خواہ ثمرہ ملے یا نہ ملے۔ ہر حالت میں راضی رہنا چاہیے۔
اگر ایسا نہ کیا گیا تو تحبون العاجلہ میں من وجہ داخل ہو گے۔
مسلمانو! آخرت کے لئے عمل کرو ورنہ اس نکات میں داخل ہو جاؤ گے۔

دُنیا پر آخرت کی ترجیح

ترجیح الآخرۃ

شریعت نے تمتّع دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ ترجیح دنیا علی الآخرۃ سے منع کیا ہے۔ پس دنیا کو بقدرِ ضرورت طلب کرنا خواہ تجارت سے ہو یا ملازمت سے یہ حرام نہیں۔ ہاں! دین کو برباد کر کے دُنیا کمانا حرام ہے۔

آخرت کی فضیلت پر یہ وعظ باغ عبدالباقی خان واقع الہ آباد میں شب دوشنبہ بعد عشاء ۱۰ شعبان سنہ ۱۳۴۰ھ کو قریباً ۵۰۰ کے مجمع میں کھڑے ہو کر فرمایا جو ڈھائی گھنٹے میں ختم ہوا۔ اور مولینا ظفر احمد صاحب تھانوی عثمانی نے اسے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا والاٰخرۃ خیر وابقیٰ ۝ ان ھٰذا لفی الصحف الاولیٰ ۝ صحف ابراھیم وموسیٰ ۝

حق تعالیٰ کا شکوہ

ان آیتوں میں سے مجھے اوّل آیت کا بیان کرنا مقصود ہے اور اخیر کی دو آیتیں اسی پہلی آیت کی تاکید میں ہیں اس لئے میں نے بھی تاکید اُن کو پڑھ دیا ہے ورنہ مقصود پہلی آیت ہے کیونکہ وہی اصل ہے اور یہ دونوں اس کی تابع ہیں۔ پس بیان میں بھی ان کے ساتھ متبوع وتابع کا سا برتاؤ کیا جائے گا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہماری ایک حالت کا بیان فرمایا ہے۔ پھر اس پر شکایت فرمائی ہے۔ اور جس طرح اس حالت کے درجات مختلف ہیں کہ اس کا ایک درجہ کفّار کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک درجہ اہل ایمان واہل کفر دونوں میں مُشترک ہے۔ اسی طرح شکایت کے بھی درجات مختلف ہیں۔ بڑے درجہ میں زیادہ شکایت ہے اور چھوٹے درجہ میں کم لیکن چونکہ چھوٹا درجہ اہل ایمان اور کفّار میں مشترک ہے اس لئے اس درجہ میں شکایت مُشترک ہے۔

اب سنیئے وہ حالت کیا ہے اور اس پر شکایت کیا ہے حق تعالے فرماتے ہیں بل
تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا۔ اس میں لفظ بل اعراض کے لئے ہے یعنی پہلی بات سے اعراض
کر کے اس کے مقابل دوسری بات کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے:
قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی
اس میں فلاح کا طریقہ بتلایا ہے کہ بامراد ہوا وہ شخص جو قرآن سن کر خبیث عقائد واخلاق
اور ناشائستہ اعمال سے پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔ اس کے
بعد لفظ بل اعراض کے لئے لایا گیا ہے یعنی مگر اے منکرو! تم قرآن سن کر اس سے نہیں مانتے
اور آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ حاصل یہ ہوا
کہ فلاح کے مقابل ہماری یہ حالت ہے گو اس میں مقابلہ کی تصریح نہیں مگر لفظ بل مقابلہ
کو بتلاتا ہے کیونکہ وہ موضوع ہے اعراض کے لئے جس کی حقیقت ہے پہلے کی نفی اور
دوسرے کا اثبات۔ اور اثبات و نفی میں تقابل ظاہر ہے۔ پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ
دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا فلاح کے خلاف ہے اور اس سے فلاح مبدل بہ خسران ہو
جاتا ہے۔ پس ہماری وہ حالت یہ ہے کہ ہم کو اپنی فلاح کا اہتمام نہیں اور اس پر خدا تعالیٰ
کی شکایت یہ ہے کہ تم دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔

پس یہ مضمون نہایت قابل اہتمام ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس جگہ جو شکایت بیان فرمائی
ہے وہ معمولی شکایت نہیں بلکہ اس کا نتیجہ فلاح سے محرومی اور خسران میں مبتلا ہونا ہے
اول تو خود حق تعالیٰ کا شکایت فرمانا ہی ہمارے اہتمام کے لئے کافی محرک ہونا چاہیے اور
ہم کو ڈرنا چاہیے کہ شاید حق تعالیٰ ہماری ہی شکایت فرما رہے ہوں۔ اور یہ کیا تھوڑی بات
ہے کہ احکم الحاکمین کو کسی سے شکایت ہو۔ ایک ادنیٰ حاکم کسی کی شکایت کرتا ہے تو اس کا
کیا حال ہوتا ہے۔ پھر مسلمان کو خدا کی شکایت سن کر ضرور بیدار ہو جانا چاہیے خصوصاً
جب کہ وہ شکایت ایسی بات کے متعلق ہے جس کا نتیجہ ہمارے ہی حق میں مضرت رساں
ہے، خدا تعالیٰ کا اس سے کوئی ضرر نہیں۔

اور ہر چند کہ مخاطب اس آیت کے بظاہر کفار ہیں مگر اس سے ہم کو بے فکری اور

جسارت نہیں ہوسکتی کیونکہ دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے کے درجات مختلف ہیں۔ کفّار میں اس کا بڑا درجہ ہے اس لئے ان سے شکایت بھی بڑی ہے اور ہمارے اندر اس کا چھوٹا درجہ ہے تو ہم سے شکایت گو کم درجہ میں ہے مگر ہے ضرور۔ کیونکہ جب منشا موجود ہے تو شکایت ضرور ہوگی۔ بس یہ سمجھ کر ہم کو جسارت نہ کرنا چاہیے کہ اس کے مخاطب کفّار ہیں اور ہمارے اندر اس درجہ کی غفلت نہیں جس درجہ کی کفّار میں ہے کیونکہ جب ہمارے اندر بھی کسی درجہ کی غفلت موجود ہے تو اس سے بے فکری نہیں ہوسکتی۔

مُضرشئے کے درجات

دنیوی معاملات میں غور کرلیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جس مضرشے میں مختلف درجات ہوں ان میں یہ کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ درجہ اعظم کو چھوڑ کر عظیم کو اختیار کیا جاتا ہو عشاق کا مذاق تو سب سے الگ ہے۔ اُن کو تو خدا تعالیٰ کی ادنیٰ ناگواری بھی پہاڑ معلوم ہوتی ہے مگر شکم پروروں کو ادنیٰ درجہ میں شاید کچھ گنجائش معلوم ہوتی ہو لیکن اعظم اور عظیم میں تو یہ لوگ بھی ایسا نہیں کرتے کہ اعظم کو چھوڑ کر عظیم کو گوارا کرلیں اور ادنیٰ درجہ میں بھی جو گنجائش ان کو نظر آتی ہے وہ دین ہی میں نظر آتی ہے ورنہ دنیا میں تو وہ ادنیٰ درجہ کی مضرت سے بھی ویسے ہی احتیاط کرتے ہیں جیسی بڑے درجہ کی مضرت سے احتیاط کی جاتی ہے مثلاً یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی شخص اپنے چھپّر میں بڑا انگارا پھینکنے سے تو احتیاط کرتا ہو اور چھوٹی چنگاری سے احتیاط نہ کرتا ہو بلکہ دونوں سے یکساں احتیاط کیجاتی ہے اسی طرح مٹی کے تیل میں دیا سلائی چھوڑ کر کوئی مطمئن نہیں ہوتا حالانکہ دیا سلائی اس میں گر کر بعض دفعہ خود ہی گُل ہوجاتی ہے مگر پھر بھی احتیاط کیجاتی ہے کیونکہ جتنے لوگ جلے ہیں وہ تنور یا انجن ہی کی آگ میں جل کر نہیں مرے بلکہ اکثر ایک دیاسلائی ہی نے کام تمام کر دیا ہے۔ اسی لئے عقلاء ایک چنگاری سے ویسا ہی حذر کرتے ہیں جیسا تنور یا انجن سے کرتے ہیں بلکہ چنگاری سے بچنے کی زیادہ تاکید کرتے ہیں کیونکہ نادان آدمی اس کو خفیف سمجھ کر اس سے احتراز کم کرتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے کسی عاقل کو انجن یا تنور کی آگ سے

احتیاط کی تعلیم کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ اس تعلیم کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو ہر شخص خود ہی بچتا ہے۔ ہاں ڈبیہ اور چنگاری سے احتیاط کی تاکید کرتے ہمیشہ اپنے بڑوں کو بہت دیکھا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مضرت کا ادنیٰ درجہ زیادہ قابل اہتمام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی لوگوں سے خلوت کو منع کرنے میں زیادہ سخت الفاظ نہیں فرمائے اور نامحرم اقارب سے خلوت کے بارے میں ارشاد ہے الحمو الموت یعنی کسی نے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! عورت اگر اپنے دیور کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے تو کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ تو موت ہے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ اس کو لوگ خفیف سمجھتے ہیں اور خفیف سمجھ کر اس سے احتیاط نہیں کرتے اور تربیت کا اصول یہ ہے کہ لوگ جس مضرت کو خفیف سمجھیں، مربی وحکیم اس سے زیادہ ڈرایا کرتا ہے۔

اب نفس کا یہ عذر غلط ہوگیا کہ اس کے مخاطب تو کفار ہیں کیونکہ معلوم ہوگیا کہ تقدیم دنیا علی الآخرت کے مختلف درجے ہیں۔ کفار میں بڑا درجہ ہے ان کو اس سے منع کیا گیا۔ اور تمہارے اندر چھوٹا درجہ ہے تم کو اس سے منع کیا جاتا ہے شکایت کی علت اور منشاء میں غور کرنا چاہیے۔ جب وہ موجود ہے تو شکایت بھی ضرور ہوگی۔ پھر جس درجہ کو آپ کم سمجھتے ہیں وہ مضرت اعظم کے سامنے صغیرہ ہے مگر فی نفسہٖ صغیرہ نہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود
لیک بس عالی ست پیش خاک تود

یعنی آسمان عرش کے سامنے چھوٹا ہے لیکن فی نفسہٖ چھوٹا نہیں۔ زمین سے تو ہزاروں درجے بڑا ہے۔

غفلت کا درجہ

اسی طرح گو ہمارے اندر جو درجہ غفلت کا ہے وہ اس غفلت سے کم ہے جو کفار میں ہے مگر فی نفسہٖ یہ خود بھی عظیم ہے جس نے ہمارے دین کو ناقص اور مردہ بنا رکھا ہے لہٰذا اس کے مخاطب ظاہر میں گو کفار ہی ہیں مگر اشتراک علت کی وجہ سے جہاں جہاں یہ علت

موجود ہوں گی سب ہی مخاطب ہوں گے۔ اگر مسلمانوں کو اس کا مخاطب بالکل نہ مانا جائے تب تو یہ بات اور بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں سے اس امر کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ان کا اسلام ہی اس سے رد کنے کے لئے کافی ہے مستقل خطاب کی ضرورت نہیں۔ اور صدور نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا صادر ہونا مسلمان سے عقلاً ممتنع ہے بلکہ ممتنع عادی مراد ہے کہ مسلمان سے اس کا صدور عادۃً ممتنع ہے اور شریعت میں اس نکتہ کا بہت لحاظ کیا گیا ہے کہ جو امور مخاطب سے عادۃً ممتنع الصدور رہوں۔ ان سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا کہ اس سے تو یہ خود ہی بچیں گے۔

مثلاً زنا اور چوری سے منع کیا گیا۔ شراب پینے پر وعیدیں بیان کی گئیں لیکن شرب بول (پیشاب پینے) واکل غائط (پاخانہ کھانے) سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا کیونکہ عادۃً مسلمان بلکہ صحیح الحواس سے یہ فعل ممتنع ہے۔ اس سے بچنے کے لئے اس کا اسلام و صحتِ حواس خود زاجر ہے، خطابِ مستقل کی کیا ضرورت ہے اور ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ میں نہی کے معنی یہی زاجر ہونا ہے۔

نماز سے فواحش کا سدِّ باب

بعض لوگوں کو اس پر اشکال ہو جاتا ہے کہ نماز فحشاء والمنکر سے کیونکر روکتی ہے ہم تو نمازیوں کو فحش حرکات کرتے ہوئے ملاحظہ کرتے ہیں۔ ان صاحبوں کے نزدیک نماز کے منع کرنے کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ نماز حسّاً فحش کام سے روکتی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کی ہیئت ایسی ہے کہ اپنے اقتضاء سے فحشاء و منکر سے زاجر ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ قانون ڈکیتی سے منع کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب کون سمجھتا ہے کہ قانون ڈکیتی کا صدور نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قانون میں اس کی ممانعت ہے اور سخت سزا بتلائی گئی ہے۔ اب اگر کوئی قانون پر عمل نہ کرے تو اس سے یہ کلام غلط نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو اس آیت کا مخاطب نہ ماننے سے اس بات کو ماننا پڑے گا کہ

مسلمان سے اس کا صدور ہی نہیں ہو سکتا اس لئے نہی مستقل کی حاجت نہیں۔ تو اس طریق سے تو اس فعل کی قبح میں اور زیادہ شدت ہو گئی کیونکہ اب مطلب یہ ہوا کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا کافروں ہی کا کام ہے مسلمان کو اس کا اسلام ہی اس سے روکتا ہے اس لئے اس کو منی علیہ نہیں بنایا گیا تو اس سے صاف یہ لازم آیا کہ جو مسلمان ایسا کرتا ہے وہ کافروں کا کام کرتا ہے اور یہی مطلب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا:

من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر

یعنی جس نے نماز کو عمداً ترک کیا وہ کافر ہو گیا یعنی اس لئے کافروں کا کام کیا کیونکہ عادۃً مسلمان سے نماز کا ترک صادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس زمانہ میں واقعہ یہی تھا۔ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں

ما کان فرق ما بیننا وبین المنافقین ترک الصلوٰۃ

کہ ہمارے اور منافقوں کے درمیان میں نماز کا ترک کرنا ہی ما بہ الامتیاز تھا۔

تو یہ فقد کفر ایسا ہے جیسے ہم اپنے بیٹے کو کہیں کہ تو پورا چمار ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو چماروں کے کام کرتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تو واقع میں چمار ہے اسی طرح حدیث کا مطلب سمجھ لیا جاوے۔ غرض مسلمانوں کو اگر اس آیت کا مخاطب نہ مانا جائے تو عتاب اور زیادہ شدید ہوگا۔ اب یہ بہانہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس آیت کے مخاطب نہیں ہیں۔ یا تو کفار کے حق میں ہے۔ صاحبو! پھر تو اور زیادہ افسوس ہے کہ جو شکایت حق تعالیٰ کو کفار سے تھی آپ اسی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا نتیجہ

اب سمجھیے کہ وہ حالت ہماری کیا ہے جس کی حق تعالیٰ شکایت فرما رہے ہیں۔ وہ حالت یہ ہے کہ ہم دنیا کو آخرت پر مقدم کر رہے ہیں اور یہ مرض ایسا ہے کہ ہم اس کو مرض ہی نہیں سمجھتے اس میں عام ابتلاء ہو رہا ہے۔ گناہوں کی فہرست میں چوری، زنا، شراب خواری کو سب گنیں گے سود لینے اور رشوت لینے کو بھی گناہ سمجھیں گے۔ لیکن کہیں یہ بھی کسی ذہن میں آتا ہے کہ دنیا

کو آخرت پر ترجیح دینا بھی گناہ ہے۔ اس طرف کسی کو بھی التفات نہیں۔ اس کو گناہ تو کیا سمجھتے بلکہ بعض اوقات یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیا دار آدمی ہیں۔ ہم سے دنیا کو نہیں چھوڑا جاتا یہ کام تو انھی لوگوں کا ہے جو بیوی اور بچے نہ رکھتے ہوں۔ دنیا سے بالکل بے غرض ہوں۔

پس ترجیح دنیا علی الآخرت کے بعض افراد کو تو یہ لوگ گناہ ہی نہیں سمجھتے اور جس درجہ کو معصیت سمجھتے ہیں اس میں اپنے کو عاصی نہیں سمجھتے کیونکہ جب انھوں نے اپنے کو معذور سمجھ لیا تو معصیت کہاں رہی۔ ان لوگوں نے کسی سے سن لیا ہے کہ معذوری اور مجبوری کی حالت میں گناہ گناہ نہیں رہتا جیسے کسی نے ایک شخص کو دھمکی دی کہ شراب پیو ورنہ مار ڈالوں گا اور وہ دھمکی دینے والا ایسا کر بھی سکتا ہے تو اس صورت میں شریعت اس شخص کو حفاظتِ نفس کے لئے اجازت دیتی ہے کہ شراب پی لے۔ اس حالت میں شراب پینے سے تم کو گناہ نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ سن کر لوگ ہر جگہ اس کو جاری کرنے لگے اور بات بات میں اپنے کو معذور سمجھ کر گناہ پر دلیر ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس قانون شرعی کی تفسیر آپ نے خود ہی تو کی ہے مگر آپ کو اس کا کیا استحقاق ہے۔ آپ کو شریعت ہی کے اکراہ کے حدود بھی پوچھنا چاہیے۔ اکراہ کے باب میں فقہاء نے اس کے حدود بیان فرمائے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت میں اکراہ کا وہ کون سا درجہ ہے جس سے انسان معذور ہو سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جو تفسیر اکراہ کی آپ نے خود کی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بھائی سرحدی نے قانونِ ریلوے کی تفسیر کی تھی۔ کہ وہ ریل سے ایک من بھر کا کشمش کا بورا لے کر پلیٹ فارم پر آئے نکلا۔ جب پلیٹ فارم کے دروازہ پر پہنچا تو ٹکٹ بابو نے اس کو ٹوکا کہ ٹکٹ لاؤ۔ اس نے ٹکٹ دکھا دیا۔ بابو نے کہا کہ اس سامان کی بلٹی بھی دکھاؤ۔ اس نے پھر وہی ٹکٹ دکھا دیا۔ بابو نے کہا، یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے، سامان کا ٹکٹ دکھاؤ۔ سرحدی نے کہا کہ یہی ہمارا ٹکٹ ہے اور یہی سامان کا ٹکٹ ہے۔ بابو نے کہا، نہیں! یہ سامان پندرہ سیر سے زیادہ ہے۔ اس کے لئے جدا ٹکٹ کی ضرورت ہے۔ تو سرحدی صاحب کیا فرماتے ہیں کہ نہیں! ریلوے نے پندرہ سیر کا قانون اس لئے مقرر کیا ہے کہ ہندوستانی آدمی اس سے زیادہ نہیں

اٹھا سکتا۔ اور حقیقت میں اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ جتنا اسباب مسافر خود اٹھا سکے وہ معاف ہے اور جو اس سے زیادہ ہو جس کے لئے مزدور کی ضرورت ہو اس پر محصول لگایا جائے گا۔ چونکہ ہندوستانی آدمی پندرہ سیر سے زیادہ خود نہیں اٹھا سکتا اس لئے پندرہ سیر کی تعیین کر دی گئی اور ہم لوگ من بھر سے زیادہ خود اٹھا سکتے ہیں اس لئے ہمارا بھی پندرہ سیر سے اسیر محصول نہیں ہو سکتا تو کیا ریلوے کمپنی اس سرحدی کی اس تفسیر کو قبول کر سکتی ہے۔ ہرگز نہیں اور اسکے جواب میں یہ کہے گی کہ تم کو قانون کی تفسیر کرنیکا کوئی حق نہیں۔ قانون کا مطلب تم کو ہم سے پوچھنا چاہیے۔

اسی طرح قانون شرعی کی تفسیر کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں اور نہ آپ اس تفسیر کی بنا پر معذور ہو سکتے ہیں۔ غرض لوگوں نے اپنے دل میں یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے میں مجبور ہیں۔ اس لئے اس کو معصیت ہی نہیں سمجھتے اور اگر معصیت سمجھتے بھی ہیں تو نہایت ہی کم درجہ کی اور گناہ کبیرہ کو صغیرہ سمجھنا یہ خود معصیت ہے۔

جیسے کوئی شخص ڈکیتی کو دو لعت میں خیانت کرنے پر قیاس کرنے لگے اور یہ سمجھے کہ خیانت مذکورہ میں بھی دوسرے شخص کے مال کو ضائع کرتا ہے اور ڈکیتی میں بھی اس لئے یہ دونوں ایک درجہ کے جرم ہیں۔ تو حاکم وقت اس شخص پر دخل اندازی قانون کا جرم قائم کر دیگا اور یہ کہیگا کہ جب قانون میں ڈکیتی اور خیانت کی سزائیں مختلف ہیں کہ ڈکیتی میں عبور دریائے شور یا چودہ برس کی قید سخت ہے اور خیانت میں یہ نہیں تو تم کو دونوں کے برابر کرنے کا کیا استحقاق ہے؟ تم قانون میں دخل بے جا کرتے ہو۔

اسی طرح شریعت میں جب ہر گناہ کی سزا الگ ہے تو سب کو برابر سمجھنے کا کسی کو حق نہیں اور اگر کوئی کبیرہ کو صغیرہ سمجھے گا اس پر دوسرا جرم تحریف شریعت کا قائم ہوگا۔ اس لئے فقہا نے تصریح کی ہے کہ معصیت کو خفیف سمجھنا معصیت بلکہ یہ قریب کفر ہے۔

آخرت سے بے فکری کا نتیجہ

حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں کہ تم ترجیح دنیا علی الآخرۃ کے مرض میں مبتلا ہو۔ فرماتے ہیں: بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا (ای علی الآخرۃ ۱۲) والآخرۃ خیر و ابقیٰ۔

بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت دنیا سے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے یعنی تم اس کی کوشش کرتے ہو کہ دنیا میں عیش و عشرت اچھی طرح ہو آخرت چاہے کیسی ہی برباد ہو جائے۔ اس جگہ آخرت کے متعلق ایک لفظ تو خیر کا فرمایا ہے جو کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے مطلب یہ ہوا کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور بہت بہتر ہے۔ دوسرا لفظ ابقیٰ فرمایا کہ وہ بھی اسم تفضیل ہے کہ آخرت بہ نسبت دنیا کے پائیدار بھی ہے مگر پھر بھی تم دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہو اور آخرت سے بے فکر ہو۔

حالانکہ ایک امر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ آخرت میں بے فکری کے ساتھ دنیا اور گندی ہو جاتی ہے چنانچہ میں آگے بتلاؤں گا کہ آخرت فی نفسہ بھی قابلِ اہتمام تو ہے ہی مگر اس لئے بھی قابل اہتمام ہے کہ دنیا کی بھی حلاوت اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ آخرت کی فکر ہو اور جو لوگ آخرت سے بے فکر ہیں بخدا ان کو دنیا کا بھی لطف حاصل نہیں ہوتا (یہ مضمون بالکل اخیر میں بہت ہی مختصر مذکور رہا۔ غالباً ارادہ مفصل بیان کرنے کا تھا مگر یاد نہیں رہا۔ جامع)۔

اب سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی اس شکایت کے ہم مصداق ہیں یا نہیں، تو کفار کا مصداق شکایت ہونا تو ظاہر ہے مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمان بھی آج کل اس شکایت کا مصداق بنے ہوئے ہیں ہر شخص اس مرض میں مبتلا ہے کہ اس کو بہ نسبت آخرت کے دنیا کا زیادہ اہتمام ہے یہ تو میں نہیں کہتا کہ مسلمانوں کو آخرت کا اعتقاد نہیں یا وہ اعتقاداً آخرت کو دنیا سے کم سمجھتا ہو۔ ہاں کفار کا یہ اعتقاد ہو سکتا ہے کیونکہ بعض کفار تو سرے سے آخرت ہی کے منکر ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی مٹی میں مل جاتا ہے۔ نہ اس کو کسی جگہ عذاب ہو گا نہ ثواب۔ اور بعض کفار کو آخرت کا اعتقاد اگر ہے بھی تو وہ ایسا اعتقاد ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا تھا۔ اس کے ایک دم تھی اور ایک سونڈ تھی۔ اس تفسیر سے ہر شخص سمجھ لیگا کہ اس نے بادشاہ کو ہرگز نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کس الابلا کو دیکھ لیا ہے اسی طرح جو کفار آخرت کے معتقد ہیں وہ اس کے متعلق ایسے خرافات بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے معتقد نہیں کسی دوسری چیز کے معتقد ہیں۔ اس لئے ان کا اعتقاد عدم اعتقاد کے حکم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری کوشش دنیا ہی میں صرف ہو جاتی ہے۔ آخرت کی ان کو ذرا فکر نہیں۔

تو مسلمانوں کی یہ حالت تو نہیں ہے۔ وہ آخرت کے معتقد بھی ہیں اور آخرت کا علم بھی ان کو صحیح طور پر حاصل ہے اور اس کو دنیا سے افضل بھی سمجھتے ہیں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کا عمل اس اعتقاد کے موافق نہیں۔ وہ صرف اعتقاد آخرت ہی کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں اس سے عمل میں کام نہیں لیتے۔ ہر چند کہ اعتقاد کی خود بھی ضرورت ہے اور وہ فی نفسہ بھی مقصود ہے مگر اعتقاد کی ایک غایت اور بھی ہے یعنی شریعت نے جو اعتقادیات کی تعلیم دی ہے اس سے دو مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ فی نفسہ ان امور کا اعتقاد رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ ان سے عمل میں کام لیا جائے کیونکہ یہ بات تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اعتقاد کو عمل میں بہت دخل ہے۔ ایک عارف فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش	چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس	ہمیں است بنیاد توحید و بس

توحید کامل کا اثر

دیکھئے اس میں توحید کو اعمال میں مؤثر بتلایا گیا ہے کہ جب توحید کامل ہو جاتی ہے تو اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ خدا کے سوا کسی سے رجا و خوف نہیں رہتا۔ ایک آیت میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے اور حدیث کے مل جانے سے تو تصریح ہو گئی۔ آیت یہ ہے:

فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔ یعنی جس شخص کو خدا تعالیٰ سے ملنے (اور انکے پاس جانے کا) اعتقاد ہو اس کو نیک عمل کرنے چاہئیں اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ حدیث میں اس جملہ لا یشرک کی تفسیر میں لا یرائی وارد ہوا ہے یعنی عبادت میں شریک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ریا نہ کرے اور یہ تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گویا حق تعالیٰ کی تفسیر ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود	گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اب اس آیت میں دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اعتقاد لقاء رب کو عمل صالح میں بہت دخل ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے فمن کان یرجوا لقاء ربہ پر فلیعمل عملاً

صالحاً کو مرتب فرمایا ہے اور شرط و جزا میں علاقہ سببیت کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم
ہوا کہ اعتقاد وحدانیت رب کو زوال ریا میں بھی دخل ہے کیونکہ ولا یشرک بعبادۃ ربہ کو
بھی من کان یرجوا لقاء ربہ پر مرتب کیا گیا ہے۔ پس اعتقاد کو نفس عمل میں بھی دخل
ہوا اور کمال عمل میں بھی۔ اور آیت میں ریا کو جو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے
کہ حقیقت ریا کی یہ ہے کہ عبادت کو کسی کے دکھلانے کے واسطے کیا جاوے اور ظاہر ہے کہ
جس کو دکھلانا مقصود ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ عبادت میں مقصود ہے، تو اس شخص نے عبادت
میں خدا کے ساتھ دوسرے کو بھی اور یہ شرک فی القصد ہے اس لیے ریا کو
حق تعالیٰ نے شرک فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ توحید صرف لا معبود الا اللہ کا نام نہیں یعنی توحید صرف اس کا نام
نہیں کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھے بلکہ لا مقصود الا اللہ بھی کمال توحید ہے یعنی خدا تعالیٰ
کے سوا کسی کو مقصود بھی نہ سمجھے۔ اور جب خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ سمجھے گا تو اب اس کو کسی پر
نظر نہ رہے گی کسی سے خوف و طمع ہوگی۔ اسی کو ان عارف نے بیان فرمایا ہے

موحد چہ بر پائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جو شخص ریاکار ہوگا اسی کو مخلوق سے امید و ہراس بھی ہوگا اور جو
ریا سے پاک ہوگا اس کو کسی سے امید و ہراس بھی نہ ہوگا کیونکہ اسے غیر حق پر نظر ہی نہ ہوگی
غرض اس آیت و حدیث کے ملنے سے یہ معلوم ہوا کہ اعتقاد کو عمل اور درستی عمل میں بڑا دخل ہے
جیسا کہ پہلے مسئلہ آیت سے معلوم ہوا تھا۔ پھر تو ہر جگہ یہی سمجھ میں آوے گا وہ آیت یہ ہے
لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتکم۔ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے فرمایا
ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتب من قبل ان نبراھا
ان ذلک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتکم
(کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب لوح
محفوظ میں (پہلے سے) لکھی ہوئی ہے)۔

تقدیر کی حقیقت

اس میں حق تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ جو کچھ تم کو پیش آتا ہے سب سے پہلے مقدر ہو چکا ہے۔ آگے ارشاد ہے: ان ذلک علی اللہ یسیر۔
"بے شک یہ خدا تعالیٰ پر آسان ہے"۔ (کیونکہ اس کو علم غیب حاصل ہے تو پہلے سے آئندہ ہونے والے واقعات کا لکھ دینا اسے کچھ مشکل نہیں) آگے فرماتے ہیں: لکیلا تاسوا علی ما فاتکم
اس میں لام کے ہے جس کے متعلق کی ضرورت ہے جو یہاں مذکور نہیں بلکہ مقدر ہے۔ یعنی واخبرناکم بذلک لکیلا تاسوا علی ما فاتکم اور ہم نے تم کو یہ بات بتلا اس واسطے دی تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے (عافیت یا اولاد و مال و جاہ) تم اس پر رنج نہ کرو۔ اور جو چیز خدا نے تم کو دی ہے اس پر اتراؤ نہیں کیونکہ مصیبت کے وقت جب اس مضمون کا استحضار ہو گا کہ یہ پہلے ہی سے مقدر تھی۔ تقدیر میں اسی طرح تھا اس سے رنج میں کمی ہو جائے گی۔ اور نعمت کے متعلق جب یہ سمجھ لیا جاوے گا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل سے پہلے ہی اس کو میرے واسطے مقدر کر دیا تھا۔ اس سے ناز و عجب پیدا نہ ہو گا۔ کیونکہ اترائے تو وہ جس کا استحقاق ذاتی ہو یا اپنے آپ اس نے نعمت کو حاصل کیا ہو۔ اور جب دوسرے کے حکم و مشیت سے ایک چیز ملی ہے اس پر اترانے کا کیا استحقاق ہے تو اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر کے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے تاکہ اس اعتقاد کی بدولت مصیبت میں صبر کی توفیق ہو اور راحت میں عجب و دلال نہ پیدا ہو اس سے صاف معلوم ہوا کہ امور اعتقادیہ کو وجود اعمال و صلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔

شریعت میں اعتقاد کا درجہ

اور شریعت کا مقصود یہ ہے کہ اعتقادیات سے عمل میں بھی کام لینا چاہیے چنانچہ اسی مقصود کو سمجھ کر محدثین نے یہ کہا ہے کہ اعمال ایمان کا جز ہیں اور اعمال کے کم و بیش ہونے سے ایمان میں بھی زیادت و نقص ہوتا ہے (اور معتزلہ و خوارج نے تو یہاں تک ترقی کی کہ ایمان بدون عمل کے کوئی چیز نہیں) مگر محققین کے نزدیک گو اعمال ایمان کا جزو نہیں ہیں

مگر مکمل ایمان ضرور ہیں۔ پس ہر چند کہ ایمان عقائد ہی کا نام ہے مگر ان کے کمال و ضعف کا مدار اعمال پر ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مقاصد میں ہمیشہ درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے درجہ ضعف پر کوئی اکتفا نہیں کیا کرتا۔ چنانچہ مقصد دنیویہ میں ہر شخص درجہ کمال ہی کا طالب ہے اس سے معلوم ہوا کہ محض عقائد کی تصحیح کافی نہیں بلکہ تصحیح اعمال بھی ضروری ہے ورنہ بدون تصحیح عمل کے عقیدہ بھی کامل نہ ہوگا۔ دنیا کے کاموں میں مشاہدہ اس کا کر لیا جائے۔

دیکھئے اگر آپ کسی شخص سے یہ کہیں کہ زید تیرا باپ ہے اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب محض یہ نہیں ہوتا کہ دل میں اس کے باپ ہونے کا اعتقاد کر لیا جائے بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ تم کو اس کے ساتھ ادب و تعظیم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اگر مخاطب اپنے باپ کے ساتھ ادب و تعظیم کا برتاؤ نہ کرے تو آپ اس کو ملامت کریں گے کہ کم بخت میں نے تم کو جتلا دیا تھا کہ زید تیرا باپ ہے پھر بھی تو نے اس کی تعظیم کا حق ادا نہ کیا۔

معلوم ہوا کہ امور اعتقادیہ سے محض اعتقاد مطلوب نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقتضا پر عمل کرنا بھی مطلوب ہوتا ہے اور اگر عمل اس کے موافق نہ ہو تو اس اعتقاد کو کالعدم سمجھا جاتا ہے ان مقدمات کے بعد میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اگرچہ آخرت کا اعتقاد ہے اور اس کو دنیا سے افضل بھی سمجھتے ہیں مگر ان کا عمل اس اعتقاد کے موافق نہیں ہے۔ پس بقاعدہ مذکورہ یہ کہنا صحیح ہے کہ انکو آخرت کا اعتقاد کامل طور پر نہیں کیونکہ جس اعتقاد کے موافق عمل نہ ہو وہ اعتقاد ناقص ہے۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مضمون کس قدر سچا ہے اور ہمارا اعتقاد و عمل موافق نہ ہونا ہماری حالت سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال میں جس وقت دنیا و آخرت کا تعارض ہوتا ہے وہاں دنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دی جاتی ہے مثلاً نماز کے وقت اپنی دکان پر کوئی خریدار آ گیا تو اس وقت عموماً نماز میں تاخیر کر دی جاتی ہے اور دنیا کے نفع کو مقدم کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی ترجیح ہے آخرت پر۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کی ممانعت

اسی طرح اگر کوئی حسین صورت نظر پڑ گئی۔ اس وقت ایسے لوگ بہت کم ہیں جو آخرت کے

خیال سے نگاہ نیچی کرلیں۔ اکثر لذتِ نفس کے لئے اس کو گھور گھور کر دیکھتے رہنا۔ یہ بھی اسی گناہ کی مد ہے کہ آخرت سے دنیا کو مقدم کیا گیا۔ پھر کوئی تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ آخرت کو دنیا پر مقدم کریں۔ یہ کام تو بزرگوں کا ہے۔ تو یہ لوگ تو گناہ کر کے اس کو گناہ گار بھی نہیں سمجھتے اور بعض لوگ گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں مگر دل کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ بعد میں توبہ کر لیں گے اس غلطی میں بہت کم لوگ مبتلا ہیں مگر یاد رکھو یہ سراسر دھوکا ہے نفس کا

ہم نے مانا کہ توبہ گناہ کے لئے تریاق ہے مگر تریاق کے بھروسہ زہر کھا لینا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو سنکھیا اس بھروسہ پر کھاتا ہو کہ میرے پاس تریاق ہے بعد میں اسے کھا لونگا اور اگر کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو اسکو سب لوگ بیوقوف بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زہر کا ضرر تو فی الحال تھا اور تریاق کا نافع ہونا فی المآل تھا اور وہ بھی موہوم کیونکہ ممکن ہے کہ زہر کا اتنا قوی اثر ہو جائے جو تریاق سے بھی زائل نہ ہو یا زہر کا اتنا فوری اثر ہو جائے کہ تم کو تریاق کھانے کی نوبت ہی نہ آوے۔

اسی طرح توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا بھی سراسر حماقت ہے کیونکہ معصیت کا ضرر فی الحال ہے اور توبہ کا نفع فی المآل ہے اور وہ بھی موہوم۔ کیا خبر اس گناہ کے بعد حیات بھی ہے یا نہیں چنانچہ بعض لوگوں کے واقعات سنے گئے کہ وہ عین حالت زنا میں مر گئے۔ گناہ سے فارغ ہونے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ دوسرے ایک مرتبہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر کے پھر اس گناہ کا چسکا پڑ جاتا ہے پھر توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ توبہ کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ آئندہ کے لئے پختہ عزم کیا جائے کہ پھر یہ گناہ کبھی نہیں کریں گے محض لفظی توبہ قابلِ اعتبار نہیں کہ اے اللہ میری توبہ! گناہ کے بعد جب اس کا چسکا لگ جاتا ہے تو توبہ کے وقت نفس یہ کہتا ہے کہ اس توبہ سے کیا نفع۔ کیونکہ کام تو پھر بھی کرنا ہے۔ تو اب توبہ بھی گئی۔ اس وقت نفس یہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کام سے جی بھر جاوے تو سب گناہوں سے اکٹھی توبہ کر لیں گے مگر یہ وعدہ بھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ حدیث میں ہے کہ گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے جو بار بار گناہ کرنے سے بڑھتا رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

ہر گناہ زنگیست بر مرآۃ دل	دل شود زیں زنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی	نفس دوں را بیش گردد خیرگی

تو اس زنگ کی ظلمت اتنی غالب ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور اگر کوئی اس سے توبہ کے لئے کہے بھی تو وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ میاں اتنے گناہوں کے سامنے بیچاری توبہ کیا کرے گی۔ اب اس کو رحمت خداوندی سے مایوسی ہوجاتی ہے۔

چنانچہ بعض محتضرین[1] کو لوگوں نے کہا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلو۔ انہوں نے یہی جواب دیا کہ میاں اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیونکر مٹا سکتی ہے۔ پھر ظالم اسی حالت میں بدون توبہ کئے مر گئے تو آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا بڑا نفس کا دھوکا ہے کہ توبہ کے بھروسہ گناہ کی رغبت دلاتا ہے۔

صاحبو! خدا سے ڈرو اور نفس کے اس دھوکا میں نہ آؤ۔ حدیث میں ہے کہ اے عائشہ گناہوں کو حقیر نہ سمجھو حقیقت میں جو لوگ توبہ کے بھروسہ گناہ پر دلیری کرتے ہیں وہ گناہوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ غرض ہر شخص کے پاس معصیت کے اختیار کرنے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کو ہی ایک سبب اور داعی موجود ہے کوئی اس سے بچا ہوا نہیں۔ الا ماشاء اللہ ہر شخص کچھ نہ کچھ سبب نکال لیتا ہے۔ کوئی اپنے کو معذور سمجھ لیتا ہے کوئی توبہ کا سہارا ڈھونڈھ لیتا ہے۔

مال وجاہ کے شعبے

اور یوں تو دنیا کے بہت شعبے ہیں مگر دو شعبے سب سے بڑے ہیں مال اور جاہ۔ مال اور جاہ کے حاصل کرنے کے لئے اکثر لوگ معصیت سے نہیں بچتے۔ آخرت کو برباد کر لیتے ہیں اور اگر یہ حضرات صوفی ہیں تو وہ معصیت کو طاعت اور دنیا کو دین بنانے کی کوشش کریں گے۔ مگر یاد رکھو! خدا کے سامنے یہ تاویلیں نہ چل سکیں گی۔ بہرحال لوگ طرح طرح کے اموال کے لئے دین کو برباد کر رہے ہیں۔ کوئی رشوت لیتا ہے۔ کوئی زبردستی اور جبر سے لوگوں کا مال وصول کرتا ہے۔ گو اس کا موقع ہر ایک کو نہیں ملتا۔ رشوت ستانی و ظلم کے اسباب ہر شخص کے پاس کہاں ہیں۔ البتہ ایک صورت تو بہت ہی کثیر الوقوع ہے جس میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ کسی کا روپیہ قرض لے کر ادا کرنے سے غافل ہیں۔ کسی کی چیز گھر میں آگئی تو اب اس کو پہنچانا نہیں چاہتے۔ میراث میں ایسے غلط سے کام کرتے ہیں۔ یہ تو ان کا حال ہے جو میراث کے مال کو چھپاتے نہیں اور بعض لوگ تو میراث کا مال چھپا ہی

---

[1] یعنی جو حالت نزع میں مبتلا تھے۔

لیتے ہیں۔ اگر کسی لڑکی کا انتقال ساس کے یہاں ہوا تو وہ اس کے برتن اور کپڑے اور زیور کو دبا لیتی ہے۔ ماں باپ کو تھوڑا سا دکھلا دیا کہ بس اس کے پاس تو یہی تھا اور اگر ماں باپ کے یہاں انتقال ہوا تو جو ان کے ہاتھ لگتا ہے وہ شوہر کو اس کی اطلاع نہیں کرتے۔ یہ تو بالکل گڑ گود رگو ہیں گفتگو تو ان لوگوں میں ہے جو چھپاتے اور دباتے بھی نہیں مگر خرچ کرنے میں بے احتیاطی وہ بھی کرتے ہیں یعنی بعد مردہ کے اوپر قیمتی دوشالہ ڈالا جاتا ہے پھر وہ غریبوں کو دیدیا جاتا ہے اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سب ورثہ کا مشترک تھا جس میں نابالغ بھی ہوتے ہیں۔ اور جو سب بالغ بھی ہوں تو وہ دل سے راضی نہیں ہوتے۔ پھر تیجی کی رسوم میں سارا خرچ مردہ کے ترکہ میں سے ہوتا ہے۔ خرچ ہوتا ہے سب ورثہ کے حصہ میں سے اور نام ہوتا ہے بڑے وارث کا۔

افتخار اور ناموری کے لئے تو اپنے مال کا خرچ کرنا بھی حرام ہے اور دوسروں کے مال سے نام کرنا تو اور زیادہ اشد ہے۔ پھر اس میں نابالغوں کا بھی حق ہوتا ہے اور بالغان بھی راضی نہیں ہوتے۔ اگر رضامندی ہوتی تو شکایت کیوں ہوتی۔ حالانکہ بعد میں تقسیم کے موقع پر شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ یہ خرچ تم نے خود کیا۔ ہم نے کب کہا تھا یہ ہمارے حصہ میں کیوں لگایا جا رہا ہے۔ اور اگر کسی نے بوجہ شرم کے کچھ نہ کہا تو اس سے رضامندی نہیں ہو جاتی۔ اگر تم کو ایسا ہی روپیہ اڑانا ہے تو سب کا حق نکال کر ان کے حوالہ کر دو، پھر اپنے حصہ میں سے جو چاہو کرو یا ان سے قرض لے لو اور بعد میں سب کا قرض ادا کر دو مگر وہ قرض کاغذی ہی نہ ہو بلکہ واقعی قرض ہونا چاہیئے ورنہ آخرت میں ماخوذ ہو گے۔

حدیث میں ہے کہ مقروض جنت سے محبوس رہتا ہے جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ ہو۔ یہ وعید ایسے ہی قرض کے بابت ہے جو محض کاغذی ہو، جس کے ادا کرنے کی نیت نہ ہو نیز ناگزیر دنیاوی ضرورت کا قرض اس سے مستثنیٰ ہے۔ ضرورت کا قرض وہ ہے جس کے بغیر ضرر ہو یا تکلیف ہو۔ سو رسوم کرنے میں تمہارا کیا ضرر ہے۔ پھر مردہ کے کپڑے تقسیم کرنے میں سخاوت سے کام لیتے ہیں قیمتی قیمتی کپڑے بھی

خیرات کر دیتے ہیں حالانکہ بعض ورثاء ان کو خیرات کرنا نہیں چاہتے اور افسوس یہ ہے کہ لینے والے بھی تفتیش نہیں کرتے کہ جو کپڑے ہم لے رہے ہیں اس میں سب ورثاء راضی ہیں یا نہیں اور اپنا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ذمہ چھان بین کرنا نہیں ہے۔ ان کی ایسی بندش کو عقل نہیں آتی چھان بین کی وہاں ضرورت نہیں جہاں شبہ نہ ہو بلکہ قوی شبہ ہو وہاں اسکی ضرورت ہے کہ تفتیش سے کام لیا جائے جس تفتیش کی ضرورت نہیں وہ یہ ہے کہ ایک شخص آپ کی دعوت کرے جس کی آمدنی بظاہر حلال ہے وہاں آپ یہ پوچھیں کہ گوشت کہاں سے آیا دام کہاں سے آئے یہ البتہ آپ کے ذمہ نہیں لیکن جہاں شبہ قوی ہو وہاں ضرور تفتیش سے کام لینا چاہیے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ تحقیق کرے تو دوسرے اقرار اس کی اس کوشش کو ناکام کرتے ہیں۔

ایک موقع کا واقعہ ہے کہ ایک زمیندار ایک بی بی اور دو نابالغ لڑکیاں چھوڑ کر مر گئے۔ بی بی نے ان کے کپڑے یہاں بھیجے یہاں سے کہہ کر واپس کر دیئے گئے کہ ان میں نابالغوں کا حق ہے۔ اتفاق سے وہاں ایک دہلی کے صاحب جو واقع میں بھی اچھے سمجھ دار ہوتے وہ کپڑے ان کے سامنے پیش کئے گئے اور یہاں کا عذر بھی بیان کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آخر ان لڑکیوں کی شادی میں بھی تو ماں ہی ان لڑکیوں کے حق سے زیادہ ہی صرف کرے گی تو اس کے مال ان کپڑوں کی قیمت ادا ہو سکتی ہے پس اس تاویل سے قبول فرما لیا یہ تو علماء کی حالت ہے کہ نہ خود تفتیش کریں اور نہ تفتیش کرنے والے کی تحسین کریں بلکہ اس کی کوشش کو مٹانا چاہتے ہیں۔

عوام کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے ایک قاعدہ کلیہ نکال لیا ہے کہ جب کسی مسئلہ یا عمل میں علماء کا اختلاف ہو تو جدھر زیادہ ہوں وہ حق ہے۔ نہ معلوم یہ قاعدہ کہاں سے نکالا ہے حالانکہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کثرت ادلہ سے ترجیح نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر ایک مقدمہ میں دو گواہ ایک طرف ہوں اور سو گواہ ایک طرف ہوں تو حاکم اسلام دونوں کو برابر سمجھے گا۔ یہ کوئی وجہ ترجیح نہیں کہ ایک طرف دو اور ایک طرف سو۔ البتہ شریعت میں اجماع حجت ہے۔ مگر اجماع اس کا نام نہیں کہ ایک طرف زیادہ جماعت ہو تو بس وہ اجماع ہو گیا فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ ایک معتبر عالم کی مخالفت بھی قادح اجماع ہے۔

وجہ علماء کے ان حالات سے عوام کو جرأت ہوتی ہے اور وہ بھی احتیاط نہیں کرتے اور صاف کہتے ہیں کہ اگر یہ احتیاط ضروری ہوتی تو مولوی لوگ کیوں چندے لیتے ہوئے تفتیش کیوں نہ کرتے اسی طرح کسی سے کوئی چیز مانگ کر لاویں گے تو جب تک خود ہی نہ مانگے اس وقت تک دینا نہیں جانتے

بدونِ رضامندی کسی چیز کا استعمال جائز نہیں

کسی نے آپ کے یہاں کھانا بھیجا اور آپ کی خاطر سے چینی یا تانبے کے برتن میں بھیجا تو اب برتن کو واپس کرنا جانتے ہی نہیں۔ بے فکرے گھر میں ڈال لیتے ہیں اور انہیں اس میں کھانا کھاتے ہیں حالانکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس برتن میں کھانا بھیجا جاوے اس کھانے کو دوسرے برتن میں نکال کر رکھنا چاہیے اسی برتن میں کھانا ناجائز ہے۔ ہاں اگر وہ ایسا کھانا ہے جس کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے اس کی لذت جاتی رہے یا صورت بگڑ جاتے تو اس کو اسی برتن میں کھانا جائز ہے جیسے فیرنی کو طشتری میں جما کر بھیجا تو اس کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے صورت خراب ہو جاتی ہے۔ فیرنی کا لطف یہی ہے کہ جس برتن میں اس کو جمایا گیا ہے اسی میں کھایا جاوے۔ لوٹ پوٹ کرنے سے بدنما ہو کر اس کی طرف رغبت ہو جاتی ہے۔ ہاں کوئی بہت ہی بھوکا ہو تو ہر حالت میں رغبت ہو سکتی ہے۔

جیسے ایک لطیفہ ہے کہ کسی عورت نے فیرنی پکا کر کسی طباق میں جمائی، خود کسی کام کو چلی گئی چھوٹے بچے کو نگرانی کے لیے بٹھا گئی۔ ایک کتا آیا اور ایک طرف منہ ڈال کر کھانے لگا۔ بچہ غافل تھا پھر اس کو ہٹایا۔ ماں آئی تو سب واقعہ سنایا۔ اس نے ایک دوسرے برتن میں فیرنی کو لوٹ کر بچے سے کہا، جا مسجد کے ملا کو دے آ۔ اس نے جا کر حوالہ کی۔ ملا جی کو بھلا فیرنی کہاں نصیب ہوتی تھی، لیتے ہی فوراً ادھر ہی سے جدھر سے کھائی ہوئی تھی لگے ہاتھ مارنے۔ لڑکے نے کہا، ملا جی ادھر سے نہ کھانا۔ ادھر تو کتا منہ ڈال گیا تھا۔ ملا جی نے جو یہ قصہ سنا برتن کو اٹھا کر دور پھینکا کہ جا کم بخت! کتے کے آگے کا میرے واسطے۔ پھینکنے سے پیالہ پھوٹ گیا۔ لڑکا رونے لگا کہ میری ماں مجھے مارے گی۔ ملا جی نے کہا تجھے کیوں مارے گی۔ کہنے لگا، اس برتن میں میرے چھوٹے بھائی کا گو اٹھاتی تھی۔ ملا جی کو یہ سن کر اور غصہ آیا۔ لگے قے کرنے

تو کوئی اس ملا جی کی طرح بھوکا ہو، وہ تو البتہ فرنی میں ہر طرح کے ہاتھ مارنے لگے گا۔ ورنہ عموماً فرنی تو اسی برتن میں کھایا جاتا ہے جس میں اس کو جمایا جاتا ہے تو ایسی چیز کو بھیجنے والے کے برتن میں کھا لینا جائز ہے ورنہ نہیں اور یہ فقہاء کے اس قول کا ظاہر ہے کہ کسی کی چیز کا استعمال بدون رضامندی کے جائز نہیں اور برتن میں بھیجنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس میں کھانے کی بھی اجازت ہے۔ ہاں جس چیز کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے اس کی کیفیت بگڑ جاتی ہے۔ (لطف جاتا رہتا ہے) اس میں دلالۃً اس کی بھی اجازت ہے کہ میرے ہی برتن میں کھاؤ۔ پس میں اس مسئلہ کو علماء اہل علم پر رکھتا ہوں۔ باقی صورت مسئلہ یہ غالباً اس وقت کے عرف پر ہوگی۔ اس زمانہ میں کھانا بھیجنے والے اپنے برتن میں کھانے کی اجازت دیتے ہوں گے لیکن ہمارے یہاں کا عرف یہ ہے کہ جو شخص کسی کے یہاں کھانا بھیجتا ہے اس کی طرف سے یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ اسی کے برتن میں کھا لیا جاوے لیکن یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ کھانا کھا کر پھر دوسرے وقت بھی اسے استعمال کرے اور استعمال بھی مہینہ مہینہ تک۔ پھر غضب یہ کہ ایک گھر میں جب کسی کا برتن آجاتا ہے پھر وہ کسی کے یہاں کھانا بھیجنا چاہیں تو اپنے برتن میں نہیں بھیجتے بلکہ دوسرے کے برتن میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے کے یہاں جا کر عرصہ تک پڑا رہتا ہے۔ پھر غاصب ثانی صاحب کے یہاں سے کوئی چیز اسی برتن میں اصل مالک کے یہاں گئی تو اس وقت آپس میں نزاع ہوتا ہے۔ اصل مالک کہتا ہے کہ یہ میرا برتن ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ واہ! یہ تو مہینوں سے ہمارے یہاں پڑا ہے اب کسی کو یاد نہیں کہ یہ برتن کس کے یہاں سے آیا اور مالک کے گھر سے کس کے پاس گیا تھا۔ اب نزاع دور کرنے کے لئے ایمان کی قسم لی جاتی ہے۔ قرآن کی قسم لی جاتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی معاشرت ہے۔

واللہ! بہت گندی معاشرت ہو رہی ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کو سختی کے ساتھ تاکید کیا کرے کہ جب کسی کے یہاں سے کھانا آیا کرے فوراً اس کا برتن ساتھ کے ساتھ واپس کر دیا کریں۔ بحمد اللہ مجھے اس کا بہت ہی اہتمام رہتا ہے جب تک دوسرے کا برتن واپس نہیں ہو جاتا مجھے چین نہیں آتا۔ یہ تو عوام کی حالت ہے۔

اہل علم کی یہ حالت ہے کہ کسی کی کتاب لے لی تو اب اس کو واپس دینے کا نام جانتے ہی

نہیں ملتا کتاب دینے والا اگر کثیر المشاغل ہو تو اس کو یاد بھی نہیں رہتا کہ مجھ سے کتاب کس نے مانگی تھی بس مطلقہ بسر کے بعد وہ سمجھ لیتا ہے کہ کتاب چوری ہو گئی اور لینے والا بے فکر ہو گیا کہ دو تو مانگتے ہی نہیں۔ اب گویا وہ ان کی ملک ہو گئی۔ پھر ان میں بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی چیز تو روپے کی چپاتی پر سوار ہو کر لیتے ہیں اور دوسروں کی چیز دینے میں لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اور بعضے دینے میں بھی لاپرواہ ہوتے ہیں اور اپنی چیز لینے میں بھی لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اس کو لوگ بزرگ سمجھتے ہیں کہ بڑا زاہد ہے۔ ایسی تیسی ایسے زاہد کی۔ یہ شخص خدا کا مجرم ہے اپنی چیز کے وصول کرنے میں تو لاپرواہ ہونا تو عیب نہیں مگر دوسروں کی چیز واپس کرتے میں لاپرواہ ہونا بڑا گناہ ہے۔ آج کل لوگوں نے گویا بے ڈھنگے پن کا نام بزرگی اور زہد رکھ لیا ہے حالانکہ اہل اللہ بڑے منتظم ہوتے ہیں۔ دوسروں کا حق کبھی نہیں رکھتے۔

ہمدردی کرنے اور قرض دینے کا نتیجہ

اسی طرح بعض لوگ قرض میں گڑبڑ کرتے ہیں کہ کسی کا روپیہ لے کر ایسا بھولتے ہیں کہ گویا دینے کا نام ہی نہیں جانتے۔ اپنے سارے کام اللے تللے سے چلاتے ہیں مگر قرض کے ادا کرنے کی فکر نہیں۔ اسی واسطے مسلمانوں میں ہمدردی نہیں رہی۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ موجود ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی کو قرض دے دیں اپنے آپ حفاظت سے بچیں اور دوسرے کا کام نکل جائے مگر کس کو دیں۔ لوگ قرض لیکر دینے کا نام ہی نہیں لیتے اسی لئے قرض بے سودی آجکل نہیں ملتا کیونکہ اس کے ادا کی فکر ہی نہیں ہوتی۔ ہاں بنیوں کا قرض خوب یاد رہتا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی تمسک لکھوا لیتے ہیں اور سودی قرض خوب دل کھول کر دیتے ہیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دو تین سال میں سود در سود ملا کر ایک ہزار کے چار ہزار وصول کر لیتے ہیں۔ بس اس سے سب خوش ہیں۔ استغفر اللہ العظیم۔ اگر لوگوں کو بے سودی قرض کا بھی ایسا اہتمام ہوتا جیسا سودی قرض کا ہوتا ہے تو آپس ہی میں مسلمانوں ہی سے روپیہ مل جایا کرتا اور مسلمانوں کی جائدادیں اس طرح ہندوؤں کے ہاتھ میں نہ پہنچتیں۔

امانت کے بارے میں بھی بہت گڑبڑ ہے۔ کسی کے پاس امانت رکھوا کر کبھی اطمینان نہیں ہوتا کہ وہ امانت کو بعینہٖ رکھے گا۔ اکثر لوگ امانت کا روپیہ اپنے کام میں خرچ کر دیتے ہیں۔ چار پانچ سو کی امانت خرچ کر گئے اور اس کے ادا کی کچھ فکر نہیں۔ اب وہ روپیہ والا غریب ان سے مانگتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی وہ تو خرچ ہو گئے جب ہوں گے دے دیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب آپ نے امانت کے روپے کیوں خرچ کیے جہاں سے ہو میری رقم ادا کیجیے۔ تو کہتے ہیں کہ صاحب مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے ضرورت میں آپ کی رقم خرچ کر دی۔ اب اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ کہاں سے لا دوں۔ یہی کہنا ہوا کہ رقم نہ ہوگی مگر اس غریب روپے والے کا تو یہ سن کر پانی نکل گیا ہوگا۔

چندوں کا غبن

سب سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ لوگ مسجدوں تک کا چندہ کھا جاتے ہیں۔ ایک شخص مسجد کے لئے چندہ کیا کرتا تھا۔ جہاں تھوڑا بہت جمع ہو گیا اسے چٹ کر کھا پی لیا، پھر چندہ مانگنے لگا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ پہلا روپیہ کہاں گیا تو قسم کھا کر کہہ دیتا کہ مسجد میں لگا دیا۔ اس کے ایک پڑوسی نے کہا کہ ظالم تو جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر مسجد میں تو کہاں لگاتا ہے۔ تو آپ نے اس سے کہا کہ آؤ میرے ساتھ چلو دکھلاؤں۔ پھر مسجد میں جا کر روپیہ کو دیوار سے لگا دیا اور کہا کہ اس پر قسم کھایا کرتا ہوں کہ مسجد میں لگا دیا بس دیوار سے روپیہ کو لگا دیتا ہوں۔

یہ حالت ہے آجکل چندہ کرنے والوں کی۔ اسلامی چندوں کا نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب۔ ہر شخص جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ یاد رکھو بعض کتب فقہ میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلہ میں جو غالباً تین پیسہ کا ہوتا ہے سات سو مقبول نمازیں لی جائیں گی۔ دنیا میں گلچھرے اڑا لو آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔

واقعی ہندوستان کے چندہ دینے والے بڑی ہمت کے لوگ ہیں کہ ہمیشہ آئے دن چندے دیتے رہتے ہیں اور یہ لوگ سب کو دیتے ہیں۔ خیر ان لوگوں کو تو ثواب مل ہی جاتا

سے کیونکہ ان کی نیت تو اچھی ہی ہوتی ہے مگر چندہ لینے والے آخرت میں خوب سزا بھگتیں گے
جو اس طرح بے دریغ مسلمانوں کا روپیہ برباد کرتے ہیں۔

ہاں! ایک صورت میں چندہ دینے والوں کو بھی ثواب نہیں ہوتا، بلکہ یہ معلوم ہو جائے کہ
شخص جس کام کے لئے چندہ کر رہا ہے اس میں نہ لگائے گا۔ اس وقت دینے والوں کو بھی گناہ
ہوگا کیونکہ اس شخص کو چندہ مانگنا حرام ہے اور لوگوں کے دینے سے اس کی جرأت بڑھتی ہے
اور حرام کی اعانت بھی حرام۔ افسوس! لوگ کس کس طرح مخلوق کو دھوکا دیتے ہیں مگر یاد رکھو!
خدا کے یہاں دھوکا نہ چل سکے گا۔

زینہار از آں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

مولانا فرماتے ہیں:

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست — با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن — رایت اخلاص و صدق افراشتن

مجھے خود ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک مقام پر ایک مدرسہ کا جلسہ تھا اس میں میرا
بیان تھا۔ وہ زمانہ چندہ بلقان کا تھا۔ بعد جلسہ کے کسی نے مختصراً اس کی بھی تحریک کر دی
اس پر ایک تحصیلدار پنشنر نے اس چندہ میں سو روپے دیئے۔ میں باہر جا رہا تھا، چند آدمی
ایک جگہ باتیں کرتے نظر آئے دریافت پر یہ قصہ معلوم ہوا۔ میں نے جزاک اللہ کہہ دیا۔
بس یہ میرا جرم تھا جس پر انھوں نے مجھ کو بعد میں پریشان کیا۔

قصہ یہ ہوا کہ ان تحصیلدار صاحب نے جن لوگوں کو چندہ دیا تھا انکو مجبور کیا کہ
میرے سو روپیہ کی رسید علیحدہ منگا کر دو۔ انھوں نے اس درخواست کو لغو سمجھ کر کچھ توجہ
نہ کی جب وہ مایوس ہو گئے چونکہ میں نے جزاک اللہ کہا تھا اس جرم میں وہ میرے سر
ہوئے اور میرے پاس خط آیا کہ مجھے سو روپیہ کی رسید منگا دو۔ میں نے بواسطہ ایک
دوست کو لکھا کہ جن کو تم نے چندہ دیا ہے ان سے رسید مانگو۔ مجھ سے کیا واسطہ!
انھوں نے پھر مجھے لکھا کہ یا تو رسید منگا دو ورنہ روپیہ واپس دو، نہیں تو عدالت

میں دعویٰ کر دونگا۔ میں نے چندہ کرنے والوں کو لکھا کہ اس شخص کا روپیہ واپس کر دو۔ معلوم ہوا کہ وہاں تو خرچ روانہ ہو گیا۔ میں نے دفع فتنہ کے لئے سو روپے اپنے پاس سے ایک دوست کے پاس واپس بھیج دیئے کہ ان کو دیدیں۔ مگر وہاں کے میرے دوستوں نے ان کو اپنے پاس سے رقم ادا کر دی اور میری رقم واپس کرنا چاہی میں نے انکار کیا۔ جب جانبین سے اصرار و انکار بڑھا۔ آخر سب کے اتفاق سے وہ رقم ایک نیک کام میں لگا دی گئی۔

تو اس وقت ایک عالم صاحب نے مجھے رائے دی تھی کہ تم نے اپنے پاس سے کیوں دیا اس میں اور چندہ بھی تو آرہا تھا۔ اس میں سے بھیج دیتے میں نے کہا، مجھے آپ کے اس فتویٰ پر حیرت ہے۔ یہ مجھے کہاں جائز ہے کہ میں دوسروں کا روپیہ اس شخص کو دوں، جن لوگوں نے اس دا چندہ دیا ہے بھلا آپ ہی سوچیں کہ اگر آپ چندہ میں روپیہ دیں اور میں اس کو اس طرح خرچ کر دوں تو کیا آپ کو یہ گوارا ہو گا۔ ہرگز نہیں۔ پھر دوسروں کی رقم میں آپ مجھے یہ رائے کس طرح دیتے ہیں؟ اور تعجب یہ کہ وہ عالم مدرس بھی تھے اور صاحب فتویٰ بھی تھے۔

دین کو مصالح کے تابع بنا دیا گیا ہے

اس طرح سے آج کل لوگوں نے دین کو اغراض و مصالح کے تابع بنا رکھا ہے۔ ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک مجتہد عالم صاحب نے ساس کو حلال کر دیا۔ ایک شخص کو اپنی ساس سے تعلق ہو گیا تھا۔ تو اس نے بیوی کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنا چاہا۔ علماء سے فتویٰ لیا سب نے یہی کہا کہ ساس سے نکاح حرام ہے مگر ایک عالم نے ایک ہزار روپیہ لے کر فتویٰ دیدیا کہ حلال ہے مگر چونکہ ساس کا حرام ہونا نص قطعی سے ثابت ہے وامہات نسائکم اس لئے آپ نے تاویل نکالی کہ آجکل عورتوں میں جہالت زیادہ ہے جس کی وجہ سے بعض کلمات انکی زبان سے ایسے نکل جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایمان زائل ہو جاتا ہے۔ تو اس کی منکوحہ کی زبان سے ایسے کلمات نکلے ہونگے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان نہیں ہوئی اس لئے منکوحہ سے اس کا نکاح درست نہیں ہوا۔ جب نکاح درست نہیں ہوا تو منکوحہ کی ماں اسکی ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہا حرمت مصاہرت کا مسئلہ یہ محض امام ابو حنیفہؒ کا مسئلہ ہے ہم اس کو

نہیں مانتے۔ حدیثیں اس کے خلاف ہیں۔

غرض اس نے گڑھ گڑھ کر سانس کو حلال کر دیا محض اس لئے کہ اس کو ایک ہزار روپیہ ملتا تھا۔ کم بخت حرص نے اس عالم کو تحریف دین پر آمادہ کر دیا۔ یہ حرص بڑی بلا ہے۔ اس میں انسان جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔

ایک اور نکتہ قابل یاد رکھنے کے ہے۔ وہ یہ کہ یہ حرص اہل اسراف کو زیادہ ہوتی ہے اور بخیل کو صرف اپنے مال کی حرص ہوتی ہے۔ دوسروں کے مال میں بخیل آدمی بڑا متقی ہوتا ہے۔ وہ کسی کے مال کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ اور یہ اہل اسراف تو دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے ہیں۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ آج کل اسراف کرنے سے بخیل ہونا اچھا ہے۔ اسراف کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں سو یہ ضرر لازمی ہے متعدی نہیں۔ اسی طرح بعض آدمی لوگوں سے ادھار لے کر ادا کرنا نہیں جانتے

مظفر نگر میں ایک شخص نے ایک سوداگر سے دس روپیہ قرض لئے کہ مجھے ضرورت ہے اس بیچارہ نے دیدیئے پھر وہ حضرت روپیہ ہضم کر کے بیٹھ گئے سوداگر نے تقاضا کیا تو پہلے ٹال ٹپ لے ٹالا۔ پھر سال بھر کے بعد کہنے لگا کہ جاؤ کیسا قرض لئے پھرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس میری کوئی تحریر ہے؟ اگر ہے تو دکھاؤ ورنہ جاؤ، میں نہیں دیتا۔ اب وہ بیچارا تحریر کہاں سے دکھاتا۔ اس نے تو اس کے اعتبار پر دیسے ہی روپیہ دیدیا تھا۔ اب اس شخص کی حرکت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ کے لئے اس نے قرض نہ دینے کا عہد کر لیا۔ غرض معاملات میں ایسی ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ میں ان کو بیان نہیں کر سکتا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

خواص کی خرابیاں

ایک دو باتیں ہوں تو بیان بھی کی جائیں۔ یہاں تو سر سے پیر تک حالت خراب ہو رہی ہے۔ عوام و خواص سبھی کے معاملات گندے ہیں۔ خواص تک کی یہ حالت ہے کہ جب وہ کسی کے یہاں مہمان ہونے میں تو کھانے کے وقت دوسرے لوگوں کو بلا بلا کر کھانے میں شریک کرتے ہیں۔ اول تو دوسرے لوگوں کو چاہیئے کہ کھانے کے وقت خود ہی وہاں سے

الگ ہو جائیں لیکن اگر وہ الگ نہ ہوں تو مہمان کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ سب کو بلا کر شریک کرے۔ آخر تم کو کیا حق ہے کہ دوسرے کے دسترخوان پر بدون اس کی اجازت کے لوگوں کو بٹھلاؤ۔

رہا یہ کہ میزبان اس سے خوش ہوتا ہے، اس کو ناگوار نہیں ہوتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہر شخص اپنے مہمانوں کے اندازے سے کھانا پکاتا ہے۔ جب زیادہ آدمی بیٹھ جائیں گے تو اس کو ضرور ناگوار ہوگا اور اگر اس کو ناگوار نہ ہو تو اس کے گھر والوں کو ناگوار ہوگا کیونکہ ان کو اپنے لئے از سر نو انتظام کرنا ہوگا بلکہ عورتوں کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے واسطے تو اہتمام گوارا نہیں کرتیں۔ اگر کسی وقت کھانا نہیں بچتا تو وہ خود فاقہ کر لیتی ہیں اور اپنے گھر والوں کی کلفت کسی کو گوارا نہیں ہوتی۔ مگر اس کی خواص کو بھی پروا نہیں۔ وہ دسترخوان پر بیٹھ کر ساری مجلس کو شریک کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاضرین کو نہ بلانا اور تنہا کھانا کھانا شرم کی بات ہے۔

افسوس! ان کو خدا سے شرم نہیں آتی۔ اگر ایسی ہی شرم ہے تو ان کو بازار سے اپنے دام خرچ کر کے کھانا منگانا چاہیے۔ پھر اختیار ہے کہ جتنے آدمیوں کو چاہو بلا لو۔ مگر ان شاء اللہ جس دن اُن سے ایسا کرنے کیلئے کہا جاوے گا اس دن ایک کو بھی نہ بلاویں گے۔

ایک مرتبہ میرے یہاں ایک عالم مہمان تھے۔ گھر سے ان کے لئے کھانا گیا اور یہ قاعدہ ہے کہ مہمان کے سامنے کفایت کی مقدار سے کچھ زیادہ ہی بھیجا جاتا ہے۔ تو کھانا زائد دیکھ کر وہ عالم صاحب ایک دوسرے شخص کو جو میرا مہمان نہ تھا کھانے میں شریک کرنے لگے۔ میرے ملازم نے کہا، یہ کھانا آپ کی ملک نہیں بلکہ اس کی اباحت کی گئی ہے جتنا آپ خود کھالیں، باقی جو بچے گا وہ گھر میں واپس جائیگا۔ دوسرے کو اس میں شریک کرنے کا آپ کو حق نہیں تو وہ عالم کہنے لگے کہ میں گھر سے اور کھانا نہ منگاؤنگا دونوں اسی میں سے کھالیں گے اور جتنا کھانا میرے واسطے گھر سے آگیا ہے اس میں مجھے اختیار ہے چاہے سب کھاؤں یا کچھ چھوڑ دوں یا کسی کو کھلادوں۔

میرے ملازم نے کہا کہ گھر میں سے مہمان کے سامنے ہمیشہ زیادہ ہی کھانا آتا ہے کہ اسے کم نہ پڑے۔ باقی اس میں مہمان کی تملیک نہیں کیجاتی ہے محض اباحت ہوتی ہے۔ اگر آپ خود سارا کھا جائیں اس کی تو اجازت ہے مگر دوسرے کو شریک کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ اور اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو فلاں شخص سے (یعنی احقر) سے پوچھ لیجئے۔ کہنے لگے ہاں! پوچھوں گا۔

حالانکہ یہ مسئلہ بالکل ظاہر تھا۔ درسی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ پوچھنے ہی کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی ان عالم صاحب کو اس کا خیال نہ ہوا اور میرے ملازم کو بے حیا بن کر کہنا پڑا۔ پھر تماشا یہ کہ پوچھا بھی نہیں۔ آخر میں نے خود ہی متنبہ کیا۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ اباحت میں کھانا مالک کی ملک میں رہتا ہے۔ اگر مالک لقمہ اگلوانا چاہے تو اس کو اس کا بھی حق ہے۔ البتہ تملیک کی صورت میں وہ کھانا لینے والے کی ملک ہو جاتا ہے جیسے تقریبات کے اندر کھانا گھروں میں بھیجا جاتا ہے وہ ملک ہے۔ باقی مہمان کے سامنے جو کھانا آتا ہے وہ اس کی ملک نہیں ہوتا وہ محض اباحت ہے کہ جتنا تم کھا سکو کھا لو باقی مالک کو واپس کر دو۔ مگر آجکل بعض اہل علم تک کو بھی اس کا لحاظ نہیں۔

اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ یہ امور شرفاء کے اندر تو فطری ہوتے ہیں۔ ان کو دوسرے کے مال میں تصرف کرتے ہوئے خود ہی حجاب آتا ہے اور چھوٹی قوموں کے اندر حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس وقت شرفاء نے علم دین کی طرف توجہ چھوڑ دی ہے چھوٹی قوموں کے لوگ زیادہ پڑھتے ہیں تو ان کے اخلاق تو ایسے ہی ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ نے خاص خاص قوموں میں خاص خاص خاصیتیں رکھی ہیں۔ اسی لئے نواب سعادت علی خاں کی عادت تھی کہ وہ بعض قوموں کو ملازم نہ رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ قومیں رشوت خوار زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک شخص جو اسی قوم کا تھا اس کو ملازمت کی ضرورت ہوئی تو سعادت علیخاں کو درخواست دی۔ انھوں نے وہی عذر کیا تو آپ نے اس قاعدہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ شعر لکھا ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد   خدا پنج انگشت یکسان نہ کرد

مطلب یہ تھا کہ تم جو ان قوموں کے سب لوگوں کو یکساں سمجھتے ہو یہ غلط ہے سب برابر نہیں ہوتے۔ سعادت علی خاں نے لطیفہ کے طور پر جواب میں لکھا۔ لیکن بوقت خوردن ہمہ یکساں می شوند۔ یعنی تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا نے پانچوں انگلیاں برابر پیدا نہیں کیں یہ درست ہے مگر کھانے کے وقت سب برابر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ لقمہ سب کے سروں کو برابر ملا کر ہی لیا جاتا ہے بس میاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے۔

اصلاح اخلاق کی ضرورت

میں تو یہ کہتا ہوں کہ علماء کو اصلاح اخلاق کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ہمارے

نواح میں ایک بزرگ کسی رئیس کے یہاں مدعو تھے۔ کھانے کے وقت ان کو بلایا گیا تو ان کے اہل مجلس سب ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اس بارہ میں گاؤں والے بہت اچھے ہوتے ہیں کہ کھانے کا نام سنتے ہی اٹھ بھاگتے ہیں۔ جب وہاں سب جا کر بیٹھے تو میزبان نے تواضع کے طور پر سب سے کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں۔ کھانا بہت ہے۔ کچھ لوگوں نے عذر کیا کہ ہم تو محض حضرت کے ساتھ چلے آتے تھے۔ ہم کھانا نہ کھاویں گے۔ میزبان خاموش ہو گیا تو وہ بزرگ صاحب فرماتے ہیں کہ جب ایک مسلمان محبت سے کہتا ہے تو تم انکار کیوں کرتے ہو سبحان اللہ! کوئی اس غریب کے دل سے پوچھتا کہ وہ کیسی محبت سے کہہ رہا تھا۔ وہ تو محض اس غیرت کے لحاظ سے کہہ رہا تھا کہ جب یہ لوگ میرے گھر پر کھانے کے وقت آگئے تو ان سے کھانے کے لیے نہ کہنا اور ان کی بات تک نہ پوچھنا عرفاً مذموم ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے دس پانچ آدمیوں کے کھانے کا انتظام کیا ہو وہ اتنے بڑے مجمع کو محبت سے کب مدعو کر سکتا ہے جو اس مثل کے موافق آگئے ہوں "مان نہ مان میں تیرا مہمان"۔

غرض ان بزرگ کے ارشاد سے سب لوگ ہاتھ دھو دھو کر بیٹھ گئے اور کھانا کم ہو گیا۔ پیچھے میزبان نے اپنے بھائی کے گھر سے منگایا وہ بھی کافی نہ ہوا۔ آخر بازار سے منگایا سب کے سامنے بے آبرو ہو گئی کہ ان کے گھر سے کھانا نہ نکلا اور سخت بے لطفی ہوئی۔ بعد میں بعضوں نے خود ان بزرگ کی شکایت کی کہ ان کو خدا کا خوف نہیں آیا کہ اتنے بڑے مجمع کو دوسرے کے گھر پر لا کھڑا کیا۔

صاحبو! بے ڈھنگی بات سے سب کو تکلیف ہوتی ہے گو کوئی شرم ولحاظ کی وجہ سے ظاہر نہ کرے۔ مجھے خود ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک انجمن میں مجھے بلایا گیا تو میں نے سفر خرچ کے سوا کچھ نہ لیا اور کرایہ بھی تیسرے درجہ کا لیا۔ وہ بھی انجمن سے نہیں بلکہ خاص داعی کی رقم سے جو کہ پہلے ہی شرط ٹھہر چکی تھی۔ وہ مجھے زائد دینے لگے میں نے انکار کیا۔ اور کھانے کے اندر بھی میں نے تکلف کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس برتاؤ سے انجمن والے بڑے خوش ہوئے اور میرے سامنے سیکرٹری انجمن نے ایک واعظ کی شکایت کی کہ صاحب وہ تو ایک دن میں گیارہ روپے کے پان کھا گئے۔ گیارہ روپے کے پان ایک آدمی تو بھلا

کیونکر کھا سکتا تھا۔ بس یہ ہوا کہ جتنے آدمی اُن سے ملنے آتے اُن سب کو خوب پان کھلاتے۔ اس وقت تو کسی نے کچھ نہ کہا مگر بعد میں شکایت زبان پر آہی گئی۔

میں نے دل میں کہا کہ آپ جو مجھ کو زیادہ رقم دیے رہتے تھے اگر میں لے لیتا تو کل کو آپ میری بھی یہی شکایت کرتے۔ اور واقعی میزبان کو جب کلفت ہوتی ہے تو شکایت دل میں آتی ہی ہے۔ اس لئے الحمدللہ کہ میں نہ پان کھاتا ہوں نہ چائے پیتا ہوں نہ ناشتہ کا عادی ہوں تاکہ میزبان کو کوئی کلفت نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ کھانے کے بعد یہ خیال کر کے کہ میزبان بے تکلفی سے خوش ہوگا، میں نے پان مانگ لیا مگر میزبان نے خوب ہی کیا کہ صاف جواب دیدیا کہ ہمارے یہاں پان نہیں ہے۔ کوئی کھاتا نہیں اور واقعی یہ پان کا خرچ بالکل ہی فضول ہے۔ اس میں میزبان کا اچھا خاصا خرچ ہو جاتا ہے اور احسان کسی پر نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں نے ایک ہی ٹکڑا کھایا تھا مگر سو آدمیوں کو ایک ایک ٹکڑا دینے میں میزبان کے تو روپے خرچ ہو جاتے ہیں، پھر کھانے کا تو وقت بھی مقرر ہے کہ دن رات میں دو وقت کھایا جاتا ہے پان کا کوئی وقت ہی نہیں۔ میرے خیال میں بعض دفعہ پان کا خرچ کھانے سے بھی بڑھ جاتا ہے اس لئے اس کو بالکل ہی حذف کر دینا چاہیے، اور اگر کسی مہمان کے واسطے پان آویں تو اس کو یہ جائز نہیں کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بھی کھلائے اور فرمائش کر کے ان کیلئے بھی پان منگائے۔ اس سے میزبان کو بعض اوقات ناگواری ہوتی ہے۔

اسی واسطے میری عادت ہے کہ جب میں سفر کرتا ہوں تو اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لیتا ہوں اور داعی کو پہلے سے اسکی اطلاع کر دیتا ہوں تاکہ وہ آزاد رہے۔ داعی پر صرف میرا اور اس آدمی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بعض دفعہ راستہ میں اگر لوگ محبت کی وجہ سے ساتھ ہو لیتے ہیں تو میں اُن سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنا انتظام خود کریں۔ جہاں میرا قیام ہوگا وہاں آپ قیام بھی نہ کریں بلکہ سرائے وغیرہ میں جہاں آسانی ہو وہاں ٹھہریں اور بازار سے اپنے کھانے کا انتظام کریں اور صبح و شام محض ملاقات کے لئے میرے پاس آجایا کریں جس سے میزبان کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ پھر اگر وہ از خود آپ کی دعوت کرے تو آپ اپنے تعلقات کو دیکھ کر دعوت منظور کریں یا رد کر دیں۔ میرے طفیلی بن کر کھانا نہ کھاویں۔

اور اگر کسی وقت میزبان مجھ سے کہنے لگتا ہے کہ آپکے ان ہمراہیوں کی بھی دعوت میں کرنا چاہتا ہوں تو میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ اگر آپ کو دعوت کرنا ہو تو خود ان سے کہئے اور محض اپنے تعلقات کی بنا پر جو چاہے کیجئے میرے اوپر اس کا احسان نہ ہوگا۔ میں ان سے کہنا نہیں چاہتا میری عام عادت یہی ہے ہاں اگر کوئی بہت ہی مخلص ہوتا ہے تو وہاں میں اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ جونپور میں بہت سے لوگ میرے ساتھ ہو گئے اور سب اپنا اپنا انتظام بازار سے کرتے تھے۔ میزبان چاہتے بھی تھے کہ سب میرے ہی یہاں کھانا کھاویں مگر میرے ساتھیوں نے منظور نہ کیا۔ ایک عالم مجھ سے جھگڑنے لگے کہ صاحب آپ اپنے ساتھیوں کو فرما دیجئے کہ آپ ہی کے ساتھ کھانا کھاویں اس میں میزبان کی دل شکنی ہوتی ہے۔ میں نے کہا مولانا بس آپ خاموش رہیں۔ میں اس رسمی دل شکنی کو اس حقیقی کلفت سے سہل سمجھتا ہوں جو اتنے مجمع کے انتظام سے میزبان کو اور ان کے گھر والوں کو پیش آئے گی اور کسی کسی کو ناگواری بھی ہوگی۔

اب سنئیے دوسروں کے گھر پر تو مولینا کی یہ رائے تھی مگر جب خود دعوت کی تو صرف میری اور ساتھیوں میں سے اپنے ایک قدیم دوست کی دعوت کی بقیہ ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ پوچھا اور عذر کرنے لگے کہ گھر میں علالت تھی اس لئے میں سب کو مدعو نہ کر سکا۔ میں نے دل میں کہا کہ دوسروں کے گھر پر رائے دیتے ہوئے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ شاید ان کے گھر پر بھی کوئی عذر ہو۔ پھر گھر نہیں پک سکتا تھا تو بازار میں تو پک سکتا تھا۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا کو میری دعوت کرنے کی ہمت بھی اسی لئے ہوئی کہ دیکھ لیا کہ میں ساتھیوں کو دعوت میں شریک نہیں کرتا۔ اگر سارے ساتھی میرے ساتھ دعوت میں شریک ہوا کرتے تو شاید وہ میری دعوت بھی نہ کرتے۔ اس لئے مشائخ و علماء کو ان باتوں کا بہت ہی خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے سب ساتھیوں کا بار میزبان پر نہ ڈالا کریں۔

غرض اموال میں بہت کم احتیاط کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری معاشرت نہایت خراب ہو رہی ہے اور اس کا منشا وہی ہے کہ ہم دنیا کو دین پر اور آخرت پر مقدم کر رہے ہیں۔

جاہ، مال سے زیادہ مرغوب ہے

اب ایک چیز رہ گئی جاہ، یہ مال سے بھی زیادہ مرغوب ہے کیونکہ جاہ کی حقیقت ملک قلوب ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ جو کام ہزاروں روپے خرچ کرنے سے بھی پورے نہ ہوں وہ صاحب جاہ کے زبان ہلانے سے نکل جاتے ہیں اور اصل میں جاہ محض اس وجہ سے مطلوب ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کی ایذا سے بچا رہے یعنی جاہ کا اصل نفع دفع مضرت ہے مگر آجکل اسکو جلب منفعت کیلئے آلہ بنایا جاتا ہے اور اس سے ہزاروں روپیہ کمایا جاتا ہے۔ غرض حب مال دنیا ہے تو حب جاہ دنیا کیوں نہ ہوگی۔ حدیث میں ہے: ما ذئبان جائعان ارسلا فی قطیعۃ غنم افسد لھما من حب المال والشرف للدین (او کما قال)

"یعنی دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلہ کو اتنا تباہ و برباد نہیں کرتے جتنا حب مال و حب جاہ دین کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔"

اس سے سمجھ لیجئے کہ حب جاہ دین کو کس قدر تباہ کر دیتا ہے۔ حقیقت میں جاہ حاصل کرنے کے لئے انسان وہ وہ کام کر گزرتا ہے جو تحصیل مال کے لئے بھی نہیں کرتا۔ تحصیل جاہ میں دین کو اچھی طرح برباد کیا جاتا ہے۔ رسوم و تقریبات میں ہزاروں روپیہ محض نام کے واسطے خرچ کئے جاتے ہیں۔ شادی اور غمی میں ایک شخص اپنی زمین و جائیداد تک بیچ ڈالتا ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ تو نے کیا حاصل کیا، کچھ بھی نہیں، صرف ایک نام خریدا جو اگر بیچا جائے تو دو کوڑی کو بھی نہیں بک سکتا۔

خیر یہ لوگ تو دنیا خرچ کر کے ایسی چیز خریدتے ہیں جس کو وہ خود بھی دنیا سمجھتے ہیں مگر بعض لوگ دین کی صورت بنا کر دنیا خریدتے ہیں۔ یہ ان سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ تو دنیا کو دنیا کی صورت سے حاصل کرتے ہیں، کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور یہ جماعت دنیا حاصل کرتی ہے دین کی صورت میں۔ اس سے لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ وہ خود بھی دھوکا میں رہتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم دین کا کام کر رہے ہیں چنانچہ تحصیل علم دین سب سے اعلیٰ چیز ہے مگر دیکھ لیجئے اس میں لوگوں کی کیا کیا نیتیں ہیں۔ اکثر کی نیت محض دنیا ہی کمانا ہوتا ہے۔ گو علم دین سے دنیا

بہت حاصل نہیں ہوتی ہاں گداگری آجاتی ہے کہ آتے دن مسلمانوں سے چندہ کا سوال ہوتا ہے جس سے بجائے عزت کے ذلت زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر پھر بھی بعض لوگ محض اسی نیت سے علم حاصل کرتے ہیں کہ عالم بن کر ایک مدرسہ مستقل قائم کر کے اس کے لئے چندہ کریں گے اور بعض لوگ چندہ بھی نہیں کرتے۔ ان کو مال اگرچہ کم ملتا ہے مگر جاہ زیادہ حاصل ہوتی ہے کیونکہ اب بھی مسلمانوں میں علماء کی قدر بحمد للہ بہت ہے بشرطیکہ وہ علماء کی طرز پر رہیں۔ گداگری نہ کریں۔ گو یہ علماء کا طرز زیادہ سے اختیار کریں اور ان کی نیت علم حاصل کرنے سے یہی ہو کہ مخلوق کی نگاہ میں ہماری عزت ہوگی مگر اس طرز استغنا کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے خواہ مخواہ عالم کی قدر ہوتی ہے تو بعض لوگ علم پڑھنے سے اگر چندہ کرنے کی نیت بھی نہ کریں مگر حصولِ جاہ کی نیت کرتے ہیں۔ یہ بھی دنیا ہی ہے۔

حُبّ جاہ کے نتائج

مگر دین کی صورت میں اس علم کا انجام یہ ہوگا کہ حدیث میں ہے:

یجاء بالشھید یوم القیامۃ فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال ما عملت فیھا قال قاتلت فیک حتی استشھدت قال کذبت ولکنک قاتلت لان یقال فلان جری فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار

یعنی شہید کو قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے لایا جائیگا پھر حق تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں بتلائیں گے جن کا وہ اقرار کریگا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تو نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا اے پروردگار! میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے۔ تو نے محض اس واسطے قتال کیا تھا تاکہ لوگ یوں کہیں کہ فلاں شخص بڑا بہادر ہے۔ دل کا مضبوط ہے۔ حاکم کے سامنے بڑی جرأت سے بیان دیئے کسی سے نہیں ڈرا اور جیل خانہ میں خوشی کے ساتھ چلا گیا سو دنیا میں تمہاری تعریف ہو چکی۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دو۔

ثم یجاء بالقاری قد تعلم العلم وعلمہ وقرأ القرآن فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال فما عملت فیھا قال تعلمت العلم وعلمتہ وقرأت فیک القرآن قال کذبت ولکنک قرأت لیقال انک قاری فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجہہ حتی القی

فی النار۔ پھر عالم کو لایا جائیگا جس نے علم حاصل کر کے دوسروں کو بھی پڑھایا تھا اور قرآن کو اچھی طرح پڑھا تھا۔ حق تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں جتائیں گے جن کا وہ اقرار کریگا۔ پھر ارشاد ہوگا کہ تم نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا کیا۔ وہ کہیگا کہ میں نے علم حاصل کیا اور لوگوں کو سکھایا اور آپ کی رضا کے لئے قرآن کو سیکھا۔ ارشاد ہوگا کہ تو جھوٹا ہے بلکہ تو نے محض اس لئے علم حاصل کیا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے۔ سو یہ سب کچھ ہو چکا۔ پھر اس کے لئے بھی یہی حکم ہوگا۔ چنانچہ منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔ یہ مولانا صاحب کی گت بنی جو بڑے نکتہ داں اور بڑے مدرس و مفتی تھے جن کے ہزاروں آدمی مرید و معتقد تھے اور مصافحہ کے وقت اُن کے ہاتھ پیر چومے جاتے تھے۔ ثم جاء بالجواد

پھر سخی کو بلایا جائیگا جس کو خدا تعالیٰ نے قسم قسم کی نعمتیں اور مختلف انواع کا مال عطا فرمایا تھا۔ حق تعالیٰ اس کے سامنے بھی اپنی نعمتیں گنائیں گے جن کا وہ اقرار کریگا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے کوئی موقع ایسا نہیں چھوڑا جہاں روپیہ کا خرچ کرنا آپ کو محبوب تھا مگر وہاں آپ کیلئے ضرور مال خرچ کیا۔ ارشاد ہوگا۔ تو جھوٹا ہے بلکہ تو نے یہ سب کچھ محض اس لئے کیا تاکہ لوگ یوں کہیں کہ فلاں شخص بڑا سخی ہے۔ پس تمہاری تعریف ہو چکی۔ پھر اس کے لئے بھی وہی حکم ہوگا چنانچہ اس کو بھی اوندھے منھ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

محض صورتِ دین کا نام دین نہیں

تو دیکھئے! شہید اور عالم اور سخی کی یہ گت کیوں بنی؟ محض اس لئے کہ انھوں نے خدا کے واسطے یہ کام نہ کئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض صورتِ دین کا نام نہیں بلکہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہونی چاہیے جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انساں بُدے ۔۔۔ احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بُدے

اگر محض صورتِ دین قابلِ اعتبار ہوتی تو قیامت میں شہید اور عالم اور سخی کی یہ گت نہ بنتی کیونکہ صورتِ دین کی تو ان کے پاس کمی نہ تھی مگر حقیقتِ دین سے وہ خالی تھے۔ یعنی اخلاص فی العمل سے اس لئے وہ صورت کچھ کام نہ آئی صورت اور حقیقت میں ایسا فرق ہے جیسے

ایک تو حقیقی شیر ہوتا ہے جس کی صورت سے تو کیا آواز اور بو تک سے تمام جانور کانپ جاتے ہیں اور جنگل کا جنگل بھر آجاتا ہے اور ایک مصنوعی شیر ہوتا ہے جیسے بعض جگہ محرم کے میں بعض لوگ شیر کی کھال پہن کر شیر بنتے ہیں۔ وہ ایسا شیر ہوتا ہے کہ اگر سامنے سے بھیڑیا یا باؤلا کتا آجاوے تو یہ شیر صاحب سب سے پہلے دُم دبا کر بھاگیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو دین کی صورت میں دنیا حاصل کرتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند　　نیستند آدم غلافِ آدم اند

جس طرح وہ مصنوعی شیر حقیقت میں شیر نہیں بلکہ غلافِ شیر ہے اسی طرح دنیا بصورتِ دین حقیقت میں دین نہیں بلکہ محض غلافِ دین ہے جیسے کوئی بدشکل بڑھیا عورت جوان عورتوں کا بھیس بدل کر عمدہ لباس پہن کر ایک مرد سے شادی کرے۔ ظاہر میں وہ جوان ہوگی لیکن جب لباس اتار کر دیکھا تو ماں کی بھی ماں نکلی ؎

پیس قامت خوش کہ زیرِ چادر باشد　　چوں باز کنی ماد مادر باشد

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بدون اخلاص کے دین کے کام کرتے ہیں ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل　　واندروں قہرِ خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　وز درونت ننگ میدارد یزید

مگر اس کا یہ مطلب نہیں صورت بالکل بیکار ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ محض صورت کافی نہیں بلکہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہونی چاہیے۔ دیکھو اگر کوئی یہ کہے کہ مٹی کا بنا ہوا آم بیکار ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آم کی صورت مطلقاً بیکار ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس صورت کے ساتھ اگر حقیقت بھی آم کی ہو اس وقت تو یہ صورت بھی اچھی ہے ورنہ مٹی کی صورت کو کوئی لیکر کیا کرے۔ چنانچہ حقیقی آم میں اس کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے۔ جہاں اس کی شیرینی اور لطافت کی تعریف کیجاتی ہے وہاں اس کی شوخیٔ رنگ اور چھلکے کی باریکی کی بھی تعریف ہوتی ہے اگر کوئی شخص ایک نہایت حسین عورت کا فوٹو آپ کو دے تو اس کو آپ فضول سمجھیں گے لیکن اگر ویسی ہی حسین عورت زندہ آپ کو مل جائے تو اس وقت آپ صورت کو ہرگز بیکار نہ سمجھیں گے۔ اسی طرح سمجھو کہ دین کی صورت بھی مطلوب ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ حقیقتِ دین بھی ہو جاوے

اگر حقیقت دین کے ساتھ صورت دین نہ ہو جیسے بہت لوگ باطن کے اچھے ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں خدا اور رسول کی محبت اور تواضع و اخلاق سب کچھ ہوتے ہیں مگر ظاہر میں صورت شرع کے خلاف ہوتی ہے۔ تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص تصرف کر کے اپنی روح کو کتے کے قالب میں حلول کر دے بعض لوگوں کو تصرف کی مشق سے یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی روح کو دوسرے حیوانات کے اجسام میں منتقل کر دیتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی روح انسانی کو کتے کے قالب میں منتقل کر دیگا تو اس وقت وہ کتا ہی ہوگا انسان نہ ہوگا۔ گو روح انسان کی ہوگی مگر کوئی شخص بھی اس کو آدمیوں کے برابر بٹھلانا گوارا نہ کرے گا۔

اس مثال سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ صورت کی بھی ضرورت ہے اور حقیقت کی بھی۔ نہ صورت بدون حقیقت کے کافی ہے نہ حقیقت بدون صورت کے کافی ہے گو اس عدم کفایت میں تفاوت ضرور ہے کہ صورت بدون حقیقت کے زیادہ بری ہے اور حقیقت بدون صورت کے گو اتنی بری نہیں مگر بری وہ بھی ہے۔ خوب سمجھ لو (۱۲ جامع)۔

روح اور جسم کا تعلق

اس جگہ بعض طالب علموں کو ایک شبہ پیدا ہوگا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ شہداء کی ارواح جنت میں حواصل طیور خضر میں ہونگی اور تقریر سابق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر انسان کی روح کسی حیوان کی روح میں منتقل ہو جائے تو اس وقت وہ انسان نہ ہوگا بلکہ حیوان ہوگا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شہداء جنت میں انسان نہ رہیں گے بلکہ پرندے بن جائیں گے اور یہ فضیلت کے منافی ہے کیونکہ انسان پرندے سے افضل ہے۔ پس اس کا پرندہ بن جانا اس کے تنزل کا سبب ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں وہ جسم طیر شہداء کے لئے مرکب ہوگا انکا حقیقی جسم وہ نہ ہوگا بلکہ ان کیلئے جسم انسانی دوسرا ہوگا پس ارواح شہداء کا حواصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں ہم بہلی اور بگھی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں اگر پالکی اور بگھی بند ہو تو دیکھنے والے کو یہی معلوم ہوگا کہ پالکی اور بگھی آرہی ہے ہمارا جسم اسکو نظر نہ آئے گا مگر اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے گا کہ بگھی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری

روح ان کے اندر حلول کئے ہوئے ہے بلکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس کے اندر جو آدمی بیٹھا ہے اس کا جسم مکھی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ محض اس کی سواری ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں روح شہداء کیلئے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہوگا اور اس کے اندر روحِ انسانی اپنے جسمِ انسانی کے ساتھ سوار ہوگی پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی کہ روحِ انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر جسمِ طیر میں حلول کرتی اور وہاں یہ بات نہ ہوگی۔

اب رہی یہ بات کہ جسمِ انسانی کونسا ہے جس کے اندر شہداء کی روحیں حلول کرکے حواصل طیور خضر میں سوار ہوں گی۔ آیا وہی جسم عنصری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے؟

اس کی تحقیق کے لئے کشف کی ضرورت ہے کیونکہ نص اس سے ساکت ہے۔ اہلِ کشف کو معلوم ہے کہ عالمِ برزخ میں انسان کو جسمِ مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسمِ عنصری کے مشابہ ہے مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے لیکن یہ جسمِ مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہوگا اور جنت و دوزخ میں یہی جسمِ عنصری پھر مل جائیگا۔ گو برزخ میں جسدِ عنصری کا ہونا کچھ محال نہیں مگر خلافِ مشاہدہ ہے۔ اہلِ کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب و ثواب ارواح کو جسمِ مثالی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ملحدین کا یہ اعتراض رفع ہوگیا کہ احادیث میں جو عذاب و ثواب قبر کا ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ہم نے انسان کے مرجانے کے بعد اس کے جسمِ عنصری کا مہینوں پہرہ دیا ہے ہم کو تو کچھ بھی عذاب و ثواب نظر نہیں آیا۔

جواب یہ ہے کہ برزخ میں انسان کو دوسرا جسم عطا ہوتا ہے جو کہ جسمِ مثالی ہے۔ عذاب و ثواب اسی کو ہوتا ہے۔ لہٰذا جسدِ عنصری پر عذاب و ثواب محسوس نہ ہونے سے اس کی مطلقاً نفی نہیں ہوسکتی پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت ظاہر کرنے کیلئے اس جسمِ عنصری پر بھی عذاب و ثواب کو ظاہر کیا ہے چنانچہ اس قسم کے واقعات منقول ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مردہ کی قبر میں آگ جلتی ہوئی دیکھی بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی۔ لہٰذا اصل حدیث پر کوئی اشکال نہیں ہے خوب سمجھ لو۔

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ ظاہر کے ساتھ باطن کی بھی ضرورت ہے اور باطن کے ساتھ ظاہر کی ضرورت ہے۔ بعض جاہل درویشوں کو یہ غلطی پیش آئی ہے کہ انھوں نے باطن کا اس درجہ اہتمام

کیا بلکہ اصلاح ظاہر کو بیکار و فضول سمجھنے لگے۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ نماز کی روح ذکر ہے۔ پھر یہ دعویٰ کرنے لگے کہ ہمارا باطن ہر دم ذاکر ہے اس لئے ہم کو نماز کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی روح تزکیہ باطن ہے کہ دل کو حرص و بخل سے پاک کیا جائے۔ پھر کہنے لگے کہ ہمارے اخلاق مہذّب ہو چکے ہیں ہم کو زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں۔ علیٰ ہذا حج کی روح تجلّی الوہیت کا مشاہدہ ہے اور ہم کو تجلّی الوہیت کا مشاہدہ ہر جگہ حاصل ہو جاتا ہے اس لئے حج کی بھی ضرورت نہیں۔

یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے۔ ان لوگوں نے اعمالِ شرعیہ کی روح کو دیکھا ہی نہیں اگر وہ ان اعمال کی حقیقی ارواح کو دیکھ لیتے تو پھر ان اعمال کی صورت کو بیکار نہ سمجھتے کیونکہ ہر عمل کی روح کو اس کی صورت کے ساتھ ایسا خاص تعلق ہے کہ وہ بدون اس کے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی نماز کی روح مطلق ذکر نہیں ہے جیسا کہ ان لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ ایک خاص ذکر ہے جس کا تحقق اسی صورتِ صلوٰۃ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح حج کی روح مطلق مشاہدہ تجلّی الوہیت نہیں ہے بلکہ خاص وہی مشاہدہ ہے جو بدون افعالِ حج کے حاصل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بعض دوائیں بالخاصہ مفید ہوا کرتی ہیں کہ وہ خاصہ ان ہی میں ہوتا ہے کسی دوسری دوا سے وہ حاصل نہیں ہو سکتا گو وہ درجہ حرارت و برودت میں اس کے بالکل برابر ہی ہو۔ خوب سمجھ لو۔ میں نے اس مسئلہ کو ایک وعظ میں نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا نام روح الارواح ہے۔

اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ نہ ظاہر باطن سے مستغنی ہے نہ باطن ظاہر سے بلکہ دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے۔ یہ مضمون ظاہر و باطن کے متعلق درمیان میں ایک مناسبت سے مذکور ہو گیا۔ میں اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض لوگ دنیا کو دین کی صورت میں حاصل کرتے ہیں چنانچہ بہت لوگ علم دین حاصل کرتے ہیں جو ظاہر میں آخرت کا کام ہے دنیا کا کام نہیں مگر ان کی نیت جاہ و مال حاصل کرنے کی ہوتی ہے اس لئے ایسے علم کو دنیا ہی کہا جائیگا۔ یہ ہے تحصیلِ دنیا بصورتِ دین۔

اخلاص کی ضرورت

دین کا کام خاص وہ عمل ہے جس میں اخلاص ہو جس کی آج کل بہت ہی کمی ہے۔ علامہ شعرانی نے اخلاص کی ایک علامت لکھی ہے وہ یہ کہ جو کام تم کر رہے ہو اگر کوئی دوسرا

اس کام کا کرنیوالا تم سے اچھا اس بستی میں آ جاتا ہے اور وہ کام ایسا ہو جو علی التعین واجب نہ ہو جیسے مسجد و مدرسہ کا اہتمام یا وعظ کہنا، پیری مریدی کرنا کسی نیک کام کے لئے چندہ کرنا وغیرہ وغیرہ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو۔ بلکہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو کہ وہاں جاؤ وہ مجھ سے بہتر ہیں اور سارا کام خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر کے خود ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤ اور دل میں خدا کا شکر کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیج دیا جس نے تمہارا کام بٹا لیا۔ اگر یہ حالت ہو تب تو واقعی تم مخلص ہو۔

مگر اب تو کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا آوے جس کی طرف عوام کا رجوع ہونے لگے تو جلے مرتے ہیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی بات ایسی ظاہر ہو جس سے عوام بدگمان ہو جائیں کہ دو شمشیر در نیامے نہ گنجد۔ اسی طرح دو عالم در مقامے نہ گنجند گویا اپنے کو وحدہ لا شریک لہ سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری ہی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کسی اور کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ قبلہ و کعبہ تو ہم ٹھہرے پھر دوسری طرف نماز کیسی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو بلکہ اخلاص سے مفلس ہو۔

اور لیجیے ایک مولوی صاحب کا کسی مدرسہ میں قیام ہے جب اس کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے تو آپ کو ایک خاص حظ آتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ حظ دینی ہے کیونکہ نفس کہتا ہے کہ مجھ کو محض دین کا کام جاری ہونے اور طلبہ فارغین کو سند فراغ ملنے کی خوشی ہو رہی ہے اپنی کارروائی ظاہر ہونے کی خوشی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا ایک امتحان ہے وہ یہ کہ اگر یہ حضرت مولوی صاحب اس مدرسہ سے الگ کر دیے جائیں اور کوئی دوسرا ان کی جگہ پڑھانے لگے پھر اس کے فارغ کردہ طلبا کو سند فراغ دیجائے اور اس کیلئے جلسہ کیا جائے تو ان مولوی صاحب کو اس وقت بھی یہی حظ آئیگا یا نہیں۔ ایمانداری سے اپنے دل میں ٹٹول لیں۔ اگر اس وقت بھی انکو ایسا ہی حظ آوے تو واقعی یہ دینی حظ ہے۔ ورنہ سمجھ لو کہ یہ حظ محض دنیوی ہے جس میں ریا و عجب کی آمیزش ہے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ کسی مدرسہ سے علیحدہ کئے جانے کے بعد یہ مولانا صاحب اس مدرسہ کی تخریب ہی کے درپے نہ ہوں تو یہ انکی بڑی عنایت ہے۔ آئندہ اس کے جلسوں سے حظ آنا اور مسرت و خوشی ہونا تو بہت دور ہے۔

مجھے خود ایسے واقعات بہت پیش آتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب کسی مدرسہ میں ملازم ہیں جب تک وہ وہاں رہیں گے برابر میرے پاس خطوط بھیجتے رہیں گے کہ یہاں آپ کے آنے کی بہت ضرورت ہے۔ اس جگہ جہالت و بدعت بہت زیادہ ہے۔ پھر جب مولانا کی وہاں سے بدلی ہوگئی تو اس جگہ کی بدعت وجہالت سب رخصت ہوگئی اب وہاں کسی جلسہ اور وعظ کی کچھ ضرورت ہی نہیں رہی۔ بلکہ اب جس جگہ مولانا بدلی ہوکر پہنچے ہیں وہاں کا چاند بدلی میں آگیا۔ اب ساری بدعت وجہالت وہاں آگئی اور اس جگہ کے لئے وعظ وجلسہ کی ضرورت ظاہر ہونے لگی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری بدعات اور جہالات کی لوٹ خود ان مولوی صاحب کی ذات بابرکات ہے کہ جہاں آپ پہنچتے ہیں وہیں بدعات وجہالات کا زور ہو جاتا ہے اور وعظ وجلسہ وغیرہ کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ کچھ نہیں۔ نہ پہلی جگہ جلسہ اور وعظ بدعت وجہالت کی اصلاح کیلئے کیا جاتا تھا نہ دوسری جگہ اس غرض کیلئے جلسہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جس جگہ مولانا صاحب کا قیام ہوتا ہے اس مدرسہ سے آپ کو تنخواہ ملتی ہے اس لئے چاہتے ہیں کہ اس کی آمدنی اور شہرت زیادہ ہو تاکہ میری تنخواہ میں کمی نہ آئے بلکہ ترقی ہوتی رہے ورنہ اگر بدعت وجہالت کی اصلاح کے لئے جلسے کئے جاتے تو سب سے پہلے ان مقامات کی فکر ہوتی جہاں کے مسلمانوں کو کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ ان کی صورتیں ہندوؤں جیسی ہیں اور بیاہ شادی سب ہندوؤں کی طرح ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان مقامات پر تبلیغ کرنا فرض ہے۔ مگر اب تو ہم لوگ اسی جگہ جاتے ہیں جہاں ہماری آؤ بھگت ہو۔ ایسے مقامات پر کون جائے جہاں کے مسلمان ہمیں پانی پینے کے لئے برتن بھی نہ دیں کیونکہ وہ ہم سے ویسے ہی چھوت چھات کرتے ہیں جیسے ہندو کرتے ہیں افسوس!

نفس کا کید خفی

صاحبو! یہ نفس کا کید خفی ہے کہ ہم اپنے مدرسہ کے جلسہ سے خوش ہونے کو دینی مسرت سمجھتے ہیں۔ یہ نفس بڑا ہوشیار ہے بعض دفعہ یہ ایسی پٹی پڑھاتا ہے کہ صاحب نفس کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس میں نفس کا کید تھا۔ چنانچہ اس مقام پر بعض اوقات نفس دھوکا دیتا ہے کہ اپنی کارگزاری پر اس لئے زیادہ مسرت ہوتی ہے کہ اس فعل کا ہم کو ثواب ملا۔ غیر کے

فعل کا ثواب ہم کو نہیں ملتا۔ اس لئے اس کی مسرت اس قدر نہیں ہوتی۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ اگر ایسے اسباب جمع ہو جاویں کہ فعل تو ان کا ہو مگر انتساب ہو جاوے دوسرے کی طرف تو کیا اس وقت بھی ویسی ہی مسرت ہوتی ہے۔

غرض ہماری حالت یہ ہے کہ کوئی تو دنیا کو دنیا کی صورت سے حاصل کر رہا ہے اور اس میں ایسا منہمک ہے کہ آخرت کی اسے کچھ پروا نہیں اور کوئی دنیا کو دین کی صورت سے حاصل کر رہا ہے۔ ایسا شخص اپنے کو دیندار سمجھتا ہے مگر حقیقت میں یہ بھی دنیا دار ہے۔ حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں: بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقی۔ کہ تم فلاح کے لئے کوشش نہیں کرتے بلکہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔

مطلق طلب دنیا کی ممانعت نہیں

یہاں چند نکتے سمجھنے کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے اس جگہ بل تؤثرون فرمایا ہے جو ایثار سے مشتق ہے جس کے معنی ایک چیز کو دوسرے پر ترجیح دینے کے ہیں اور اس کے بجائے بل تطلبون یا بل تبتغون نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ مطلق طلب دنیا پر شکایت نہیں بلکہ شکایت اس پر ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جائے۔ تو اگر کوئی شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دے بلکہ دونوں کے تزاحم کے وقت آخرت ہی کو ترجیح دے لیکن اس کے ساتھ وہ دنیا کمانے میں بھی مشغول رہے تو اس کی مذمت نہیں ہے۔ اس میں زاہدان خشک کی اصلاح ہے جو مطلق طلب دنیا کو مذموم سمجھتے ہیں۔ بس خوب سمجھ لو کہ ترجیح دنیا علی الآخرت کی ممانعت ہے مطلق طلب دنیا کی ممانعت نہیں ہے۔

اب لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شادی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو بیوی رکھتے ہیں۔ بزرگوں کو بیوی کی کیا ضرورت ہے۔ سبحان اللہ بس بزرگوں کو فرشتہ ہونا چاہیے کہ نہ کھائیں نہ پئیں نہ بیوی کریں۔

ایک مرتبہ میں میرٹھ گیا۔ گھر میں سے میرے ساتھ تھیں کیونکہ ان کے معالجہ کی ضرورت تھی۔ اور وہ معالجہ قصبہ میں نہ ہو سکتا تھا شہر ہی میں ہو سکتا تھا قصبہ میں بعض اسباب علاج

میسّر نہیں ہوتے جو شہروں میں میسّر ہو سکتے ہیں۔ وہاں ایک بی بی نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی، تو ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ تو ان سے مرید نہ ہو۔ یہ تو بیوی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ ہمارے پیر صاحب سے مرید ہو جانا، انھوں نے پچاس سال سے اپنی بیوی سے بات تک نہیں کی۔ وہ بی بی کچھ مسائل سے واقف تھی۔ اس نے جواب دیا کہ جس پیر نے پچاس سال تک بیوی سے بات نہیں کی وہ تو پچاس سال تک خدا کا مجرم رہا کہ اتنے عرصہ تک بیوی کے حقوق ضائع کرتا رہا۔ وہ ولی کیا ہوتا وہ تو فاسق ہے۔ غرض آج کل بیوی کو ساتھ رکھنا بھی دنیا میں داخل کیا جاتا ہے۔

عاداتِ نبویہ کا اتّباع

اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ جو ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ آٹھ آنہ گز کا کپڑا پہنتے ہیں۔ گیہوں کھاتے ہیں جو کی روٹی نہیں کھاتے۔ حالانکہ جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی غذا ہے میں کہتا ہوں کہ حضور نے جو عادۃً کھایا ہے یا عبادۃً۔ ظاہر ہے کہ عبادۃً نہیں کھایا پھر عاداتِ نبویہ کا اتّباع شرعاً واجب نہیں نہ انکے ترک میں کوئی گناہ ہے۔ عادات میں مزاج وغیرہ کے لحاظ کرنے کا اختیار ہے۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض عادات ایسی ہیں جن کی ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے شریعت نے عاداتِ نبویہ کا اتباع واجب نہیں کیا۔ ہاں اگر کسی کو ہمت ہو اور عادات پر عمل کرنا بھی نصیب ہو جائے تو اسکی فضیلت میں شک نہیں مگر اس کو دوسروں پر طعن کرنے کا بھی حق نہیں۔

جو کی روٹی پر مجھے قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی آج سے سنّت کے موافق جو کی روٹی کھایا کریں گے چنانچہ جو کا آٹا پسوایا گیا اور اس کو چھلنی میں نہیں چھپا نا گیا کیونکہ حضور کے زمانہ میں آٹے میں پھونک مار دیا کرتے تھے جتنی بھوسی پھونک مارنے سے اڑ گئی وہ اڑ گئی۔ باقی کو گوندھ لیتے تھے خواجہ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ اب جو وہ روٹی کھائی گئی تو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اب ان کا ادب دیکھیے کہ یہ نہیں فرمایا کہ سنّت کے اتّباع سے ایسا ہوا بلکہ یہ فرمایا

بھائی ہماری غلطی تھی جو ہم نے برابری کا دعویٰ کیا اور اپنے کو اس سنّت کے قابل سمجھا۔ ہم اس کے قابل نہ تھے اس لیے ہم کو تکلیف ہو گئی پس اس سنّت پر وہی عمل کر سکتا ہے جو اس درجہ کا ہو۔ ہم اس درجہ کے نہیں ہیں۔ سبحان اللہ! ادب اسے کہتے ہیں۔

نیز حضور صلی اللہ کی عادت تھی کہ آپ زمین پر سویا کرتے تھے۔ آج کل طبائع ایسی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں سو سکتے۔ نیز بعض لوگ ایسے ہیں جو زیتون کا تیل اور چربی نہیں کھا سکتے۔ اس سے انکو تکلیف ہوتی ہے تو ان سنّتوں کا اتباع ضروری نہیں کیونکہ یہ سنّن عادیہ ہیں اور عادات میں ہر شخص کو اپنے مزاج کی رعایت کا شرعاً اختیار ہے۔ اسی طرح ملازمت اور کھیتی کر کے دنیا طلب کرنا حرام نہیں۔ چنانچہ آیت میں بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا فرمانا اور بل تطلبون وغیرہ نہ فرمانا اس کی دلیل ہے اس کے علاوہ احادیث و افعال صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان اعمال کا جواز بخوبی ثابت ہے۔

شیوخِ کاملین کی حالت

شیوخِ کاملین کی حالت یہی ہے کہ وہ ضعفاء کو قطع تعلقاتِ مباحہ کا امر نہیں فرماتے ملازمت اور تجارت و زراعت کی بے تکلف اجازت دیتے ہیں۔ عمدہ غذاؤں کے کھانے سے منع نہیں کرتے۔ نہ زیادہ سونے سے روکتے ہیں۔ نہ بیوی بچوں کیساتھ ہنسی دل لگی کرنے سے منع کرتے ہیں، نہ کم کھانے کا حکم کرتے ہیں بلکہ وہ ہر شخص کی حالت کے موافق علاج کرتے ہیں جس کو دیکھتے ہیں کہ اسے کم کھانے سے ضرر نہ ہو گا اسے تقلیل غذا کا اعتدال کے ساتھ امر کرتے ہیں۔ اور جس کو دیکھتے ہیں کہ خود ہی کمزور ہے اگر غذا کم کریگا تو وہ اور زیادہ کمزور ہو جائیگا اسے بجائے تقلیل غذا کے مقویات اور دودھ گھی کھانے کا حکم دیتے ہیں۔ وہ شیخ اناڑی ہے جو سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکے۔ بعض مشائخ کبیر کے فقیر ایسے ہیں کہ انکے پاس جو آتا ہے اسے تقلیل غذا اور تقلیل نوم وغیرہ کی تاکید کرتے ہیں چاہے کسی کا دماغ ہی خشک ہو جائے۔ مولانا ایسے ہی مشائخ کو فرماتے ہیں:

چار پارا قدر طاقت بار نہ	بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر	طفل مسکیں را از آں ناں مردہ گیر

اصلاح متیقن تھی۔ تو آپ نے اصلاح موہوم کا اس درجہ اہتمام کیوں فرمایا کہ اس وقت طالب حق کا آنا گراں ہونے لگا۔ اگر ان غریبوں کے آنے سے وہ چلے جاتے تو آپ کی جوتی سے۔ آپ کو بھی ان کے ساتھ استغنا رکھنا یہ نادر کرنا چاہئے تھا اور صحابی کی تعلیم میں مشغول ہو جانا چاہئے تھا جس کی اصلاح یقینی تھی۔

پس یہاں سے یہ مسئلہ بتلا دیا گیا کہ منفعت موہومہ پر منفعت متیقنہ کو مقدم کرنا چاہیئے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابن ام مکتوم کی اصلاح میں ذرا سی تاخیر کرنے پر عتاب فرمایا ہے حالانکہ اس تاخیر سے وہ فوت نہ ہوئی جاتی تھی بس تعلیم اصول کی تقدیم اصل وقت سے جب انفع کے مظنون اور متیقن ہوتے ہیں دونوں مساوی ہوں ورنہ متیقن مقدم ہوگا مظنون پر۔ لیکن آج کل عام طور پر مسلمان اس کے خلاف کر رہے ہیں کہ ایک موہوم دنیوی منفعت کے لئے اپنے ان منافع دینیہ کو برباد کر رہے ہیں جو اس وقت ان کو حاصل ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مقصود میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں ہمارا عذر بیان فرمایا ہے کہ لو ہم تمہارے عذر کو بھی بیان کئے دیتے ہیں کہ تم دنیا کو اس وجہ سے مقدم کرتے ہو کہ اس کے منافع قریب اور عاجل ہیں لیکن اس کا جواب بھی سن لو۔

آخرت کی صفات

والآخرۃ خیر وابقیٰ۔ اس میں جواب ہے اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اس کی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں۔ ایک خیریت دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے۔ دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے اور نہ وہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دیتا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس میں سرمایہ عاجلہ کو اس وقت

لگا پڑتا ہے اور نفع زائد آجل ہے لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔ معلوم ہوا کہ زیادت وکثرت کے مقابلہ میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور آخرت آجل ہے۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور عمدہ ہے۔

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو تو بس زراعت کو بھی جواب دے دو۔ مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو کیوں کہ اس میں زیادہ ملنے کی اُمید ہے۔ پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور یہ آجل ہے۔ ارے! وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی بھی قابل نہیں۔

اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ ابقیٰ ہے۔ بہت پائیدار ہے۔ اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلہ میں وصف عجلت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اس کی صد ہا نظیریں ہیں۔

ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں۔ ایک تو کچا بنا ہوا ہے اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہتے ہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جاوے گا اور اگر کچا مکان لینا چاہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کر دوں گا اب بتلائیے آپ کیا کریں گے؟ یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریۃً ملتا ہو وہ کچا مکان اچھا جو دواماً ملک ہو۔

مگر افسوس! تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے، دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہے! بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے

تمہید

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ شانہٗ عم نوالہٗ نے اہلِ سعادت کا مقام و مسکن بیان فرمایا ہے اس سے پہلے ایک مضمون اجمالی مذکور ہے فمنھم شقی و سعید اور اس کے اوپر قیامت کا ذکر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت آنیوالی ہے جسمیں ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا و سزا ملے گی اسی کے ضمن میں اولاً بالاجمال یہ ارشاد ہوا ہے۔ فمنھم شقی و سعید۔

اُس وقت دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ بعض شقی ہوں گے اور بعض سعید ہونگے۔ اس کے بعد دونوں قسموں کی تفصیل ہے۔ ایک آیت میں ایک جزو کی تفصیل ہے یعنی اما الذین شقوا الآیۃ کہ جو لوگ شقی ہیں وہ جہنم کی آگ میں چیختے چلاتے ہمیشہ رہیں گے جبتک آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جس وقت آپ کا پروردگار چاہے کیونکہ آپ کا پروردگار جو چاہے کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری آیت میں دوسرے جزو کی تفصیل ہے یعنی واما الذین سعدوا الآیۃ کہ جو لوگ سعید و مسعود ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے جبتک آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جس وقت آپ کا پروردگار چاہے ان پر دائمی عطا ہوگی جو منقطع نہ کیجائیگی۔ یہ حاصل ترجمہ آیتوں کا ہوا۔

قبر اور روح کا تعلق

اس وقت مجھ کو اس مضمون کے اختیار کرنے سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ دنیا ہی میں تمام لذات جمع ہیں اور آخرت کے متعلق خصوصاً قبر کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ہو کا میدان ہے یا خالی مکان ہی مکان ہے اور کچھ نہیں۔ چونکہ لوگوں کو نعمائے آخرت کی تفصیل معلوم نہیں اس لئے اس عالم کی فضا اور وسعت تو ذہن میں آتی ہے مگر وہاں کی لذات ذہن میں نہیں آتیں۔ اور جن کو تفصیل کا علم بھی ہے ان کو چونکہ استحضار نہیں ہے اس لئے انکے دل پر بھی وہی اثر ہے جو ناواقف کے ذہن پر ہے۔ اور عالم آخرت کو ہو کا میدان بھی وہی لوگ سمجھتے ہیں جو ذرا واقف ہیں اور جو ناواقف ہیں وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت بہت تنگ ہے۔ قیامت کے بعد تو جنت کا خیال اُن کو آجاتا ہے مگر قیامت سے پہلے اور موت کے بعد تو اُن کو صرف قبر کا خیال آتا ہے جو ظاہر میں ایک تنگ و تاریک گڑھا ہے۔ ناواقف لوگ اس گڑھے ہی کو قبر سمجھتے ہیں مگر جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حقیقی قبر نہیں ہے بلکہ یہ توجسد کی قبر ہے۔ بدن کا گھر ہے۔ روح کا گھر یہ گڑھا نہیں ہے۔ گو روح کو اس سے بھی تعلق ہے مگر روح اس میں مقید نہیں ہے تعلق اور چیز ہے اور قید ہونا دوسری چیز ہے۔

دیکھو! آفتاب کو زمین سے تعلق تو ہے کہ تمام عالم اس سے منور ہے مگر کیا وہ زمین کے اندر مقید ہے۔ ہرگز نہیں، وہ تو اتنا بڑا ہے کہ زمین سے صد ہا حصے زیادہ ہے پس روح کو ایسا ہی سمجھو

کالشمس فی کبد السماء وضوؤہا یغشی البلاد مشارقاً و مغارباً

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک پیالہ میں یا لگن میں پانی بھر کر رکھا جائے تو اس میں آفتاب کا جسم نظر آتا ہے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آفتاب اس کے اندر مقید ہے، ہرگز نہیں! اسی طرح آئینہ میں آپ اپنی صورت دیکھتے ہیں تو اس وقت آئینہ سے آپ کو تعلق تو ہوتا ہے مگر کیا آپ آئینہ کے اندر مقید ہیں، ہرگز نہیں۔ بس مرنے کے بعد روح کو جسم سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے جیسا آپ کو آئینہ سے تعلق ہے۔ پس قبر ظاہری محض جسد کیلئے تو قید ہے مگر روح کے لئے قید نہیں ہے اور انسان کی حقیقت روح ہے نہ کہ جسد۔ اگر کوئی شخص قبر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ بھیڑیا اس کو کھا لے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ بھیڑیے نے انسان کو کھا لیا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں۔ بدن کو کھا لیا۔

پس قبر کو انسان کیلئے قید سمجھنا غلط ہے۔ وہ صرف بدن کی قید ہے اور اعمال سیئہ سے جو قبر میں تنگی ہوتی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ گڑھا تنگ ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی اس گڑھے میں دفن نہ کیا جاوے تو کیا وہ اس تنگی سے بچ جاویگا۔ بلکہ وہ تنگی اور قسم کی ہے پس خوب سمجھ لو کہ روح قبر کے اندر مقید نہیں ہاں انکو قبر سے تعلق ضرور ہے۔ تو جو لوگ بالکل ناواقف ہیں وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت جو موت کے بعد شروع ہوتا ہے بہت ہی تنگ ہے کیونکہ وہ اس ظاہری قبر کو روح کی قبر سمجھتے ہیں۔

آخرت سے توحش کی وجہ

اور جن کو تھوڑی سی واقفیت ہے وہ روح کو قبر میں مقید تو نہیں سمجھتے مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت ایسا ہے جیسا افریقہ کا میدان کہ بالکل ہو کا مکان ہے۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہاں پر یہاں سے اچھے میوے ہیں۔ بڑے خوشنما اور خوبصورت باغ ہیں اور بڑے عمدہ مکانات ہیں۔ ہر طرح کا سامان راحت ہے۔ اسی واسطے عام طور پر آخرت کی طرف لوگوں کو رغبت نہیں بلکہ اس سے متوحش ہیں۔ یہ خرابی ہے نعمائے آخرت کے نہ جاننے کی کیونکہ عام حالت یہ ہے کہ انکو لذات ہی کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ ایسی طبائع بہت کم ہیں جن کو محض قرب حق کی وجہ سے آخرت کی طرف رغبت ہو۔ عام طور پر طبائع کو لذات کی طرف رغبت ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آخرت کی لذتوں اور نعمتوں کو بیان فرمایا ہے اور انکو بیان کرکے فرمایا ہے: وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ کہ رغبت کرنیوالوں کو اس میں رغبت کرنا چاہیئے۔ ادھر تو نصوص میں آخرت کی طرف رغبت اور دنیا سے بے رغبتی دلائی گئی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَہٗ وَلَھَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَہٗ

کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کے پاس گھر نہ ہو اور دنیا کیلئے جمع وہی کرتا ہے جس کو عقل نہ ہو۔ ادھر ہماری حالت اس کے برعکس ہے کہ دنیا ہی سے رغبت ہے اور آخرت سے توحش ہے اور اس کا سبب ہے نعمائے آخرت سے ذہول۔ چنانچہ ابھی مذکور ہوا اور علاج ہوتا ہے ازالہ سبب سے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آخرت کی نعمتوں اور لذتوں

کو مستحضر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے اس وقت بیان کیلئے اس آیت کے اختیار کرنے کی۔
تو سنیئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیھا۔
جو لوگ سعید ہیں وہ جنت ہیں ہیں لغت میں جنت باغ کو کہتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا
پاکیزہ کلام ہے کہ ایک لفظ میں تمام تفصیل بتلادی جس کا بیان عنقریب آتا ہے ایسے ہی
اس سے پہلے جو فرمایا ہے اما الذین شقوا ففی النار کہ بدبخت لوگ آگ ہی جائیں گے
وہاں بھی ایک ہی لفظ بیان فرمایا ہے مگر اس میں لزوماً بھی تفصیل ذکر نہیں کی گئی۔
اس میں ایک راز ہے جو طلبہ کے سمجھنے کا ہے وہ یہ کہ خوف خود مطلوب نہیں بلکہ وہ صرف
اس لئے مطلوب ہے کہ معاصی سے بچنے کا وسیلہ ہے تو اس طرز بیان میں ہم کو تعلیم کا طریقہ بتلایا
گیا ہے کہ تخویف میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ زیادہ ڈرانے سے آدمی گھبرا جاتا اور بعض دفعہ
رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے جس سے وہ عمل سے معطل ہو جاتا ہے۔
چنانچہ کانپور میں ایک وکیل صاحب میرے ہم نام میرے پاس اس حالت میں آئے کہ ان کے
چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ احیاء العلوم کے باب الخوف کا مطالعہ کر کے مایوس ہو چکے
تھے میں نے ان کی تسلی کی ... علوم کا باب الخوف دیکھنے سے اُن کو منع کیا۔
اسی لئے زیادہ خوف دلانے کا حکم نہیں ہے۔ حدیث میں خود تصریحاً موجود ہے واسئلک
من خشیتک ما تحول بہ بینی وبین معاصیک۔ معلوم ہوا کہ خوف کا صرف وہ درجہ مطلوب ہے
جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اس سے زائد مطلوب نہیں جو مایوس کر دے۔ اسی لئے حق
تعالیٰ نے یہاں لفظ نار پر اکتفا فرمایا ہے۔ اور چونکہ نار عادۃً دیگر عقوبات کو مستلزم نہیں اس
لئے اس میں دیگر عقوبات کی طرف اشارہ بھی نہیں ہوا اور رجاء و ترغیب خود مقصود ہے اس لئے
اس کے مقابل اہل سعادت کے لئے تفصیل کی ضرورت تھی تاکہ ان کو آخرت کی طرف زیادہ رغبت ہو۔

نعمائے آخرت سے لاعلمی کا اثر

مگر اللہ تعالیٰ کا کلام المبالغ ہے کہ مقابلہ میں بھی ایک ہی لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ مگر وہ
ایک لفظ ایسا ہے کہ عادۃً ذہن اس کی تفصیل کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ باغ

اور تنگ دستی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ تو بغداد کے خلیفہ کے پاس کیوں نہیں جاتا جس کی سخاوت کا دنیا میں شور و غل ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس کی ایک نظر سے ہماری تنگدستی مٹ جائے۔ مرد نے کہا کہ تو نے اچھا مشورہ دیا مگر بادشاہوں کے دربار کے لائق کوئی تحفہ بھی تو ہونا چاہیے۔ بیوی نے کہا کہ آج کل کئی برس کے قحط کے سبب اطراف میں کہیں پانی نہیں مل رہا ہے مگر ہمارے تالاب میں کچھ پانی ہے۔ وہ عجیب چیز ہے۔ اس سے بڑھ کر بادشاہ کے لیے کیا تحفہ ہوگا۔ بدوی نے کہا واقعی سچ ہے۔ اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔ بادشاہ کو ایسا پانی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

چنانچہ ایک گھڑے میں تالاب سے پانی بھر کر چلا اور بغداد کا رخ کیا اور راستہ بھر رب سلّم سلّم کا ورد کرتا رہا کہ خدا کرے یہ گھڑا صحیح سالم پہنچ جائے۔ خدا خدا کر کے گھڑا صحیح سالم بغداد تک پہنچا اور خلیفہ کے محل تک پہنچ کر اس نے نقیبوں سے کہا کہ میں خلیفہ کے لیے ایک نایاب تحفہ لایا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ نقیبوں نے فوراً خلیفہ کو اطلاع دی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ بدوی کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ یہ دربار میں گھڑا سر پر رکھے ہوئے پہنچا۔ خلیفہ نے پوچھا، یا وجہ العرب ما عندک کہ اے معزز عربی! تیرے پاس کیا تحفہ ہے؟ آپ نے یہ سنتے ہی اس کو تخت پر جا دھرا اور کہا ھذا ماء الجنۃ۔ یہ جنت کا پانی ہے۔

خلیفہ نے جو گھڑے کا منہ کھولا تو تمام دربار سڑ گیا۔ کیونکہ کئی دن سے گھڑا بند تھا۔ اس میں گرمی کی وجہ سے تعفن پیدا ہوگیا تھا۔ مگر اللہ رے حوصلہ اور کرم کہ خلیفہ کے چہرہ سے ذرا ناگواری ظاہر نہ ہوئی۔ پھر درباریوں کی کیا مجال تھی جو کوئی ناک منہ چڑھاتا۔ خلیفہ نے بدوی کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ واقعی تم میرے واسطے عجیب تحفہ لائے کہ اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اس کو مہمان خانہ میں بھیج دیا اور چند روز مہمان رکھ کر خلعت عطا کیا اور حکم دیا کہ اس کے گھڑے کو اشرفیوں سے بھر کر واپس کردیا جائے اور واپسی میں اس کو دجلہ کے پاس سے نکالا جائے تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ خلیفہ کو اس تحفہ کی ضرورت نہ تھی۔ خود اس کے محل کے نیچے سے ایسا صاف شفاف شیریں دریا بہہ رہا ہے۔

ز دیر و سلطان و سکار و بار ہیں حسن تحریری تحتہا الانہار بلیں!

جس وقت وہ بدوی اشرفیوں سے بھرا گھڑا لے کر دجلہ کے پاس سے گذرا ہے تو

اس کی یہ حالت تھی کہ زمین میں گڑا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ اللہ اکبر! خلیفہ نے جو کچھ میرے ہدیہ کی قدر کی یہ محض اس کا کرم تھا اور اس کے صلہ میں جو خلعت و انعام اس نے مجھے دیا ہے یہ اولئک یبدل اللہ سیاتھم حسنات کا مصداق تھا۔

سمجھو! جس طرح یہ شخص دجلہ کو دیکھ کر اپنے تالاب کے پانی کو تحفہ کہنے سے شرماتا تھا تو اسی طرح جب ہم لوگ آخرت کی نعمتوں کو دیکھیں گے تو اس وقت یہاں کی لذات کو لذات کہنے سے شرمائیں گے مگر ہم کو وہاں کی نعمتوں اور لذتوں کی خبر نہیں۔ اس لیے جب یہاں آم یا خربوزہ کھاتے ہیں تو اپنے مُردہ عزیزوں کو یاد کرتے ہیں کہ ہائے! آج وہ نہ ہوا، وہ بھی کھاتا۔ ارے واللہ! وہ تو اس وقت تمھارے خربوزہ کو نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، کھانا تو درکنار۔

مُردہ کو چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لیے خیرات کیا کرتے ہیں۔ خاص کر وہ چیزیں جن کو مرنے والے کو رغبت تھی۔ اس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں۔ اور وہ بہت دور پہنچے انہوں نے اس عمل کے لیے لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون "(اے مسلمانو!) تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے۔" سے استدلال کیا کہ انفاق محبوب شرعاً مطلوب ہے۔ پھر اس میں کیا حرج ہے کہ مرنے والے کا مرغوب و محبوب خیرات کیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مما تحبون فرمایا ہے، مما یحبون نہیں فرمایا۔ پس خیرات کرنے والے کو اپنا محبوب خیرات کرنا چاہیے نہ کہ مُردہ کا محبوب اور راز اس میں یہ ہے کہ اصل مدار فضیلت کا اخلاص ہے اور اپنے محبوب کے انفاق میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے انفاق میں۔ یہ تو اُن کے استدلال کا جواب تھا۔

اب میں وہ دلیل بیان کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ جو چیز ہم خیرات کرتے ہیں، مُردوں کو وہ بعینہٖ نہیں پہنچتی بلکہ اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ سنیئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم۔

"اللہ کے پاس نہ تو اُن کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اُن کا خون لیکن اس کے پاس تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔"

اس میں صاف تصریح ہے کہ قربانی کا گوشت و خون خدا کے یہاں نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا خلوص و اخلاص پہنچتا ہے اور اسی ہی کا ثواب تم کو ملتا ہے اور وہی ثواب مُردوں کو پہنچ دیا جاتا ہے جبکہ اُن کی طرف سے قربانی یا کوئی اور خیرات کی جائے۔

اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ محرّم کے شربت میں بھی عوام کے عمل کا مبنی یہی خیال کہ شہدائے کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے اس لئے شربت پہنچانا چاہیے کہ پیاس بجھے سو اوّل تو یہی سمجھنا غلط ہے کہ ان کو یہ شربت پہنچتا ہے شربت ہرگز نہیں پہنچتا۔ دوسرے یہ عمل عقیدت کے بھی تو خلاف ہے۔ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرات ابھی تک پیاسے ہی ہیں۔ کیا ان کو جنت سے ابھی شربت نہیں ملا اور اب تک پیاسے ہیں۔ یہ اعتقاد آپ ہی کو مُبارک ہو۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ ان کو شہادت کے وقت ہی ان شاء اللہ تعالیٰ شرابِ طُہور کا وہ جام مل چکا ہے جس سے پہلی بھی پیاس جاتی رہی اور آئندہ کی بھی جاتی رہی۔

اور اس اعتقادِ فاسد کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ محرم کا مہینہ سردیوں میں آتا ہے تو اس وقت بھی شربت ہی پلایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت لوگ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ کسی کو نمونیہ ہو جاتا ہے۔ خدا بچائے ایسی پابندیٔ رسم سے۔ اور غور کر کے دیکھا جاتا ہے کہ رسوم کی پابندی ہمیشہ بے سوچے سمجھے ہی ہوتی ہے۔

چنانچہ شادی سے پہلے دُولہن کو مانیوں بٹھلانا واجب سمجھتے ہیں کہ اس کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے بٹھلا دیا جائے جہاں اس کو خاموش رہنے اور بھوکا رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ شادی

ف فان قال لیس مبنا ہذا العمل اعتقاد وصول ہذا المشروب بعینہ بل مبناه ما قال لہ بعض الصوفیۃ ان لکل عمل صورۃ مثالیۃ فی عالم الآخرۃ تناسب العمل وقرر ذلک بقولہ تعالیٰ کلما رزقوا منہا من ثمرۃ رزقا قالوا ہذا الذی رزقنا من قبل واتوا بہ متشابہا ای اتوا جزاء العمل متشابہا للعمل واذا کان کذلک فالتصدق بالمشروب وان لم یستلزم وصولہ عینہ مشابہا لہ وہذا الامر فیہ ولا یرد شیء من النصوص. نعم لما کان اعتقاد العوام فی ہذہ المسئلۃ فاسدا امرنا بمنعہم عن امثال ہذہ الاعمال واللہ اعلم. قلنا ان المناسبۃ مسلم لکنہا موکولۃ الی اللہ تعالیٰ لا الی رأینا فمن این لزم ان الماکول یناسب الماکول، المشروب یناسب المشروب بل ثبت بالحدیث ان اللبن المشروب یناسب العلم والدین الخیر المشروبین وکذا فلا یصح ما قالہ ہذا القائل ۱۲

کے بعد منہ پر ہاتھ رکھنا اور خاموش رہنا دشوار نہ ہو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ شعر و گفتن چہ ضرور۔ بشاشی کے بعد ہی منہ پر ہاتھ رکھنے اور خاموش رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہی پابندی رسم اور کچھ نہیں۔

اس پابندی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ گرمی کے زمانہ میں شادی ہوتی ہے اور لڑکی کو مائیوں بٹھلاتے ہیں تو اس کے دماغ پر گرمی چڑھ جاتی ہے۔ اب عورتیں یہ تو نہ کہیں گی کہ مائیوں بٹھلانے سے دماغ کو گرمی چڑھ گئی بلکہ یہ کہیں گی کہ آسیب آ گیا۔ میں کہتا ہوں، ہاں سچ ہے مگر خبر بھی ہے وہ آسیب کون ہے وہ دولہن کی اماجان ہیں جس نے اس غریب کو کال کوٹھری میں بند کر رکھا ہے کیونکہ شیاطین دو قسم کے ہیں شیاطین الجن و شیاطین الانس۔ مگر عورتوں کے یہاں تو آسیب بہت سستا ہے۔ بات بات میں آسیب کا خلل ہو جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں تو لڑکی کو گرمی دماغ کی وجہ سے ہذیان ہوتا ہے جب تم نے اس کو آسیب بتلایا اور آسیب کا علاج کیا تو اب بعض مقامات پر لڑکیوں کے ہاتھ بہانہ آ جاتا ہے۔ پھر وہ ہر بات میں اپنے اوپر آسیب سوار کر لیتی ہیں۔ جیسے بعض مقامات میں سنا گیا کہ جہاں کوئی عورت خاوند سے ناخوش ہوئی اور اس نے الٰہ بخش کا بہانہ لے لیا کہ میرے اوپر تو ماموں الٰہ بخش آ گیا ہے۔ کوئی شوہر نادان ہوا تو عورت کے دھوکا میں آ گیا اور عاقل ہوا تو اس کا علاج جوتے سے کر دیا جہاں دماغ پر دس بارہ جوتے لگے اور سب آسیب جاتا رہا۔

تو جس طرح مائیوں بٹھلانے کی پابندی ہے کہ گرمی دیکھیں نہ سردی اسی طرح محرم کا شربت ہے جس کا مبنیٰ یہ خیال ہے کہ جو چیز خیرات کی جاتی ہے مردہ کو وہی پہنچتی ہے اور مردہ کی محبوب چیز خیرات کرنے کا مبنیٰ یہ حسرت ہے کہ ہائے آج وہ ہوتا تو وہ بھی کھاتا۔ جب وہ نہیں ہے تو لاؤ خیرات ہی کر دو تاکہ اس کو پہنچ جائے۔ منشا یہ ہے کہ ہم کو نعمائے جنت کا استحضار نہیں ہے۔ اگر ہم کو یہ بات مستحضر ہوتی کہ بہت سی نعمائے جنت سے وہ محظوظ و مسرور ہو رہا ہے تو یہ حسرت ہرگز نہ ہوتی۔ کیونکہ نعمائے جنت سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو کیا نسبت۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمائے جنت میں رمان و نخل وغیرہ کا بیان فرمایا ہے دنیا کی رمان و نخل پر قیاس نہ کیا جائے۔ نعمائے آخرت کو نعمائے دنیا سے محض نام کی مشارکت ہے ورنہ حقیقت میں وہ اور چیزیں ہیں اور یہ اور

علیہ السلام کو اس سے اسی لئے منع کر دیا تھا کہ اس کے کھانے سے فُضلہ پیدا ہوگا اور جنت میں بیت الخلاء نہیں ہے جہاں فضلہ نکالا جائے جب آدم علیہ السلام نے اسے کھا لیا تو قضائے حاجت کا تقاضا ہوا حکم ہوا کہ جنت سے نکلو، دنیا میں جاؤ بیت الخلاء وہاں ہے جنت میں نہیں ہے تو ان کا جنت سے نکالنا قضائے حاجت کے واسطے ہوا تھا محض عتاب کے طور پر نہیں ہوا بھلا مقربین پر بھی کہیں محض عتاب ہوتا ہے۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے جو جنت کی غذا اور اس میں فضلہ نہ ہونے پر یاد آ گیا۔ باقی اصل مضمون یہ تھا اور بالکل صحیح ہے کہ جنت کی غذا میں فضلہ بالکل نہیں۔ تو اب ہماری یہ حسرت بالکل فضول ہے کہ ہائے ہمارا فلاں عزیز دنیا کی ان نعمتوں سے محروم ہے۔ اسے وہ تو ایسی نعمتیں کھا رہا ہے کہ تمہارے خواب میں بھی نہیں آئیں مگر ہم نے وہاں کی نعمتوں کو دیکھا نہیں اور ان کو سوچتے بھی نہیں۔ اس لئے دنیا کی نعمتوں پر مفتوں ہیں اور ایسے مفتوں ہیں کہ یہاں کی گندی سڑی ہوئی چیزوں کا جنت میں ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم حقہ پیتے تھے وہ مولانا سے پوچھنے لگے کہ حضرت جنت میں حقہ پینے کے واسطے آگ بھی مل جائے گی؟ یہ بیچارے حقہ تمباکو پر ایسے مفتوں ہیں کہ جنت میں بھی حقہ کے طالب ہیں۔ یہ خبر نہیں کہ وہاں کی نعمتوں کو دیکھ کر دنیا کی تمام لذائذ کو تم بھول جاؤ گے اور حقہ تمباکو تو کیا چیز ہے جو خود ہی واہیات ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؂

علی الصباح کہ مردم بکار و بار روند
بلاکشان تمباکو بسوئے نار روند

صبح کا پاکیزہ اور متبرک وقت دوسروں کے لئے عبادت کا وقت ہے اور حقہ والوں کو اس وقت آگ کی تلاش ہوتی ہے یہاں تک کہ متبرک جگہ یعنی جنت میں بھی اس کو اس وقت آگ کی فکر ہے کہ ملے گی یا نہیں بلی حقہ پینے کو حرام تو نہیں کہتا مگر ہے بری چیز حقہ پینے والوں کو کھانے پینے میں بھی اس کے بغیر لطف نہیں آتا اور شریف اوقات میں اُن کو اسی کی دُھن لگی رہتی ہے۔ پھر صورت بھی تو بری ہو جاتی ہے کہ منہ سے بھی دُھواں اور ناک سے بھی دُھواں اور پیٹ میں بھی دُھواں جو دوزخیوں کی سی صورت ہے۔ پھر جنتی ہو کر دوزخیوں کی سی صورت بنانا فضول بات ہے۔

جنت کے حیرت انگیز پھل

غرض ہم نے جنت کی نعمتوں کو سوچا نہیں اس لیے دنیا کی لذتوں پر مفتوں ہیں۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جنت میں عجیب تماشا ہوگا کہ بعض دفعہ پھل سامنے لایا جائے گا۔ اس کو کھانے کے واسطے توڑیں گے تو اس میں سے حسین حور نکل آئیگی جس سے حیرت ہو جائیگی۔

جیسے ایک امیر کے مہمان کی حکایت سنی ہے کہ امیر صاحب کے باورچی نے ان کے سامنے کھانا رکھا جو مقدار میں بہت قلیل تھا جب روٹی سالن ختم ہو گیا تو اس نے کہا کہ رکابی اور پیالہ نوش کیجیے۔ مہمان خفا ہونے لگے کہ گستاخی کرتا ہے ہم کو رکابی پیالہ کھانے کو کہتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضور میں گستاخی نہیں کرتا آپ اس کو توڑ کر دیکھیں تو رکابی کا پیالہ توڑا تو معلوم ہوا کہ وہ بالائی ہے، اس کو بھی کھا گئے اور بہت مزیدار معلوم ہوا۔ پھر اس نے کہا کہ اب دسترخوان بھی کھا لیجیے۔ دسترخوان کو توڑ کر کھایا تو وہ بھی ایک عجیب روٹی تھی۔

نوابوں کے یہاں تو کبھی کبھی ایسا تماشا ہوتا ہے جنت میں روزانہ ایسا ہی ہوگا۔ پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مرنے کے بعد آدمی گیا گزرا ہو جاتا ہے مسلمان ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایسی راحت اور لذت میں پہنچ جاتا ہے کہ دنیا کی لذتوں کی ان کے سامنے کوئی ہستی نہیں۔ اسی لیے وہ مرنے والے یہ تمنا کرتے ہیں کہ تم بھی وہیں ہوتے دنیا میں نہ ہوتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

جو لوگ اللہ کے راستے میں (اعلاءِ کلمۃ اللہ) جان دے چکے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھے بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ ان کو جنت کی روزی دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و

انعام سے وہ بہت خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے وہ اُن کے لئے بھی خوشیاں
مناتے ہیں کہ (یہاں پہنچ کر) ان کو کسی قسم کا خوف اور غم نہ رہے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و
انعام سے خوشیاں مناتے ہیں اور اس بات پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیک کام
کرنیوالوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔ اب بتلاؤ تمہاری رائے صحیح ہے یا اُن کی یقیناً ان
کی ہی رائے صحیح ہے کہ تم بھی وہیں جاؤ تو اچھا ہے۔

آخرت دنیا سے بہتر ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔

کہ تم دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت اس سے بہت بہتر ہے اور پائیدار بھی ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ مُردوں کی رائے صحیح ہے کہ زندوں ہی کو جنت میں پہنچنے کی تمنا کرنا چاہیے پس تم
مُردوں کی فکر چھوڑو۔ اپنی فکر کرو کہ تم بھی اُن سے جا ملو۔ ایک مضمون کو ایک بدّو نے خوب ادا کیا ہے
جب حضرت عباس بن عبد المطلب کا وصال ہو گیا تو اُن کے صاحبزادہ عبداللہ بن عباس کو بہت
صدمہ تھا۔ ایک بدوی نے اُن کی اس طرح تسلی کی ہے

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَاِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ

اے ابن عباس! صبر کیجیے کہ آپ کو دیکھ کر ہم بھی صابر ہو جائیں گے کیونکہ رعیت کا صبر سردار
کے صبر کے تابع ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے

خَيْرٌ مِنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

اور صبر کیوں نہ کیا جائے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عباس جو تم سے جدا ہو گئے اس میں نہ تمہارا
کچھ نقصان ہوا نہ ان کا نقصان ہوا۔ تم کو تو اُن کی مفارقت پر صدمہ ہونے کا ثواب مل گیا جو تمہارے
حق میں عباس کے وجود سے زیادہ بہتر ہے اور اُن کو تم سے جدا ہو کر خدا مل گیا جو اُن کے حق میں
تم سے بہت بہتر ہے۔ واقعی خوب ہی تسلی کی۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس بدّی سے بہتر کسی نے
میری تسلی نہیں کی۔
بات یہ ہے کہ ہم کو سارا رنج و غم اس واسطے ہوتا ہے کہ آخرت ہم کو یاد نہیں۔ اگر آخرت کی

نہ ولذت یاد ہوتی تو اپنے عزیزوں کا یہاں کا چلنا پھرنا یاد نہ کرتے اور طبعی غم الگ چیز ہے بلکہ کا جنت میں چلنا پھرنا یاد کرتے اور اس سے خوش ہوتے اور تمنا کرتے کہ ہم بھی وہیں ہوتے۔
دیکھو اگر تمہارا بیٹا حیدر آباد میں جا کر وزیر ہو جائے تو تم یہ تمنا کرو گے کہ وہ حیدر آباد نہ جاتا یا یہ تمنا کرو گے کہ ہم بھی حیدر آباد پہنچ جاتے تو اچھا تھا کہ اپنی آنکھوں ۔۔۔ بیٹے کی عزت و شان و شوکت دیکھتے۔ یقیناً یہی تمنا کرو گے کہ ہم بھی حیدر آباد پہنچ جاتے۔ پھر اپنے مُردہ عزیزوں کے متعلق یہ تمنا کیوں ہے کہ وہ یہاں ہوتے۔ یہ تمنا کیوں نہیں کہ تم وہاں ہوتے۔
عارفین کو یہی تمنا ہے۔ وہ اسی آرزو میں ہیں کہ کسی طرح جلدی سے آخرت میں پہنچ جائیں کیونکہ اُن پر آخرت کی راحت منکشف ہو چکی ہے۔ جامی فرماتے ہیں ؎

دلا تا کے دریں کاخ مجازی — کنی مانند طفلاں خاک بازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ — کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیاں بیگانہ گشتی — چو دوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

مولانا فرماتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند — در جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

چونکہ نالہ عاشق کے سننے سے دوسروں کو بھی شوق پیدا ہوتا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ عشاق کا نالہ اور اُن کی گفتگو سن۔ نے سے مراد عشاق عارفین ہی ہیں۔ اس میں بے رغبتی اور آخرت کی طرف رغبت کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ عشاق الٰہی کی صحبت اختیار کرو اور اُن کا نالہ جدائی سنو کس کی جدائی ؎

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق

کیوں؟ اس لئے کہ ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

جناب ہماری خرابی اس کی ہے کہ ہم نے دنیا کو وطن سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے آخرت کا اشتیاق نہیں۔

اگر آخرت کو اصلی وطن سمجھتے اور وہاں کی نعمت اور راحت مستحضر ہوتی تو اپنے عزیزوں کے وہاں جانے پر حسرت نہ ہوتی بلکہ اپنے نہ جانے پر حسرت ہوتی۔

جنّت کلفت سے خالی ہے

آخرت کی راحت کا کیا پوچھنا۔ اُن کی تو یہ شان ہے:
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۔
کہ جس چیز کو دل چاہے گا اور جو درخواست کریں گے وہ بھی پوری ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے کہ بعض لوگ کھیتی کی درخواست کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے ابن آدم! تو بڑا حریص ہے بھلا جنت میں تجھ کو کھیتی کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کہے گا اے رب میرا دل چاہتا ہے بس فوراً کھیتی پیدا ہو جاوے گی اور اسی وقت تیار ہو کر غلہ کھیتی سے الگ ہو کر انبار لگ جائے گا۔
شاید کوئی معقولی صاحب یہاں یہ احتمال نکالیں کہ اگر کسی کا مرنے کو جی چاہے تو کیا جنت میں اُسے موت بھی آئے گی؟ اس لطیفہ کا جواب تو یہ ہے کہ ایسے تم ہی ہو گے جو جنت میں مرنا چاہو اور تو کوئی ایسا ہوگا نہیں۔ کیونکہ موت کو تو دنیا میں بھی کسی کا دل نہیں چاہتا۔ طبعاً اس سے کراہت ہے اور اگر کسی کا دل موت کو چاہتا بھی ہے تو اس کی وجہ یا تو شدتِ کلفت ہے جس سے تنگ آکر کی تمنا کرتا ہے اور جنت کلفت سے خالی ہے۔ یا اشتیاقِ لقاء اللہ ہے اور جنت میں جا کر یہ پورا ہو جائیگا۔ اور اصل جواب یہ ہے کہ جنت میں جانے کے بعد مرنے کی تمنا قلب میں نہیں آ سکتی بطور امتحان کے بھی یہ تمنا دل میں نہ آئے گی اور یہ سب عیش تو دخول جنت کے بعد ہوگا جو قیامت کے بعد ہونے والا ہے

ارواح کی حالت

اور قیامت سے پہلے یہ حالت ہوگی کہ روحوں کے رہنے کے واسطے عرش کے نیچے قندیلیں لٹکے ہوں گے جن کے اندر سبز پرندوں کے قالب میں روحیں رہیں گی اور یہ قالب ان کے واسطے جسم و قالب نہ ہوگا بلکہ مثل مرکب کے ہوگا کہ جہاں چاہیں اس مرکب کے ذریعہ سے اُڑتے پھریں گے۔ یہی نعمتیں اور راحتیں آخرت کی ہیں جن کی وجہ سے اہل اللہ کے قلوب دنیا سے بیزار ہیں۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا کو مجھ سے کیا واسطہ اور مجھے دنیا سے کیا تعلق ، میری حالت تو دنیا میں ایسی ہے جیسے ایک سوار چلتے چلتے کسی درخت کے نیچے سایہ لے لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ سوار اس حالت میں درخت کے ساتھ دل نہیں لگاتا نہ اس کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔

اب ہماری حالت قابلِ افسوس ہے یا نہیں کہ ہم نے دنیا کے ساتھ دل لگا رکھا ہے حالانکہ اس کو چھوڑنے کا سب کو یقین ہے۔ کوئی شخص یہاں ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ اور زیادہ وجہ دُنیا سے دل لگانے کی یہ ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان ایک تنگ و تاریک گڑھے میں مقید ہو جاتا ہے اور تنہا پڑا رہتا ہے۔ اس تنہائی کے تصور سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے بلکہ انسان میں ایسا بُرا مادہ ہے کہ غائب کو شاہد پر قیاس کر کے یہ سمجھتا ہے کہ جیسے تنہائی سے اب وحشت ہوتی ہے مرنے کے بعد بھی ہوگی۔ اسی پر یہ خیال مبنی ہے کہ مرنے کے بعد تنہائی ہوگی اور تنہائی سے وحشت ہوگی۔ مگر یہ دونوں مقدمات مخدوش ہیں۔ ثانی تو اس لئے کہ یہاں خود مشاہد ہے کہ بعض تنہائی بھی راحت ہے۔ چنانچہ کہا ہے ؎

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت ست چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست

جو لوگ یہاں خلوت پسند ہیں اُن سے خلوت کا مزا پوچھو کہ وہ تنہائی انجمن آرائی پر ترجیح ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

صنم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر و سمن درآ تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

پھر بھی دنیا میں اُن کو خلوت کا پورا لطف اس لئے نہیں آتا کہ جسم کی قید کمالِ خلوت سے مانع ہے۔ مرنے کے بعد یہ قید بھی مرتفع ہو جائے گی تو خلوت کا پورا لطف حاصل ہوگا یعنی مشاہدۂ جمالِ حق پوری طرح نصیب ہوگا۔ اس میں وہ لطف ہے کہ بخدا کسی چیز میں اس کی برابر لطف نہیں خاقانی فرماتے ہیں

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملکِ سلیمانی

اور نواب شیفتہ فرماتے ہیں ؎

چہ خوش ست با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

اور ایک عاشق کہتے ہیں ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ما ہے چہ کنم کہ چشم بد بیں نکند بکس نگاہے

(اور ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوۂ یار کے سوا — میری نظر میں خاک بھی جامِ جہاں نما نہیں

اور فرماتے ہیں ؎

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر — تو اپنا بوریہ بھی پھر ہمیں تختِ سلیماں تھا (جامع)

پس وہاں کی خلوت کو سببِ وحشت سمجھنا غلط ہے۔ اس تنہائی پر دنیا کی ہر مجلس آرائی قربان ہے۔ اور اوّل تو مقدمہ۔ اس لئے کہ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مرنے کے بعد انسان بالکل تنہا رہ جاتا ہے بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالمِ ارواح میں پہنچتی ہے جہاں سب روحیں اس کا استقبال کرتی ہیں اور دنیا کے حالات اس سے دریافت کرتی ہیں اپنے عزیزوں کا حال پوچھتی ہیں۔ پھر ایک کہتا ہے کہ اس کو راحت کرنے دو۔ دنیا سے تھکا ہوا آیا ہے۔

میری نانی صاحبہ کا جب وصال ہونے لگا تو انھوں نے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ چلو ان شاء اللہ تم کو کچھ خطر نہیں تو احادیث اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی تنہائی ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کی روح عالمِ ارواح میں جا کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوتی اور اپنے عزیزوں کی ملاقات سے مسرور ہوتی ہے۔ غرض وہاں ہر وقت خوشی رہے گی اور ایسی خوشی ہوگی کہ دنیا میں اس کا خواب بھی نہیں دیکھا گیا۔ حق تعالے فرماتے ہیں ؎

يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ

کہ جنتی ایسی ہی جامِ شراب میں چھینا جھپٹی کریں گے جس میں نہ بیہودگی ہوگی نہ گالم گلوچ کا نام و نشان ہوگا۔ اسی راحت کا کچھ نمونہ دنیا میں اگر نظر آتا ہے تو اہل اللہ کی زندگی میں نظر آتا ہے اہلِ دنیا کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔

ہمارے حاجی صاحب کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب کا معمول تھا کہ نمازِ فجر و اشراق کے بعد حضرت اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکالتے اور مولانا شیخ محمد صاحب اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب کے ساتھ مٹھائی تناول فرماتے۔ تو بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ ایک صاحب ہنڈیا اٹھا کر بھاگ جاتے اور دوسرے حضرات ان کے پیچھے پیچھے چھیننے کو

دوڑتے تھے۔ آج کل تو اس کو خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے مگر کیا جانے ان لوگوں نے کس چیز کو تہذیب سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل تعذیب کا نام تہذیب رکھ لیا ہے۔

غرض دُنیا میں وہ راحت اور وہ سامان میسّر نہیں آسکتا جو آخرت میں ہوگا۔ اگر اس کو یاد رکھا جائے تو کسی عزیز کے مرنے پر حسرت نہیں ہوسکتی۔ ہاں یہ حسرت ہوسکتی ہے کہ ہم وہاں کیوں نہیں پہنچے۔ اور اگر تمہاری دعا قبول ہوجاتی اور مُردے یہاں آجائیں تو واللہ! یہاں رہنا ہرگز گوارا نہ کریں اور موت ہی کی تمنا کریں اور تم کو ملامت کریں کہ دنیا سے دل لگا رکھا ہے۔ آخرت کو بھلا رکھا ہے۔ پس اب ہماری یہ حسرت کہ ہائے فلاں عزیز اس وقت ہوتا تو وہ بھی امرود و انار کھاتا بالکل اس کا مصداق ہے ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را　　　چہ شناسی زبانِ مرغاں را

اور ہماری حالت یہ ہے ؎

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں است　　　زمین و آسمانِ وے ہماں است

عزیز کے انتقال پر رنج طبعی کا تو مضائقہ نہیں وہ غیر اختیاری بات ہے اور اس میں حکمت ہے کہ انسان کو توجہ الی اللہ کی دولت اس کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے اور ثواب ملتا ہے مگر یہ حسرت اور دل بچھانا واہیات ہے کہ ہائے وہ اکیلا ہوگا۔ ہائے وہ ہماری طرح مزے مزے کی چیزوں سے متمتع نہ ہوگا۔ بخدا وہ تم سے زیادہ راحت میں ہیں۔ تم اُن کی فکر نہ کرو۔ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ مُردوں کے عیش و راحت کو معلوم کرنا چاہو تو میرا رسالہ شوقِ وطن مطالعہ کرو۔ اس کے متعلق میں توکلاً علی اللہ دعوی کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ اس کے دیکھنے کے بعد زندوں کو موت کا اشتیاق ہوگا اور مُردوں کے زندہ ہونے کا خیال نہ ہوگا بلکہ اپنی فکر ہوگی کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پہنچ جائیں۔ پس ہم کو اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہم کو آخرت کی چین اور راحت حاصل ہو جس کا طریقہ اس آیت میں بتلایا گیا ہے جس کا مجمل عنوان سعادت حاصل کرنا ہے۔

اور یہ ایک اتفاقی لطیفہ ہے کہ جس عزیز کے واقعہ انتقال کی تعزیت کے لئے یہ بیان ہوا ہے اس کا نام بھی سعادت پر مشتمل ہے اور ان شاء اللہ وہ اپنے نام کی طرح مسعود ہی ہے۔ ان شاء اللہ وہ آخرت کی راحت و آسائش سے کامیاب ہے۔ بہرحال آخرت کی راحت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ

سعادت و نحوست کی حقیقت

سعادت کی حقیقت لغت میں نیک بختی ہے جس کے معنی ہیں خوش قسمتی مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اچھے نصیب والے ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور اس حقیقت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دخول جنت میں عمل کو دخل نہیں بلکہ جس کا نصیب اچھا ہے جس کی تقدیر بھلی ہے وہی جنت میں جائے گا۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جنت میں جانے کے لئے عمل کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن و حدیث دو قومی کی تاکید اور گناہوں پر وعید کیوں ہوتی؟ کیا یہ تاکید و وعید بیکار ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ جس کے نصیب اچھے ہیں جس کی تقدیر بھلی ہے اس کے متعلق وہاں یہی لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ عمل نیک کریگا اس لئے جنت میں جائے گا۔ پس صاحب نصیب وہی ہے جو نیک عمل کرتا ہے اور بدنصیب وہ ہے جو بُرے عمل کرتا ہے۔ نصیب کا اچھا ہونا، تقدیر کا بھلا ہونا عمل صالح پر موقوف ہے۔ قانون اور قاعدہ یہی ہے۔

یوں خلافِ قاعدہ کسی پر فضل ہو جائے وہ اور بات ہے مگر وہ بھی صرف ہمارے نزدیک خلافِ قاعدہ ہوگا کیونکہ ہم کو اس کے عمل کی خبر نہیں۔ باقی اللہ تعالٰی کے نزدیک وہ بھی خلافِ قاعدہ نہیں کیونکہ اللہ تعالٰی کو ہر شخص کی پوری خبر ہے تو جس کو باوجود بدعملی کے بلا عذاب جنت میں بھیجا جائے گا اس کے پاس کوئی عملِ صالح اتنا بڑا ہوگا جو تمام گناہوں پر غالب آگیا ہے جس کی خبر خدا تعالٰی کو تھی ہم کو خبر نہ تھی۔

سعادت کے دوسرے معنی اور بھی ہیں جو نحوست کے مقابل ہیں یعنی بابرکت ہونا۔ اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ بابرکت ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور جو منحوس ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حقیقی منحوس کون ہیں؟ صرف وہ ہیں جو کہ جہنم میں جائیں گے۔ اور یہ جو مشہور ہے نحوست کہ بعض لوگ قمری کو یا الو کو یا کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں، یہ کوئی چیز نہیں، میرٹھ میں ایک بنیا منحوس گھوڑوں کو خریدتا تھا اور بہت نفع کماتا تھا اس کے حق میں وہی بابرکت تھے۔ بعض لوگوں کو قرآن کی اس آیت فارسلنا علیھم ریحا صرصرا فی ایام نحسات "تو ہم نے ان پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو (ان کے حق میں) منحوس تھے" سے شبہ ہوگیا ہے کہ بعض ایام

بھی منحوس ہوتے ہیں ۔ مگر افسوس تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایام نحسات کی تفسیر دوسری آیت میں سبع لیال وثمانیۃ ایام وارد ہوئی ہے ۔ تو اس کو ملا کر یہ لازم آئیگا کہ کوئی دن بھی مسعود نہیں بلکہ سب ایام منحوس ہی ہیں ۔ اور اس کا کوئی قائل نہیں ۔ لہٰذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا درحقیقت ایام میں سعد ونحس کا مسئلہ اہل نجوم کا اختراع ہے ۔ اور شیعہ نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس کو منسوب کیا ہے مگر وہ روایت موضوع ہے ۔ شریعت میں بعض ایام متبرک تو ہیں مگر منحوس کوئی دن نہیں ۔ رہا یہ سوال کہ پھر ایام نحسات کے کیا معنی ہیں ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے معنی نحسات علیہم ہیں یعنی قوم عاد کے حق میں وہ ایام منحوس تھے کیونکہ اُن پر ان ایام میں عذاب آیا تھا اور وہ عذاب مسبّب تھا کفر و معصیت سے پس معلوم ہوا کہ اصل نحوست کی چیز معصیت ہے ۔ بہرحال خود اس آیت سے معلوم ہوا کہ سعادت نام ہے طاعت کا اور نحوست نام ہے معصیت کا ۔ اب بتلاؤ کہ منحوس ہم ہیں یا الو اور قمری اور کیلا ۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معصیت سے مبرا ہیں ۔ تو یہ کیسی غلطی ہے کہ ہم اپنی نحوست کو دوسری چیزوں پر ڈالتے ہیں بس ہماری وہ حالت ہے ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

عمل صالح کی توفیق

اب میں اس آیت کے متعلق چند علمی نکات بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں ۔ میرے خیال میں اس جگہ سُعِدُوا بصیغہ مجہول میں ایک راز یہ سمجھ آتا ہے بشرطیکہ لغت سے اس کی تائید ہو جائے ۔ اور سُعِدَ کا متعدی ہونا معلوم ہو جائے مجھے یہاں قاموس نہیں ملی ورنہ تحقیق کر لیتا کہ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ تم جو کامیاب اور نیک بخت کئے گئے ہو یہ تمہارا کیا ہوا نہیں بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے محض عنایت ہی عنایت ہے کیونکہ ہر چند کہ سعادت کا مدار عمل صالح پر ہے مگر عمل صالح کی توفیق محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہے یہ جو آپ کو نماز کا شوق ہے اور رات کو تہجد میں اٹھتے ہیں یہ آپ کا کام نہیں بلکہ کوئی اور ہی اُٹھا رہا ہے بس ہماری حالت یہ ہے ؎

لہ لغت سے اس کی تائید نہیں ملی سَعِدَ وسُعِدَ بالفتح ہے وبالضم المعنی واحد ہے متعدی اسعدہ اللہ ہے مگر مفعول نہیں بلکہ مسعود ہے ۔ کما فی القاموس ۲۱ ظ ۔ میں کہتا ہوں کہ اس تحقیق کے بعد اس نکتہ کو اس طرح بدل دیا جائے گو سُعِدُوا متعدی نہیں مگر صورت متعدی کی رکھتا ہے اس صورت میں اس نکتہ کا الہام ہے گو دلالت نہیں (اشرف علی)

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یہ تو شعدُّوا میں نکتہ تھا۔

دو علمی نکتے

اس کے بعد ما دامت السموت والارض الا ماشاء ربک کے متعلق دو علمی نکتے عرض کرتا ہوں کیونکہ اس پر بظاہر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت کا جنت میں خلود آسمان و زمین کے دوام کے برابر ہوگا اور آسمان و زمین کا دوام محدود ہے تو اہل جنت کا خلود بھی محدود ہوا۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں پر سمٰوٰت والارض سے مراد جنت کے آسمان و زمین ہیں۔ دنیا کے آسمان و زمین مراد نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کی زمین و آسمان رہے اور جنت کی زمین و آسمان کا دوام غیر محدود ہے۔ اُن کے لئے کبھی فنا نہیں۔ تو اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کی دلیل کہ جنت کی زمین و آسمان کا دوام محدود نہیں وہ آیات ہیں جن میں خالدین فیہا ابدا وارد ہے اور وہ احادیث ہیں جن میں یا اھل الجنۃ خلود ولاموت ویا اھل النار خلود ولاموت وغیرہ وارد ہے۔

رہا یہ سوال کہ ما دامت السموت والارض کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسا جیسے کسی کو انعام میں کوئی گاؤں دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ جب تک یہ گاؤں باقی ہے اس وقت تک تم اس کے مالک ہو۔ تو اس طرز سے مخاطب کی پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ مجھ سے اس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ یہی مقصود اس جگہ ما دامت السموت والارض کے بڑھانے میں ہے۔

اس کے بعد الا ماشاء ربک کے متعلق ایک اشکال کو دفع کرنا چاہتا ہوں۔ بظاہر الا ماشاء ربک خالدین فیہا استثنا رہے۔ ترجمہ یہ ہوا کہ اہل سعادت جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جب خدا چاہے۔ تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کسی وقت اہل جنت کا خلود منقطع بھی ہو جائیگا یا انقطاع کا احتمال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ خالدین سے مستثنیٰ نہیں بلکہ الذین سعدوا سے استثنا ہے اور ما بمعنی من ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں وہ جنت میں

جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے وہ جنت میں نہ جائیگا یعنی بعض اہلِ سعادت ایسے بھی ہیں جن کو ہم لوگ سعید سمجھتے ہیں مگر خدا کے نزدیک وہ سعید نہیں ہیں۔ واللہ یہ بات قاصمۃ الظہر ہے۔ اس نے عارفین کی کمر توڑ دی ہے کیونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں ہے کہ ہم خدا کے نزدیک کیسے ہیں ؎

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

ابن عباسؓ نے دوسری جگہ سورۂ اعراف میں الا ما شاء ربک میں ما کو بمعنی من فرمایا ہے اس میں اور اس میں بظاہر کچھ فرق نہیں۔ اس لئے یہاں بھی ما کو بمعنی من کہنے میں کچھ حرج نہیں اور اس کے بعد خلودِ اہلِ جنت میں کچھ اشکال باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں خلود سے استثنا نہیں ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک اور تفسیر کی ہے جو بہت ہی عجیب ہے۔ وہاں تک کسی کا ذہن نہیں پہنچ سکا اس کا حاصل یہ ہے کہ الا ما شاء ربک سے اللہ تعالیٰ کو فرق کرنا منظور ہے۔ اپنی ابدیت اور اہلِ جنت کی ابدیت سے کہ خدا تعالیٰ کی ابدیت کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور اہلِ جنت کی ابدیت داخلِ مشیت ہے۔ الا ما شاء ربک سے فقط یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ اہلِ جنت کی ابدیت مستقل نہیں بلکہ تابعِ مشیتِ الٰہیہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ ابدیت کسی وقت منقطع ہو جائیگی کیونکہ دوسری نصوص سے یہ امر معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت جو خلودِ اہلِ جنت کے متعلق ہے وہ کبھی منقطع نہ ہوگی۔ یہ حاصل ہے شاہ صاحب کی تفسیر کا۔

مگر ان کی عبارت سے یہ مضمون ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ وہی سمجھے گا جس کو یہ معلوم ہو کہ اس مقام پر ایک اشکال ہے جس کو شاہ صاحب رفع کرنا چاہتے ہیں۔ واقعی شاہ صاحب نے اس کو بہت سہل اور مختصر عنوان سے رفع کر دیا ہے جو ان کے تبحرِ علم کی دلیل ہے۔

ایک آریہ نے یہ اعتراض دوسرے عنوان سے شائع کیا تھا کہ خدا کا وجود بھی غیر متناہی ہے اور جنتیوں کا وجود بھی غیر متناہی ہے تو دونوں برابر ہو گئے۔

میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالفعل ہے اور جنتیوں کا وجود غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد ہے مگر شاہ صاحب کا جواب سب سے عمدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالذات ہے اور اہلِ جنت کا وجود غیر متناہی بالغیر ہے یعنی مشیت کے تابع ہے۔ یہ چند نکات تھے جو اس آیت کے متعلق تھے۔ اب میں آیت کا خلاصہ عرض کرکے بیان کو ختم کروں گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو آخرت کی راحتوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے تاکہ اُن کو مستحضر کر کے ہم آخرت کی طرف رغبت کریں اور اُس کے لئے سعی کریں اور طریقہ راحت اُخرویہ حاصل کرنے کا یہ بتلایا ہے کہ سعادت حاصل کریں جس کا خلاصہ عملِ صالح ہے۔

اور یہاں سے میں اہلِ علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اہلِ علم آج کل علم حاصل کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں عمل کا اہتمام اور تکمیلِ عمل کی کوشش نہیں کرتے۔ اور حیرت ہے کہ اس پر وہ اپنے آپ کو نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے ہیں۔ کیا یہی علم مجرد عن العمل وہ شے ہے جس سے تم نیابتِ رسول چاہتے ہو۔ اس علم خالی عن العمل کی تو وہ حالت ہے جس کے متعلق اہلِ تحقیق یوں فرماتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل است قال	نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آں کہ رہ بنمایدت	زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند	خوف وخشیت درد لت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز!	خود ندانی تی کہ تو حوری یا عجوز
علم نبود غیر علم عاشقی	مابقی تلبیس ابلیس شقی!
علم چوں بر دل زنی یارے شود	علم چوں بر تن زنی مارے شود

حقیقی علم

حقیقی علم وُہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ بدون عمل کے نہیں ہو سکتی پس علم بدون عمل کے جہالت کی مثل ہے ؎ علمے کہ رہِ حق نہ نماید جہالت ست۔

غرض علم محض پر کفایت کرنا بڑی غلطی ہے۔ علماء و طلباء کو عمل کا پورا اہتمام کرنا چاہیئے جب ہی اُن کو سعادت حاصل ہو گی۔ چونکہ اس بیان میں اہلِ علم و طلباء بھی شریک ہیں اس لئے یہ مضمون طالب علموں کی ضرورت کا بیان کر دیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی چین چاہتے ہو تو سعادت حاصل کرو اور ایسی سعادت جس سے جنت کا دخول اولی حاصل ہو اور حق تعالیٰ کا قرب کامل عطا ہو علم دین مع العمل ہے۔ گو سعادت کا ایک درجہ مجرد علم سے

اور مجرد عمل سے بھی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ نجات مطلقہ کے لئے نفس ایمان واسلام بھی کافی ہے مگر ناقص درجہ پر کفایت کرنا غلطی ہے کیونکہ آخرت کا عذاب ذرا سا بھی بہت ہے۔ واللہ! اس کا تحمل نہ ہوسکے گا۔ بس اس کی کوشش کرو کہ سعادت کاملہ نصیب ہو اور وہ جبھی ہوگی جب کہ علم دین بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ عمل کا بھی اہتمام ہو۔

اب مرحوم کے لئے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کو راحت و چین عطا فرماوے اور زندوں کے لئے صبر و قرار و سکون کی دعا کیجیے۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس بیان سے اُن کا دل ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔ اور اگر اس مضمون کو سوچتے رہے تو ان شاء اللہ پوری طرح قرار و سکون ہوجائے گا۔ ایک تدبیر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ مرحوم کی بیماری اور انتقال وغیرہ کا تذکرہ موقوف کردیا جائے کہ اس سے دل پر تازہ زخم لگتا ہے۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سعادتِ کاملہ عطا فرمائیں اور فہم سلیم و عمل مستقیم عطا فرمائیں۔ آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

اسلم ۸۵/۱/۱۷

ساتھ رکھتا ہے۔ تمام ساز و سامان پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ پھر جس شہر، سرائے یا ہوٹل میں جا کر قیام کرتا ہے تو وہاں ہمیشہ کے لئے دل لگا کر نہیں بیٹھ جاتا۔ بلکہ اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح یہاں کے کام سے جلد فراغت پا کر گھر لوٹے، کیونکہ جو سکون و آرام اور راحت انسان کو گھر میں نصیب ہوتی ہے۔ وہ گھر سے باہر حالت سفر میں قطعاً نصیب نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب ایسے سفر سے واپسی کے بعد اُسے کہا جاتا ہے کہ جس طرح آپ نے ایک شہر سے دوسرے شہر کا چند روز کا سفر طے کیا ہے۔ اسی طرح یہ ناسوتی زندگی بھی اس فانی دنیا سے اُس ابدی دنیا کے سفر کا دور ہے۔ وہاں کے سفر کی بھی آپ کو ہر وقت تیاری رکھنی چاہیے تاکہ عین وقت پر کوئی پریشانی نہ ہو، تو وہ اس بات کو ناممکن بتاتا ہے جو اس کے جہل اور حرماں نصیبی کی انتہا ہے۔ اگر اس کا خالق اُسے ایک حقیر قطرہ سے احسن تقویم میں بدل کر شرف انسانیت بخش سکتا ہے۔ اس کے لئے اتنی وسیع و عریض دنیا تیار کر سکتا ہے تو کیا اُسے دوسری زندگی بخشنے اور کسی دوسری دنیا میں پہنچانے اور بسانے پر وہ قادر نہیں ہو سکتا؟

پیش کردہ مواعظ کے اندر حضرت تھانویؒ نے انہی امور کی طرف انسان کی توجہ دلائی ہے اور اس پر نہایت احسن طریق سے دنیا کی حقیقت، آخرت کی اہمیت اور اعمال صالحہ کی افادیت واضح کی ہے تاکہ وہ غفلت و معصیت کی دلدل سے نکل کر اپنے سفر آخرت کی تیاری کرے جو ہر انسان کو ہر حالت میں پیش آتا ہے اور جس سے کسی کو مفر نہیں۔ ان میں بعض ایسے رموز و نکات اور حقائق و معارف بھی آ گئے ہیں۔ جن کا کسی مستقل تصنیف میں ملنا مشکل ہے اور جو اپنی انفرادی حیثیت سے نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختلف مواعظ کے اندر جو نادر رموز و نکات منتشر حالت میں پائے جاتے ہیں۔ انشاء اللہ ان کو جمع کر کے ایک مستقل تصنیف کی شکل میں قارئین کرام کی خدمت میں جلد پیش کیا جائے گا۔

۱۰ جون ۱۹۵۷ء	احقر العباد!
چہلیک - ملتان شہر	منشی عبدالرحمٰن خاں

وہ کوئی بڑی علمی کتاب نہیں۔ محض ترجمہ دیکھنا بعض عقلا، کو غلطی میں ڈال دیتا ہے تو قرآن کا ترجمہ دیکھنا کیونکر کافی ہو جائے گا اور اس میں غلطی کا کیوں احتمال نہ ہوگا۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب ترجمہ قرآن بھی بدون پڑھے نہیں آسکتا تو ترجمہ کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے کیا نفع ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ سے نفع یہ ہوا کہ آپ کو عربی صرف ونحو ولغت پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیا یہ تھوڑا نفع ہے۔ اگر ترجمہ نہ ہوتا تو پہلے صرف ونحو میں دماغ صرف کرنا پڑتا۔ پھر کہیں برسوں کے بعد اس قابل ہوتے کہ ترجمہ قرآن سمجھ سکیں۔ اب اتنی آسانی ہے کہ جیسا چاہو ترجمہ کسی مولوی سے شروع کر سکتے ہو۔ یہ تھوڑا نفع ہے۔ باقی ترجمہ کرنے والوں کا یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی سے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں

صاحبو! ذرا دنیا کے کاموں پر نظر کرو کہ ذرا ذرا سا کام بھی بدون اُستاد کے بتلائے نہیں آتا۔ بخاری یعنی بڑھئی کا کام ذرا کوئی بدون سیکھے کر تو لے یقیناً اپنے ہاتھ پیر کاٹے گا۔ حالانکہ بار ہا بڑھئی کو کاٹتے چھیلتے دیکھا ہوگا۔ وہاں کوئی نہیں کہتا کہ بس ہم نے طریقہ دیکھ لیا۔ ہم بھی ایسے ہی کریں گے۔ ان باتوں میں ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ بھائی صرف دیکھ لینا کافی نہیں، جب تک کہ باقاعدہ اُستاد سے نہ سیکھا جائے۔ افسوس قرآن کو ایسا معمولی کلام سمجھا جاتا ہے کہ اس کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی ہوگیا۔ صاحبو! آپ کو اس سے تعجب ہوگا کہ میری عمر پچاس سال سے متجاوز ہوگئی اور لکھنے پڑھنے کا اس عرصہ میں بہت ہی کام رہا مگر آج تک قلم بنانا مجھے نہیں آیا۔ کیونکہ کسی سے سیکھا نہیں۔ یونہی اُلٹا سیدھا کاٹ چھیل کر کام چلا لیتا ہوں۔ جب ایسے خسیس فن بدون اُستاد سے سیکھے نہیں آسکتا تو ترجمہ قرآن کی بابت کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں بدون اُستاد کے سمجھ لیتا ہوں اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ اس کا امتحان اس طرح کر لیں کہ پہلے خود سارا ترجمہ قرآن دیکھ جائیں۔ اس کے بعد کسی عالم سے پڑھیں۔ انشاء اللہ اُس کے بعد خود ہی اپنے کو جاہل کہیں گے اور معلوم کر لیں گے کہ محض ذہین ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تدبر قرآن کے لئے سب کو مولوی بننا ضروری نہیں۔ بلکہ قرآن میں تدبر کی اور بھی سہل صورتیں ہیں جو بدون مولوی بنے حاصل ہو سکتی ہیں، مگر اس سے یہ نہ سمجھ جانا چاہئے کہ جب بدون ترجمہ پڑھے تدبر نہیں ہو سکتا تو قرآن کا تلاوت کرنا بھی فضول ہوا۔

ہے کہ فضول اور بیکار وہ ہے، جس میں کوئی نفع نہ ہو۔

فوائدِ تلاوت

قرآن میں منافع بہت سے ہیں۔ ایک نفع تو بعد فہم کے اس پر عمل کرنے کا ہے۔ دوسرا فائدہ ثواب ہے تو بدون معنے سمجھے پڑھنا فضول اس وقت ہو، جبکہ اس کو ثواب نہ ملے۔ اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف تو الم میں تین حرف ہوئے۔ اس کی تیس نیکیاں ہوئیں اور بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ میں الف اور لام اور میم میں سے ہر ایک کو ایک حرف نہیں کہتا۔ بلکہ لفظ الف میں جو اوّل الف آیا ہے۔ وہ ایک حرف ہے اور لفظ لام میں جو اول لام بولا گیا وہ ایک حرف ہے اور لفظ میم میں جو اوّل میم بولا گیا۔ وہ ایک حرف ہے تو گویا آپ نے ہر حرف کے سرے کو بیان کیا ہے اور باقی کو قیاس پر چھوڑ دیا اس حساب سے الم میں نو حرف ہوئے اور اس میں نوے نیکیاں ہوئیں تو یہ قرآن کا تھوڑا نفع ہے کہ بے سمجھے پڑھنے سے بھی ایک لفظ میں نوے نیکیاں مل گئیں اور ہمارا کچھ خرچ بھی نہیں ہوا، اور یہ ثواب کوئی حروف مقطعات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ تو ایک تمثیل تھی۔ قرآن کے ہر لفظ کا یہی ثواب ہے۔ سورۃ فاتحہ ہم پڑھتے ہیں۔ جہاں زبان سے الحمد نکلا تو اس میں پانچ حرف ہیں۔ معاً پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو نفع نہیں سمجھتے۔ مگر مر کر اس کی قدر معلوم ہوگی۔

اس کی بعینہ ایسی مثال ہے کہ دو شخص مکہ جانے والے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تانبے کا پیسہ وہاں بالکل نہیں چلتا۔ ایک نے تو تانبے کے پیسوں سے دوسرا سکہ چاندی کا جو کہ وہاں رائج ہے، خرید لیا۔ دوسرا شخص جو کہ مکہ کی حالت سے جاہل ہے اور اس کو خبر نہیں کہ وہاں کس سکے کی ضرورت ہوگی۔ اس پر ہنستا ہے اور اس کو بے وقوف بناتا ہے اور کہتا ہے۔ جب یہ پیسہ یہاں کارآمد ہے تو وہاں بھی ضرور کام دیگا۔ اس نے صرف پیسے ہی پیسے ساتھ باندھ لئے۔ مگر ایک تیسرا

شخص جو کہ مکہ ہو کر آیا ہے۔ فیصلہ کرے گا کہ پہلا شخص بے وقوف نہیں، بلکہ وہ عاقل ہے اور دوسرا شخص بے وقوف ہے۔ اس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ میں جہاں جا رہا ہوں۔ وہاں کا کیا دستور ہے۔ مگر ابھی تک اس ثالث کے فیصلے کی کسی کو قدر نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں شخص مکہ پہنچے۔ اب دونوں کی حالت میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا۔ پہلا شخص جو کہ مکہ میں چلنے والا سکہ ساتھ لایا ہے، وہ تو ہر دوکان پر جاتا ہے اور بے تکلف ضرورت کی چیزیں لے آتا ہے، اور دوسرا جس کی تھیلی میں تانبے کے پیسے ہی پیسے ہیں۔ ہر ضرورت کے وقت دوسروں کا منہ تکتا ہے اور اب اپنی حماقت پر روتا ہے کہ افسوس میں نے عقلاء کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور اب یہ پیسے تو یہاں بالکل فضول ہیں۔ کس طرح کھانا خریدوں؟ کہاں سے پانی خریدوں، کس طرح سے دن کٹیں گے؟

اسی طرح ان نیکیوں کی قدر ہم کو آخرت میں ہوگی کیونکہ یہ وہیں کا سکہ ہے، وہاں آپ کے یہ روپے پیسے کام نہ دیں گے اور وہاں سب کو جانا ہے۔ اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا۔ جب بازار قیامت قائم ہوگا۔ وہاں بھی دو قسم کے لوگ ہوں گے، ایک وہ جو کہ وہاں کا سکہ یعنی نیکیاں پلے باندھ کر لائے ہیں، وہ تو بے تکلف ہر قسم کی راحت حاصل کریں گے۔ دوسرے وہ لوگ جو اپنی غفلت کی وجہ سے آخرت کو بھولے ہوئے تھے اور اس وجہ سے کچھ نیکیوں کا ذخیرہ ساتھ باندھ کر نہیں لائے، ان کا یہ حال ہوگا

که بازار چندان که آگنده تر
تهی دست را دل پراگنده تر

اس وقت آپ اُن لوگوں کی قدر کریں گے۔ جن کو آج مولویوں کا بگاڑا ہوا کہا جاتا ہے۔ اُس دن وہ احمق جن کی حماقت پر آج کل کی نئی روشنی نے رجسٹری کر دی ہے۔ عاقل کہلائیں گے۔ اُس وقت حیرت ہوگی کہ یہ لوگ جن کو ہم ذلیل سمجھتے تھے۔ بڑے باشوکت ہیں اور آج ہم اُن کے آگے ذلیل ہیں۔

اہمیتِ اعمال

صاحبو! وہاں بجز اعمال صالحہ کے کچھ کام نہ آوے گا اور یہ بھروسہ نہ کرنا کہ ہمارے

ماں باپ بہت نیک تھے۔ اُن سے کچھ نیکیاں بٹوالیں گے۔ وہاں کوئی کسی کے کام نہ آوے گا۔

حدیث شریف میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اور وہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں تو جنتی ہے اور بدیاں زیادہ ہوں تو دوزخی ہے اور دونوں برابر ہوں تو چندے اعراف میں رکھا جائے گا۔ اس قاعدہ کے موافق اُس شخص سے ارشاد ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے تم کو مل جائے تو جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ وہ شخص خوش ہوگا کہ میرے تو ماں باپ، بیوی بچے، دوست احباب بہت سے ہیں۔ کسی سے ایک نیکی کا مل جانا کیا دشوار ہے۔ چنانچہ وہ جائے گا اور جاکر باپ سے اپنی حالت عرض کرے گا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت ہے۔ تم میرے باپ ہو۔ میرے حال پر رحم کرو۔ ایک نیکی دے دو۔ وہ صاف جواب دے دیگا کہ میاں ہم کو اپنی جان کی پڑی ہے، تجھے ایک نیکی کیسے دے دوں۔ ماں بھی اسی طرح جواب دے دے گی۔ اولاد بھی ٹکا سا جواب دے دے گی۔ دوست احباب بھی دور کی سنائیں گے۔ آخر نہایت مایوس ہو کر لوٹے گا۔ راستہ میں ایک شخص تخی ملے گا جس کے پاس صرف ایک ہی نیکی ہوگی۔ وہ اس سے پوچھے گا کہ میاں پریشان کیوں ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟ وہ جواب دے گا کہ اگر میری پریشانی کا علاج ہو سکتا تو میں ظاہر بھی کرتا، مگر اس کا علاج کسی سے نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہے۔ ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ ماں باپ، اولاد و اقارب، دوست احباب سب جواب دے چکے۔ تم ہی کیا کر لوگے؟ وہ کہے گا تم اپنا حال تو کہو شاید میں اس میں کچھ ساتھ دے سکوں۔ غرض بعد کلام بسیار یہ اپنا حال کہے گا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت تھی۔ وہ شخص جواب دے گا کہ میرے پاس کل ایک نیکی ہے اور وہ میرے کسی کام کی بھی نہیں۔ کیونکہ گناہ بہت زیادہ ہیں۔ میں تو جہنم میں جاؤں گا۔ یہ نیکی ہوئی تو کیا نہ ہوئی تو کیا، یہ نیکی تو ہی لے جا۔ تیرے ہی کام آجائے گی۔ یہ شخص حیران ہوگا کہ یا اللہ! یہ کون سخی ہے۔ جو اس طرح بے خطر اپنی نیکی دے رہا ہے۔ صاحبو! وہاں بھی یہ اہل دل ہی سخاوت کریں گے اور یہی مخلوق پر رحم کریں گے۔ ماں باپ کچھ کام نہ آویں گے۔ غرض یہ شخص

خوش ہو کر وہ نیکی لے کر لوٹے گا اور دربارِ الٰہی میں پیش کر دے گا۔ وہ تو بموجب اُس قاعدہ کے بخش دیا جائے گا۔ کیونکہ نیکیاں غالب ہوگئیں۔

اس کے بعد اُس سخی صاحب کو بلایا جائے گا کہ تم نے یہ کیا کیا کہ اپنی نیکی دوسرے کو دے دی۔ کیا تم کو اپنی نجات کا فکر نہیں۔ وہ عرض کرے گا کہ الٰہی! میرے پاس صرف ایک ہی نیکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ قاعدہ کے موافق تو میں جہنمی ہوں اور یہ نیکی میرے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر حق تعالیٰ اپنے فضل سے بخش دیں تو اور بات ہے۔ مگر جب میری بخشش صرف فضلِ حق پر موقوف ہے اور میں اپنے عمل سے نہیں بخشا جا سکتا تو اس غریب کی بھی کیوں اُمید توڑوں۔ میں نے وہ نیکی اُس مسلمان بھائی کو دے دی کہ اُس کی تو مغفرت ہو جائے گی۔ میرا معاملہ رحمتِ حق کے سپرد ہے۔ وہ شخص اس سخاوت پر بخش دیا جائے گا۔

صاحبو! وہ عجیب دربار ہے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات پر بخشش ہو جاتی ہے۔ ایک اور شخص کا قصہ حدیث میں آیا ہے کہ اُس کے پاس کوئی نیکی نہ تھی کہ اُس نے ایک دن راستہ میں سے کانٹا ہٹا دیا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ بہت ہی ذرا سی بات ہے مگر حق تعالیٰ کے یہاں اس کی بھی قدر ہوئی اور اُس کو اسی بات پر بخش دیا گیا۔ صاحبو! نیک کام کو، چاہے کتنا ہی ذرا سا ہو، حقیر نہ سمجھو۔ بعض دفعہ ذرا سی بات قبول ہو جاتی ہے اور بڑے بڑے عمل جن پر ناز تھا، رکھے رہ جاتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو کسی دوسرے بزرگ کو کشف ہوا یا خواب میں دیکھا کہ اُن سے سوال ہو رہا ہے کہ ہمارے واسطے کیا عمل لے کر آئے ہو، انہوں نے جواب دیا کہ اور تو کچھ نہیں، توحید لے کر آیا ہوں۔ ارشاد ہوا جھوٹا ہے۔ توحید بھی تیری درست نہیں "اذکر لیلۃ اللبن" دودھ والی رات کا قصہ یاد کرو۔ دودھ والی رات کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک روز دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا تھا تو انہوں نے کسی سے یہ کہا کہ دودھ سے درد ہو گیا تو یہ باز پرس ہوئی کہ تم نے دودھ کو موثر قرار دیا، حالانکہ مؤثر ہم ہیں۔ یہ کیسی توحید ہے۔ جب توحید بھی غلط ثابت ہوئی تو وہ بزرگ بہت پریشان ہوئے۔

پھر ارشاد ہوا کہ تم اپنے قول کے موافق دوزخ کے مستحق ہو چکے۔ کیونکہ تمہارے اقرار میں تمہارے پاس صرف ایک نیکی تھی اور وہ بھی غلط ثابت ہوئی۔ اب سنو! ہم تم کو کس بات پر بخشتے ہیں۔ ایک رات کو تم نے ایک بلی کے بچے کو سردی سے کانپتا دیکھا تھا اور تم نے اُس پر رحم کھا کر لحاف ڈال دیا تھا۔ جس پر اُس نے تم کو دعا دی۔ وہ دعا اُس بلی کے بچے کی ہم نے قبول کر لی اور تم کو اُس کی دعا پر بخشا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک عمل تھا، مگر کبھی حق تعالیٰ بدون عمل کے صرف ظاہری صورت پر بخش دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ ہیں، قاضی یحییٰ بن اکثمؒ جو بخاریؒ کے شیخ ہیں۔ اُن کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ ان سے سوال ہو رہا ہے اور عتاب آمیز سوال ہو رہا ہے اور وہ چُپ خاموش کھڑے ہیں۔ جب عتاب ہو چکا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو حدیث میں پڑھا کرتا تھا کہ ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم کہ حق تعالیٰ شانہٗ بوڑھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں اور اس کو بخش دیتے ہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جاؤ اگرچہ نیکی کچھ نہیں، مگر تمہارے بڑھاپے پر رحم کر کے تم کو بخشا جاتا ہے۔ ہمارے رسولؐ نے سچ کہا ہے۔ بے شک ہم کو بوڑھے آدمی پر رحم آتا ہے۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں

دلم میدہد وقت وقت ایں اُمید
کہ حق شرم دارد ز موئے سفید

اس سے زیادہ حیرت انگیز دوسری حکایت ہے کہ یہاں تو قاضی یحییٰ بن اکثمؒ واقعی بوڑھے تھے۔ ایک مسخرہ جوان کی حکایت ہے کہ جب مرنے لگا تو اُس کو اپنی حالت پر خوف تھا کیونکہ عمل صالح کچھ نہ کیا تھا۔ اُس نے یہ وصیت کی کہ جب مجھ کو غسل و کفن دے چکو تو میری داڑھی پر ذرا سا آٹا چھڑک دینا۔ چنانچہ ورثاء نے وصیت پوری کی۔ اُس کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ اُس سے سوال ہوا کہ تو نے یہ وصیت کیوں کی تھی۔ اُس نے عرض کیا کہ یا اللہ میرے پاس عمل تو کچھ تھا نہیں۔ اس لئے اپنی حالت پر اندیشہ تھا اور یہ حدیث میں نے سنی تھی۔ ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم کہ خدا بوڑھے مسلمان سے شرماتا ہے۔ قسمت سے میں بوڑھا بھی نہ تھا اور بوڑھا بننا اپنے اختیار میں تھا۔ تو میں نے یہ وصیت کی کہ میرے بالوں

میں آٹا لگا دینا کہ بوڑھوں کی سی صورت تو ہو جاوے۔ بس اتنی بات پر وہ شخص بخش دیا گیا۔ سچ کہا ہے ؎ رحمت حق بہانہ می جوید۔

یہ تو حکایتیں اہل کشف کی ہیں، جو خود حجت شرعیہ نہیں۔ مگر حدیث میں بھی تو اُن کی اصل موجود ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کو صرف راستہ میں سے کانٹا ہٹا دینے پر بخش دیا گیا۔ جب اُن کی اصل حدیث میں موجود ہے تو پھر ان کشفیات کو بھی تائید میں بیان کرنا صحیح ہو گیا۔ کیونکہ کشف کا بھی یہ حکم ہے کہ اگر حدیث و قرآن کے موافق ہو تو قبول ہے، ورنہ رَد ہے (یہاں تک بیان نماز جمعہ سے پہلے ہوا۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے نمازِ جمعہ پڑھائی۔ بعد نماز کے پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا ۱۲ جامع)

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہٗ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لآ الٰہ الا اللہُ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔ اما بعد!

میں اس بات کو بیان کر رہا تھا کہ نیکیوں کی قدر ہم کو وہاں جا کر ہو گی۔ اس لئے کہ یہ آخرت ہی کا سکہ ہے۔ وہیں اس کا کار آمد ہونا معلوم ہو گا۔ یہاں تو نیکیوں پر کوئی رقم نہیں ملتی۔ اس لئے لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ مگر مرنے کے بعد سب کو قدر معلوم ہو جائے گی اور میں نے احادیث سے اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ وہاں ذرا ذرا سی نیکی بھی کار آمد ہے۔ جس کی آج ہم کو قدر نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کا بے سمجھے ہوئے پڑھنا بھی بیکار نہیں۔ کیونکہ اس کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ایسی چیز بیکار کیوں کر ہو سکتی ہے مگر اُس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کر لینا کافی ہے۔ فہم معنی کی ضرورت نہیں۔ ورنہ شاید کوئی حافظ صاحب خوش ہو جاتے کہ بس ہم مولویوں سے بھی بڑھ گئے۔ سو یہ خیال صحیح نہیں۔ کیونکہ اگرچہ الفاظ قرآن پر اس قدر ثواب ملتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ مقصود صرف یہی

اور سردی بھی بہت ہے، گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے پیاس معلوم ہوئی اور پیاس بہت شدید معلوم ہوئی مگر بوجہ تند ہوا کے باہر آنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس درمیان میں اس کے پاس حاکم کا حکم پہنچا کہ اسی وقت فلاں جگہ جو کہ شہر سے بہت فاصلہ پر ہے، ہم سے آ کر ملو۔ اب غور کیجئے کہ یا تو یہ شخص اس سردی کی حالت میں اندر سے صحن تک بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اب وہ کونسی چیز ہے جو اس کو گھر کے اندر سے صحن تک اور صحن سے گھر کے باہر اور وہاں سے شہر کے باہر کئی میل تک بارش اور سردی میں لے جاتی ہے۔ وہ صرف قوت ارادہ ہی ہے کہ پہلے ارادہ نہ ہوا تھا۔ کیونکہ پیاس کوئی قوی محرک نہ تھی اور اب ارادہ ہو گیا کیونکہ حکم حاکم بوجہ کسی قسم کی رغبت یا رہبت کے قوی محرک ہے، جس نے اس کی قوت ارادہ کو حرکت دے دی ہے اور یہ کمل لے کر تمام مصائب کو برداشت کرتا ہوا حاکم تک جا پہنچتا ہے۔

اب ارادہ کی قوت معلوم کر کے جانو کہ ارادہ فی نفسہٖ نہ کوئی بُری شے ہے نہ اچھی یہ اپنے حسن و قبح میں موقوف ہے اپنے مضاف الیہ پر، یعنی مراد پر، اگر اچھے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ عمدہ ہے اور بُرے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ بُرا ہے۔ اچھے ارادہ پر ثواب ملے گا اور بُرے ارادہ پر اگر پختہ ارادہ ہو جائے گا گناہ لکھا جائے گا۔ اس سے بھی ارادہ کی عظمت معلوم ہو گئی۔ کیونکہ کسی عمل پر جزا و سزا بدون ارادہ کے مرتب نہیں ہوتی اور ارادہ پر بدون عمل کے بھی گناہ و ثواب لکھا جاتا ہے۔ اگر بدون ارادہ کے کوئی گناہ بھول چوک سے ہو گیا تو وہ معاف ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا

یعنی بندوں کو تعلیم فرماتے ہیں کہ اس طرح دعا کیا کرو "یا اللہ اہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہم سے مواخذہ نہ کیا جائے" اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اواخر سورۂ بقرہ کی دعائیں مقبول ہو گئیں، یعنی بھول چوک پر مؤاخذہ نہ ہو گا۔ ایک حدیث میں اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ رُفع عن امتی الخطأ والنسیان۔ کہ میری اُمت سے خطاء و نسیان معاف کر دیا گیا اور بعض اعمال میں تو سب لوگ جانتے ہیں کہ بدون ارادہ کے عمل معتبر نہیں ہوتا۔ مثلاً نماز بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتی۔ نیت کا نام ہی تو ارادہ ہے۔ اگر بدون بس

ارادہ کے کوئی تمام دن نمازیں پڑھتا رہے تو سب فضول ہیں اور اگر نیت کر کے دو رکعت بھی پڑھ لے۔ وہ صحیح ہیں۔ ارادہ ہی کی وجہ سے قتل خطا و عمد میں شریعت نے فرق کیا ہے اگر قصداً کسی کو قتل کیا گیا تو اس میں گناہ بھی بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض صحابہؓ کا خیال تھا کہ قتل عمد کے لئے توبہ بھی نہیں۔ اگرچہ جمہور نے اس کو رد کیا ہے اور اس صورت میں قاتل پر قصاص بھی آیا ہے کہ مقتول کے عوض اس کو قتل کر دیا جائے اور اگر خطا، بھول چوک سے قتل ہو گیا اور قتل کا ارادہ نہ تھا۔ مثلاً تیر شکار پر چلایا تھا کسی آدمی کے لگ گیا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں گناہ بھی نہیں ہوتا نہ قصاص آتا ہے۔ صرف دیت آتی ہے۔ نیز اگر کسی معصیت کا پختہ عزم ہو جائے تو گناہ فوراً لکھا جاتا ہے اور اگر بدون ارادہ کے غلطی اور خطا سے گناہ ہو گیا تو کچھ بھی گناہ نہیں ہوتا۔ وہ معاف ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ارادہ سبب غالب ہے۔ اُس عمل کے ہو جانے کا اور ایسے سبب کے لئے حکم مسبب کا ہوا کرتا ہے۔

مثلاً سنکھیا سبب غالب ہے ہلاکت کا تو اگر کوئی شخص بے قاعدہ بلا مشورہ طبیب خودکشی کی نیت سے سنکھیا تولہ بھر کھائے تو چاہے بعد میں دست وقے کرا کر اُس کی جان بچ بھی جاوے، تب بھی اس کو گناہ خودکشی کا ہو گیا کیونکہ اس نے تو کوئی کسر جان ہلاک کرنے میں نہ رکھی تھی۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ وہ اس کے بعد بھی بچ گیا۔ اسی طرح جب کسی شخص نے پختہ ارادہ کر لیا۔ کسی گناہ کا تو گویا اُس نے اُس کے کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ کیونکہ عادت اللہ یُوں ہی جاری ہے کہ پختہ ارادہ کے بعد عمل ہو ہی جایا کرتا ہے۔ یُوں کبھی اتفاقاً نہ ہوا تو یہ نادر ہے۔ والنادر کالمعدوم۔ اس لئے یہ شخص ارادہ پختہ کر لینے سے ایسے سبب کا مرتکب ہو گیا جو اکثر مفضی الے المسبب ہو جاتا ہے۔ اس لئے گناہ کا مستحق ہو گیا۔ اسی طرح کسی شخص نے نیک کام کا قصد کیا تو وہ ثواب کا مستحق ہو گیا۔ کیونکہ سبب کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے۔ کبھی نہ ہونا۔ اتفاقی بات ہے۔ لہٰذا وہ مثل کرنے والے کے سمجھا جائے گا اور اُس کو اس عمل کا ثواب مل جائے گا۔ اب معلوم ہوا کہ ارادہ کتنی بڑی چیز ہے۔ جو کہ عمل کے وجود کے لئے سبب غالب ہے۔ جس کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شریعت میں اُس کو عمل ہی کے مثل شمار کیا گیا ہے۔

ہمت و قدرت

سو اس کی مسلمانوں میں آجکل بہت ہی کمی ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم نے بہت ہی کرنا چاہا، مگر نہیں ہوا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا، صرف تمنا ہی تمنا کی۔ ارادہ اس کا نام ہے کہ جس اختیاری کام کا خیال کرتے ہیں۔ اسی کی دھن لگ جائے اور اپنی پوری کوشش اس میں صرف کر دے۔ ایسا کر کے پھر کوئی بتلائے کہ کام نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد بھی کام نہ ہوا کرے تو دنیا کا کام کیوں کر چلے۔ اس لئے جو شخص یوں کہے کہ میں نے ارادہ کیا اور پھر بھی کام نہیں ہوا، میں اس کو کبھی تسلیم نہ کروں گا۔ بلکہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے اس کام کی تمنا تو کی، ارادہ نہیں کیا۔ ایک شخص میرے پاس آئے، جو بوڑھے ہو گئے تھے۔ مگر نظر بد کے مرض میں بتلا تھے آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جوانی میں گناہ نہیں چھوٹتے تو بڑھاپے میں جا کر چھوٹ جائیں گے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو گناہ جوانی میں نہیں چھوٹا وہ بڑھاپے میں کبھی نہ چھوٹے گا۔

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے　　　بہ نیروئے شخصے بر آید ز جائے

اگر ہمچناں روزگارے ہلی　　　بہ گردونش از بیخ بر نگسلی

سو جو گناہ اب جوانی میں نہ چھوٹا حالانکہ ابھی اس کی جڑ کمزور ہے تو بڑھاپے میں کیا خاک چھوٹے گا۔ جب کہ جڑیں مضبوط ہو جائیں گی اور چاروں طرف پھیل جائیں گی۔ نیز ایک بات تجربہ کی یہ ہے کہ ہمیشہ عفت جوان آدمی کی قوی ہوتی ہے۔ کیونکہ جس طرح جوانی میں تقاضا زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے روکنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں یاد رکھئے کہ تقاضا کم نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ مگر تقاضے میں کمی نہیں آتی اور اس تقاضے کو روکنے والی قوت کم ہو جاتی ہے تو اور بھی کچھ نہ ہو۔ نظر بد میں تو وہ شخص بتلا رہے ہی گا۔ خصوصاً جب کہ عورتیں اس کی نظر سے احتراز بھی نہیں کرتیں۔ چنانچہ بوڑھے آدمی سے پردہ بھی کم کرتی ہیں۔ بہت سے بہت وہ فعل نہ کر سکے گا۔ مگر میں کہہ چکا ہوں کہ مدار معصیت ارادہ پر ہے۔ جب ایک شخص نے معصیت کا پختہ ارادہ کر لیا اور پھر بوجہ ناکارہ ہونے کے اسے پورا نہ کر سکا تو گناہ

پیش کرتے ہوئے کچھ تو شرمانا چاہیئے آج کل لوگ بہت بے باک ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ صاحب کیا کریں مجبور ہیں۔ بدون سود اور رشوت کے خرچ نہیں چلتا اور علماء کو تنگ کرتے ہیں کہ اس مجبوری پر نظر کریں۔ اُن کو بھی یہ حق ہے کہ ایک حاکم سلطنت کی طرح وہ بھی صاف جواب دے دیں کہ ہم نہیں جانتے خرچ چلے یا نہ چلے۔ شریعت مقدسہ نے اس کو حرام کیا ہے بچنا پڑے گا، ورنہ گنہگار ہو گے اور فاسق فاجر کے خطاب کے مستحق ہو گے۔ آج کل لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ سود کے جواز کے فتوے دو اور یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ جواز کے فتوے دے بھی دیں گے تو وہ بھی آپ ہی کے شمار میں ہو جاویں گے۔ بلکہ اُن کی آپ سے بھی زیادہ گردن نپے گی۔ بھلا کسی مولوی کے جائز کرنے سے کوئی حرام کام حلال ہو سکتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ عوام مسلمان جن کو ذرا شریعت کا پاس ہے۔ اُن مولوی صاحب ہی کو چھوڑ دیں گے

صاحبو! اوّل تو علماء اس کے ذمہ دار نہیں کہ آپ کا خرچ چلتا ہے یا نہیں۔ خدا و رسول کا جو حکم ہے۔ اُس کو ماننا پڑے گا۔ دوسرے یہ عذر بھی بالکل غلط ہے کہ ہم سے گزر نہیں ہو سکتا۔ گذر ہو سکتا ہے۔ مگر فضولیات کو حذف کر دو۔ فیشن نہ رکھو، نوکر زیادہ نہ رکھو، کپڑا سستا پہنو، غرض جائز آمدنی کے موافق خرچ رکھو۔ دیکھو گزر ہوتا ہے یا نہیں مگر یہ فضولیات تو چھوڑتے نہیں، پھر کہتے ہیں کہ گذر نہیں ہو سکتا۔ یوں کہیئے کہ سود اور رشوت کے بغیر عیش پرستی نہیں ہو سکتی۔ اس کو ہم بھی تسلیم کریں گے۔ مگر عیش پرستی کی فکر کی شریعت میں خود ممانعت ہے۔ اس کی ذمہ دار شریعت کیوں کر ہو سکتی ہے اور جس کو گذر کرنا ہو۔ وہ حلال روزی میں یقیناً گزر کر سکتا ہے۔ البتہ ظاہراً اس میں لوگوں کی نگاہوں سے قدرے تنگی ہو گی سو اوّل تو یہ بھی خیال غلط ہے۔ ایسے شخص کی قلوب میں بڑی وقعت ہوتی ہے۔ حکام بھی ایسے شخص کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم نے فرض کیا کہ تنگی ہی ہوتی ہے۔ مگر اس کو گوارا کرنا چاہیئے اور خیال کرنا چاہیئے کہ اگر ہم سود یا رشوت لیں گے تو آخرت میں تنگی ہو گی۔ جب حشر کی تنگی کا خیال دل میں ہو گا۔ اس تنگی پر نظر نہ جائے گی اور اس کی پروا بھی نہ ہو گی۔ واللہ! ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں، ورنہ یہ عذر کبھی زبان پر نہ آتے۔

اچھا صاحبو! یہ عذر آپ کا کہ بدوں اس کے گزر نہیں ہو سکتا۔ اگر مان بھی لیا جاوے

تو یہ بھی صرف انہیں گناہوں میں چل سکتا ہے جن کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان ہوتا ہو۔ جیسے سود یا رشوت۔ مگر پھر سوال یہ ہے کہ جن گناہوں کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان بھی نہیں ہوتا۔ وہ کیوں کیئے جاتے ہیں۔ جیسے جھوٹ، غیبت، مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ ستانا اور نظر بد کیا نگاہ بد سے بھی کچھ غلہ بڑھ جاتا ہے؟ جس کے چھوڑنے سے وہ مقدار غلہ کی کم ہو جائے گی۔ آخر ان گناہوں کے کرنے میں آپ کو کون سی مجبوری ہے اور ان سے بچنے میں کون سا نقصان ہے ان کو چھوڑنے میں آپ کیا عذر کریں گے؟ بلکہ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں سے روزی کم ہو جاتی ہے۔ ابن ماجہ میں ہے۔ ان العبد لیحرم الرزق بخطیئۃ یعملہا گناہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ گناہ کرنے والے سے راحت کوسوں دور ہے۔ کھانے پینے کی فراغت کا نام عیش نہیں ہے۔ اصلی عیش دل کی راحت اور چین ہے جو گنہگار کو نصیب بھی نہیں اور اہل طاعت کے دل میں بے چینی کا نام نہیں ہوتا۔ جب دنیا ہی میں گناہوں سے یہ عذاب ہو رہا ہے۔ پھر نہ معلوم گناہ کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ واللہ! مسلمان کو تو گناہ کچھ بھی مزہ نہیں دیتا۔ کافر تو بے فکر ہو کر گناہ کرتا ہے کیونکہ اُسے آخرت کا یقین نہیں مگر مسلمان کو تو گناہ کرتے وقت بھی مزا نہیں آتا۔ بار بار دل میں خوف خدا سے خطرہ پیدا ہوتا ہے پھر یہ شخص غفور الرحیم کے مضمون کو آڑ بنا کر اس خطرہ کو ٹالتا ہے۔ غرض ایک کشمکش سا دل میں پڑ جاتا ہے۔ پھر ایسی حالت میں گناہ کا کیا لطف کم بخت کو آئے گا؟ وہی مثل ہے۔ گناہ اور بے لذت۔

اور اس مقدمہ سے کہ اللہ غفور الرحیم ہے۔ آج کل بالکل غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے غفور الرحیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ سے جو ضرر ہوتا ہے۔ وہ ضرر ہی نہ پایا جائے۔ اگر غفور الرحیم ہونے کے یہ معنی ہیں تو کوئی صاحب ہمت کر کے سنکھیا تو کھالیں اگر غفور الرحیم ہونے کے — — — یہی معنی ہیں کہ مضرت کا ضرر زائل ہو جاتا ہے تو چاہیے کہ سنکھیا کھالیں تو وہ کبھی ضرر نہ کرے۔ حالانکہ وہ ضرر ضرور کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ معنی اس کے نہیں پس نہ معلوم کہ گناہوں کی بابت یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ اس اعتقاد کے بعد وہ ضرر بھی نہیں کریں گے۔ صاحبو! گناہ کی ظلمت تو ضرور پیدا ہوگی اور اس ظلمت کے ساتھ دخول

جنت مشکل۔ پس یا تو خدا بعد میں سچی توبہ کی توفیق دے اور یہ توبہ ایسی جرأت کرنے والوں کو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ اس ظلمت کو دور کرنے کے لئے عذاب جہنم موجود ہے۔ الا ان یرحم بفضلہ جب اعتقاد غفور الرحیم سے دنیا کا ضرر رفع نہیں ہوتا تو یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ اس اعتقاد سے آخرت کا ضرر مرتب نہ ہونا سمجھ لیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ کا بیان ہے اور متعلق کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں، محمودہ و مذمومہ۔ ان دونوں کے احکام اس آیت میں مذکور ہیں اور اس وقت میں انہیں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ غور سے سنیئے۔

اہمیتِ نیّت

حق تعالےٰ شانہٗ فرماتے ہیں:

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جہنم یصلہا مذموما مدحورا۔ ومن اراد الاخرۃ وسعی لہا سعیہا وھو مؤمن فاولئک کان سعیہم مشکورا۔

یعنی جو کوئی عاجلہ کا یعنی دنیا کا ارادہ کرتا ہے۔ اس کو ہم جلدی اسی جگہ جو چاہیں اور جس کے لئے چاہیں دے دیتے ہیں۔ ذرا قیود پر غور کیجیے کہ دنیا کے طالب کو دنیا عطا فرمانے کا پختہ وعدہ نہیں فرماتے بلکہ اتنی قیدیں ہیں کہ ما نشاء لمن نرید کہ جتنا ہم چاہیں اور جس کے لئے چاہیں عطا کر دیں گے۔ معلوم ہوا کہ ہر طالب دنیا کا مراد کو پہنچنا لازم اور ضروری نہیں اور اگر دنیا کے دینے کا پختہ وعدہ بھی ہوتا۔ جب بھی وہ تو لینے کے قابل نہ تھی اور میں اس کو دلیل سے بتلاتا ہوں۔

دیکھئے! اگر ایک شخص کسی کو دو مکان دکھلائے ایک خستہ و خراب دوسرا نہایت عمدہ اور یہ کہہ دے کہ خراب تو اسی وقت تم کو مل سکتا ہے اور بعد ایک ماہ کے واپس لے لیا جائے گا اور دوسرا اس وقت نہیں مل سکتا، بعد ایک ماہ کے ملے گا اور وہ واپس نہیں

ہے۔ اس میں ایک حکیم صاحب رہتے ہیں جو ہمارے حضرات ہی کی اولاد میں ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اُن کے یہاں مہمان ہوئے تو انہوں نے بے تکلف چپکے سے آ کر مولانا سے عرض کیا کہ میاں آپ کے بہت معتقد ہیں۔ اگر آپ فرمائیں کہیں دعوت کا ڈھنگ ڈالوں کیونکہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے۔ دیکھئے ذرا بھی اُن پر مولانا کی تشریف آوری کا اتنا بار نہ ہوا کہ کہیں سے اُدھار لے کر دعوت کرنے کا خیال کرتے۔ جب اپنے گھر میں فاقہ تھا تو مہمان سے صاف کہہ دیا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی کیا اچھے مہمان تھے۔ فرمایا، بھائی! میں تو تیرا مہمان ہوں۔ جب تیرے گھر فاقہ ہے تو میں فاقہ ہی سے رہوں گا۔ خبردار! کسی سے دعوت کا تذکرہ نہ کیجو۔ صبح سے شام ہو گئی اور سارا گھر فاقہ سے بے فکر رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کے وقت ایک مریض آیا اور حکیم صاحب کو گیارہ روپے دے گیا۔ اس وقت حکیم صاحب نے آ کر مولانا سے عرض کیا کہ حضرت جی! آپ کی دعوت کے لئے خدا نے گیارہ روپے بھیج دیئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی کھانے میں تکلف نہ کرنا۔ انہوں نے کہا۔ حضرت یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ جب نہیں تھا میں نے آپ سے فاقہ تک کرا لیا اور اب جب کہ خدا نے آپ کی برکت سے یہ روپے بھیج دیئے تو اب میں کھانا عمدہ پکواؤں گا۔ چنانچہ پلاؤ وغیرہ تیار کرایا اور خوب مزے سے کھایا۔

ایک شخص نے ایک اور عجیب حکایت بیان کی کہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں الٰہ آباد میں مہمان ہوا۔ تو ایک روز اُس کے بچے بڑی خوشیاں کر رہے تھے کہ ابا جی! ہمارے یہاں شیخ جی آئے۔ وہ شخص کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاید کوئی بزرگ آئے ہوں گے۔ دیر تک اسی کا منتظر رہا کہ اُن بزرگ کی میں بھی زیارت کروں۔ مگر جب دیر ہو گئی اور نہ کوئی بزرگ آئے اور نہ اُن کا سامان آتا نظر آیا اور کھانے کا وقت بھی گزر گیا تو میں نے دریافت کیا کہ یہ بچے شیخ جی کسے کہہ رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ آج اس گھر میں فاقہ ہے۔ ان لوگوں نے فاقہ کا نام شیخ جی رکھا ہے۔ جب فاقہ ہوتا ہے تو بچوں کو بہلا دیتے ہیں کہ آج شیخ جی آئے ہیں۔ روٹی نہیں ملے گی۔ بچے ایسی خوشی سے رہتے ہیں کہ اُن کو فاقہ سے رنج ہی نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانہ ہے صبر و استقلال کا کہ بڑے تو بڑے بچے تک بھی پریشان نہ ہوتے تھے۔

تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی، یہاں بھی ہم پردہ پوشی کرتے ہیں۔ پھر اُس کے نامۂ اعمال میں سے گناہوں کو محو فرمادیں گے اور اُن کی جگہ اعمال حسنہ درج فرمادیں گے۔ یہ ہے۔ اولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات کا مضمون۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ اس رحمت کا کہ مسلمانوں کو اپنی رحمت سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اس کی عزت بڑھائی جائے گی اور یوں ظاہر کیا جائے گا کہ گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ کیا اُس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں، جو یوں نافرمانی پر کمر بستہ ہوئے ہو۔ ایسے رحیم و کریم خدا کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا کرو اور اس کی محبت میں کوشش کرو۔ بس اب میں وہ ترکیب بتلا کر جس سے حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا ہو، بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

ترکیب تعلق

اس کی ترکیب یہ ہے کہ سب سے پہلے علمِ دین بقدرِ ضرورت حاصل کرو کہ بدون اس کے خدا تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا پتہ نہیں چلے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے پکا عہد کرو کہ آئندہ گناہ نہ کریں گے اور گذشتہ گناہوں سے سچی توبہ تو یہی ہے کہ آئندہ کے لئے پختہ عہد کرلیا جائے کہ اب گناہ نہ کریں گے۔ توبہ کے وقت عہد پختہ کرنا چاہئیے۔ اس کے بعد اگر غلطی سے عہد ٹوٹ جائے تو توبہ پھر ایسی پختگی کے ساتھ کی جائے اور اس پختہ عہد کے بعد اگر پھر گناہ ہو جائے تو صلوٰۃ التوبہ کے ساتھ توبہ کرنی چاہئیے۔ خالی زبانی توبہ پر اکتفا نہ کیا جاوے کہ یہ علاج ہے نفس کا جس کی اب زیادہ ضرورت ہو گئی۔ ذرا چند روز اسکا التزام کرکے تو دیکھو کہ پھر گناہوں سے طبعی نفرت ہوتی ہے یا نہیں۔ بڑا مجرّب نسخہ ہے اور نہایت سہل کہ جب گناہ ہو جائے تو وضو کرکے دو رکعت نفل پڑھ کر توبہ کی جائے۔ ہر گناہ پر ایسا ہی کیا جائے۔ آخر کار گناہ سے طبعی نفرت اور طاعت کی طبعی رغبت پیدا ہو جائے گی۔

اور اس کے ساتھ ہی کسی کامل کی صحبت تلاش کرو۔ اہل اللہ سے ملتے رہو۔ اُن سے

کو اپنا مال نہ سمجھو۔ اپنے جاہ کو جاہ نہ سمجھو۔ اپنے بیٹے کو اپنا بیٹا نہ سمجھو۔ اپنی بیوی کو بیوی نہ جانو۔ غرض جس جس شے سے علاقہ قلب کو ہوتا ہے۔ سب ہی کچھ اس میں آ گیا۔ گویا، مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ سب اشیاء کی فہرست تم سے کہاں تک بیان کی جاوے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شے کو اپنا نہ سمجھو۔ جڑ کی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی اور کس خوبصورتی سے فرمایا ہے۔ ایک دم سے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا گھر نہیں ہے تاکہ جو لوگ اس کو گھر سمجھتے ہیں۔ اُن کو اوّل نظر میں انکار کی گنجائش نہ ملے۔ پس اس کی خاطر سے یہ فرمایا کہ گھر تو ہے۔ مگر اُس شخص کا ہے، جو بے گھرا ہو۔ پس جو گھر سمجھتا ہے وہ بھی اگر غور کر کے دیکھے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعی دنیا گھر نہیں ہے۔

تفصیل اس مجمل کی یہ ہے کہ ہم نے مان لیا کہ گھر ہے، لیکن یہ تو بتلاؤ کہ گھر کس کو کہتے ہیں۔ اپنا گھر عرفاً اس کو کہتے ہیں کہ جس میں سے تم کو کوئی نکال نہ سکے۔ مثلاً تم کلکتہ جاؤ اور وہاں کسی کے مکان میں ٹھہر جاؤ اور یہ کہو کہ ہمارا گھر ہے۔ مالک کان پکڑ کر نکال دے گا۔ اسی طرح اپنا مال اُس کو کہا جاتا ہے، جو دوسرا تم سے نہ لے سکے یعنی دوسرے کی امانت نہ ہو۔ پس تم جو دنیا کو گھر سمجھتے ہو اور یہاں کے مال کو اپنا مال سمجھتے ہو اور یہاں کی آبرو کو اپنی آبرو سمجھتے ہو اور یہاں کی بیوی بچوں، نوکر چاکر کو اپنا سمجھتے ہو تو غور تو کرو کہ اس پر اپنا ہونے کی تعریف بھی صادق آتی ہے یا نہیں۔ پس اگر واقع میں یہ چیزیں مملوک ہیں تو مملوک ہونے کی علامتیں اس میں ہونا چاہئیں اور اگر ہم یہ دکھلا دیں کہ اس میں یہ علامتیں نہ پائی جاویں تو اُن کو کیسے اپنی سمجھو گے؟

اپنا گھر کون سا ہے۔ جس میں سے کوئی تم کو نہ نکالے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جب سرکاری حکم آتا ہے تو زبردستی ڈنڈا ڈولی کر کے ایک گڑھے میں پھینک دیئے جاتے ہو۔ کیوں صاحب یہی تھا تمہارا گھر؟ اور اگر اس پر بھی اپنا گھر سمجھتے ہو تو کیا وجہ ہے کہ اسی کو اپنا گھر سمجھو۔ ساری دنیا کے گھروں کو اپنا گھر سمجھو۔ اپنا گھر وہی ہے کہ جس پر قبضہ قابو ہو۔ کوئی وہاں سے اُٹھا نہ سکے۔ یہ معیار تو تمہارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ اس معیار پر یہ گھر تمہارا ہے یا نہیں؟ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ نہیں ہے۔ جب مالکِ حقیقی چاہتے ہیں۔ کان پکڑ کر باہر نکال

دیتے ہیں۔ نہ گھر پر قابو رہتا ہے، نہ بیوی رہتی ہے، نہ بچے رہتے ہیں، نہ مال اپنا رہتا ہے۔ پس جو علامتیں اور معیار اور تعریف اپنا ہونے کی تھی۔ وہی یہاں مفقود ہے، پھر کیسے اپنا کہتے ہو۔

یہ تو مرنے کے ساتھ حالت ہوتی ہے اور اس سے قبل کی حالت پر شاید کوئی ناز کرے کہ مرنے تک تو اپنا ہے۔ مر کر ہی تو چھوٹ جائے گا۔ صاحبو! زندگی کی حالت میں بھی کوئی شے اپنی نہیں دیکھو گے۔ کھانا ہی ہے جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں۔ اُس سے محروم کر دیتے ہیں۔ پیٹ میں مروڑہ لگا اور دست آنا شروع ہوئے۔ کھانے قسم قسم کے اپنی ملک میں موجود ہیں اور کھا نہیں سکتے۔ پھر یہ کیا اپنے ہوئے اور اُن پر کیا قابو ہے۔ بھلا کھانا تو ایک منفصل شے ہے۔ خود جو صفات آدمی کے ہیں۔ راحت اور آرام، یہ بھی جب اللہ میاں چاہتے ہیں، چھن جاتی ہے۔ پس مال اور جاہ اور ہماری صفات حتیٰ کہ ہماری ذات کوئی شے ہماری نہیں۔ جب چاہیں جو شے چاہیں چھین لیں۔

انسان کی بے بسی

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی کی آنکھیں چھین لی جاتی ہیں۔ کسی کی زبان ماؤف ہو جاتی ہے۔ کسی کی عقل پر آفت آجاتی ہے۔ کل جو بڑے عاقل تھے۔ آج ان کے حواس میں فرق آگیا، پاگل ہو گئے۔ کہاں گئی وہ عقل، کہاں گئے وہ حواس۔ بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ جنون کے بعد ان کو گوہ موت میں بھی تمیز نہیں رہتی۔ ایک پاگل پاخانہ کھایا کرتا تھا اور دلیل یہ بیان کرتا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ لوگ اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ یہ میرے ہی اندر سے تو نکلا ہے پھر میرے ہی اندر اگر چلا جائے تو اس میں کیا خرابی ہے۔ میں ان عقل پرستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تمہاری عقل اس پاگل کی سی عقل ہے۔ اس لئے کہ شریعت اور سلامت فطرت تو تمہارے نزدیک کوئی شے نہیں، عقل ہی قبلہ و کعبہ ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ اگر عقل ہی پر مدار ہے تو اس شخص کے اس استدلال کا جواب دو۔ مگر دیکھو شریعت اور سلامت فطرۃ کو ضم نہ کیجیو۔ محض عقل سے جواب دو۔ بظاہر تو وہ عقل کی بات کہہ رہا ہے کہ میرے ہی اندر سے نکلا ہے

میرے ہی اندر چلا جاوے تو کیا حرج ہے۔ اگر یہ کہو کہ ہم کو نفرت آتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس کو نفرت نہ آوے کیا اُس کا کھانا جائز ہو جاوے گا۔ وہ پاگل کہتا ہے کہ مجھے تو نفرت نہیں ہے تو کیا یہ فعل مستحسن ہو جاوے گا۔ کچھ نہیں۔ سب خرمستیاں ہیں۔ آپ جس طرح اس پاگل پر ہنستے ہیں۔ اسی طرح اہل بصیرت تم پر ہنستے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس عقل پر آج ناز ہے۔ وہ ذرا سی آفت سے سلب ہو جاتی ہے۔

میں ایک بار عشاء کے بعد مدرسہ سے گھر کو جا رہا تھا۔ رات بہت تاریک تھی۔ گھر کا راستہ بھول گیا۔ بہت پریشان رہا کبھی بھائی کے مکان پر جاتا ہوں اور کبھی اُس کے سامنے مکان ہے۔ لطافت علی کا اس پر کبھی میاں محمد اختر کے مکان پر جاتا ہوں۔ غرض بڑی پریشانی کے بعد اپنا مکان ملا۔ حالانکہ رات دن کی آمد و رفت۔ اگر آنکھیں بند کر کے بھی جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں۔ مگر اُس روز حق تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تمہارے حواس اور تمہارا ادراک اس درجہ کا ہے کہ ہم جب چاہیں بیکار کر دیں۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر کس منہ سے کہتے ہو کہ ہماری چیز ہے۔ ہمارا مال ہے۔ میرا گھر ہے۔ ایسا گھر ہے کہ جب میعاد ختم ہو جائے گی۔ یا بدست دیگرے دست بدست دیگرے۔ جہاں چاہیں گے۔ پھینک دیں گے۔ اگر تم اس وقت فرض کرو نہ جانا چاہو تب بھی زبردستی تم کو پھینک دیں گے۔

ایک کلکٹر کا شملہ پر انتقال ہو گیا تھا۔ وہاں سے اُس کی لاش ڈولی میں آ رہی تھی۔ ایک شخص نے دیکھ کر بیان کیا کہ سر نیچے پتھروں سے ٹکراتا جا رہا تھا۔ ایک ایسا حاکم کہ ضلع میں جو چاہے حکم نافذ کر دے۔ آج وہ اپنے سر کو پتھروں کے صدمہ سے نہیں بچا سکتا۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا	یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بے خبر	میں بھی کبھی کسی کا سر پُر غرور تھا

اس پر وہ ناز ہے کہ کچھ حد و حساب نہیں۔ بعضوں کا تو اتنا ناز بڑھا کہ خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ فرعون نے کہا تھا۔ انا ربکم الاعلیٰ آج کل بھی لوگوں میں خدائی کے دعوے سے کم کبر نہیں ہے۔

انسان کی مختلف حالتیں

چنانچہ کہتے ہیں کہ " تم نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں " ایک بزرگ نے خُوب جواب دیا تھا۔ ایک شخص اکڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اُن بزرگ نے نصیحت کی کہ میاں اس طرح نہیں چلا کرتے۔ تواضع اور مسکنت سے چلنا چاہیئے۔ کہنے لگا کہ نہیں جانتے ہم کون ہیں۔ فرمایا جانتا ہوں۔

اولك نطفة قذرة وآخرك جيفة مذرة وانت بين ذلك تحمل العذرة.

اوّل تو تیرا یہ ہے کہ تو ایک ناپاک نطفہ تھا اور انجام تیرا یہ ہے کہ ایک مردار ہو جائے گا اور درمیانی حالت تیری یہ ہے کہ کئی سیر پاخانہ تیرے اندر ہے۔ اس کو تو اٹھائے پھرتا ہے۔

حق تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ آدمی کے بدن میں قسم قسم کی نجاستیں اور گندگیاں بھر رہی ہیں اور معدہ اور اندرون جسم سے ظاہر بدن تک کئی منفذ بھی ہیں۔ مگر ان منافذ سے بُو نہیں آتی۔ اگر ان منفذوں سے بُو آنے لگے تو آدمی کو بڑی مشکل ہو جائے، کہیں بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ جہاں جائے دھکے دے دیئے جاویں۔ چنانچہ کبھی کبھی اس کا نمونہ دکھلا دیتے ہیں بخر یعنی گندہ دہنی کا بعض لوگوں کو مرض ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے پاس کھڑا ہونا موت ہو جاتا ہے۔ جب میں دیوبند میں طالب علمی کرتا تھا۔ نماز میں ایک شخص کبھی کبھی میرے پاس آکر کھڑے ہو جاتے تو نماز پوری کرنا مصیبت ہو جاتی تھی۔ فقہاء، سبحان اللہ! کیسے حکیم ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو بخر کی بیماری ہو، اس کو چاہیئے کہ جماعت سے نماز نہ پڑھے۔ علیحدہ پڑھا کرے جماعت کا ہی ثواب ملے گا۔ پس یہ بخر معدہ ہی کی رطوبت سے ہوتا ہے۔

پس انسان کا یہ کلمہ کہ نہیں جانتے ہو میں کون ہوں۔ بڑے کبر اور جہل کی بات ہے پس ہماری جب یہ حالت ہے تو کسی شے کو اپنی کہنا کیسے صحیح ہو گا۔

حدیث شریف میں ہے۔

یقول ابن آدم مالی مالی مالک الا ما اکلت فافنیت اولبست فابلیت اوتصدقت فامضیت۔

یعنی آدمی کہتا ہے کہ میرا مال ہے۔ میرا مال ہے۔ تیرا کیا ہے، مگر جو تو نے کھالیا وہ تو فنا کر دیا اور جو پہنا وہ پرانا کر دیا اور جو صدقہ دیا وہ آگے بھیج دیا۔ وہ بے شک تیرا ہے۔

صاحبو! نہ مال اپنا ہے نہ بیوی اپنی ہے نہ بچے اپنے ہیں۔ ہم لوگ تو مزدور ہیں۔ چھکڑے کھینچ رہے ہیں۔ جس میں بیوی بچے، مال متاع لدا ہوا ہے۔ جب منزل پر پہنچ جائے گا۔ الگ کر دیئے جاویں گے۔ صاحبو! مزدور اور خادم اور حمال مالک نہیں ہوا کرتا۔ پس ہم اصل حقیقت میں جب خادم ہیں تو مخدوم کیسے بن جاویں گے۔ اصل میں جب رعایا ہیں تو حاکم کیسے ہو سکتے ہیں۔ عبد ہیں مولیٰ نہیں ہیں۔ چھوٹے ہیں۔ بڑائی اس کا حق ہے مقہور و مغلوب ہیں۔ وہ قاہر و غالب ہے۔

ولہ الکبریاء فی السموات والارض

اسی کیلئے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں

ہر چیز امانت ہے

جب ان چیزوں کی یہ حالت ہے کہ کوئی اپنی نہیں۔ سب عاریت ہیں تو دوسرا حکم نہایت واضح ہو گیا یعنی ولہا یجمع من لا عقل لہ کہ اس دنیا کو وہ جمع کرے گا کہ جس کو عقل نہ ہو۔ اس لئے کہ پرائی چیزوں کو کوئی عاقل جمع نہیں کیا کرتا۔ اگر کوئی جمع کرتا ہے تو اس کو لوگ بے عقل کہتے ہیں اور کان پکڑ کر باہر نکال دیتے ہیں۔ جیسے کسی کھیت میں پولوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اس شخص نے اپنے سمجھ کر جمع کرنا شروع کر دیا تو ظاہر ہے کہ مالک آکر اس کو ملامت کرے گا اور نکال دے گا۔ اس کو چاہیئے تھا کہ اول تحقیق کرتا کہ یہ کس کے ہیں۔ اگر اس کے ثابت ہوتے تو جمع کرتا۔ پس جیسے یہ شخص بوجہ پرائی شے کے جمع کرنے کے بے وقوف ہے۔ اسی طرح جو دنیا جمع کرے وہ احمق ہے۔ یہ حالت ہوئی دنیا کی۔

اب یہ سمجھو کہ دنیا اس مال کا نام نہیں۔ مال بے چارہ تو مفت میں بدنام ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ بعض مال اچھا ہے۔ جیسے حلال مال اور بعض مال بُرا ہے۔ جیسے رشوت، چوری کا مال۔ پس اگر دنیا نفسِ مال کا نام ہوتا تو اس کی دو قسمیں کیسے ہوتیں۔ دنیا نام تعلق بغیر اللہ کا ہے، یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے تعلق بڑھا کر بکھیڑوں میں پڑ کر، معاملات میں گھس کر اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا۔ پس یہ تعلق بغیر اللہ سب کے لئے بُرا ہے۔ بخلاف مال کے کہ کسی کے لئے اچھا کسی کے لئے بُرا ایسے ہی اولاد بھی دنیا نہیں، ہاں قلب کا اس کے ساتھ اتنا تعلق جو غافل کر دے یہ دنیا ہے۔

ایک بی بی ہمارے بزرگوں میں سے میرے لئے دعا کیا کرتی تھیں۔ اے اللہ! میرے اشرف کا بھی دنیا میں ساجھا کیجیو (یعنی کوئی اولاد ہو جائے) میں نے کہا کہ اگر بچہ ہونے سے دنیا میں ساجھا ہوتا ہو تو میں ایسی اولاد کو نہیں چاہتا۔

اولاد کا فتنہ

صاحبو! آج کل کی اولاد تو بیشتر ایسی ہی ہے کہ وہ خدا سے غافل کرنے والے ہیں۔ پس جس کے نہ ہو وہ شکر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے سب فکروں سے آزاد کیا ہے۔ اُن کو تو چاہیئے کہ وہ تو اطمینان سے اللہ تعالیٰ کی یاد کریں۔ بعض عورتوں نے مرید ہونا چاہا تو میں نے اُن سے شرط کی کہ دیکھو رسمیں چھوڑنا پڑیں گی۔ کہنے لگیں کہ میرے کچھ ہے ہی نہیں، بال نہیں، بچہ نہیں، میں کیا رسمیں کروں گی۔ میں نے کہا کہ کرو گی تو نہیں، لیکن صلاح تو دو گی۔ یہ پرانی بڈھیاں شیطان کی خالہ ہوتی ہیں۔ خود اگر نہ کریں تو دوسروں کو بتلاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھتا ہوں کہ جن کی اولاد نہیں وہ خود تو کچھ نہیں کرتیں، لیکن دوسروں کو تعلیم دیتی ہیں۔ کوئی پوچھے کہ اس کو کیا شامت سوار ہوئی ہے۔ اس کو تو یہ مناسب تھا کہ تسبیح لے کر مصلے پر بیٹھ جاتی۔ کچھ فکر تو ہے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب باتوں سے فارغ کیا تھا۔ وقت کی قدر جانتی مگر یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ بس یہ مشغلہ ہے کہ کسی کی غیبت کر رہی ہیں کسی کو لڑائے دے رہی ہیں۔ گویا یہ بڑی بنتی ہیں۔ بات بات میں دخل دیتی ہیں۔ یاد رکھو! زیادہ بولنے سے کچھ عزت نہیں ہوتی۔ عزت اسی عورت کی ہوتی ہے جو خاموش رہے اور اگر ساکت صامت ہو کر ایک جگہ بیٹھ کر

لوگ ان بچوں پر ہنستے ہیں کہ یہ کس کو گھر سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی اہل اللہ ہم پر ہنستے ہیں کہ یہ دنیا کے ساتھ کیسا دل لگائے ہوئے ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں وما ھذہ الحیٰوۃ الدنیا الا لہو ولعب۔ اور جیسے بچے اپنے باپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں کہ اس نے ہمارا گھر گرا دیا۔ ایسے ہی ہم لوگ عقلاء الٰہی کو بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ ہم سے دنیا چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کو ضرورت زمانہ کی کچھ خبر نہیں۔ ارے ان کو سب خبر ہے۔ کیونکہ ان پر بھی سب طرح کی حالت گزری ہے اگر وہ پہلے دنیادار تھے۔ بعد میں تائب ہوئے۔ تب تو ظاہر ہے۔ ورنہ ان کو دنیا کی حالت کا تجربہ ہے۔ اس لئے جن ضرورتوں کو تم جانتے ہو۔ ان سے وہ بھی بے خبر نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ان کو ایک اور چیز کی بھی خبر ہے۔ جس کی تم کو خبر نہیں۔ اس لئے وہ تم پر ہنستے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق اطفالند جز مست خدا

نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

ساری مخلوق نابالغ بچے ہیں جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا وہ البتہ بالغ ہے۔

غرض اہل اللہ ہم کو طفل ناداں سمجھتے ہیں کیونکہ ہماری حالت یہ بتلا رہی ہے کہ ہم دنیا کو سفر کی جگہ نہیں سمجھتے گو زبان سے ہر شخص اس کا مدعی ہے۔

زہد فی الدنیا کے درجے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ زہد فی الدنیا کے چار درجے ہیں۔ گو مشہور تو تین ہی درجے ہیں۔ مگر میرے قلب پر اس وقت ایک درجہ اور آیا ہے۔ جو فی نفسہٖ بزرگوں کے کلام میں مذکور ہے۔ مگر اس سلسلہ میں مذکور نہیں تھا۔ ایک درجہ علم کا۔ ایک عمل کا۔ ایک حال کا۔ یہ تو مشہور ہیں اور ایک میں نے بڑھایا ہے۔ کیونکہ حال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حال راسخ ایک حال غیر راسخ۔ تو میں نے حال میں تفصیل کی ہے کہ ایک درجہ حال غیر راسخ کا اور ایک درجہ حال راسخ کا۔ جس کو سہولت ضبط کے لئے مقام سے تعبیر کرنا چاہیئے اور حال غیر راسخ کو صرف

حال کہنا چاہیئے۔ تو اب چار درجے یوں ہوئے۔ ایک درجہ علم کا۔ ایک عمل کا۔ ایک حال کا ایک مقام کا اور اس کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ لوگوں کو اس میں دھوکا ہو جاتا ہے۔ بہت لوگ حال راسخ کو کافی سمجھتے ہیں اور حال غیر راسخ یعنی کیفیت غیر دائمہ کچھ کمال نہیں۔ یہ تو اکثر کو پیش آجاتا ہے۔ اب اگر اسی پر درجات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ جیسا کہ تقسیم مشہور میں ہے تو لوگوں کے نزدیک یہی منتہی ہو گا۔ حالانکہ یہ کچھ معتدبہ نہیں، جب تک کہ راسخ نہ ہو۔

ابلیس کی غلطی کا راز

صاحبو! حالات غیر راسخہ اور کیفیات کو منتہی سمجھنے ہی سے بہت سے لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔ بلعم باعورا اور ابلیس وغیرہ اسی غلطی میں تباہ ہوئے۔ ان لوگوں کو کچھ سرسراہٹ اور کیفیت محسوس ہو گئی تھی۔ بس انہوں نے اسی کو منتہی سمجھ لیا اور اس کے بعد مجاہدۂ نفس سے اپنے کو مستغنی سمجھ لیا۔ نفس کی اصلاح کے درپے نہ رہے۔ اس سے غافل ہو گئے۔ آخر کار تباہ ہوئے کیونکہ ان کا نفس ہنوز زندہ تھا۔ یہ کیفیات جو مجاہدہ سے اس میں پیدا ہوئی تھیں۔ درجۂ مقام پر نہ پہنچی تھیں اور اس غلطی میں اب بھی لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ مثلاً کسی میں خوف خشیت کا کچھ اثر پیدا ہو گیا۔ دو چار دفعہ رونا آگیا یا محبت و معرفت کے آثار پیدا ہو گئے یا ذکر اور صحبت شیخ سے ایک قسم کا مشاہدہ حاصل ہو گیا۔ یہ اس کو منتہی سمجھ گئے اور آئندہ کے لئے مجاہدہ و سعی کو چھوڑ بیٹھے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے۔ کہ کچھ دنوں میں کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ حال غیر راسخ تھا۔ اس کی بقا کے لئے سعی کی ضرورت تھی۔

اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کسی نے درخت لگایا۔ اس کو پرورش کیا۔ تو عرفاً درخت کا منتہی یہ ہے کہ اس پر پھل آجاوے۔ اُس نے کیا کیا کہ ایک دفعہ جو اس پر پھل آگیا تو اُس نے اُسی دن سے پانی دینا اور اُس کی خدمت کرنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ ایک بار پھل آجانا کافی نہیں۔ کیونکہ بعضے درختوں پر بہت جلدی پھل آجاتا ہے۔ جیسے بعضا قلمی آم ایک سال ہی میں پھل دیتا ہے۔ حالانکہ اُس کی بساط کچھ بھی نہیں ہوتی۔ جیسے آج کل بعضے بچے بادا ہو

جاتے ہیں۔ گو دیکھنے میں پاؤ ہی سے ہوں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اخیر زمانہ میں بالشتی لوگ ہوں گے۔ شاید یہ وہی لوگ ہیں۔ کیونکہ پہلے زمانہ کے آدمیوں کے سامنے یہ آج کل کے بچے جو تھوڑی ہی عمر میں بالغ ہو جاتے ہیں بالشتی سے زیادہ نہیں۔ پہلے زمانے میں آدمی جلدی بالغ نہ ہوتا تھا۔ ساٹھ ستر برس کی عمر میں شادی کی فکر ہوتی تھی۔ چنانچہ ساٹھے پاٹھے کا محاورہ اب تک زبان زد ہے۔ مگر آج کل لوگ ساٹھ برس میں گور کا حریرہ ہو جاتے ہیں تو جیسے آدمیوں میں بالشتی ہیں۔ ایسے ہی درختوں میں بھی بالشتی ہیں کہ ذرا زمین سے اُبھرے اور پھل دینے لگے۔ درخت لگانے والا خوش ہو گیا کہ بس اب یہ منتہیٰ کو پہنچ گیا ہے۔ اُس نے پانی دینا موقوف کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بیل اُس کے پاس سے گذر گیا اور ایک لات ماردی تو درخت گر پڑا۔ یا گرمی کے زمانہ میں خشکی نے آدبایا اور چند روز میں خشک ہو کر ایندھن رہ گیا۔ عقل کی بات یہ تھی کہ ایک دفعہ پھل آجانے سے بے فکر نہ ہوتا بلکہ اُس درخت کو برابر پانی دیتا رہتا۔ یہاں تک کہ تنہ خوب موٹا ہو جاوے اور اتنا اونچا ہو جائے کہ جانوروں کا منہ اُس تک نہ پہنچ سکے۔ اب بے شک یہ پانی دینے سے مستغنی ہو جائے گا۔ اس وقت قدرتی بارش ہی اس کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح حال وکیفیت پیدا ہونے سے سالک کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ برابر مجاہدہ میں مشغول رہنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ حال مقام ہو جائے۔ اس کے بعد اُس صاحب مقام کو چلہ و مجاہدات شاقہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ مولانا فرماتے ہیں ؂

خلوت و چلہ برو لازم نماند

(تنہائی اور محنت اس پر ضروری نہیں رہتی)

انسان مختار و صاحب ارادہ ہے

مگر عمل کی پھر بھی ضرورت رہے گی اور نفس کی نگہداشت اور باطن سے ذکر میں مشغول رہنا اس پر ہمیشہ لازم ہے۔ کیونکہ درخت تو غیر مختار ہے۔ وہ تو تکمیل کے بعد بلا قصد بھی فیضانِ الٰہی لے سکتا ہے اور انسان مختار و صاحب ارادہ ہے۔ اس کو بدونِ

طلب و قصد کے فیض نہیں مل سکتا۔ اس لئے طلب کا باقی رکھنا اس پر تمام عمر کے لئے ضروری ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں نہ گزار۔ اُمید ہے کہ وہ نگاہِ کرم کریں اور تو بے خبری میں ہو۔

اور حدیث میں ہے الا ان لربکم نفحاتٍ فی الدھر الا فتعرضوا لہا۔ بہت لوگ اس ورطہ میں آکر تباہ ہو گئے کہ انھوں نے حالات و کیفیات کے طاری ہونے پر عمل چھوڑ دیا۔ پھر ویسے ہی کورے ہو گئے۔ جیسے کہ پہلے تھے، بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ طلب کے بعد ترکِ طلب اشد ہے۔ کیونکہ یہ اعراض ہے۔ بلعم باعورا اور ابلیس نے اپنے کو حالات ہی سے کامل سمجھ لیا تھا۔ پھر کمبختوں نے مجاہدہ اور کوشش چھوڑ دی۔ بعض اولیا بھی اس دھوکا میں مبتلا ہیں۔ اُن کو اولیا مستہلکین کہتے ہیں۔ پس خوب یاد رکھو کہ تکمیل کے بعد بھی کوشش لازم ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست
ہشیار و گوش را بہ پیام سروش دار

طریق محبت میں شیطانی الجھاوے بہت سے ہیں۔ ہوشیاری سے چل اور کانوں کو آوازِ وحی پر لگائے رکھ۔

پیام سروش سے مراد وحی ہے اور وحی کا حکم یہ ہے۔ واعبد ربك حتیٰ یاتیك الیقین کہ موت تک عمل سے استغنا نہیں، مرتے دم تک اس پر جا رہے۔ فرق اتنا ہوگا کہ پہلے مجاہدہ کے طور پر عمل کرتا تھا۔ اب عبادت کے طور پر عمل کرتا رہے۔ محبوب نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیا تھا، اُس وقت تم نے بھی ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد پھر بھی تم کو ہاتھ بڑھا ہوا ہی رکھنا چاہیئے تاکہ طلب باقی رہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب تک تم ہاتھ نہ کھینچو، اُس وقت تک وہ بھی ہاتھ نہیں کھینچتے اور یہی عادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

تھی۔ کیونکہ آپ مظہر اتم صفات الہیہ ہیں۔ جب کوئی آپ سے مصافحہ کرتا تو جب تک خود ہی ہاتھ نہ کھینچتا۔ آپ کبھی ہاتھ نہ کھینچتے تھے۔ جب آپ کی یہاں یہ عادت تھی تو وہاں بھی یہی عادت ہوگی۔ پھر کیا ہے ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو
کہ دارد چنیں سیّد پیشرو

گناہوں میں مقید کوئی ایسا شخص نہیں رہے گا کہ وہ سرکار دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم جیسا اپنا پیش رو رکھتا ہو۔

جن کو ایسا رحیم وکریم نبی مل گیا ہو۔ اُن کو بہت کچھ امیدیں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صفت حق تعالیٰ کی صفت کرم کا ظل تھا تو حق تعالیٰ اس مسئلہ میں اصل ہیں کہ جب تک تم طلب باقی رکھو گے وہ اپنی عطا اور توجہ کو کم نہ کریں گے۔ مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری کا مقولہ ہے کہ میاں جو خدا یہاں ہے۔ وہی تو حشر میں بھی ہوگا اور یہاں تو وہ بڑے رحیم وکریم ہیں اور اُن کی صفات میں تغیر ہے نہیں۔ الآن کما کان پھر کیا خطرہ ہے۔ انشاء اللہ وہاں بھی یہی رحمت ہوگی بلکہ اس سے زیادہ۔

امید ورجا کی حقیقت

مگر اس سے بے فکر ہو کر نہ بیٹھ جانا۔ کیونکہ اس میں بھی ایک تو رجاء کا درجہ ہے اور ایک غرور کا۔ امید ورجا وہی ہے جو عمل کے ساتھ ہو ورنہ غرور ہے۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ رجا مجرم کو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے جن احادیث میں رجا اور حسن ظن باللہ کی تعلیم ہے۔ درحقیقت ان میں عبادت وعمل کی تعلیم ہے۔ کیونکہ رجا اسی سے پیدا ہوتی ہے ورنہ وہ تو غرور ہے۔ جس کی نسبت ارشاد ہے۔ وغرکم باللہ الغرور۔ غرض حق تعالےٰ بڑے رحیم وکریم ہیں کہ ہاتھ بڑھا کر خود نہیں کھینچتے مگر اس کے ساتھ ان میں استغنا بھی بہت ہے ؎

ہی نہیں۔ بتلائیے اس میں کیا تعطل ہے کہ انسان دنیا میں مسافر بن کر رہے۔ کیا مسافر کھانا چھوڑ دیتا ہے، پینا چھوڑ دیتا ہے، کپڑے نہیں پہنتا، کیا کام نہیں کرتا۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ عمر بھر سفر ہی میں رہتے ہیں اور ان کے کسی کام میں بھی خلل نہیں آتا بیوی بچے سب سفر میں ساتھ رہتے ہیں۔ سونا جاگنا بیوی کے پاس جانا سارے کام ہوتے رہتے ہیں۔ صرف اتنی بات ہوتی ہے کہ وہ کسی شہر یا مکان سے دل نہیں لگاتا۔ ہر دم اٹھاؤ چولہا رہتا ہے۔

ضرورت کے موافق دنیا سے تعلق رکھو

بس اسی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ ضرورت کے موافق دنیا سے تعلق رکھو۔ مگر اس سے دل نہ لگاؤ۔ اس میں منہمک نہ ہو جاؤ نہ تعلقات کو بڑھاؤ بلکہ حتی الامکان اختصار رکھو۔ اس میں نہ تعطل ہے نہ اس پر عمل دشوار ہے۔ مگر اللہ بھلا کرے۔ بعض واعظین کا کہ وہ وعظ کے وقت جو زہد و توکل کا بیان کریں گے تو اسکو ہوّا ایسا بنا دیں گے جو ان واعظ صاحب کے باپ سے بھی نہ ہو سکے۔ حالانکہ شریعت میں ممتنع العمل کوئی بات نہیں ہے پس یہ شریعت کی تعلیم نہیں ہے بلکہ واعظوں کی من گھڑت ہے۔ شرعاً زہد و توکل کے لئے یہ لازم نہیں کہ ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھے۔ بلکہ مال جمع کرنے کے ساتھ بھی زہد و توکل ہو سکتا ہے۔

جس کی صورت یہ ہے کہ مال کے ساتھ دل نہ لگائے اور ضرورت سے زیادہ کے درپے نہ ہو۔ پس یہ زہد ہے اور اگر بدون طلب و انہماک کے ضرورت سے زیادہ سامان حق تعالیٰ عطا فرما دیں تو یہ بھی زہد کے خلاف نہیں۔

اور توکل یہ ہے کہ اسباب کو مؤثر نہ سمجھے اور نہ اُن پر اعتماد کرے بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے اور ہر چیز کو انہی کی عطا سمجھے۔ اس کے لئے ترک اسباب اور ترک ملازمت ضروری نہیں۔

ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی کو اسباب کے اختیار کرنے سے الجھن ہوتی ہو اور

بس یہ عزرائیل فرشتہ ہے جو میری روح نکالنے آیا ہے تو وہ گھبرا کر کہنے لگی ۔ اے موت مہتی[1] نہیں ہوں ۔ مہتی تو وہ پلنگ پر پڑی ہے ۔ میں تو غریب بڑھیا ہوں ؎

گفت اے موت من نہ مہتیم
پیر زال غریب محنتیم

صاحبو! ہم اپنی موت کو یاد رکھتے تو ہوش اڑ جاتے اور اس کی علامات ظاہر ہوتیں مگر ہمارے اندر اس کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی ۔ اور اگر اپنی موت یاد آتی تو پھر دوسرے مردہ پر بھی اتنا نہ روتے ۔ کیونکہ اگر کوئی قید سے چھوٹ جاوے تو اس میں اتنے رنج کی کیا بات ۔ ہے ۔ گو طبعاً حزن ہوتا مگر عقلاً تو یہ خوشی کی بات ہے اس وقت اس بات کی خوشی ہونا چاہئے تھی کہ ایک دن ہم بھی قید خانے سے چھوٹنے والے ہیں ۔ جیسا یہ چھوٹ گیا ۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

شوقِ لقاء میں موت کی تمنا جائز ہے

اہل اللہ تو موت کے دن کی تمنا کرتے ہیں اور یہاں ہم کو اس کے نام سے بھی جاڑہ بخار چڑھتا ہے ۔ تو موت کو ہم اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتے دیکھ کر بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ منزل ہمارے سامنے بھی ہے ۔ بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اسی کے واسطے تھی ۔ اور اگر کوئی یاد بھی کرتا ہے تو بطور وظیفہ کے ۔ مگر کیا اگر کوئی لڈو مٹھائی کا نام لے کر وظیفہ پڑھا کرے تو اس سے اس کا منہ میٹھا ہو جائے گا ہرگز نہیں ۔ اسی

[1] اس کی بیٹی کا نام ہے ۱۲ -

کچھ نصیحتیں کیں، مگر اس نے ایک نہ مانی۔ تو مولوی صاحب اپنا سا منہ لے کر واپس آئے اور بادشاہ سے کہا، حضور! یہ تو بد معاش ہیں، مانتے نہیں ہیں۔ بس اُن کا ایمان گیا اور تمہارا ملک گیا، صبر کرو۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا توکل نہیں سکھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکیم ہیں اور حکیم بھی کیسے کہ تمام حکما، آپ کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ حق تعالیٰ نے بلا واسطہ آپ کو تعلیم دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادبنی فاحسن تادیبی۔

حضرت جبرئیلؑ کی حیثیت

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا واسطہ یہ کچھ واسطہ نہیں ہے۔ وہ تو محض قاصد ہیں جیسے ڈاکیہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ڈاکئے کا واسطہ کچھ واسطہ نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص خط میں اپنے کسی شاگرد یا مرید کو علمی نکات لکھ کر بھیج دے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شاگرد یا مرید کو ڈاکئے نے یہ علوم سکھلائے ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ معلم کاتب خط ہی کو کہا جائے گا۔ اسی طرح جبرئیل علیہ السلام ڈاکئے کی طرح محض علوم کے پہنچانے والے ہیں خود تعلیم دینے والے نہیں ہیں۔ معتزلہ کی عقل خبط ہو گئی ہے کہ وہ جبرئیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل کہتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم ہیں۔ ان احمقوں کو اب تک معلّم کے معنیٰ ہی معلوم نہیں جبرئیل علیہ السلام معلم بمعنی اُستاد ہرگز نہیں ہیں، بلکہ معلم بمعنی مبلغ و سفیر ہیں ان کی ایسی مثال ہے۔ جیسے بادشاہ اپنے دربان کے ذریعہ سے کسی شخص کے پاس پیغام بھیج دے کہ ہم نے تم کو وزیر بنا دیا ہے تو بتلائیے اُس شخص کو بادشاہ نے وزارت دی یا دربان نے؟ اور اگر بادشاہ وزیر کے پاس انتظام سلطنت کے متعلق کچھ قوانین لکھ کر دربان کے ہاتھ بھیج دے تو ان قوانین کا معلم بادشاہ کو کہا جائے گا یا دربان کو؟ اسی طرح یہاں سمجھو۔

عارفین زبان شناس نبوّت ہیں

اس کا مطلب عارفین نے سمجھا ہے۔ کیونکہ وہی زبان شناس نبوت ہیں۔ اُن سے اس کا مطلب پوچھو۔ خود اپنی طرف سے تفسیر نہ کرو۔ کیونکہ تم نبوت کی زبان نہیں سمجھتے ؎

تو ندیدی گہے سلیمان را
چہ شناسی زبانِ مرغاں را

جب تو نے سلیمانؑ کو دیکھا ہی نہیں تو پھر تو پرندوں کی بولیاں کس طرح سمجھے گا۔

اس کا مطلب حضرت فرید عطار بیان فرماتے ہیں ؎

ہر کہ اورا معرفت بخشد خدائے — غیر حق را در دلِ او نیست جائے
نزدِ عارف نیست دنیا را خطر — بلکہ بر خود نیستش ہرگز نظر
عارف از دنیا و عقبیٰ فارغ ست — زانچہ باشد غیر قولی فارغ ست

جس کو خدائے بزرگ اپنی پہچان نصیب کر دے تو اُس دل میں غیر اللہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ عارف کے نزدیک دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر ہے بلکہ خود اپنے وجود ہی کے ہونے نہ ہونے پر نظر نہیں۔ عارف دنیا و آخرت کے غم سے فارغ ہے۔ اس لئے کہ فرمانِ الٰہی کے علاوہ جو کچھ ہے۔ اس سے بے تعلق ہے۔

فرماتے ہیں کہ معرفت اس کا نام ہے کہ دنیا کی قدر دل میں نہ ہو اور اس سے دل کو خالی رکھو۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہاتھ کو بھی خالی رکھو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اے پسر از آخرت غافل مباش
با متاعِ ایں جہاں خوش دل مباش

در بلیّات جہاں صبار باش!
گاہِ نعمت شاکرِ جبار باش!

صاحبزادے! فکر آخرت سے غفلت میں نہ رہ۔ اس جہاں کے سامان زینت سے دل بستگی نہ کر۔ دنیا کے سرد گرم پر راضی برضا رہ اور ہمیشہ خدا کی نعمتوں کا شکر کرتا رہ۔

بس یہ معنی ہیں کانک غریب کے کہ دنیا کے ساتھ دل نہ لگائے اور جہاں تک ہو سکے تعلقات نہ بڑھائے یعنی زائد از ضرورت تعلقات کو کم کر دے۔ پند نامہ عجیب کتاب ہے۔ اس میں عمل کرنے کی باتیں ہیں۔ لوگوں کو مثنوی کا بہت شوق ہے۔ کیونکہ اس میں عمل کی باتیں کم ہیں۔ زیادہ تر مسائل اور احوال وکیفیات کی تحقیق ہے۔ جو منتہی کے کام کی باتیں ہیں۔ بتدی کو تو سب سے زیادہ عمل کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے الف۔ با۔ تا کی ضرورت ہے اور وہ پند نامہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کتاب کو اپنے عمل میں رکھے۔ تو انشاء اللہ واصل ہو جائے گا۔ مگر عمل شرط ہے کہ امتحان وہی ہے ؎

او! امتحاں بدون تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ وشاب کا

اسی کو فرماتے ہیں ؎

کار کن کار بگذار از گفتار
کاندریں رہ کار باید کار

دعوے چھوڑ عمل میں لگ۔ اس طریق الفت میں صرف عمل ہے۔

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم
کہ اصلے ندارد دمے بے قدم

طریقت میں عمل کرنا چاہیئے نہ کہ دعویٰ کہ دعویٰ بغیر عمل کے بے حقیقت ہے۔

شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب پند نامہ مولانا رومی کو دی تھی۔ چنانچہ مولانا رومی نے اس کتاب کو اپنا دستور عمل بنایا۔ پھر معلوم ہے کہ وہ کس درجہ کے ہوئے۔ اس طرح شیخ فرید عطار مولانا رومی کے اُستاد ہو گئے۔ مولانا رومی نے بعض مقامات پر اُن کی بہت تعریف فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

حضرت عطار عشق کے سات شہروں کو طے کر چکے اور ہم تو ابھی تک ایک ہی گلی کے موڑ پر ہیں۔

تو اتنے بڑے شخص کا قول یہ ہے کہ دنیا سے دل نہ لگانا ہی معرفت ہے۔ باقی دنیا کا پاس ہونا مضر نہیں۔ ہاں بے ضرورت سامان جمع نہ کرے۔ فرماتے ہیں ؎

چیست تقویٰ ترک شبہات و حرام
از لباس و از شراب و از طعام

تقویٰ کیا ہے؟ کھانے پینے پہننے میں شبہ اور حرام سے بچنے کا نام ہے۔

ہر چہ افزوں ست اگر باشد حلال
نزد اصحاب ورع باشد وبال

زائد از ضرورت ہر شے چاہے حلال ہو متقی بندوں کے لئے وبال ہے۔

زائد از ضرورت سامان کی ممانعت

بزرگوں نے تو حلال آمدنی کو بھی جب کہ ضرورت سے زیادہ ہو، وبال سمجھا ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ مشتبہ اور حرام مال سے بھی گھر بھرتے رہتے ہیں اور بے ضرورت سامان جمع کرتے ہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن سے کبھی کام بھی نہیں

نکلے گی۔ مجذوب نے کہا۔ ہمارا کیا ہے۔ ہم تو یُوں جان دے دیں گے یہ کہہ کر لیٹ گیا۔ جب دیر ہوگئی تو مولانا نے آکر ہلایا۔ دیکھا وہ جان دے چکا تھا۔ بس اُن کے قلب پر ایک چوٹ لگی اور اسی وقت تمام دکان کا سامان خیرات کر کے اللہ کی طلب میں نکل گئے۔

سو جو ہماری حالت ہے۔ اس میں تو واقعی ہماری جان بھی مرتے ہوئے اس سامان میں اٹکی رہے گی خصوصاً عورتوں کی کیونکہ یہ تو بے ضرورت بھی سامان بہت جمع کرتی ہیں۔ جو چیز اُن کے سامنے سے گزرتی ہے۔ فوراً اس پر اُن کی رال ٹپک جاتی ہے۔ ان کی حالت یہ ہے ؎

لختے بُرداز دل گذر دہر کہ زپیشیم

میرے سامنے سے ہر گزرنے والا دل کا ایک ٹکڑا لے جاتا ہے۔

دہلی میں ایک شاعر نے یہ مصرعہ کہا تھا۔ اس کے بعد اگلا مصرعہ نہ بنتا تھا۔ اب آپ مجھے غوطے لگا رہے ہیں۔ اسی لئے حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ الم تر انہم فی کل واد یہیمون جب شاعر کو کسی مصرعہ کی فکر ہوتی ہے۔ اُس وقت اُس کی بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔ یہ شاعر بھی دوسرے مصرعہ کی فکر میں پریشان اور غلطاں و پیچاں تھا۔ اتفاق سے ایک کنجڑا تربوز کی قاشیں بیچتا ہوا اُس کے مکان کے پاس سے یہ صدا لگاتا ہوا نکلا ؎

من قاش فروش دلِ صد پارہ خویشم

میں اپنے دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں۔

یہ سُن کر شاعر پھڑک گیا کہ میرے مصرعہ کا جوڑ یہی مصرعہ ہو سکتا ہے۔ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ فوراً بھاگا ہوا کنجڑے کے پاس آیا کہ یہ مصرعہ تم میرے ہاتھ بیچ دو۔ مطلب یہ تھا کہ اب سے اگر کوئی پوچھے تو اس مصرعہ کو میری طرف منسوب کرنا، اپنی طرف منسوب نہ کرنا۔ اس کا کیا حرج تھا۔ مفت میں دام مل گئے۔ شاعر صاحب مصرعہ خرید کر خوشی خوشی واپس ہوئے۔ مگر اس کے اس قصہ سے مقصود پھر بھی حاصل نہ ہوا کیونکہ اب تک لوگ بیان کرتے آرہے ہیں کہ یہ مصرعہ کنجڑے سے خریدا گیا ہے۔ اگر وہ یہ قصہ نہ کرتا اور ویسے ہی اپنے مصرعہ کے ساتھ یہ دوسرا مصرعہ لگا لیتا تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ یہ مصرعہ کبہ

کی نظر میں بڑا بننے کی نیت ہو تو حرام ہے۔ اس اس معیار کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔ مگر اس سے ہر شخص خود کام نہیں لے سکتا، بلکہ اس پر عمل کرنے کے لئے کسی مربی کی رائے کی ضرورت ہے۔ یہاں سے شیخ کی ضرورت معلوم ہو گئی ہو گی۔ خوب فرمایا ہے ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا
دامن رہبر بگیر و پس بیا
یار باید راہ را تنہا مرو
بے قلاوز اندریں صحرا مرو

اے دل! اگر طریق الفت میں تجھ کو چلنے کی خواہش ہے تو کسی شیخ کامل کا پلہ پکڑ اور خود رائی کو چھوڑ دے۔ واقف کار ساتھی کے بغیر اکیلا سفر میں مت چل خصوصاً صحرائے محبت میں تو شیخ کامل کے بغیر ہرگز قدم نہ رکھ۔

اور اس کے لئے کسی سے بیعت ہو جانا کافی نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ اپنے کو اس کے سپرد کر دے ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو
ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن در کار خضر اے بے نفاق
تا نگوید خضر رو ہٰذا فراق

جب تو نے شیخ کامل اختیار کر لیا تو سراپا اطاعت بن جا۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرح خضر علیہ السلام کے حکم پر چل۔ اے مخلص خضر راہ کے حکم کی علت معلوم کرنے میں جلدی مت کرنا کہ تجھ کو تیرا خضر راہ ھٰذا فراق بینی و بینک نہ کہہ دے۔

غرض ہر بات کو شیخ سے پوچھو کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں، یہ ضروری ہے یا غیر ضروری۔ اس سے پوچھ کر کچھ عرصہ کام کرو۔ انشاءاللہ ایک دن تم بھی محقق ہو جاؤ گے ومن یؤمن

باللہ یہ مقصد قلبًا محقق ہونے کی صورت یہی ہے کہ پہلے اپنے کوکسی کے سپرد کردو اور اُس کے کہنے کے موافق عمل کرو اور محض عمل بھی کافی نہیں بلکہ حال کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہی بات جس کا ذکر ہو رہا ہے۔ دل کو لگ جائے کہ ہم دنیا میں مسافر ہیں۔ یہ بھی شیخ ہی کے سپرد ہونے سے حاصل ہوگا۔ مگر افسوس! اب تو مشائخ بھی اس حال سے خالی ہیں۔ چنانچہ اُن کو جو کوئی بھی کچھ ہدیہ دیتا ہے۔ فوراً لے لیتے ہیں اور غیر ضروری چیزوں کا ذخیرہ بھی رکھتے ہیں۔

بعض مشائخ کے یہاں جانمازیں اور قالین غیر محدود جمع ہو جاتے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تم اتنی جانمازیں کیا کرو گے۔ پھر ایک صورت تو یہ ہے کہ بے ضرورت سامان اس نیت سے لے لیا جاوے کہ ہم کو گو ضرورت نہیں۔ مگر اپنے احباب و متعلقین میں سے کسی کو دیدیں گے۔ اُن کے کام آجائے گا۔ اس کا تو مضائقہ نہیں۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ اس کو لے کر حفاظت کیا خاک رکھا جاتا ہے اور اگر اس میں سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو خدام پر مار دھاڑ ہوتی ہے۔ کیونکہ قلب کو اس سے تعلق ہو گیا ہے۔

دنیا میں بے وطن کی طرح رہو

اگر ——— كن فى الدنيا كانك غريب ——— دنیا میں بے وطن کی طرح رہو ——— ان کا حال بن جاتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ حال تو ایسا ہونا چاہئے جیسے غوث اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں ایک آئینہ چینی ہدیہ میں آ گیا تھا۔ آپ نے ہدیہ دینے والے کا دل خوش کرنے کے لئے خادم سے فرمایا کہ اس کو احتیاط سے رکھو اور جب ہم کنگھی کیا کریں۔ اُس وقت سامنے لاکر رکھ دیا کرو۔ لوگ سمجھے ہوں گے کہ شیخ کو اس سے تعلق ہو گیا ہے۔ اتفاق سے ایک دن خادم کے ہاتھ سے وہ آئینہ گر کر ٹوٹ گیا۔ وہ ڈرا کہیں عتاب نہ ہو ڈرتے ڈرتے اُس نے عرض کیا ؂

از قضاء آئینہ چینی شکست

"قضائے الہٰی سے آئینہ چینی ٹوٹ گیا"

خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں. جب وقت آئے گا تو رسی توڑ کر بھاگو گے. لوگ تم کو پکڑنا چاہیں گے اور تم روکے نہ رکوگے. یہ ہوتی ہے حالت حال کی.

مقصودِ حال نہیں اعمال ہیں

صاحبو! حال پیدا کرو۔ بدون حال کے کام نہیں چل سکتا. گو حال مقصود نہیں بلکہ مقصود اعمال ہیں۔ اگر بدون حال کے بھی آدمی عمل پر جارہے تو کامیاب ہو جائے گا مگر بدون حال کے عمل پر استقامت دشوار ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے. جیسے ریل کو آدمی ٹھیلتے ہوں۔ آخر کہاں تک ٹھیلیں گے، تھوڑی دور چل کر رہ جائیں گے. پھر کچھ بھی حرکت نہ ہوگی اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے. جیسے انجن کی اسٹیم گرم ہو اور وہ ریل کو لئے جا رہا ہو۔ اب وہ بدون روکے ہوئے تھوڑا ہی رُکے گا۔ اگر اس کے روکنے کو راستہ میں لکڑ اور پتھر بھی رکھ دو گے تو وہ سب کو پھینک پھانک چل دے گا۔ عراقی اسی کی طلب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

صنما! رہِ قلندر سرد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

"میرے مرشد! مجھے تو طریق جذب کا رستہ دکھلا دے کیونکہ ریاضت
ومحنت کا راستہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

رہ قلندر سے مراد طریق حال ہے اور رسم پارسائی سے عمل محض کا طریق مراد ہے تو فرماتے ہیں کہ طریق عمل محض تو بہت دور دراز ہے۔ اس میں غوائل بہت ہیں۔ آدمی کہاں تک اپنے کو ٹھیلتا رہے اور کہاں تک خلوص واخلاص کی رعایت کرے. کبھی ریاء پیدا ہوتا ہے کبھی عجب پیدا ہوتا ہے. سب سے الگ الگ کہاں تک بچے. چنانچہ اسی کو آگے فرماتے ہیں ؎

بطوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند
کہ بروں درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

بزمیں چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی
بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم
چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

"طواف کعبہ کے لئے میں گیا تو مجھے حرم کے در پر روک کر کہا کہ باہر ہی کیا کیا ہے جو اندر آکر پورا کرنے کی آرزو ہے۔ جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین پکاری مجھ کو تو نے ریائی سجدہ کر کے گندہ کر دیا۔ میں جوئے خانہ میں پہنچا تو وہاں سب کو جوئے کے عہدوں پر مخلص پایا۔ عبادت خانہ میں گیا تو اکثر کو خلوص سے خالی پایا۔"

غرض اخلاق عمل بدون حال کے بسہولت نصیب نہیں ہوتا اور حال بدون کسی شیخ کی صحبت کے حاصل نہیں ہوتا ؎

نفس نتواں کشت الاظل پیر
دامن آں نفس کش را سخت گیر

"نفس کا شیخ کامل کی سرپرستی کے سوا قابو میں آنا مشکل ہے۔ اس مصلح نفس کے دامن کو مضبوطی سے پکڑلے۔"

بدون طریق حال کے ہوائے نفس کا غلبہ رہتا ہے۔ محض عمل میں نفس نہیں دبتا بلکہ غلبۂ حال ہی سے دبتا ہے اور حال کیونکر پیدا ہوتا ہے، دوام عمل اور کسی قدر ذکر اور معیت کاملین سے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان تین چیزوں کو اختیار کرلو۔ انشاءاللہ حال پیدا ہو جائے گا۔ پھر ضرورت ہے۔ اس کے ابقاء کی۔ پھر ترقی کرکے یہی حال مقام ہو جائے گا اور دونوں میں یہ فرق ہوگا کہ صاحب مقام کی حالت تو ظاہر میں عوام متدین کی طرح ہوگی اور باطناً اسکو ترقی ہوگی۔ منتہی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ دل سب سے الگ اور ہاتھ میں سب کچھ۔ اگر سلطنت بھی اس کے ہاتھ میں ہو تو اس سے بھی دل کو تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ہزاروں لاکھوں روپے بھی اس کے پاس ہوں تو دل کو ان سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہوتا۔ جب اس سے کہا جائے

کہ اٹھو چلو، اسی وقت سب کو چھوڑ کر الگ ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ اس کو اپنا مال ہی نہیں سمجھتا۔ اس پر تو ہر وقت یہ حال غالب ہے ؂

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست
ایں امانت چند روزہ نزد ماست

"حقیقت میں ہر چیز کا مالک تو خدا ہی ہے۔ ہمارے پاس یہ چیزیں کچھ دنوں کے لئے امانتاً ہیں"

جب وہ ہر شے کو خدا کی سمجھتا ہے تو اسکو فکر کی کیا ضرورت ہے۔ اب زیادہ تفصیل کا اول تو وقت نہیں، دوسرے مقامات کی علامات بالکل ابتدائی کے مشابہ ہوتی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں احمق مبتدی اُن سے دھوکا نہ کھا جاوے اور اپنے آپ کو کامل نہ سمجھ جائے۔ کیونکہ صاحب مقام میں تمکین اور استقامت کی وجہ سے حالات کا غلبہ نہیں ہوتا تو جیسے مبتدی حالات سے کورا ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ بھی نظر آتا ہے۔ اس میں بظاہر عوام سے کچھ امتیاز نہیں ہوتا۔ مگر واقع میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس امتیاز میں مبتدی اور متوسط اور منتہی کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک شخص نے تو شراب کبھی پی ہی نہ ہو۔ اس لئے ہوش میں ہے۔ یہ تو مبتدی ہے اور ایک شخص نے ابھی شراب پینا شروع کی ہے۔ اس لئے مست ہے۔ یہ متوسط ہے اور ایک شخص برسوں سے پینے کا عادی ہے۔ اس کو کسی قدر تو نشہ ہوتا ہے۔ مگر زیادہ نہیں۔ یہ منتہی ہے۔ گو وہ متوسط سے زیادہ شراب پی گیا ہے مگر عادت ہو جانے کی وجہ سے اس پر متوسط کی برابر نشہ نہیں ہوتا اور متوسط نے ابھی تھوڑی ہی سی پی ہے۔ مگر اس لئے وہ نشہ کا تحمل نہیں کر سکتا۔ آپے سے باہر ہے۔ کبھی انا الحق کہتا ہے۔ کبھی چیختا چلاتا ہے۔ اس کو سب پہچان جاتے ہیں اور منتہی کو خاص خاص ہی پہچانتے ہیں۔ اسی کو شیخ عبدالحق ردولوی فرماتے ہیں۔

"منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ اینجا مرد انند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نزنند"

یعنی منصور کامل نہ تھے، متوسط السلوک تھے۔ اس لئے ایک قطرہ

ہی سے چلانے لگے اور یہاں کامل ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں
اور ڈکار بھی نہ لیں۔

سو بات وہی ہے کہ کامل پر بوجہ تمکین و استقامت کے حالات کا زیادہ غلبہ نہیں ہوتا وہ از جا رفتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اور مبتدی یکساں معلوم ہوتا ہے اور اس کی علامات بھی ابتداء کے مشابہ ہوتی ہیں، جن سے مبتدی کو اپنے کمال کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ اس لئے مقامات کی تفصیل اور ان کی علامات کا بیان نہیں کرتا اور نہ ابھی اس کی ضرورت ہے آپ پہلے حال ہی تک پہنچ جائیں۔ پھر مقام تک پہنچانے والے بھی انشاء اللہ مل جاویں گے۔ ابھی تو تین سبق پڑھنے ہیں۔

تین ضروری اسباق

اوّل علم ——— پھر عمل ——— پھر حال ——— جب تم یہ تین سبق پورے کر لوگے تو چوتھا سبق کوئی اور پڑھا دے گا۔ خواہ ہم ہی پڑھا دیں یا کوئی اور اللہ کا بندہ پڑھا دے۔ پس جن کو علم حاصل نہیں۔ وہ علم حاصل کریں اور جن میں علم ہے عمل نہیں وہ عمل کا اہتمام کریں اور جن میں علم و عمل دونوں ہیں مگر حال نہیں۔ وہ اپنے اندر حال پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

سو جب اس حدیث کا یعنی کن فی الدنیا کانک غریب کا حال طاری ہوگا۔ اس کے یہ علامات ہوں گے کہ غیر ضروری سامان میں اس کو انہماک نہ ہوگا نیز وہ کسی سے لڑے بھڑے گا نہیں۔ کیونکہ مسافر کو کوئی بُرا بھلا کہہ دے تو وہ اس کی وجہ سے اپنی منزل کھوٹی نہیں کیا کرتا چنانچہ اسٹیشن اور سرائے میں کسی کو کسی سے تکلیف پہنچ جائے تو رپٹ نہیں لکھوایا کرتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس کے لئے قیام کی ضرورت ہے اور مجھے قیام کی فرصت نہیں۔ سفر میں رپٹ وہی لکھوائے گا جو اپنے کو مسافر نہ سمجھے۔ یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی یہ کہے کہ میں تو سفر میں بھی لڑا کرتا ہوں۔ اس کا جواب میں نے دے دیا کہ اس وقت تم اپنے کو مسافر نہیں سمجھتے اگر اپنے کو مسافر سمجھتے تو ہرگز انے

ہیں کہ اخیر میں بھی دین اجنبی اور بے یار و مددگار ہو جائے گا کہ لوگ زیادہ تر اس کی مخالفت کریں گے۔ موافقت نہ کریں گے۔ فطوبی للغرباء یعنی مبارک باد ہے۔ اُن لوگوں کے لئے جو اس حالت میں دین پر جمے رہیں اور دنیا میں اجنبی اور بے یار و مددگار بن کر رہیں۔ کیونکہ جس زمانہ میں دین کی مخالفت ہوگی۔ اہلِ دین کی بھی ضرور مخالفت ہوگی جس وقت اہل دین بھی غرباء ہوں گے۔ یعنی بے یار و مددگار۔ اور یہ لوگ اہل حق ہیں۔ جو حق پر جمے رہتے ہیں اور جس طرح وہ غرباء ہیں۔ اسی طرح وہ غرباء کی طرح رہنے کا قصد بھی کرتے ہیں۔ جس کی تعلیم اس حدیث میں ہے۔ اس لئے اُن کو کسی کی مخالفت کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو ——— کن فی الدنیا کانك غریب ——— پر عمل کرکے دنیا میں اپنے کو بے یار و مددگار سمجھتے ہیں۔ وہ خدا کے سوا کسی کو اپنا ساتھی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا کسی کی مخالفت سے اُن کو رنج نہیں ہوتا۔ اگر تمام دنیا اُن کو چھوڑ دے۔ جب بھی اُن کے حال میں فرق نہیں آتا۔ وہ سب سے آزاد ہیں۔ اُن کی وہ حالت ہوتی ہے ؎

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

"وہ جو درخت پھل پھول والے ہیں، بوجھ میں دبے ہوئے ہیں۔
سرو کتنا اچھا ہے جو ہر قسم کی خوشی و غمی سے آزاد ہے۔"

ان سے زیادہ راحت میں کوئی نہیں ہوتا اور اخیر انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بھی بادشاہت کرتے ہیں۔ مخالفین اخیر میں خود ہی اُن کے غلام ہو جاتے ہیں اور اگر فرضاً ظاہر میں دنیا میں بادشاہ نہ بھی ہوئے تو آخرت میں تو وہی بادشاہ ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ

تم دنیا میں مسافر اجنبی بے یار و مددگار کی طرح بن کر رہو۔ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھو اور اس مضمون کو اپنا حال بنالو۔ انشاء اللہ پھر تعلقات زائدہ اور فضول سامان

سے تم اکو خود ہی نفرت ہو جائے گی اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھے گی۔ یہی مطلوب ہے اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ ہم کو توفیق عمل نصیب ہو۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا
محمد و علیٰ آلہ واصحابہ
اجمعین ؛

ہماری ہے کہ شکل تو بنا لیتے ہیں۔ علماء کی فضلاء، وصلحاء کی، لیکن باطن میں سینکڑوں خباثتیں بھری ہیں۔

از بروں چوں گور کافر پُر حلل
واندروں قہر خدائی عز و جل
از بروں طعنہ زنی بر با یزید
وز درونت ننگ میدارد یزید

کہ صورت تو کافر کی قبر کی سی نہایت مزّین۔ اسی کو کہتے ہیں۔ "از بروں طعنہ زنی بر بایزید" کہ بیرونی وضع تو ایسی کہ بایزید بھی شرما جائیں اور قلب کی یہ حالت کہ یزید کو بھی اس سے عار آئے۔ ہم میں صورت کے دیندار تو بہت ہیں۔ مگر سیرت کے دیندار کم ہیں۔

غرض یہ حدیث صورت اور لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر حالت کو عام ہے اور لوگ اس حدیث میں خواہ مخواہ کلام کرتے ہیں۔ یہ تو عقلی بات ہے اور ہر کس وناکس اس کو سمجھتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص لغو و بیہودہ باتیں کرنے لگے تو اس کو کہتے ہیں کہ تو چار ہو گیا یا اگر ایک شخص ہر وقت ہیجڑوں میں رہنے لگے تو انہیں میں شمار ہونے لگے گا جب یہ بات ہے تو اگر ہم اخلاق کافروں کے اختیار کریں گے تو ہم بھی اُن ہی جیسے ہو جائیں گے پس اُن کے ساتھ دوزخ میں بھی جائیں گے۔ (اللھم انی اسئلك الجنة واعوذ بك من النار۔ جامع) ورنہ دوزخ سے مومن کو کیا علاقہ۔

جیسے جنت خاص متقیوں کے لئے ہے۔ ایسے ہی دوزخ خاص کفار کے لئے ہے۔ بیچ کے لوگ تو چونکہ وہ نہ کافر ہیں اور نہ متقی اس لئے ہمیشہ کو دوزخ میں بھی نہ جائیں گے اور ابتداءً جنت میں بھی نہ جائیں گے، مگر چونکہ ایمان کی وجہ سے متقیوں کے مشابہ ہیں۔ اس لئے بعد چندے جنت میں چلے جائیں گے تو جنت میں جانے کے قابل وہ ہے کہ یا تو خود متقی ہو یا مشابہ ہو متقی کے ورنہ نہیں۔ ہاں ایسے لوگ جب پاک صاف ہو جائیں گے۔ اس وقت جنت میں جانے کے قابل ہوں گے۔ جیسے چراغ کہ اس پر اگر بہت سی کیٹ[1] جمع ہو جائے

[1] چیکٹ

تو اس کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے اور اس وقت وہ نفیس جگہ کے استعمال کے قابل ہوتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کو دوزخ کے چولہے میں ڈال کر صاف کیا جائے گا۔

دوزخ میں تعذیب و تہذیب

یا دوسری مثال میں یوں سمجھو کہ بچہ اگر نجاست میں تھڑا ہوا آوے تو کہا جائیگا کہ اس کو حمام میں لے جاؤ اور خوب رگڑو اور اس پر سے نجاست کو کھرچو۔ تو دوزخ بھی حمام ہے لیکن اس کی برداشت ہرگز نہ ہو سکے گی۔ غرض مسلمانوں کا دوزخ جانا بوجہ مشابہت کفار کے ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کفار کو تعذیب کے لئے بھیجا جائے گا۔ مسلمانوں کو تہذیب کے واسطے مگر تکلیف تو ضرور ہی ہوگی۔ دیکھو! جب حمام میں بھانوے سے رگڑا جاتا ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے تو تہذیب کہہ دینے سے ان کا کیا نفع ہوا تکلیف تو ہوئی۔ جہنم میں تو گئے! دیکھو! اگر ایک شخص کے بدن میں چھریاں بھونکی جائیں اور دوسرے کے بدن میں سوئیاں کوچی جائیں تو کیا اس دوسرے کو اطمینان ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں اور ہم لوگ اس سزا کو تو کیا برداشت کر سکتے۔ ہم سے نشتر کی تکلیف تو برداشت نہیں کی جاتی۔ تو ان باتوں سے ہرگز تسلی نہیں ہونی چاہیے۔

ابوطالب کے لئے آیا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی تھی۔ خدا تعالیٰ کی حکمت کے قربان ہو جائیے۔ دیکھئے اتنے بڑے تو محب اور ان کو کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ موت کے وقت کلمہ پڑھنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن خدا ناس کرے ابوجہل کا کہ اُس نے اس وقت بھی بہکایا۔ آخر اسی حالت پر خاتمہ ہو گیا تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا اور اسی لئے اس کو بیان بھی کیا، ورنہ جی نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ ایک مسئلہ کا استنباط مقصود تھا۔ اس لئے بیان کیا۔

نجات کے لئے اظہار محبت کافی نہیں

سو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج کل لوگ مجلس کر لینے کو یا مولد کر لینے کو نجات کا باعث

سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو بہت محبت ہے اور بس اسی کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ نہ نماز کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ روزے کی نہ حج کی نہ استغفار کی اور اس میں زیادہ تر خطا پڑھے لکھے لوگوں کی ہے۔ انہوں نے اپنے طمع اور لالچ کے لئے ایسا کیا کہ عوام الناس کو راضی کرنے کے لئے اُن کو ایسے ایسے مضامین سنائے۔ اُن کے کہنے پر ایسی مجلسیں کیں۔ وعظ میں یہ مضامین بیان کئے جاتے ہیں کہ صاحبو! ڈاڑھی منڈواؤ، ناچ کرو، سب معاف ہو جائے گا، مگر حضورؐ سے محبت رکھو اور اُن منکر وہابیوں کے پاس نہ بیٹھو اور وہابی نام رکھا ہے اہل سنت کا گو وہ مقلد اور حنفی ہوں۔ نیز مجالس وعظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو چاہو کرو۔ مگر صرف محبت رکھو اور اس کا اثر لوگوں پر یہ ہوا کہ انہوں نے تمام اعمال کو غیر ضروری سمجھ لیا تو ایسے لوگوں کو اس حدیث سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ابوطالب کے برابر کوئی بھی ان مدعیانِ محبت میں سے محبت رکھنے والا نہیں۔ ابوطالب وہ تھے کہ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا، لیکن ابوطالب نے ساتھ دیا اور بہت سی تکالیف اٹھائیں۔ آج تو یہ حالت ہے کہ مخالفت شریعت نبویہؐ میں اگر ایک پیسے کا نفع ہو تو مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ایک مجلس میں یزید کے تذکرہ پر ایک شخص کہہ رہا تھا کہ افسوس! میں نہ ہوا ورنہ یوں کرتا اور یاں کرتا۔ یہ سن کر ایک دیہاتی شخص کو جوش آگیا کہنے لگا کہ میں کہتا ہوں کہ میں یزید ہوں اور میں نے ایسا ایسا کیا ہے۔ اگر کچھ ہمت ہو تو آجاؤ۔ یہ سن کر ان بہادر صاحب کے حواس باختہ ہو گئے۔ یہی حالت آج کل کے محبانِ رسولؐ کی ہے۔

تو دیکھئے! ابوطالب جن کو اس قدر محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ اُنکو بھی نرے دعویٰ محبت نے بلکہ محبت نے بھی دوزخ سے نہ بچالیا۔ کیونکہ اطاعت نہ تھی اور آج تو کس کا منہ ہے کہ اتنی محبت کا بھی دعویٰ کرے اور اگر کرے بھی تو خوب یاد رکھو کہ

وجائزة دعوی المحبة فی الھوی
ولکن لا یخفی کلام المنافق!

میں کہتا ہوں کہ محبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرو مگر جس طرح ذکر کا طریق ہے۔ صحابہؓ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے لیکن کیا وہاں کوئی تاریخ مقرر ہوئی

اور پھر قبر کو یاد کرو۔

اور پھر حشر کو یاد کرو۔

اور یوم حشر کے احوال کو اور وہاں کے شدائد کو یاد کرو۔

اور سوچو کہ ہم کو خدائے تعالیٰ قادر کے روبرو کھڑا کیا جائے گا!

اور ہم سے باز پرس ہوگی!

ایک ایک حق اگلنا پڑے گا۔

اور پھر سخت عذاب کا سامنا ہوگا!!!

اسی طرح روزانہ سونے کے وقت سوچ لیا کرو۔ دو ہفتے میں انشاءاللہ تعالے کایا پلٹ ہو جائے گی اور جو اطمینان و اُنس اور دلچسپی دنیا کے ساتھ اَب باقی ہے، نہ رہے گی۔

اور اس وقت اگرچہ احکامِ فرعیہ بیان نہیں ہوسکے، مگر اصول بحمداللہ کافی بیان ہوگئے ہیں۔ اب خدا تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ توفیقِ عمل دے۔

فکر دین کم ہوتی ہے۔ جس درجہ کی حُبِ دنیا ہوگی۔اسی درجہ کی فکر دین کم ہوگی۔اگر کامل درجہ کی حُبِ دنیا ہے تو کامل درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی۔ جیسا کہ کفار میں متحقق ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حُبِ دنیا ہے اسی درجہ کی دین سے بے فکری ہے تو یہ دخل ہے حُبِ دنیا کو ان امور میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں اور کفار میں تو یہ مرض ہے ہی، افسوس یہ ہے کہ ہم میں بھی پایا جاتا ہے۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جاوے کہ اس آیت کو کیوں اختیار کیا گیا۔یہ تو کفار کے بارہ میں ہے، چنانچہ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا۔ اس میں صریح ہے۔ مسلمانوں کو اس سے کیا علاقہ؟ یہ شبہ بہت لوگوں کو ہوا ہوگا۔کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو آیتیں کفار کے بارہ میں ہیں، مسلمانوں سے اُن کو کچھ علاقہ نہیں اور اسی لئے لوگ بے فکر بھی ہو گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو وعیدیں کفار کے بارہ میں وارد ہیں۔ان وعیدوں کی بناء کیا ہے۔آیا کفار کی ذات ہے یا کفار کے اعمال ہیں، ظاہر ہے کہ بناء ان وعیدوں کی اعمال ہی ہیں، جو کفار میں پائے جاتے ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ تو کسی کی ذات سے محبت ہے نہ کسی کی ذات سے بغض ہے۔ من حیث الذات۔ خدا تعالےٰ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

محبت وبغض کا مدار اعمال ہیں

بلکہ دار و مدار بغض ومحبت کا صرف اعمال ہیں۔جس کے اچھے اعمال ہوں۔حق تعالےٰ کو اس سے محبت ہے اور جس کے اعمال بُرے ہوں۔اُس سے بغض ہے۔مثل مشہور ہے، کہ کام پیارا ہے، چام پیارا نہیں۔اگر کسی کی ذات مبغوض ہو تو چاہیئے کہ باوجود اعمال کے بھی وہ شخص مقبول نہ ہو۔حالانکہ حدیث میں ہے کہ جب بندہ توبہ کر لیتا ہے تو اگر اُسکے گناہ زمین بھر کر بھی ہوں۔وہ بھی معاف کر دیئے جاتے ہیں۔بس سمجھ لو کہ کفار پر جو وعیدیں ہیں۔وہ ان کی ذات پر نہیں، بلکہ اعمال پر ہیں۔اس لئے اگر وہ امور کسی مومن میں پائے جائیں تو وہ بھی مستحق وعید اور عنداللہ مبغوض ہوگا گو اس درجہ کا نہ ہو۔کیونکہ اقتران بالکفر

سے اُن اعمال میں زیادہ مبغوضیت آجاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مدار حُب و بغض کا اعمال پر ہے۔ البتہ مومن و کافر کے عمل معصیت میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک شخص نے سنکھیا کھایا اور تریاق نہیں کھایا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص مرے گا اور ایک شخص نے سنکھیا کھایا اور تریاق بھی کھا لیا۔ اثر سنکھیا کا اس صورت میں بھی ہوگا، مگر ضعیف۔ یہی حال مومن اور کافر کا ہے کہ مومن نے باوجود استعمال معصیت کے تریاق بھی کھا رکھا ہے۔ وہ کیا ہے؟ ایمان کہ اس نے اثر کو ضعیف کر دیا ہے۔ بخلاف کفار کے کہ تریاق ایمانی انہوں نے نہیں کھایا اس لیے پورا اثر ہوا۔ باقی زہر کھانے والے دونوں برابر ہیں۔ اس لیے دونوں کو زہر کے مفاسد سنائے جائیں گے۔

ایک مثال اس کی یہ ہے کہ دنیا میں جرائم کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو بادشاہ کے باغی ہیں اور جرائم بھی کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں کہ جرائم تو کرتے ہیں مگر باغی نہیں۔ یہ دوسرا فریق چونکہ مطیع ہے اس پر جرائم کی سزا محدود رہے گی۔ بخلاف اُس گروہ کے جو باوجود جرائم کرنے کے باغی بھی ہے۔ اس کی سزا محدود نہ ہوگی۔ اور پہلے فریق سے سزا میں وہ بڑھا ہوا ہوگا۔ وہ یہ کہ دائم الحبس کیا جاوے گا۔

ابدی سزا کا راز

یہی راز ہے کفار کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا کہ کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے اور مومن کو ہمیشگی نہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ مومن جرائم تو کرتا ہے مگر اس کے ساتھ باغی نہیں اور کافر جرائم بھی کرتا ہے اور باغی بھی ہے۔

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ خدا تعالےٰ کے یہاں کفار کو ابدی سزا ہونا خلاف عقل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تم بھی وہی کرتے ہو جو خدا تعالےٰ نے تجویز کیا ہے مگر حکام کے اختیار میں غیر محدود ہمیشگی نہیں اور اللہ تعالےٰ کے قبضہ میں غیر محدود ہمیشگی ہے۔ اگر دوام ابدی آپ کے قبضہ میں ہوتا تو آپ بھی ایسے مجرموں کے لیے دوام ابدی ہی تجویز کرتے۔ مگر کیا کریں مجرم کو بلا اختیار آپ کی موت آجاتی ہے۔ اس لیے آپ مجبور ہیں۔ اپنے قلوب کو

ٹٹول کر دیکھ لو، اگر دوام ابدی آپ کے قبضہ میں ہوتا تو کیا کرتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی دوامی سزا تجویز کرتے۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا اس لیے مجبور ہیں اور جتنا اُن کا بس چلتا ہے اس میں کسر نہیں چھوڑتے۔ جیسے بعض ملکوں کی خاصیت ہے کہ وہاں عمریں بڑی ہوتی ہیں تو وہاں اگر باغی کو دائم الحبس کیا گیا، تو وہ ہندوستان کے باغیوں سے زیادہ جیل خانہ میں محبوس رہے گا۔ مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ ہندوستان کے باغی تو بیس تیس برس ہی محبوس رہتے ہیں مگر دوسرے ملکوں کے باغیوں کو سو پچاس برس تک کیوں محبوس رکھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اعتراض کرے تو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ سزا تو دونوں کی ایک ہے یعنے حبس دائمی مگر اس کا کیا علاج کہ ایک ملک کے باغی قید میں جلدی مرجاتے ہیں اور دوسرے ملک کے دیر میں مرتے ہیں۔ اس لیے زمانہ حبس میں تفاوت ہو گیا۔

اسی طرح عالم آخرت کی خاصیت ہے کہ وہاں عمریں طویل ہوتی ہیں کسی کو وہاں موت نہیں آتی۔ اور باغی کی سزا دنیا میں بھی حبس دائمی ہے تو آخرت میں بھی اگر حبس دائمی ہے تو اسمیں خدا تعالیٰ پر کیا اعتراض ہے؟ خدا تعالےٰ نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ وہی کیا ہے جو تم کرتے ہو۔ مومن میں چونکہ ایمان ہے اس لئے اس کے اثر سے میعادی سزا ہو گئی۔ کیونکہ وہ باغی نہیں ہے۔ اور کافر چونکہ باغی ہے اور بغاوت کی سزا عقوبت دائمہ ہے اس لیے اُس کو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہو گا۔

طالب علمانہ اشکال کا جواب

یہاں ایک اور طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ آیت کفار کے بارہ میں ہے اور وعید جن اعمال پر وارد ہے ان میں بعضے فرعی بھی ہیں۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار مکلف بالفروع ہوں۔ حالانکہ فقہا و اصولین کے نزدیک کفار مکلف بالفروع نہیں۔ اسی لیے انہوں نے تصریح کی ہے کہ اگر کافر قبل اسلام لانے کے نماز پڑھے تو اس کی نماز نہ ہو گی کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں۔ اسی طرح بعد اسلام کے ان

نمازوں کی قضا واجب نہیں۔ اس سے کفار کا مکلف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا۔ وہ اس طرح کہ کفار کو جو عذاب ہوگا وہ اصل میں نفس کفر پہ ہوگا۔ بخلاف مسلمان کے کہ اس کو جو سزا ہوگی وہ ترک فروع پہ ہوگی۔ ہاں کافر کی سزا میں بوجہ ترک فروع کے اضافہ ہو جائے گا اور عقوبت بڑھ جائے گی۔ یہ نہیں کہ نفس ترک فروع پر سزا ہوگی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو باغی ہوں جو حکومت کی اطاعت نہیں کرتے مگر ان میں ایک تو وہ ہے کہ بغاوت بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ملک میں شورش بھی کرتا ہے۔ اور دوسرا باغی تو ہے مگر نافرمانی اس کی ذات ہی تک ہے۔ شورش نہیں کرتا ظاہر ہے کہ بغاوت پہ سزا دونوں کو ہوگی۔ مگر جو بغاوت کے ساتھ شورش بھی کرتا ہے اس کی سزا میں بہ نسبت شورش نہ کرنے والے کے اضافہ ہوگا۔ اس صورت میں اصل سزا تو بغاوت پر ہے مگر بوجہ شورش کے اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کافر تارک فروع کی مثال شورش کرنے والے باغی کی سی ہے کہ کفر تو کرتا ہی ہے لیکن باوجود کفر کے فروع کو بھی بجا نہیں لاتا۔ تو اس کو اصل سزا تو کفر پہ ہوگی مگر ترک فروع کی وجہ سے سزا میں زیادتی ہو جائے گی۔ اور اس کافر کی مثال جو بعض فروع کو ادا کرتا ہے جو مشروط بالایمان نہیں جیسے عدل و تواضع و سخاوت، اس باغی کی سی ہے جو شورش نہیں کرتا۔ اس کو اصل سزا کفر پہ ہوگی، ترک فروع سے اضافہ اور زیادتی نہ ہوگی۔ اب شبہ کفار کے مکلف ہونے کا جاتا رہا۔ اور مسلمان کی مثال اس مجرم کی سی ہے جو باغی نہیں۔ اس کو صرف ترک فروع پر سزا ہوگی۔ بغاوت کی سزا اس کو نہ ہوگی کیونکہ وہ باغی نہیں ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار گو فروع کے مکلف نہیں مگر پھر بھی ترک فروع پہ عتاب ہوگا گو تقویت ہی کے لیے سہی۔ تو مسلمان جو کہ فروع کے مکلف ہیں وہ آیت سے زیادہ مورد وعید ثابت ہوں گے کیوں کہ جب غیر مکلف بالفروع کو بھی ان فروع کے ترک سے ضرر ہوتا ہے تو جو ان فروع کا مکلف ہے اس کو ان کے ترک سے کیوں ضرر نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو ان معاصی کو اختیار کرے گا وہ مستحق وعید ہوگا خواہ کوئی ہو پس اگر وہ اعمال جو کفار میں پائے جاتے ہیں ہم میں بھی ہیں تو ہم بھی ضرور مستحق وعید

ہوں گے۔ گو وعید کفر کے مستحق نہ ہوں مگر وعید معاصی کے ضرور مستحق ہوں گے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو امور اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں اگرچہ سارے ہمارے اندر موجود نہ ہوں مگر بعض کا پایا جانا متحقق ہے گو کفار کے برابر نہ پائے جاتے ہوں۔ چنانچہ آیت کے جزو اول یعنے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا سے تو مسلمان بے شک بری ہیں۔ کیونکہ حق سبحانہٗ تعالٰے کی لقاء کا تو ہر مسلمان کو اعتقاد ہے۔ یہ جزو تو بحمد اللہ تعالٰے مسلمانوں میں ہے نہیں مگر دوسرا جزو یعنے رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا تو موجود ہے۔ گو کفار سے کم درجہ میں ہو مگر ہے ضرور۔ اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جس رضا بالدنیا پر وعید ہے شاید یہ مشروط بعدم رجاء اللقاء یعنی مشوط بالکفر ہو پھر مسلمان اس کا مورد نہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ذوق لسان کے بالکل خلاف ہے۔ ہر اہل لسان سن کر یہی سمجھے گا کہ ان اعمال کی بھی تقبیح مقصود ہے بلا شرط اقتران بالکفر کے۔

آگے ارشاد ہے وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا یہ رضوا بالحیٰوة الدنیا کی تفسیر ہے اور یہ عجیب پُرشفقت موقعہ ہے تفسیر کا کیونکہ رضا بحیات دنیا انسان کا امر طبعی ہے جو اختیار میں نہیں۔

اطمینان بالدنیا مذموم ہے

اگر مطلق رضا بحیات دنیا معصیت ہوتی تو کوئی فرد انسانی بھی اس سے نہ بچ سکتا۔ کیونکہ دنیا کی زندگی سے کون راضی نہیں۔ اس لیے ضرورت واقع ہوئی تفسیر کی۔ اگر تفسیر ساتھ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس آیت سے لوگوں کی کمر ٹوٹ جاتی۔ پس شفقت اسی میں ہے کہ ساتھ کے ساتھ تفسیر کر دی جائے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا اس قید کے بڑھانے سے معلوم ہوگیا کہ رضا بحیات دنیا معصیت ومذموم وہ ہے جس کے ساتھ اطمینان بھی ہو ورنہ معصیت نہیں کیونکہ یہ تو امر طبعی ہے چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تصریح ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ الخ

یعنی آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے قبیلے اور تمہارے وہ اموال جن کو تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور اس کے راستہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہوں الخ

یہاں وعید اس پر ہے کہ یہ چیزیں اللہ رسولؐ سے زیادہ محبوب ہوں۔ اور اگر یہ چیزیں کسی درجہ میں تو محبوب ہوں لیکن اللہ رسولؐ سے زیادہ محبوب نہ ہوں تو اُن پر وعید نہیں کیونکہ ان چیزوں کا محبوب ہونا امر طبعی ہے۔ معلوم ہوا کہ ان چیزوں کو پسند کرنا اور ان پر خوش ہونا اور مطلق رضا محل وعید نہیں۔ البتہ حیات دنیا پر مطمئن ہونا محل وعید ہے اگر اطمینان کی حالت ہو تو قابل علاج ہے ورنہ نہیں۔

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اطمینان کس کو کہتے ہیں کہ جس پر یہ وعید وارد ہے۔ اطمینان کے معنی ہیں سکون کے، جو مقابل ہے حرکت کا، مطلب یہ ہوگا کہ حیات دنیا پر اتنا قرار ہو گیا ہے کہ اس سے قلب و ذہن کو آگے حرکت ہی نہیں ہوتی۔ آگے خیال ہی نہیں چلتا جیسے کوئی چیز مرکز پر ٹھہر جاتی ہے کہ آگے نہیں بڑھتی اس پر وعید ہے۔ سو آج کل اکثر ہماری یہی حالت ہو رہی ہے کہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے۔ آگے قدم ہی نہیں بڑھاتا۔ ہم کو ساری فکر حیات دنیا ہی کی ہے۔ منہمکین فی الدنیا کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی تذکرہ کرتے ہیں تو دنیا ہی کا۔ حتیٰ کہ ریل میں ہوتے ہیں تب بھی دنیا ہی کا تذکرہ ہے یہی پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں اناج کا کیا حال ہے؟ بارش کیسی ہوئی؟ نرخ کیا ہے؟ غرض ہر مجلس میں دنیا ہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ ریل کا موقع تو بے فکری اور فرحت کا ہے مگر ان کو اس میں بھی دنیا ہی کی فکر ہے۔ اس سے آگے حرکت ہی نہیں ہوتی۔ دنیا ہی پر سکون و قرار ہو گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آخرت کی فکر نہیں۔ آگے ارشاد ہے۔ وَهُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُوْنَ - یہ ہے کہ باوجودیکہ ہماری نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر پھر غافل ہیں ان تینوں جملوں کا یہ حاصل تھا۔ جس سے اصل جرم یہ ثابت ہوا کہ ہم کو حیات دنیا پر اطمینان ہو گیا ہے یعنی حرکت الی الآخرت نہیں ہوتی۔

حرکۃ الی الآخرۃ کی اقسام

اب یہ سمجھئے کہ حرکت الی الآخرت جو کہ مقابل ہے سکون کا، تین قسم کی ہوتی ہے ایک حرکت اعتقادی، دوسری عملی، تیسری حالی۔ یعنی آخرت کی دھن میں ہر وقت بے چین رہنا اور اسی کی کاوش ہونا۔ کفار کو تو کسی قسم کی حرکت بھی نہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہی درست نہیں۔ مسلمانوں کو حرکت اعتقادی تو حاصل ہے مگر حرکت عملی اور حالی نہیں یعنی نہ اعمال آخرت کا اہتمام ہے نہ اُس کی دھن ہے۔ اس کی کاوش ہی نہیں۔ یہ مرض قریب قریب عام ہے اور عوام تو عوام خود ہم لکھے پڑھوں کی حالت یہ ہے کہ ہمارے قلوب آخرت کے لیے بے چین نہیں ہیں جیسے کسی پر کوئی مقدمہ دائر ہوتا ہے اور اس وقت طبیعت بے چین ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی قلب کو قرار نہیں ہوتا۔ ہر وقت اسی کی دھن اور اُسی کا فکر اور خیال ہوتا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں طاعون پھیلا ہوا تھا تو قلوب پر کیسی بے چینی طاری تھی کہ کسی وقت قرار ہی نہ تھا۔ اُسی کا دھیان اور اسی کی سوچ تھی۔ سو ہماری یہ حالت نہیں بلکہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ حالت موجودہ سے ترقی کی جاوے۔

مثلاً نماز ہی کو لیجئے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اسی پر قرار ہے۔ یہ نہیں کہ پانچ وقت کے علاوہ اور بھی کوئی نفل نماز پڑھیں۔ نہ یہ خیال ہے کہ جو نماز ہم پڑھ رہے ہیں وہ ٹھیک طور سے بھی پڑھتے ہیں کہ نہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی حرکت ہے جس کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔ بس ہم کو اپنی حالت پر اطمینان ہے اور سمجھتے ہیں کہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ حالانکہ حالت یہ ہونی چاہئے کہ باوجود سب کچھ کرنے کے پھر بھی ڈرتے رہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ______ !

اور جو لوگ دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔

یعنی باوجود عمل نیک کرنے کے پھر بھی ان کے قلوب خوف زدہ ہیں۔ دیکھئے کوئی حاکم بالا ہو۔ اور اس کا عملہ بڑی مستعدی سے کام کرتا ہو مگر پھر بھی لوگوں کو اس کے آنے کے وقت یہ ڈر سوار رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حاکم بالا ہم کو پاس نہ کرے جس وقت حاکم آتا ہے تو ان کے قلوب کو بے چینی لاحق رہتی ہے کہ دیکھئے انجام کیا ہو۔ اسی طرح مسلمانوں کے قلب کی حالت ہونی چاہئے کہ باوجود کام کرنے کے پھر بھی ڈر سوار ہے کہ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو کسی وقت چین نہ ہونا چاہیئے۔ اگر یہ حالت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

دیکھئے! حضرات انبیاء علیہم السلام جو کہ حال پر غالب ہوتے ہیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ ہر وقت سوچ میں رہتے تھے اور ہماری بے فکری کی تو یہ حالت ہے اور پھر ہم کو اپنے تقویٰ پر ناز ہے۔ ہم انبیاء علیہم السلام سے تو زیادہ نہیں۔ وہاں تو یہ حالت تھی کہ حق تعالےٰ کے خوف سے اُن کی روح فنا ہوتی تھی اور ہر وقت سوچ میں رہتے تھے۔ ہر مسلمان کی یہی حالت ہونا چاہیے کہ کسی وقت بھی چین نہ ہو۔ قرار نہ ہو یہ کیفیت ہو ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدستِ دگرے دادن وحیراں بودن

یہی ہر وقت کی فکر ترقی ہے قرب کی۔ اور خدا تعالےٰ کے اس قرب کی تو کوئی انتہا ہی نہیں کہ جس پر سکون و قرار ہو سکے وہاں تو یہ حالت ہے کہ جس قدر بھی ترقی کرو وہ کم ہے۔ یہ کیفیت ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہے است
ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

ہم زمینداروں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو دنیا کی ترقی سے چین نہیں۔ جس قدر زمین وغیرہ ان کے پاس ہے اس پر قناعت نہیں بلکہ یہی ہوس ہے کہ اور زمین ہو اور گاؤں ہو۔ پھر افسوس یہ ہے کہ لوگ صرف نماز کی ٹکریں مار کر کیسے بے فکر ہو گئے

دل بھر جاتا ہے۔ کیونکہ یا اس کے حسن کی انتہا ہے آگے کچھ نظر آتا ہی نہیں۔ مگر خدا سے تو جی بھرنا نہ چاہیئے کیونکہ ان کے حسن کی انتہا ہی نہیں۔ وہاں تو یہ حالت ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

اور یہ کیفیت ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمے گنجد

ان کا حسن تو کیا منتہی ہوتا ان کی حکایات کا بھی کہیں منتہیٰ نہیں۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا

اُن کی تو شان یہ ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

سیری کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ حسن منتہی ہو۔ دوسرے یہ کہ طلب نہ ہو۔ پہلی صورت تو سیری کی یہاں ہو نہیں سکتی کیونکہ حسن کی انتہا نہیں۔ ہاں یہ صورت البتہ ہے کہ ہماری طرف سے طلب نہیں ہے۔ اور مسلمان کے لیے یہ بڑی غفلت اور کمی کی بات ہے۔ اس واسطے ہم کو طلب پیدا کرنا چاہئے۔

صاحبو! دھن پیدا کرو اور یہ سمجھ لو کہ ہر چیز کے حاصل ہونے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ دھن پیدا ہونے کے بھی طریقے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ مراقبات کرو۔ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ ذکر کرو۔ ہم کو چاہیئے کہ شب و روز سوچا کریں۔ افسوس ہمیں کچھ سوچ نہیں ہے۔ اگر عادت سوچ کی ہو جاوے تو سب مرحلے طے ہو جاویں۔ ہم میں جو عمل کرنے والے ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ وقت نکال کر کثرت سے وظائف پڑھتے ہیں، نوافل پڑھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جیسا ان کے لیے وقت نکالا ہے آیا

سوچنے کے واسطے بھی کوئی وقت رکھا ہے جس میں آخرت کی باتوں کو سوچا کریں کہ مابعد الموت کیا پیش آنے والا ہے۔ قبر میں کیا ہوگا؟ میدان آخرت میں کیا کیفیت ہوگی؟ پلصراط پر کیا حالت ہوگی؟ حق تعالے کے روبرو جانا ہوگا؟ صاحبو! عذاب کو سوچو، ثواب کو سوچو۔

قرآن شریف میں فکر کے مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں۔ کہیں جنت کا ذکر ہے کہیں دوزخ کا حال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طبائع مختلف ہیں کسی کو عذاب کے سوچنے سے نفع ہوتا ہے کسی کو جنت کی نعمتوں کا خیال کرنا سودمند ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ موت کے سوچنے سے دل گھبراتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر موت کے سوچنے سے دل گھبراتا ہے تو حیات کو سوچو کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے۔

صاحبو! دنیا اور آخرت کی مثال روپیہ اور اشرفی کی سی ہے مثلاً ایک شخص اشرفی لے کر نکلا۔ دوسرا شخص راستہ میں ملا۔ اس کے پاس چمکدار روپیہ تھا۔ وہ اس سے کہنے لگا کہ اگر تم کہو تو یہ چمکدار روپیہ تم کو دے دوں اور اشرفی میں لے لوں۔ اشرفی والے کو اشرفی کا رنگ روپیہ کے سامنے اچھا معلوم نہ ہوتا تھا اور روپیہ وزن میں بھی زیادہ تھا۔ اس لیے بدلنا چاہا۔ اس حالت میں کسی نے اس سے کہا کہ میاں! دھوکا مت کھانا۔ روپیہ اگرچہ بہ نسبت اس کے چمکدار اور وزن میں زیادہ ہے مگر اشرفی اٹھارہ روپیہ کو بکتی ہے۔ اب اس نے سوچا کہ جب یہ صورت ہے تو میں روپیہ کو لے کر کیا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ شخص مبادلہ پہ کبھی راضی نہ ہوگا۔ یہ نتیجہ ہوا سوچنے کا۔

سوچنے کو علم حقیقت لازم ہے۔ جب آدمی سوچتا رہتا ہے تو حقیقت معلوم ہو ہی جاتی ہے۔ پس جب کوئی دنیا اور آخرت کو سوچے گا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کوئی چیز نہیں۔ روپیہ اور اشرفی کی بھی نسبت نہیں۔ یہ جو قرآن شریف میں ہے کہ

انہوں نے خلوت کا طریقہ عجیب اختیار کیا تھا۔ مجمع میں ہوتے، دروازہ کھلا رکھتے نفل پڑھتے رہتے۔ جب کوئی آتا سلام کے بعد بہت خوش اخلاق سے پیش آتے خیریت دریافت کرتے۔ ضروری باتیں کرکے پھر نیت باندھ لیتے۔ پھر سلام کے بعد ایک آدھ بات کر لیتے اور پھر نیت باندھ لیتے۔ یہ نہ تھا کہ ہماری طرح اُن کے پاس باتوں کا چرخہ چلتا ہی رہے۔ لوگ اُن کو رو کھا خیال کرکے خود ہی آمدورفت کم کر دیتے۔ اور کوئی ان کی شکایت بھی نہ کرتا کہ بڑے بد دماغ ہیں بولتے ہی نہیں کیونکہ وہ نماز میں رہتے تھے اور نماز میں کوئی بولتا ہی نہیں ہے۔ لوگ یہی خیال کر لیتے کہ چونکہ مولوی صاحب نماز میں اکثر رہتے ہیں۔ اس لیے زیادہ کلام نہیں کرتے مولوی صاحب تنہائی میں نہ بیٹھتے تھے کہ جس کی وجہ سے ممتاز معلوم ہوں مجھے یہ طرز ان کا بہت پسند آیا کہ ظاہراً تو خلوت نہ معلوم ہوتی تھی مگر حقیقت میں خلوت تھی۔

ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ رات کو بولتے دن کو نہیں بولتے۔ کیونکہ رات کو مجمع نہیں ہوتا کہ جس سے خرابیاں پیش آئیں۔ اور وہ بھی عشاء تک بولتے اور بعد عشاء کے گھر جاکر سو رہتے۔ اس میں بھی نہ بولنے میں ان کی شہرت نہیں ہوتی تھی۔ اور عشاء کے بعد ویسے بھی بلا ضرورت بات چیت کرنا خلاف سنت ہے مگر اب تو بعض لوگ بزرگوں کو عشاء کے بعد بھی دق کرتے ہیں اور اُن کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور وہ اخلاق کی وجہ سے کچھ کہتے نہیں حالانکہ اُن کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے، مگر لوگ بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں، آپ کو کیا حق ہے اُن کو مجبور کرنے کا اور وہ کس کس کی مرضی کے موافق کام کریں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسوں کو روک دینا چاہیئے گو بعض ناراض ہوں گے مگر اس کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔

مخلوق کے مقابلہ میں خالق کی رضا ضروری ہے

بس صرف اس کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ خدا و رسول ﷺ ناراض نہ ہوں چاہے ساری دنیا جاتی رہے۔ مخلوق کو کوئی راضی نہیں کر سکتا۔ اللہ میاں ہی احق ہیں کہ ان کو راضی رکھا جاوے واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ۔ اگر ان کو راضی رکھو گے تو وہ لوگوں کی گردنیں پکڑ کر راضی کر دیں گے۔ مگر نیت یہ نہ ہونی چاہیئے کہ حق تعالیٰ کو اس

تمہید و تعینِ مقصود و ضرورت

یہ ایک آیت ہے جس میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے دین کے ایک خاص کام میں سستی کرنے پر ملامت فرمائی ہے۔ مگر اس وقت اس خاص ہی کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس ملامت کی جو بنا اور علت بیان فرمائی ہے جس کا ذکر اَرَضِیْتُمْ سے شروع ہوتا ہے اس کا بیان کرنا مقصود ہے تاکہ اس کے عموم سے مضمون بھی عام ہو جائے۔ ہر عمل کی کوتاہی کو فرماتے ہیں "تم جو دین کے کام میں سستی کرتے ہو کیا حیاتِ دنیا پر راضی ہو گئے ہو؛ اور یہ سستی جو تم میں آگئی ہے تو کیا آخرت کی ضرورت اور خیال تم کو نہیں رہا؟" پھر فرماتے ہیں کہ "آخرت کے مقابلے میں حیاتِ دنیا کی متاع تو بالکل ہی قلیل ہے۔ کچھ بھی نہیں اور باوجود اس کے تم پھر دنیا پر راضی ہو"، یعنی اس سے اتنی محبت ہے کہ اس کو اپنی قرارگاہ سمجھتے ہو۔ اور اسی لیے اس دینی کام سے[1] گھبراتے ہو۔ سو یہ تو ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی حیات پر راضی ہو جائے۔

یہ ہے مضمون اس علت کا اور اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کا حاصل اس کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں پر ملامت کر رہے ہیں جنہوں نے دنیا پر قناعت کر لی ہے اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہیں مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں۔

---

[1] لانہ سبب الفراق عن الدنیا ظاھراً۔ ۱۲ منہ

مسلمانوں کا منکرانہ برتاؤ

مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے، یوں بسیں گے، بہو آئے گی، جائداد آئے گی یوں ہم ملازم ہوں گے۔ ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوئی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہوگی۔ اس میں باغات اور مکانات ہوں گے۔ یوں حوریں ہوں گی۔ غالباً کبھی بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے۔ تو دنیا کی جس قدر محبت ہے نہ آخرت کی وہ محبت نہ وہاں جانے کا اتنا شوق۔ اور اگر ہوتی تو جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں وہاں کی زندگی کے متعلق بھی تو ہوتے۔ اور جیسے دنیاوی امور میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں اور یہاں کی خوشیوں میں کھپے رہتے ہیں ایسا ہی امور آخرت کے متعلق بھی تو کچھ ہوتا۔ سو بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ دنیا کی خوشیاں مناتے ہیں اور آخرت کی امنگ کبھی خواب میں بھی نہیں آتی۔ اور بعض ایسے ہیں جن کے پاس دنیا میں خوشی کا کوئی سامان نہیں اور اس لئے وہ ہمیشہ غمزدہ رہتے ہیں اور ان کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ شاید میرے جواب میں یوں کہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو یہ سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی نہیں وارث نہیں، یہ زندگی کیسے کٹے گی۔ تو میں جواب میں کہوں گا کہ مجھ کو ان کی یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کی زندگی کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی۔ دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیوں کر سہی جائے گی، پھر جیسے یہاں کی تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مستقل اطمینان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کو بھی سوچا ہے۔ حالانکہ دنیا کے مصائب تو بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کی کوئی تدبیر ہی نہیں ہے اور اس لئے اس کو سوچنا عبث ہے۔ مگر پھر سوچتے ہو۔ اور آخرت کی تو کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں ہے جو لا علاج ہو بلکہ اس کی ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے مگر پھر بھی اس کا

نہ ذکر نہ فکر۔

درستی آخرت کی تدابیر کی ضرورت

اور اگر بعض ایسے لوگ ہوئے بھی کہ وہ کبھی علی السبیل التذکرہ آخرت کا ذکر کر دیتے ہوں اور اس لئے سمجھتے ہوں کہ ہم کو دین کی فکر ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔

دیکھو اگر کسی کے پاس آٹا بھی ہو اور توا بھی ہو، لکڑیاں بھی ہوں اور پکائے نہیں مگر ان سب سامانوں کا ذکر کرتا رہے اور سوچتا رہے تو اس ذکر سے اور اس سوچنے سے کیا ہوتا ہے تدبیر تو یہ ہے کہ ہمت کر کے اٹھے اور پکانا شروع کر دے اور جب بھوک لگے کھالے۔ تو آخرت کی فکر بھی یہی ہے کہ یوں سمجھتے کہ ہیں مرنے کا خدا کا سامنا ہوگا۔ یوں عذاب ہوگا۔ اور یہ سوچ کر عذاب سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے لئے تدابیر شروع کر دے شیطان نے بہت سے لوگوں کو بہکا رکھا ہے کہ گاہ گاہ ان کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دل میں ڈال دیتا ہے کہ تم کو دین کی بہت فکر ہے۔

صاحبو! اگر تمہارے پاس سامان نہ ہوتا تو اتنا ہی غنیمت تھا۔ لیکن جب خدا نے ارادہ دیا، ہمت دی، بھلے بُرے کی پہچان دی۔ پھر کیا وجہ کہ دنیا کے معاملات میں تو نری فکر پر بس نہیں کیا جاتا اور دین کے کام میں نری فکر کو کافی سمجھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ واقع میں آخرت کا خیال ہی نہیں ہے ——!!

دنیا سے زیادہ آخرت کا اہتمام ضروری ہے

بہر حال اگر کوئی دنیا کی خوشیاں مناتا ہے تو یہ شکایت ہے کہ آخرت کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں۔ اور اگر کوئی دنیا کے غم میں رہتا ہے تو اس کی یہ شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں۔ اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہے ہم تو گنہگار ہیں اور دنیا کی خوشی تو حاضر ہے اس کو کیسے نہ منائیں تو یہ شیطان کا دھوکا ہے۔ اس میں دو دعوے ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ یعنی اوّل بھی غلط کہ دنیا کی

خوشی حاضر ہے دوسرا بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ہے۔ پہلا تو اس لئے غلط کہ جو کہا جاتا ہے کہ یوں بیٹا ہوگا یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضہ میں کہاں ہے۔ ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ پھر اگر خوشی ہوتی بھی ہے تو تجربہ یہ ہے کہ تمنائیں ہمیشہ عدد میں حاصل سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یعنے حاصل ہوتا ہے کم اور تمنا ہوتی ہے زیادہ۔ تو جس کی تمنا جس قدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا۔

اللہ والے البتہ خوش رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے اولاد ہوئی اس پر خوش ہیں نہ ہوئی اس پر خوش ہیں۔ ہر حال میں راضی ہیں۔ اور دنیا داروں کو خوشی کہاں۔ واللہ! راحت جس چیز کا نام ہے اگر وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر اس کا جتنا سامان ہوگا زیادہ موجب تکلیف اور موجب حسرت ہوگا۔

لوگ روپے پیسے کو راحت سمجھتے ہیں حالانکہ راحت روپیہ پیسہ نہیں۔ ورنہ چاہیئے تھا کہ صندوق کو زیادہ لذت ہوتی۔ مگر یہ لوگ صندوق سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔ کیونکہ اس کو اور اک الم کا تو نہیں ہے۔ اور یہ لوگ تو آلام میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیا دار بہت ہی کم آرام میں ہیں۔ غرض دنیا میں کہیں خوشی نہیں ہے۔ اور دوسری بات کہ آخرت میں کونسی خوشی ہے اس لئے غلط ہے کہ وہ بعد وعدہ الٰہیہ بالکل تمہارے اختیار میں ہے۔

چنانچہ دنیا کی خوشی تو کبھی کبھی حاصل بھی نہیں ہوتی کہ ساری عمر چاہا ہوا ور نہ ہو۔ اور آخرت کی کوئی راحت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اختیاری نہ ہو۔ خدا کی یہ رحمت ہے کہ آخرت کی کتنی ہی بڑی سے بڑی تمنا ہو مگر وہ باستثنا منصوص مثلاً درجات نبوت وغیرہ مباشرت اسباب سے ضرور پوری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر چھوٹے درجے کا آدمی جیسے عاصی گنہگار بڑے درجہ میں جانا چاہے مثلاً حضرت جنیدؒ کے درجے میں تو جا سکتا ہے اس طرح سے کہ اپنے اعمال میں ترقی کرلے۔

تو بس وہاں تو خوشی ہی خوشی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے۔ تو اس کی فکر کرو اور اس کی امنگیں پیدا کرو اور اس کی تدبیر کرو یعنے معصیت کو چھوڑ دو اور نمازیں پڑھو۔ جو اب تک چھوٹ گئی ہیں اُن کی قضا کرو۔ زکوٰۃ دو۔ اس کے بعد سب خوشی تمہارے واسطے ہے اس کے بعد حق ہے کہ خوشی مناؤ۔

اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے کہ یہاں کی مصیبت تو حاضر ہے اس لیے اس کا اہتمام ہے۔ اور وہاں تو اللہ غفور الرحیم ہے پھر کیوں غم کریں۔ تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا دھوکا ہے۔ غفور الرحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے کہ خواہ تم کچھ ہی کرو میں تم کو جنت میں بلا عقوبت اول ہی بار داخل کر دوں گا۔ غرض نہ آخرت کی نعمت کو کوئی سوچتا ہے نہ وہاں کی مصیبت کو جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دنیا کو گھر بنا رکھا ہے۔

اے مسلمانو! تمہارا وطن آخرت ہے مگر تم نے اپنے لئے دنیا کو وطن بنا رکھا ہے اور اپنے لئے اور اپنے ہر عزیز کے لئے دنیا ہی دنیا چاہتے ہو۔ میری ایک خاندانی بزرگ بی بی نے مجھ کو ایک بار یہ دعا دی تھی کہ اللہ کرے اس کا بھی دنیا میں سا جھا ہو۔ کیسے گندے عنوان سے دعا کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تو دین ہی دین ہے خدا کرے دنیا میں بھی پھنسے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دنیا ہی بڑی چیز تھی۔ اس لئے یہ چاہا کہ ہمارے پیارے بھی اس میں پھنسیں۔ انا للہ........ الخ کیسے غضب کی بات ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ سارے غم اس سے ہیں کہ دنیا کو گھر بنا رکھا ہے۔ ورنہ اگر اس کو گھر نہ سمجھتے تو کوئی بھی غم نہ ہوتا۔

دنیا اور دار آخرت

دیکھو! جب کسی سفر میں جاتے ہیں اور کسی سرائے میں قیام ہوتا ہے تو وہاں کی چارپائی میں کیسے کھٹمل ہوتے ہیں۔ کبھی چارپائی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے۔ مگر سوچتے ہو کہ ایک شب تو قیام ہی کرنا ہے جس طرح ہو گذار دو۔ ایک شب کی تکلیف ہی کیا۔ پھر تو گھر پہنچ جائیں گے۔ غرض سرائے کی تکلیف اس لئے تکلیف نہیں معلوم ہوئی کہ اس کو گھر نہیں سمجھا۔ یہی حال دنیا کی تکلیفوں کا ہے۔ سو اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اس کے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا۔ ہر گز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا نہ اس کا اس قدر سلسلہ گھسیٹتے بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے۔ وہاں چین و آرام کریں گے۔ یہاں کی ذرا سی تکلیف کا کیا ہے حالانکہ ہم کو کبھی بھی یہ خیال نہیں ہوتا۔ خاص کر عورتیں کہ اگر کوئی غم ان پر آجائے تو وہ حالت ہوتی ہے کہ گویا کبھی خدا تعالیٰ کی کوئی نعمت ہی ان پر نہیں ہوئی۔ اور اس وقت ان کو بجز اس مصیبت

کی بادشاہت سے اس کو راحت پہنچے گی ہرگز نہیں۔

بس یہی حالت ہے دنیا کے غم اور دنیا کی خوشی کی کہ اگر خدا کے سامنے خوش گیا تو یہاں کے عمر بھر کے غم و رنج کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور اگر خدا کے سامنے غمزدہ گیا تو یہاں کی عمر بھر کی خوشی بھی خاک ہے۔ مگر اب لوگ اس خواب و خیال کو حقیقی غم اور خوشی سمجھتے ہیں جس کی وجہ بس وہی ہے کہ جس کا بیان کر رہا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ صحابہ کرام میں بس یہ بات نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان حضرات میں نہ تکبر تھا نہ شیخی تھی اور نہ وہ کسی مخلوق سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ہر وقت آخرت کے منتظر تھے۔ اور صحابہ کرام کی تو بڑی شان ہے اولیاء اللہ کی یہی حالت ہوتی ہے

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ پر جب فقر و فاقہ ہوتا اور بیوی کئی کئی وقت کے بعد بہت پریشان ہو کر شکایت کرتیں تو آپ فرماتے کہ اب عنقریب ہم کو جنت میں ملنے والا ہے وہاں ہمارے لئے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں۔ وہ بھی ایسی نیک بخت تھیں کہ فوراً ہی مان جاتیں۔ آج کل کی بیویاں نہ ہوئیں بعض تو اس وقت ایسی ہیں کہ عجب نہیں یوں کہتیں کہ بس وہ نعمتیں تم ہی بھو مجھے تو روپیاں لاؤ جس سے پیٹ بھرے۔ مگر ان بندی خدا کی یہ حالت تھی کہ ان کے پاس زیور تو کیا ہوتا۔ صرف ایک چاندی کا ہار تھا۔ اور وہ بھی اس لئے رکھا تھا کہ مولانا رکن الدین یعنی صاحبزادے کے نکاح میں اگر دو چار مہمان آ گئے تو ان کو ایک دو وقت کھانا کھلا دیں گے۔ مگر حضرت شیخ کو وہ بھی ناگوار تھا اور ہمیشہ اس کے جدا کرنے کا تقاضا فرماتے اور وہ یہ عذر کرتیں۔ تو دیکھئے یہ نہیں کہا کہ آخر کچھ تو میرے ناک کان میں ہونا چاہیئے۔ آخر عورت ہوں۔ سبحان اللہ! وہ حضرات کیسے قانع اور صابر تھے۔

تو ان حضرات کی یہ حالت صرف اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو ان کو غم بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ غم خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے۔ تو جو شخص کسی چیز کے بارے میں یہ امید رکھے کہ یہ ہم سے جدا نہ ہوگی اس کو اس چیز کے جدا ہونے کا غم ہوگا۔ ورنہ کوئی بھی غم نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں طبعی رنج دوسری بات ہے۔ میں پریشانی کے غم کی نفی کر رہا ہوں۔ یہ ہے

چاہیے اور کوئی گناہ صادر ہو چکا ہو تو مراقبہ کی تجدید کے ساتھ توبہ کر لیا کرو۔ اور توبہ کا متمم یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمے ہو اُس کو بہت جلدی ادا کر دو اس سے انشاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آخرت کا دائمی عیش ہو گا۔ اور آخرت کا شوق پیدا ہونے کی میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے "شوق وطن" اس کا مطالعہ بھی بہت مفید ہو گا

حاصل سب کا یہ ہوا کہ دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے اور اس کا علاج موت کی یاد ہے۔ اور اس کے توحش سے بچنے کے لیے خدا کی رحمت کو یاد کرنا علاج ہے۔ اور اُن کے موکد کرنے کے لیے "شوق وطن" کا مطالعہ ہے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ اپنے مرض کی اطلاع سب کو ہو گئی ہے اس کو بہت جلد زائل کریں۔ اور خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمت عطا فرمائیں۔

آمین! یارب العالمین

شوقِ لقا میں موت کی تمنا جائز ہے۔ اس لئے اہل اللہ موت کی تمنا کرتے ہیں مگر ہم کو اس کے نام سے بخار چڑھ جاتا ہے ہم موت کو اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتا دیکھ کر بھی اتنا خیال نہیں آتا کہ یہ منزل ہمارے بھی سامنے ہے بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اُسی کے واسطے تھی ——————!

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ ط وَلَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔۔۔۔۔!

(۵)

قرآن وحدیث کا کمال

یہ ایک مختصر سی آیت ہے اس میں حق تعالیٰ جل شانہٗ وعم نوالہٗ نے ہم کو ایک بڑے کام کی بات تعلیم فرمائی ہے جس سے ہماری تمام پریشانیوں کا علاج ہو جائے گا اور یہ مضمون بہت ظاہر ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اور یہ قرآن وحدیث کا کمال ہے کہ اس کی کوئی بات پیچیدہ نہیں۔ شریعت مقدسہ کی تعلیم بہت صاف تعلیم ہے۔ کیونکہ قرآن مجید ایسے لوگوں کے لیے نازل ہوا ہے جن میں مختلف فرقے اور مختلف حالات ہیں۔ اسلئے قرآن کے علوم بہت سہل ہیں۔ اور اس کی باتیں دل لگتی ہیں تاکہ سب کو فائدہ پہنچے۔ اس لئے اگر قرآن سے ایک عامی منتفع ہے تو ایک فلسفی بھی اس سے مستفید ہے۔ ہر شخص خواہ عامی ہو یا عالم اس سے مستفید ہونے میں یکساں ہے گو استفادہ کا درجہ مختلف ہو۔ ہر شخص کو اُس کے مرتبہ کے موافق اُس سے نفع ہوتا ہے۔ اس کی یہ شان ہے ؎

بہارِ عالم حسنش دل وجاں تازہ مے دارد
برنگ اصحابِ صورت را ببو ارباب معنی را

اس لئے بعض لوگوں نے قرآن شریف کو بارش سے تشبیہ دی ہے کہ ہر زمین کو اپنی استعداد کے موافق اس سے سیرابی وسرسبزی حاصل ہوتی ہے۔ اور جس طرح یہ صفت قرآن شریف کی ہے ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اور جو تعلیمات حدیث میں ہیں اُن کی بھی یہی شان ہے۔ کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے۔ اس لئے جو مضمون حدیث میں ہو اُس کا سمجھنا اور سمجھانا بھی بہت سہل ہے جیسے قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا سہل ہے۔ اور کیوں نہ ہو وہ ایسے متکلم کا کلام ہے جس کو ہر مشکل کا آسان کرنا سہل ہے پس قرآن

وحدیث کی تعلیم کا سہل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اور یہ سہولت تذکیر کے حصہ میں ہے اور استنباط کا حصہ صرف مجتہدین کے ساتھ خاص ہے۔ اسی لئے یسرنا میں للذکر اور لتبشر وتنذر کی قید ہے۔ اور بعض مضامین میں یستنبطونہ کی قید ہے۔ انہی سہل اور تذکیری مضامین میں سے یہ بھی ایک مضمون ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اگر اس میں تدبر کیا جائے تو اس سے ہماری بہت بڑی غلطی رفع ہوگی۔

عدم تدبّر کا نتیجہ

تدبر کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ شریعت کی تعلیم باوجود سہل ہونے کے ہم کو خفی اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ ہم اس میں تدبر سے کام نہیں لیتے۔ اور عدم تدبّر سے تو دنیوی حسی باتیں بھی خفی ہو جاتی ہیں علمی مضامین کا تو ذکر ہی کیا۔ مضامین علمیہ کا تعلق چونکہ بلاواسطہ عمل سے ہے وہاں تو بدون تدبر کے کام نہیں چل سکتا مگر محسوسات میں بھی باوجودیکہ اُن کا تعلق حس سے ہے تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بدون تدبر کے بعض دفعہ سخت غلطی ہو جاتی ہے۔ اسی مضمون کو دیکھ لیجئے کہ باوجود واضح ہونے کے عدم تدبر کی وجہ سے خفی ہو گیا۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "جو تمہارے پاس ہے وہ ختم اور فنا ہو جائے گا"۔ ایک جملہ تو یہ ہے۔ دوسرا جملہ اسی کی تتمیم وتکمیل کے لئے ہے کہ "جو خدا کے پاس ہے وہ پائیدار و باقی رہنے والا ہے"۔

ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کوئی پیچیدہ اور خفی مضمون ارشاد نہیں فرمایا بلکہ ایک واضح آسان و سرسری مضمون ہے۔ مگر عرفی اصطلاح کے موافق وہ سرسری نہیں کیونکہ واقع میں بڑا اعلیٰ مضمون ہے۔ مگر چونکہ ہم اس میں تدبر نہیں کرتے اس لئے سرسری سمجھا جاتا ہے۔ غرض ایک معنی کے لحاظ سے تو یہ سرسری بھی ہے یعنے سہل ہونے کی وجہ سے۔ مگر آج کل سرسری بات، معمولی اور بے وقعت بات کو کہا جاتا ہے۔

سو اس معنی کر قرآن کا کوئی مضمون بھی سرسری نہیں۔ ہر مضمون باوقعت اور اعلیٰ درجہ کا ہے۔ ہاں دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کو سرسری کہنا صحیح ہے کہ واضح اور صاف اور آسان مضمون ہے۔ مگر چونکہ ہم اس میں غور نہیں کرتے اس لئے ہم کو قرآن کی باتیں غیر واضح معلوم ہوتی ہیں۔ اور اُن سے ہم کو اجنبیت سی ہے۔ اور باوجودیکہ مضمون اعلیٰ درجہ کا ہے اور نہایت باوقعت ہے مگر آج کل اس کی زیادہ وقعت نہیں کی جاتی۔

کثرت سماع ومشاہدہ کا اثر

جس کی ایک وجہ کثرت سماع وکثرت مشاہدہ بھی ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس بات کو بار بار سنا جائے یا بار بار دیکھا جائے وہ طبعی امر ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کی زیادہ عظمت نہیں ہوتی۔ پھر اس بات کو اگر اہتمام کے ساتھ کوئی بیان کرے، تو تعجب ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نیا مضمون ہے۔ اس لئے انسان اس میں کسی قدر معذور بھی ہے مگر خدا نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور فطرت دی ہے اس لئے اگر دونوں کے مقتضا میں تزاحم ہو تو اس وقت اس کو شریعت کی تعلیم پر عمل کرنا چاہئے کیونکہ شریعت کی تعلیم میں دونوں کی رعایت ہے۔ مثلاً کسی چیز کے فوت ہونے سے رنج پہنچے تو عقل اس وقت رنج کرنے سے منع کرتی ہے۔ کیونکہ وہ یہ کہتی ہے کہ رنج کرنے سے وہ شے واپس نہیں آسکتی۔ اس لئے رنج فضول ہے اور طبیعت رنج کا تقاضا کرتی ہے۔ مگر طبیعت کا یہ اثر اور تقاضا ایک حکم غیر واقعی پر مبنی ہے کہ یہ چیز ہم سے جدا کیوں ہوئی۔ اس لئے ہے کہ تمہارے قبضہ میں تو خود اپنی ذات بھی نہیں۔ اگر تم کو اپنی ہی ذات پر قبضہ ہوتا تو کوئی شخص بھی بیمار یا مفلس نہ ہوا کرتا۔ مگر انسان کی ذات میں جو تصرفات وتغیرات رات دن ہوتے رہتے ہیں وہ اس کو بتلاتے ہیں کہ وہ خود مختار نہیں بلکہ دوسرے کے قبضہ میں ہے۔ تو جب یہ اپنی ذات میں بھی خود مختار نہیں تو دوسری چیزوں میں اس کو دخل در معقول کا کیا حق ہے۔ تو چونکہ یہ حکم عقل کے خلاف تھا اس لئے عقل نے اس کو رد کر دیا۔ شریعت کی خوبی دیکھئے کہ دونوں کی رعایت کی گئی کہ حزن بھی ہو مگر اس کو غالب نہ

قدر سامان جو وطن اصلی کے مناسب تھا۔ پس ہم کو جو فنائے دنیا سے غفلت ہے اس کا تو مضائقہ نہیں مگر اس کا حد سے بڑھ جانا یہ محل شکایت ہے۔

ہماری حالت ایسی ہے جیسے ایک چمار کی حکایت ہے کہ کسی نے اس کے ایک جوتا مارا تو وہ کہتا ہے اب کے تو مار۔ اُس نے پھر مارا تو پھر بھی کہا کہ اب کے تو مار۔ غرض وہ مارتا رہا اور یہ برابر یوں ہی کہتا رہا اب کے تو مار۔ اس طرح ہم بھی رات دن فنائے دنیا کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں مگر اپنی فنا سے غافل ہیں۔ گویا بزبانِ حال یوں کہتے ہیں کہ اب کے تو موت آئے۔ اب کے تو طاعون آئے۔

اے صاحبو! مشاہدہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ جب مشاہدہ سے بھی ہماری غفلت کا پردہ نہ اٹھا تو کب اٹھے گا۔ یہ غفلت تو ہماری زوالِ دنیا کے متعلق ہے جو مشاہدہ ہے۔

بقائے آخرت سے غفلت

رہا بقائے آخرت تو ہر چند کہ وہ مشاہد نہیں مگر اعتقادی مسئلہ ہے اور اعتقادیات کا دل میں مضبوطی کے ساتھ جما رہنا ضروری ہے۔ اور جو بات دل میں جمی ہوئی ہو اس سے اجنبیت نہ ہونا چاہئے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم مر گئے اور خدا کے سامنے جاؤ گے۔ قبر میں سوال جواب ہوگا۔ قیامت میں نامۂ اعمال سامنے ہوگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب دیکھ رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کا درجۂ حال میں دل میں جما ہوا ہونا چاہئے تھا وہ ایسی ہوگئی جیسے خواب ہو۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ ناصحین سے الجھتے ہیں اور بعضے تو بے دھڑک کہہ دیتے ہیں ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

اور جو اُن سے ذرا اچھے ہیں وہ ناصحین کی نصیحت کے جواب میں یوں کہہ دیتے ہیں کہ میاں اللہ غفور الرحیم ہے۔ آخرت کی فکر کہاں تک کریں۔ اللہ میاں

کو سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہمارے اعمال میں نورانیت حضورؐ کی برکت سے تھی۔ حضورؐ کے بعد وہ نورانیت نہیں رہی۔ گو ظاہر میں اعمال کا ذخیرہ بعد میں بھی بہت کچھ نظر آرہا ہے۔ مگر چونکہ نورانیت ویسی نہیں تو ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے سامنے ہزاروں ٹوکرے امرود و انار وغیرہ کے پیش کرے مگر ہوں سڑے ہوئے۔ تو کیا اس انبار کی محض اس لئے کہ ظاہر میں بڑا انبار تو ہے کچھ قدر ہوسکتی ہے۔ سلاطین دنیا تو سارے انبار کو ہمارے منہ پر دے ماریں گے۔ اس لئے حضرت عمرؓ کو اپنے ان اعمال کے متعلق خطرہ تھا اور فرماتے تھے کہ ثواب تو بہت دور ہے۔ میں اس پر ہی راضی ہوں کہ ان پر گرفت نہ ہو اور الٹے منہ پر نہ مارے جائیں۔

حضرت عمرؓ پر خوف کا غلبہ تھا اور حضرت ابوموسیٰؓ پر حالت رجاء غالب تھی جب حضرت عمرؓ کی طاعات کے باب میں یہ حالت تھی باوجودیکہ آج اُن کے برابر کوئی بھی نہیں ہوسکتا ہے تو پھر ان اللہ کے بندوں کو جو اللہ غفور الرحیم کہہ کر ناصحین کا منہ بند کرتے ہیں معاصی کے باب میں یہ خوف کیوں نہیں ہوتا کہ شاید ہماری پکڑ ہونے لگے۔ تو آخرت سے باوجودیکہ اعتقادی مسئلہ ہے ہم کو اس قدر غفلت ہے کہ خبر ہی نہیں۔

اسی طرح فنائے دنیا ظاہر ہے مگر کبھی بھولے کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن ہم بھی ختم ہوں گے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ آخرت کے لئے سامان سے بے پروائی ہے نہ رہن چھوڑنے کی فکر ہے نہ قرض ادا کرنے کا خیال ہے نہ موروثی زمین چھوڑنے کا قصد ہے۔ گویا اللہ میاں کے ذمہ ہے کہ ان کا قرض ادا کردیں گے۔ غرض ایک عالم لایعنی شغل میں مبتلا ہے۔ کوئی زیور کی دھن میں ہے۔ کوئی مکان بنانے میں منہمک ہے۔ یہ کسی کو یاد نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔

تو یہ ایسا مضمون ہے جو واقع میں ظاہر ہے مگر غفلت نے اس کو خفی بنا رکھا ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے جابجا ہم کو بار بار متنبہ فرمایا ہے جن میں سے ایک مقام یہ بھی ہے جس کو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

عورتوں کے دنیوی انہماک

بالخصوص عورتوں کے تو مرنے کھپنے کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کا ایک کپڑا تیار ہوگا۔ تو اس کے لیے بھی ایک کمیٹی منعقد ہوتی ہے کہ خالہ دیکھنا گوٹ اچھی بھی ہے یا نہیں۔ دیکھنا اس پر بیل لگاؤں یا لچکا لگاؤں کیا اچھا لگے گا۔ اور جو اُن سے کہا جائے کہ دنیا بھر کو ایک کپڑے کے واسطے جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے جو اپنے کو اچھا لگے پہن لو، تو یہ جواب دیں گی کہ واہ قاعدہ یہی ہے کہ کھائے اپنی پسند کا اور پہنے دوسرے کی پسند کا۔ مقولہ یہ بھی ہے کہ پیٹ کا کیا ہے چاہے ڈھیلے پتھروں سے بھر لو مگر کپڑا ہو عزت کا۔

صاحبو! یہ ساری مستیاں اور یہ سارے قاعدے اس واسطے ہیں کہ یہ یاد نہیں ہے کہ ایک دن ہم یہاں نہ ہوں گے۔ اسی لئے مجھے تو عورتوں کا تقریبات میں جانا بھی مضر معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر کپڑے بدل بدل کر جانا تو بہت ہی اوچھا پن ہے۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے کہ بچوں کو بھی بڑھیا قیمتی کپڑے پہنائے جاتے ہیں چاہے وہ ان میں ہگ ہی دیں۔ پھر لڑکیوں کو زیور سے ایسا لادا جاتا ہے کہ سر سے پیر تک زیور ہی زیور ہوتا ہے۔ پھر وہ ناسمجھ بچی ہے۔ تقریبات کے ہنگامے میں بعض دفعہ وہ زیور کو نکال کر موقع بے موقع ڈال دیتی ہیں پھر اس کی تلاش میں تکلیف الگ ہوتی ہے اور جی بُرے بھلے الگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ عورتوں میں بدگمانی کا بہت مادہ ہے فوراً کسی کا نام لے دیتی ہیں کہ یہ کام اس کا ہے۔ اس لیے باہر پھرنے والی بچی کو جو کہ ناسمجھ بھی ہو زیور پہنانا بڑی غلطی ہے۔ مگر عورتوں کو اس کا خبط ہے اور غضب یہ کہ بچیوں کو بھی اس کا شوق ہوتا ہے۔ اگر ان کے ناک کان نہ بندھوائے جائیں تو روتی ہیں اور ضد کر کے بندھواتی ہیں چاہے تکلیف ہی ہو مگر خوشی خوشی اس کلفت کو گوارا کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی اپنے مطلب کی عقل تو ہوتی ہے مگر اس کو خرچ کرتی ہیں دنیا میں، دین میں خرچ نہیں کرتیں۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ عملاً بھی کوتاہی ہے اور حالاً تو بہت ہی کوتاہی ہے کیونکہ جب عمل نہیں تو حال کہاں سے آئے۔ حال اُسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف ایسا خیال جم

وغیرہ نہ کرنا چاہئے۔

یہ اعرابی کے ساتھ معاملہ تھا حضورؐ کا۔ اور تعلیم یافتہ صحابہؓ کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ ایک بار دیوار مسجد پر کھنکار دیکھ کر غصہ سے آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔

غرض صحابہؓ لکھے پڑھے سب نہ تھے۔ بعض ان میں ایسے بھولے تھے جن کے واقعات آپ نے ابھی سنے۔ مگر ساری اُمت سے وہ افضل ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت غوث اعظمؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا اویس قرنی و عمر بن عبدالعزیز؟ فرمایا، حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار لگا ہوا وہ بھی اویس قرنی و عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ تو ان کے افضل ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حضورؐ کے نظر کردہ تھے۔

پس عمل کے ساتھ اگر اہل اللہ کی نظر بھی مل جائے تو پھر وہ حال اور قوی ہو جاتا ہے۔ اور جلدی کام بن جاتا ہے۔ مگر ٹھنڈے رہ کر حال حاصل کرنا چاہو، تو محال ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جیسے تم کسی آنے والے کے انتظار میں ہر وقت دروازہ پر نظر رکھتے ہو ویسے ہی آخرت کا دھیان ہر دم رہنا چاہئے تب حال کا درجہ حاصل ہوگا کہ زیور پہننے میں، کپڑا پہننے میں، کپڑا رنگنے میں، کھانے پینے میں، غرض ہر کام میں آخرت ہی کا دھیان رہے گا کہ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ ہم یہاں نہ ہوں گے اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ایک صحابی کو کہ اے عبداللہ! شام کو صبح کا خیال نہ کرو۔ اور صبح کو شام کا خیال نہ باندھو اور اپنے کو میت شمار کرو اور سچ یہ ہے کہ بدون حال کے محض عمل قابل اطمینان نہیں عمل بلا حال کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کو مزدور دھکیل کر لے جائیں۔ اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن ریل گاڑی کو لے جائے۔ اسی لئے عراقی فرماتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے عمل مع الحال اور رسم پارسائی سے زہد خشک یعنی عمل بلا حال مراد ہے کہ اس سے کامیابی دیر میں ہوتی ہے اور غیر راسخ ہوتی ہے۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبار گی گور غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

یہ دارا و سکندر وہ تھے جو کبھی تمام دنیا پر حکومت کرتے تھے۔ آج اُن میں اتنی بھی قوت نہیں کہ اپنی قبر پر پیشاب کرنے والے کو ہٹا دیں۔ اسی مضمون کا ایک اور قطعہ بھی ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پُر غرور تھا

یہ اشعار محض ترقیق قلب کے لیے پڑھ دیئے ہیں کیونکہ نظم سے رقت زیادہ ہوتی ہے اور وہ محفوظ بھی رہتی ہے ورنہ ہمارے لئے اصل چیز تو کلام اللہ و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ پس ہر رات کو اتنا سوچ لیا کرو کہ ایک دن ہم کو جانا ہے، موت آنے والی ہے۔ جب ہمیشہ اتنا نفس کو تنگ کرو گے تب نفس اعتدال پر آجائے گا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ضروری تعلقات کو ترک کر دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے جی نہ لگاؤ۔ اس کا یہ اثر ہوگا کہ گو یہ چیزیں نفس سے چھوٹیں گی نہیں مگر ان کی ہوس نہ رہے گی اور یہی ہوس ہے جس کا علاج ضروری ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کا علاج بہت اہتمام سے کیا ہے۔ حدیث کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طولِ امل اور حرص و ہوس سے کس قدر رد کا ہے اور اس کے ازالہ کی کس قدر تدابیر تبلائی ہیں۔

اب دعا کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہماری غفلت و حرص کو دور فرمائیں اور آخرت کی رغبت اور دنیا سے زہد و بے رغبتی عطا فرمائیں، اور ان مرحوم کی مغفرت فرمائیں

الباقی

فکرِ آخرت کے متعلق یہ وعظ تھانہ بھون میں مولانا سعید احمد صاحب کے انتقال پر عورتوں کی تسلی اور صبر کے لئے یکم رجب ۱۳۳۱ھ کو ہوا جس پر دو گھنٹے اور پانچ منٹ لگے۔ یہ وعظ حضرتؒ نے اپنے مکان پر بیٹھ کر فرمایا جسے مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہی نے قلمبند فرمایا۔

***

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد واٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ما عندکم ینفد وما عند اللہ باقٍ ولنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔

طرف کہ دنیا میں غافل ہو کر نہ رہنا مگر ہم لوگوں کی غفلت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اس پر بھی تنبیہ نہیں

ارباب بصیرت کی ہنسی

جن لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں وہ ان سب چیزوں کو ہیچ سمجھتے ہیں بلکہ اپنے کو بھی انھوں نے ایسا مٹا دیا ہے کہ زندہ نہیں سمجھتے مردہ شمار کرتے ہیں۔ اسی واسطے ایک بزرگ اپنے بچوں کو کہا کرتے تھے، افسوس! یہ یتیم ہو گئے ہیں۔ ہمارے خیالات ہمارے مکانات دیکھ کر اہل نظر ہنستے ہیں اور ان مکانات کی خرابی ان کو بننے سے پہلے نظر آ رہی ہے۔

جیسے چند لونڈیاں جمع ہو کر ریت جمع کر کے کھیلنے کے لئے گھر بناویں۔ پھر ایک اس کو توڑ دیتی ہے۔ دوسری اس سے لڑتی ہے کہ تو نے ہمارا گھر توڑ دیا۔ ہم کو ان لونڈیوں پر ہنسی آتی ہے اور کہتے ہیں یہ بھی کوئی مکان ہے جس کے توڑنے سے لڑائی ہوئی۔ اسی طرح اللہ والے ہمارے پختہ پختہ مکانات اور ان مکانات پر ہمارے لڑائی جھگڑے دیکھ کر ہنستے ہیں اور ان کی خرابیوں کو لڑکیوں کے ریت کے گھر کی طرح مشاہدہ کرتے ہیں، چنانچہ آپ خود دیکھ لیں کہ بڑے بڑے مکانات اُجڑے پڑے ہیں۔ ان کے رہنے والوں کے دماغوں میں کیا کیا تمنائیں ہوں گی اور کیسی کیسی تمنائیں ہوں گی مگر وہ سب آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

جیسے شیخ چلی کی حکایت ہے کہ کہیں جا رہے تھے کسی شخص نے کہا کہ یہ گھڑا تیل کا اٹھا لو۔ تجھ کو ایک پیسہ ملے گا شیخ چلی نے وہ گھڑا اٹھایا۔ اب چلتے چلتے آپ دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ ایک پیسہ جو یہ ملے گا اس کا ایک بیضہ خریدوں گا، پھر اس کو بیچوں گا اور ان پیسوں کے اور انڈے خریدوں گا۔ اسی طرح جب بہت سے پیسے ہو جائیں گے تو ان کی مرغی خریدوں گا۔ جب مرغیاں بہت ہو جائیں گی تو بکریاں خریدوں گا اور بکریوں سے گائیں خریدوں گا اور گائیں سے بھینسیں، گھوڑے، ہاتھی خریدوں گا۔ پھر بڑا عالیشان مکان بنواؤں گا اور ایک وزیرزادی سے نکاح کروں گا۔ بچے ہوں گے۔ وہ بچے کہیں گے ابا! ابا! ہم کو پیسے دے دو۔ میں ان کو دھمکا کر کہوں

ولن یؤخر اللہ نفسًا اذا جاء اجلھا

"اور اللہ تعالیٰ کسی جان کو مہلت نہیں دیں گے جب اس کی میعاد آجائیگی۔"

یعنی خواہ وہ نبی ہو یا ولی ہو جب میعاد ختم ہو جاوے گی، مہلت نہ ملے گی۔ اس وقت تمنا کرے گا کہ اگر میرے پاس دنیا کے تمام خزانے ہوں تو وہ دے کر بھی ایک دن مجھ کو مل جاوے تو میں دے کر لے لوں لیکن ممکن نہ ہو گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام سے زیادہ کون ہے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرا رہے تھے کہ پیغام موت آگیا۔ عرض کیا کہ اے اللہ مجھ کو اس قدر مہلت مل جاوے کہ مسجد بنوالوں۔ بعد میں یہ نا تمام ہی رہ جائے گی۔ حکم ہوا کہ مہلت تو نہیں مل سکتی باقی مسجد بن جاوے گی۔ تم اپنی لاٹھی پر سہارا لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ لاٹھی پر سہارا لگا کر کھڑے ہو گئے اور روح قبض ہو گئی اور اسی طرح کھڑے رہے۔ جنوں نے یہ سمجھا کہ حضرت کھڑے ہیں۔ برابر کام مسجد کا ہوتا رہا حتیٰ کہ مسجد پوری ہو گئی۔ برس روز میں اس لاٹھی کو کیڑے نے کھا لیا تو گر پڑے۔ اس وقت حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ برس روز سے مردہ کھڑے تھے۔

دیکھئے سلیمان علیہ السلام نبی اور کام مسجد کا بنوانا اس کے لئے بھی مہلت نہ ہوئی تو اگر یہی انتظار کرتے رہو گے کہ جب کام سے فارغ ہوں گے اس وقت متوجہ الی اللہ ہوں گے تو یاد رکھو ایسا وقت ہرگز ہرگز نہ ملے گا۔ اس کا طریقہ تو یہی ہے کہ اس کو درمیان میں سے قطع کر دیا جاوے۔ ہم کو تو وہ دن دور نظر آتا ہے اور واقع میں بہت قریب ہے۔ دیکھو باپ دادا کہاں گئے اور بعض جگہ بیٹے پوتے بھی سامنے ہی چل دیتے ہیں اور اگر ہمارے مرنے کے بعد ہی اولاد ہماری مرے تب بھی لاحاصل ہے۔ اس لئے کہ جب خود مرے تو ہماری تمناؤں پر مرنے کے ساتھ ہی پانی پھر گیا۔ لوگ اولاد کی تمنا اس لئے کرتے ہیں کہ نام ہو۔ نام کی حقیقت یہ ہے کہ باپ دادے تک تو سب کو یاد رہتا ہے کہ یہ شخص فلاں کا بیٹا فلاں کا پوتا ہے اور آگے پردادا اگر دادا کا نام پوچھو تو خود اولاد کو بھی معلوم نہیں۔ یہ دنیا کچھ نہیں سب خیالات اور امنگیں ہیں اور درحقیقت کوئی شے نہیں۔ ایک تذکرہ میں مردوں کی لڑائی لکھی ہے۔ مردوں میں لڑائی کبھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نخاز سونگھایا کسی نے عطر اس کے دماغ کو لگایا۔ وہ اور زیادہ بے ہوش ہو گیا۔ یہی تدبیریں کر رہے تھے کہ اس کا بھائی آ گیا۔ اس نے جو دیکھا تو سب کو منع کیا کہ ان تدبیروں سے ہوش میں نہ آوے گا۔ میں اس کا علاج کروں گا۔ کہیں سے ایک ٹھیکرے میں گوہ لایا اور اس کی ناک کو لگایا۔ فوراً ہوش آ گیا۔ اسی طرح گوہ کھاتے کھاتے ان دنیا داروں کی حالت ہو گئی۔ پھر یہ باتیں خوشبو کی ان کو کہاں پسند آویں۔

دنیا کی محبّت کی حقیقت

دنیا کی محبت کی گندگی ایسی بری شے ہے کہ دنیا داروں میں رہ کر دیندار بھی بگڑ جاتے ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جہاں یہ عورتیں جمع ہوں ان کی باتیں مت سنو ورنہ دو صورتیں ہیں۔ اگر تم نے ان پر نفرت ظاہر کی تو خواہ مخواہ تو تو میں میں ہو گی اور اگر سنتے رہے اور سکوت کرتے رہے تو ان دیندار صاحب کا بھی مزاج بگڑ جاویگا اور ویسا ہی دماغ ہو جاویگا۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک عطر فروش کی لڑکی چمڑہ فروشوں کے یہاں بیاہی گئی تھی۔ وہ بے چاری عطر خانہ سے نکلی تھی۔ چمڑہ کی بُو کی اس کو کب سہار تھی اس لیے خاموش ایک جگہ اپنے کو گھونٹ کر بیٹھی رہا کرتی۔ رہتے رہتے اس بدبو کی سہار بھی ہونے لگی۔ ساس نے ایک روز کہا کہ یہ بہو بھی کسی کام کی نہیں ہر وقت بیٹھی ہی رہتی ہے تو بہو کیا کہتی ہے کہ میں ایسے کام کی ہوں کہ جب سے میں آئی ہوں تمھارے گھر کی بدبو تک جاتی رہی۔

تو بات کیا تھی کہ بدبو نہ گئی تھی بلکہ اس کو عادت پڑ گئی تھی۔ اسی طرح گندوں میں اچھے آدمی کا مزاج بھی گندہ ہو جاتا ہے۔ اس لیئے اے بیبیو! اس گندگی سے نکلو۔ دوسری طرف آؤ تو تم کو عادت پڑے گی خوشبو کی۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ ہم گندگی میں تھے اور اس وقت تم کو اس خوشبو کا احساس نہیں ہے۔ اگر خوشبو کا احساس ہوتا تو یہ شکایتیں اور حکایتیں اور ارمان اور حسرتیں نہ ہوتیں۔ اگر کوئی کہے کہ زبان کو ہم نے روک لیا لیکن دل میں ہمارے یہ باتیں آتی ہی ہیں ہم اس کو کس طرح خالی کریں۔ بات یہ ہے کہ یہ باتیں دل میں جب ہی تک آویں گی جب تک دل میں کوئی اور شے نہیں ہے۔ لو تم جب

تک خالی ہے اس میں ہوا بھری رہے گی۔ اگر تم اس کو ہوا سے خالی کرنا چاہو تو اس کی ترکیب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اس میں پانی بھر دو۔ ایک قطرہ پانی ڈالوگے تو اتنی ہی ہوا نکل جاوے گی حتیٰ کہ اگر بھر دوگے تو ہوا بالکل نکل جاوے گی۔ تم بھی دل کو اللہ کے ماء الحیات سے بھر دو تو یہ چیزیں تمھارے پاس بھی نہ پھٹکیں گی۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب تمھارے دل میں یہ حسرتیں اور ارمان آویں تو فوراً یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ بڑے رحیم و کریم ہیں جب انھوں نے میرے لئے یہ تجویز کیا ہے تو بس اسی میں خیر ہے۔ دیکھو! حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے کو مار ڈالا۔ ماں باپ کے لئے یہ رحمت ہوئی۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں مرنے والا اگر زندہ ہوتا تو یوں ترقی ہوتی۔ لوگوں کو اس سے فیض ہوتا۔ یہ سب سرتیں ہیں۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ فیض ہی ہوتا۔ خدا جانے آگے چل کر وہ کیسا ہوتا۔ پچاس پچاس برس کی عمر کے لوگ ہم دیکھتے ہیں کہ بددین ہوجاتے ہیں طریق حق پر رہ کر موت آجانا بڑی نعمت ہے۔

حُبّ اللہ کی ضرورت

بعض لوگ یہ مضامین سُن کر کہہ دیتے ہیں کہ بس جی پھر تو کسی شے کی بھی محبت نہ ہونا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شے کی محبت نہ ہونا چاہیے۔ میں یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سب چیزوں کی محبت پر غالب رہنی چاہیے اسی واسطے احب الیکم من اللہ (زیادہ پیاری ہیں تم کو اللہ تعالیٰ سے) فرمایا ہے۔ محبوب نہیں فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہونا چاہیے اور یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کی محبت نہ ہو جس کا ایک پیسہ کھویا جاوے اس کو رنج تو ہوگا اور اس سے یہ معلوم ہوگا کہ محبت اس پیسہ کی تھی لیکن وہ محبت اس لئے دب گئی کہ جس نے کھویا ہے وہ اس سے زیادہ محبوب ہے اس لئے کچھ پروا نہیں کی۔

دیکھو جب آفتاب نکلتا ہے تو ستارے معدوم نہیں ہوتے بلکہ رہتے ہیں مگر نور آفتاب کا ایسا غالب ہوتا ہے کہ کچھ احساس نہیں ہوتا اسی طرح جب آفتاب عشق الٰہی طلوع

ہوتا ہے تو اس کے سامنے سب محبتیں مثل ستاروں کے کالعدم ہو جاتی ہیں لیکن واقع میں ہر محبت کا وجود ہوتا ہے بلکہ اللہ والوں کو تم سے بھی زیادہ محبت ان چیزوں سے ہوتی ہے مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور زیادہ ہوتی ہے چنانچہ اگر کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو ان کو زیادہ بے چینی ہوتی ہے۔ اس کی تکلیف سے کڑھتے ہیں اس لئے کہ یہ حضرات رحیم القلب اور رقیق القلب[1] زیادہ ہوتے ہیں اس لئے کسی کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حسنین علیہما السلام بچے تھے، آ گئے۔ حضورؐ نے خطبہ کو قطع فرمایا اور ان کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضورؐ کو اس قدر محبت تھی کہ کسی کو بھی اپنے اہل کے ساتھ اس قدر نہیں لیکن فرماتی ہیں: "فاذا نودی قام کانہ لا یعرفنا۔" یعنی حضورؐ ہمارے ساتھ مشغول رہتے تھے جب اذان ہوتی تھی تو اس طرح سے اٹھ جاتے تھے کہ گویا ہم کو پہچانتے بھی نہیں۔"

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے بھی قابل محبت کے نہیں ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے الیاعیب ان سب چیزوں کا بیان فرمایا کہ جو ظاہر الاشتراک اور بدیہی ہے یعنی جو چیز تمہارے پاس ہے وہ فنا ہونے والی ہے جب فنا ہونے والی ہے تو اس قابل نہیں ہے کہ اس سے جی لگایا جاوے۔

اس جزو کے متعلق قصد بیان کرنے کا نہ تھا اس لئے کہ کل ہو چکا تھا لیکن متبعاً بیان ہو گیا۔ اب مجھ کو مقصود بالبیان اس آیت کا جزو ثانی ہے اس لئے اس کو بیان کرتا ہوں

باقی رہنے والی چیز

فرماتے ہیں: "وما عند اللہ باق" یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ باقی رہنے والی ہے۔ پہلا جز یعنی "وما عندکم ینفد" جو چیز تمہارے پاس ہے وہ فنا ہونے والی ہے، تو ہم کو کھلم کھلا نظر آتا ہے کہ کل فلاں مرا تھا آج فلاں۔ اس کے لئے تو ضرورت اس کی نہیں کہ ایمان والا ہی اس کو سمجھے۔ مومن، کافر، مشرک سب کھلی آنکھوں فنا اور تغیرات

---

[1] رحیم دل اور نرم۔

کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ باقی اس دوسرے جزو کے مضمون کا یقین اس شخص کو ... ہوگا اور کلامِ الٰہی کو سچا سمجھے گا۔ وہ یقین کرے گا کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والی ہیں لیکن اس جملہ خبریہ سے غرض اخبار نہیں کہ پہلے جملہ سے بھی یہ مقصود نہیں بلکہ غایت اس کی دوسری شے ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماعند اللہ (جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے) سے جی لگاؤ۔ اس سے ایک کلیہ مستنبط ہوا۔ وہ یہ ہے کہ جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ قابلِ دل لگانے کے ہے اور یہ اہلِ دنیا کا بھی مسلمہ ہے کہ دل لگنے کا منبع وہ بقا کو مانتے ہوتے ہیں۔

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھیے۔ مثلاً دو مکان ہمارے پاس ہیں ایک تو عاریت کا ہے اور ایک ہم کو ہبۃً ملا ہے کہ ہم کو اس کا مالک بنا دیا گیا ہے مگر دونوں مکانوں کو اندر جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ خراب خستہ پڑے ہیں۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی ہیں، کڑیاں گری ہوئی ہیں۔ دونوں مرمّت طلب ہیں۔ اب ایک ہزار روپیہ مرمّت کے لئے تجویز کیا لیکن اب کلام اس میں ہے کہ یہ ایک ہزار روپیہ کس میں لگانا چاہیے۔ عاریت کے مکان میں یا موہوب میں۔ ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ جو اپنا مکان ہے اس میں لگانا چاہیے اس لیے کہ وہ ہمارے پاس باقی رہنے والا ہے اور مستعار تو قبضہ سے نکلنے والا ہے اس میں روپیہ لگانا ضائع کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ کوشش و سعی کا کرنا اور مال کا خرچ کرنا اسی شے کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جو شے باقی رہنے والی ہے اور اپنے پاس رہنے والی ہے اگرچہ وہ بقا محض خیالی ہی کے درجہ میں ہو۔ اور جو شے اپنے پاس باقی رہنے والی نہ ہو بلکہ جلدی قبضہ سے نکل جانے والی ہو اس میں اگر کوئی اپنی ہمت و سعی خرچ کرے تو اس کو بے وقوف کہا جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص سرائے میں ایک شب کے لئے ٹھہرا اور ہزار روپیہ کما کر لایا تھا کہ بیوی بچوں کو لا کر دیں گے۔ اتفاق سے جو کوٹھری سرائے میں اس کو ملی وہ خراب سی تھی۔ اس نے اسی وقت معماروں کو بلا کر وہ ہزار روپیہ اس کوٹھری کی مرمّت میں خرچ کر ڈالے اور بیوی بچے منتظر ہیں کہ میاں باہر سے کمائی لا دیں گے۔ میاں صاحب نے یہ حرکت

کی۔ اب اس شخص کو بے وقوف کہوگے یا عقلمند۔ ظاہر ہے کہ بے وقوف ہے۔ تو یہ بیوقوف کیوں ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ جلدی قبضہ سے نکل جانے والی شے میں اس نے اپنا سارا سرمایہ غارت کیا۔

عُمر کا بے بہا ذخیرہ

اسی طرح تم کو بھی ایک ذخیرہ و سرمایہ عمر کا حق تعالیٰ کے یہاں سے ملا تھا کہ اس کا ایک ایک منٹ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے اور دلیل قیمتی ہونے کی یہ ہے کہ اگر کسی کا دم نکلنے لگے اور اس سے کوئی یہ کہے کہ ہم فی گھنٹا دس لاکھ روپیہ لیں گے اور اتنی مہلت تم کو دی جاتی ہے۔ اگر اس کے پاس روپیہ ہوگا تو ہرگز دریغ نہ کریگا بلکہ اس سے زیادہ بھی دریغ نہ ہوگی سلطنت دینے سے بھی انکار نہ ہوگا۔

چنانچہ ایک بزرگ تھے۔ ان کو کسی بادشاہ کو نصیحت کرنا منظور تھا اس لئے انھوں نے اس بادشاہ سے کہا کہ کیوں جی! اگر تم جنگل میں ہو اور رفیقوں سے بچھڑ جاؤ اور پیاس تم کو لگے اور کہیں پانی اس جنگل میں نہ ملے حتیٰ کہ پیاس کے مارے مرنے لگو اور اس وقت کوئی شخص ایک کٹورہ پانی کا تمھارے سامنے لائے اور یہ کہے کہ آدھی سلطنت دو تو میں یہ کٹورہ پانی کا تم کو دُوں۔ تم اس وقت کیا کروگے؟ بادشاہ نے کہا۔ میں فوراً دے دُوں گا۔

پھر کہا کہ اگر خدانخواستہ تمھارا پیشاب بند ہوجائے اور تمام اطباء اور حکماء علاج سے عاجز ہوجائیں اور کوئی تدبیر نہ ہو اور کوئی شخص یہ کہے کہ اگر نصف سلطنت مجھ کو دیدو تو تمھارا پیشاب ابھی کھل جاتا ہے۔ تم دیدوگے؟ کہا کہ بیشک دیدونگا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ بس دیکھ لو، آپ کی سلطنت کا یہ نرخ ہے۔ یعنی ایک پیالہ پانی اور ایک تپا لہ موت۔

معلوم ہوا کہ عمر ہفت اقلیم کی سلطنت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ پھر دیکھو تو اس بے بہا سرمایہ کو تم کو کہاں خرچ کیا۔ سرائے کی کوٹھڑی میں! کوٹھڑی تو اس واسطے تھی کہ سرائے میں ایک دو رات اس میں بسر ہوجاتے۔ تم نے سارا سرمایہ ہی اس میں خرچ کر ڈالا۔ اب جب گھر پہنچوگے تو خالی ہاتھ جاؤگے اس لئے کہ سرمایہ تو اس کوٹھڑی میں اڑا دیا جس دن قیامت

کے دن بازار لگے گا وہاں حسرت ہوگی۔

ع که بازار چندانکه آگنده تر — تهیدست را دل پراگنده تر

"یعنی بازار جس قدر مال و متاع سے بھرا ہوگا اسی قدر تنگ دست کا دل زیادہ پراگندہ ہوگا"۔

اور حسرت پر حسرت بڑھانے کے لئے کافر سے یہ کہا جاویگا کہ اس کو جنت دکھلائی جائیگی اور کہا جاویگا کہ اگر تو مومن ہوتا تو تجھ کو یہ گھر ملتا۔ اس سے اس کو اور زیادہ افسوس و حسرت ہوگی۔ افسوس اب نظر نہیں آتا۔ اس وقت تو سرائے کی کوٹھڑی میں سرمایہ لگا رہے ہیں بلکہ دنیا تو سرائے کی کوٹھڑی سے بھی زیادہ ناپائیدار ہے اس لئے کہ مسافر کو وہاں ایک رات رہنے کی تو امید ہے اور دنیا میں تو اتنی بھی نہیں۔ ہر وقت انسان موت کے سامنے ہے ؎

شاید ہمیں نفس نفسِ واپسیں بود

"یعنی شاید یہی سانس آخری سانس ہو"۔

لہٰذا یہاں تو ایک سانس کی بھی امید رکھنا فضول ہے اس لئے کہ رات کو سوتے ہیں ممکن ہے کہ زلزلہ آوے مکان گر پڑے۔ کوئی سانپ ہی کاٹ لیوے۔ غلطی سے کوئی دوا مہلک کھا جاوے کہیں اوپر سے ہی گر پڑے اور یہ عوارض تو خیر کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ اگرچہ فی نفسہٖ کثیر الوقوع ہیں لیکن یہ حضرتِ انسان تو دو وقت معرضِ موت میں ہے اس لئے کہ کھانا جو دو وقت کھاتا ہے یہ موت کا پورا سامان ہے۔ اس لئے کہ گلے میں دو سوراخ ہیں۔ ایک سے سانس آتا ہے اور دوسرے سے کھانا جاتا ہے۔ دیکھئے ہر فعلِ اختیاری کا اول تصور ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے۔ آپ ہی بتلائیے کہ داہنے سوراخ سے جاتا ہے یا بائیں سے ؟ کسی کو خبر بھی نہیں پس معلوم ہوا کہ نگلنا تو اختیاری ہے مگر خاص سوراخ سے نگلنا یہ اختیاری نہیں جب اختیاری نہیں تو دوسری جانب اگر چلا جاوے تو تمہارے پاس اس کا کیا انسداد ہے۔ تو تم دو وقت ایسا کام کرتے ہو کہ اگر اس میں غلطی ہو جاوے تو موت سے ادھر کوئی منزل ہی نہیں سو کھانا نگلنا ہی کس قدر خطرناک امر ہے۔ اگر کوئی شخص وہمی ہوا اور یہ امر اس کو پیشِ نظر ہو کہ اگر سانس والے سوراخ میں لقمہ چلا گیا تو جان پر آ بنے گی تو کھانا کھانا

اس کو دشوار ہو جائے گا چنانچہ گاہ گاہ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو واقعی جان پر بن آتی ہے بلکہ بعض واقعات تو ایسے ہوئے ہیں کہ جان ہی نکل گئی ہے۔ پھر اگر خیریت سے نکل بھی گئے تو یہ بھی ایک سخت خطرناک بات ہے گو ہم کو یہ خطرناک اس لئے معلوم نہیں ہوتا کہ ہم عادی ہو گئے ہیں۔ فی نفسہٖ یہ امر بھی بہت خطرناک ہے اس لئے کہ جو شے نگل جاتی ہے وہ آپ کی ہم جنس نہیں۔ ممکن ہے کہ معدہ میں جا کر ہضم نہ ہو پھر اس کے نکالنے کی فکر ہو اور اتفاق سے نہ نکلے اور سُدّا پیدا ہو جاوے یا مثانہ میں یا آلاتِ بول میں کوئی شے رہ جاوے۔ کیسے دونوں وقت اپنے ہاتھوں مرنے کا سامان کرتے ہو یا نہیں۔ مقدّر سے بچ جاتے ہیں ورنہ ہم تو کسر نہیں کرتے، اتنے اسباب کے ہوتے ہوئے اگر نظرِ غور سے دیکھا جاوے تو مرنا تعجب کی بات نہیں بلکہ زندہ رہنا حیرت کی بات ہے۔

دُنیا اور دُنیا دار کی مثال

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو ایک مثال کے ضمن میں بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں: مالی وللدنیا انما مثلی مثل راکب استظل شجرۃ۔

"یعنی مجھ کو دنیا سے کیا علاقہ ہے۔ میری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار رستہ پر جا رہا ہو اور کسی درخت کے سایہ میں سستانے کیلئے ٹھہر جاتے اور سستا کر اپنی راہ لے۔"

اور اس جی لگانے والے کی مثال ایسی ہے کہ اس نے کہا کہ بڑھئی کو بلاؤ اس کو درست کرائیں گے چنانچہ بڑھئی آیا اور اس ڈالے کی درستی میں تمام روپیہ خرچ کر ڈالا۔ دنیا میں رہنا اور مرنا ایسا ہی ہے جیسے راستہ کے درخت پر مرنا اور رہنا۔ ایک بزرگ دنیا کی مثال میں فرماتے ہیں:

درر عقبیٰ است دنیا چوں پلے — بے بقا جائے و ویراں منزلے

"یعنی راہ عقبیٰ میں دنیا کی مثال پل جیسی ہے۔ ایک فانی جگہ اور ایک ویران منزل ہے۔ پل پر آدمی ٹھہرتا بھی نہیں مگر جو مثال حضورؐ نے بیان فرمائی ہے اس میں تمام آئند کی رعایت ہے۔ اس لئے کہ درخت کے نیچے پہنچنے سے کچھ راحت ملتی ہے بخلاف پل کے۔ اسی طرح دنیا ہے کہ آخر کچھ راحت ملتی ہے اور نیز درخت ہے بھی ایسی شے کہ دہ تج

چلتے چلتے اس کی سرسبزی اور تازگی و شادابی کو دیکھ کر اپنا بہت سا وقت اس کے دیکھنے میں صرف کر دیتا ہے۔ اسی طرح دنیا تر و تازہ نظر آتی ہے بخلاف پل کے کہ اس میں یہ رعائتیں نہیں۔ غرض راستہ کا درخت کہو یا پل کہو، دنیا جی لگانے کے قابل نہیں۔ مدار و مبنیٰ دل بستگی کا بقا ہے اور بقا ماعند اللہ (اللہ تعالیٰ کے پاس والی چیز) کے لئے ثابت ہے۔ اس لئے ماعند اللہ میں جی لگانا چاہیئے۔

آخرت کی نعمتیں

اور نعیم آخرتیہ کو ماعند اللہ سے تعبیر کرنے میں چند نکتے ہیں۔

اوّل تو یہ ہے کہ جو شئے اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگی اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا بخلاف دنیا کی نعمتوں کے کہ ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت جاتی رہے بخلاف اس شئے کے کہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ وہ سرکاری حفاظت میں ہے۔ اس حیثیت سے بھی قابل طلب کے آخرت کی نعمت ہوئی۔

دوسرے یہ نکتہ ہے کہ جب وہ نعمتیں اللہ کے پاس ہیں تو بغیر حق تعالیٰ کی خوشنودی کے وہ مل نہیں سکتیں اور بغیر نیک عمل کے خوشنودی نہیں ہوتی تو وہ بغیر عمل صالح کے نہ ملیں گی جیسے خزانہ پر شاہی پہرہ ہو۔ تو اگر کوئی شاہی خزانہ میں کچھ لینا چاہے تو بادشاہ کی خوشامد کرے اور اس کو راضی کرے۔ وہ ایک پروانہ خزانچی کے نام لکھ دیگا تو خزانہ مل جاویگا ورنہ کوئی صورت اس کے ملنے کی نہیں۔

تیسرے یہ کہ ماعند اللہ کا مصداق دنیا کی نعمتیں نہیں ہیں اگرچہ یہ بھی حقیقۃً اللہ ہی کی ملک ہیں لیکن چونکہ مجازاً اور عارضیتاً ہمارا بھی ان کے ساتھ تعلق ہے اس لئے یہ ماعندکم (اور جو چیز تمہارے پاس ہے) میں جو کہ اس کا مقابل ہے داخل ہیں اور ماعند اللہ میں صرف آخرت کی نعمتیں آئیں۔

پس حاصل ہوا کہ آخرت کی نعمتیں قابل طلب کے ہیں۔ ان کے حاصل کرنے کی تدبیر کرو اور یقینی بات ہے کہ جس شخص کو آخرت مطلوب ہوگی تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ اپنے

لئے بھی اور اپنے عزیز کے لئے بھی اللہ کے پاس رہنا زیادہ پسند کریگا بہ نسبت یہاں رہنے کے۔
اس کی ایسی مثال ہے کہ دو شخص سفر میں ہیں اور سفر کی مشقتیں اور متاعب برداشت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو بادشاہِ وقت نے بلا بھیجا کہ تمہارے سفر کی میعاد ختم ہو گئی ہے۔ اب تم ہمارے پاس راحت کے لئے آجاؤ۔ دوسرے شخص کو ظاہر ہے کہ اس کے جانے سے خوشی ہونا چاہیے کہ اچھا ہوا، اگرچہ جدائی کا رنج بھی ہوگا مگر عقلاً وہ اس کو خلافِ مصلحت نہ سمجھے گا بلکہ سمجھے گا کہ اچھا ہوا اپنے ٹھکانے جا پہنچا اور خود بھی متمنی ہوگا کہ وہ کونسا دن ہوگا کہ میرے سفر کی مدت بھی ختم ہوگی اور میں بھی بادشاہ کی خدمت میں جا پہنچونگا چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جناب حافظ صاحب شہید کے بارہ میں مثنوی تحفۃ العشاق میں ایک شعر لکھا ہے ؎

جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر — مثلِ تلچھٹ رہ گیا میں خاک پر

یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے مرنے کی تمنا تو کیا ہوتی دوسرے کی موت پر حسرتیں اور ارمان اور خلافِ مصلحت ہونے کے خیالات ہوتے ہیں اور تمنا موت کی بھی کس منہ سے کریں۔ تمنا تو وہ کرے جس کے پاس نیک عمل ہوں۔ یہاں پر ایک شبہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تمنا کرتے ہیں تو گویا ان کو اپنے نیک اعمال پر بھروسہ ہوتا ہے۔

نیک عمل کی خاصیت

اپنے اعمال پر بھروسہ کسی کو بھی نہ چاہیے۔ ہرگز نہیں۔ ان کو بھروسہ کبھی نہیں ہوتا۔ ایک اور بات ہے کہ ہر شے میں حق تعالیٰ نے ایک خاصیت رکھی ہے۔ نیک عمل میں یہ خاصیت ہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی احتمال ہو کہ وہاں اپنے بُرے اعمال کی سزا ملے گی لیکن پھر بھی دنیا کے عیش سے آخرت کے عذاب کو وہ ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے کہ ہر مسلمان مرکر اپنے رب سے ملتا ہے۔ تو اس ملنے کی وہ مسرت ہے کہ وہ عذاب کو کچھ نہیں سمجھتا اور اس مسرت کی اُمید میں اس کا دل [illegible] میں نہیں لگتا اور : الدنیا سجن المومن "دنیا مومن کے لئے جیل ہے"[۱]

۱ [illegible]

کے یہی معنی ہیں اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں ان حضرات کو تکلیف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ جی نہیں لگتا جیسے جیل خانہ میں جی نہیں لگا کرتا اور اپنا گھر اگرچہ جھونپڑا ہو وہاں ہی جی لگتا ہے اور یہ جی نہ لگنے کا اثر نیک عمل سے پیدا ہوتا ہے جس قدر نیک عمل ہوں گے اسی قدر آخرت کا شوق اور دنیا سے دل اُچاٹ ہو گا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں یہ کیفیت کھلی نظر آتی تھی چنانچہ ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت کی خدمت میں ایک بوڑھا آیا کہ حضرت میری بیوی بیمار ہے اور مررہی ہے، دعائے صحت فرمائیے۔ حضرت نے تعجب سے فرمایا کہ دیکھو کیسا کم فہم ہے کہ ایک مسلمان جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور یہ اس پر افسوس کرتا ہے۔ بڑے میاں! ایک روز تم بھی چھوٹ جاؤ گے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ بڈھا بیچارا بیوی کو اچھی کرانے آیا تھا۔ حضرت نے خود اس کے مرنے کی خوشخبری سُنا دی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مومن جب نیک عمل کریگا اس کا دل خدا تعالیٰ سے ملنے کو ضرور چاہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً دو تحصیلدار ہیں۔ ایک تو ان میں سے رشوت لیتا ہے ظلم کرتا ہے، کچہری سے غیر حاضر بھی رہتا ہے اور علاوہ اس کے دیگر جرائم کا مرتکب ہے۔ اور دوسرا نیک چلن ہے نہ کسی پر ظلم کرتا ہے نہ رشوت لیتا ہے اور بہت ہوشیاری سے اپنا کام کرتا ہے۔ حاکم اعلیٰ نے دونوں کو معائنہ کے لئے بلایا۔ یہ خبر سُن کر اس رشوت خور ظالم کے تو چھکے چھوٹ جائیں گے اور یہ تمنا کرے گا کہ کسی طرح یہ معائنہ کی تاریخ اور مؤخر ہو جائے اور دوسرا خوش ہو گا کہ اچھا ہوا کہ وہ وقت آپہنچا کہ حاکم کی خوشنودی کا پروانہ مجھ کو ملے۔ گو اس کی سطوت سے خوف بھی ہو۔

ابن القیم نے ایک حدیث لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ موت نہ آنا چاہیے مگر اس حالت میں کہ تیرا گمان حق تعالیٰ کے ساتھ نیک ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ نیک عمل کرو کیونکہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان ہو جاتا ہے، یہ عمل صالحہ ہے، طریقہ حب ما عند اللہ (یعنی اُن چیزوں کی محبت کا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں) اس سے آخرت میں رہنا تم کو اپنا بھی اور اپنے عزیزوں کا بھی زیادہ پسند ہو گا۔

یہی مضمون ہے کہ ہم نے تو اس کو بڑی کوشش سے ثابت کیا ہے اور ایک اعرابی نے دو شعروں میں ادا کر دیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضورؐ کے عم بزرگوار کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو رنج تھا۔ ایک اعرابی آیا اور اس نے حضرت ابن عباسؓ کو دو شعروں سے تسلّی دی۔ وہ یہ ہیں ؎

اصبر نکن بک صابرین فانما　　　صبر الرعیۃ بعد صبر الراس

خیر من العباس اجرک بعدہ　　　واللہ خیر منک للعباس

مطلب یہ ہے کہ آپ صبر کیجیے، ہم آپ کی وجہ سے صابر بنیں گے اس لئے کہ رئیس کے صبر کے بعد رعیّت کا صبر ہوتا ہے۔ بڑوں کو چاہیے کہ چھوٹوں کے سامنے تذکرہ بھی نہ کریں۔ آج کل بڑوں کی یہ حالت ہے کہ وہ چھوٹوں سے پیش قدمی کرتے ہیں۔ آگے وہ اعرابی کہتا ہے کہ تم عباسؓ کی وفات پر کیوں رنجیدہ ہوتے ہو۔ تم کو تو عباسؓ سے بہتر شے یعنی ثواب مل گیا ہے اور اگر اس پر رنج ہے کہ عباسؓ مجھ سے جدا ہو گئے ہیں تو عباسؓ کو تم سے بہتر یعنی اللہ تعالیٰ مل گئے ہیں جو تم سے اچھے ہیں۔ خوش رہو کہ وہ بہت اچھی جگہ پہنچ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو اس سے بڑھ کر کسی نے تسلّی نہیں دی۔ یہ اس وقت کے گنواروں کی حالت تھی۔ اصل یہ ہے کہ جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلّق ہے اُن کی یہی حالت ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ہمشیرہ حج کو گئی تھیں۔ بہت دنوں سے خیریّت معلوم نہ ہوئی۔ طبیعت پریشان تھی۔ مراقب ہوئے، دیکھا کہ ایک بڑا دفتر آیا اور اس میں جدولیں اور خانے بنے ہوئے ہیں۔ ایک خانہ ہے العامل۔ دوسرا خانہ ہے العمل۔ تیسرا خانہ الجزا اور اس میں ہزاروں نام لکھے ہیں۔ تلاش کرتے کرتے ان کی ہمشیر کا نام طاہر العمل کے خانہ میں لکھا ہے۔ الحج اور جزا کے خانہ میں فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر (اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھے ٹھکانے میں ہے) سمجھتے کہ حج کے بعد انتقال ہو گیا اور خدا تعالیٰ کے یہاں یہ رتبہ ملا کہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں جگہ ملی۔ بس خوش ہو گئے اور اطمینان ہو گیا۔ بعد میں ان کی حیات معلوم ہوئی لیکن مقصود میرا

ہی ہو جیسا کہ ایک مسافر کا قیام منزل پر۔ لیکن جو ارشاد آپ نے اپنی نسبت فرمایا ہے اس میں تو اتنے قیام کا بھی ایہام نہیں۔ وہ ارشاد یہ ہے کہ:

"میرا دنیا سے کیا علاقہ! میری تو دنیا کے ساتھ ایسی مثال ہے جیسے کوئی سوار چلا جا رہا ہو اور چلتے چلتے کسی درخت کے سایہ میں کھڑا ہو جائے"۔

اور یہ بھی درحقیقت تفسیر اسی ارشاد کی ہے تاکہ اس تفسیر سے ہر قسم کے شبہات زائل ہو جاویں اور خلاف مقصود کا ایہام بھی نہ رہے یعنی یہ نہ سمجھنا کہ ہم شب کو مقیم ہیں یا صبح ہم کو جانا ہے۔ جیسے کہ مسافر خیال کرتا ہے کہ صبح کو جانا ہے بلکہ یہ سمجھو کہ ہم چل رہے ہیں۔

انسان ہر وقت سفر میں ہے

ہم ہر دم مسافرت میں ہیں۔ ہر وقت مسافت سفر کو قطع کر رہے ہیں۔ اب اگر کسی ظاہر بین کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو کہیں بھی کسی کو ہر وقت چلتا ہوا نہیں دیکھتے بلکہ بعض اوقات تو ہم حرکت تک بھی نہیں پاتے۔ چہ جائیکہ قطع مسافت بلکہ حرکت کی ضد سکون موجود ہوتا ہے ایسے موقع پر قطعِ مسافت متحقق ہونا محال عقلی ہے۔ اس وجہ سے کہ اجتماع ضدین محال ہے۔ سکون اور حرکت کا اجتماع ناممکن ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک قطع مسافت کے واسطے حرکت لازمی ہے لیکن جناب آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ حرکت نہیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے کہ حرکت کی دو قسمیں ہیں ایک حرکت مکانی اور ایک حرکت زمانی۔ تو یہاں پر حرکت مکانی اور انتقال اَینی تو بے شک نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہراً ہم دیکھتے ہیں کہ آخرت میں پہنچنے کے واسطے اللہ پاک نے کوئی زینہ نہیں بنایا جس پر چڑھ کر ہم آخرت میں چلے جاویں۔ نہ کوئی سیڑھی ہے جس کو لگا کر آسمان پر پہنچ جاویں۔ نہ کوئی میل دو میل کی مسافت ہے جس کو پیادہ یا سواری میں طے کر کے اللہ میاں کے ہاں پہنچ جاویں جیسے ہم ریل یا تانگہ میں بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن اس حرکتِ مکانی کے نہ ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ حرکتِ زمانی بھی نہیں بلکہ یہاں پر حرکت زمانی متحقق ہے۔ یعنی اگرچہ ہم ساکن محض ہیں لیکن زمانہ حرکت کر رہا ہے

اشیاء کہ وہ رکھنے سے محفوظ و مصئون ہوتی ہیں، یہ غلطی کی اور اسی بھولے پن اور لاعلمی کے عالم میں رہ کر انھوں نے اپنے ہاتھ سے برف کھو دی۔ ایسے ہی برف کی طرح ہماری عمریں ہیں کہ ان میں برابر انحطاط کا عالم ہے۔

ہر ساعت اِنسان کی عُمر گھٹتی ہے

ہر ساعت ہر لحظہ ہماری عمر کا ایک بیش بہا قیمتی حصہ برف کی طرح پگھلتا ہے اور ہم ان دیہاتیوں کی طرح غافل ہیں اور نہیں سمجھتے۔ آخر کار ہمارا انجام بھی وہی ہونے والا ہے جو ان کا ہوا تھا جس طرح انھوں نے اپنے ہاتھوں سے برف کو کھویا تھا اسی طرح ہم بھی اپنی عمر کو کھو رہے ہیں کسی دن ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو جاویں گے اور یہ گران قیمت عمر تمام ہو جائے گی۔ اس وقت بجز کفِ افسوس ملنے کے اور کوئی چارۂ کار نہ ہو گا۔

یہی غفلت و لاپروائی بنا ہے تمام دنیا کی لذات و اہلِ دنیا کی دلچسپیوں کی اور یہی ہے وہ مارِ آستین جو نیچے نیچے ہماری جڑ کھوکھلی کر رہا ہے اور اس عزیز سفر کی منزل کو کھوٹا کرا رہا ہے۔ کاش! ہم لوگوں کی آنکھوں سے یہ غفلت کے پردے اٹھیں اور ہم ہوش میں آکر اس تپ دق کی چارہ جوئی کریں اور اس لاعلاج مرض کی دوا کی فکر کریں۔ وہی دوا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے مریضوں کے واسطے اس کا علاج تجویز کیا ہے وہ یہی کہ ہر وقت اپنے کو ایک راہبر و مسافر تصوّر کریں اور دنیا کو اپنی منزل مقصود کی شاہراہ خیال کریں۔ اس وظیفہ کا ہر وقت ہر ساعت استحضار رکھیں۔ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس مراقبہ میں رہیں۔ اپنی حیاتِ دنیویہ کو ایک مسافر کی حالتِ سفری سے زائد خیال کریں جس طرح ایک مسافر اپنے سفر میں وہی کام کرتا ہے جو اس کے سفر کے معین ہوتے ہیں منزلِ مقصود پر جلد سے جلد پہنچانے والے ہوتے ہیں اور جو چیزیں اس کے سفر کو کھوٹا بنانے والی اور مخل مقصود ہوتی ہو ان کو ہرگز اختیار نہیں کرتا۔ آپ نے کہیں نہ دیکھا ہو گا کہ ایک مسافر جو اپنے منزلِ مقصود پر جلد سے جلد پہنچنے کا قصد رکھتا ہے وہ راستہ میں کہیں کھیل تماشہ میں مصروف ہو یا کسی دلچسپ چیز سے دل بہلانے کا خیال کرے

مگر اس ماجرے کو دیکھ کر اب ذرا اُن کی طبیعت میں وحشت سی ہونے لگی۔ چلتے چلتے اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچے۔ اب تو سخت حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کہیں سچ مچ یہ ہمارا گھر تو نہیں۔ کبھی خیال آتا کہ ہو نہ ہو یہ تو ہمارا ہی گھر ہے۔ کبھی دل میں سوچتے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ پھر کہتے نہیں، یہ تو بیداری ہے۔ یہ دیکھو! میرے ہاتھ پیر حرکت کر رہے ہیں۔ میں چل رہا ہوں۔ غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ اتنے میں آپ کے بھتیجے نماز فجر کے لئے مکان سے نمودار ہوئے۔ چچا کو دیکھ کر سلام کیا اور پوچھا کیا ہوا۔ بھتیجے میں کوئی شک نہ تھا۔ فرمانے لگے، لاحول ولا قوۃ! لعنت ہے ہم پر اور ہماری عقل پر۔ ساری رات تو جنگل میں ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ بارش میں بھیگے۔ میلوں کی مسافت طے کی مگر جہاں سے چلے تھے وہیں کے وہیں موجود۔ آگے ایک فرلانگ بھی نہیں بڑھے۔

جیسے تیلی کا بیل اپنے ایک ہی مرکز پر دن بھر چلتا رہتا ہے اور اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ میں نے ایک طویل مسافت میلوں کی قطع کر لی، مگر درحقیقت وہ جس جگہ سے چلا تھا وہیں موجود ہے جس مرکز پر اوّل پھیرے میں گھومتا ہوا نظر آتا تھا، اسی مرکز پر اس وقت تک سرگرداں ہے۔

ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ ان کا گھوڑا بڑا ہی مٹّی تھا اور بڑے درجے کا شریر تھا۔ منجملہ دیگر شرارتوں کے اس میں ایک شرارت یا مرض یہ بھی تھا کہ جب لید کرتا تھا تو جب تک لوٹ کر اس کو سونگھ نہ لیتا کبھی آگے نہ بڑھتا۔ وہ بے چارا راکب بھی اس کی شرارت سے عاجز آگیا تھا۔ مگر مجبور تھا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا تھا۔ اسی مصیبت میں اس بے چارا کو ایک سفر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجبوراً اسی ٹٹّو پر سوار ہو کر چلا۔ اس نے اپنی وہی ہٹ شروع کی اور جہاں لید کی پیچھے مڑ کر سونگھا اور آگے چل دیا۔ اتّفاق سے راستہ میں ایک اور شخص بھی سفر کر رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کا یہ ڈھنگ دیکھا اور سخت متعجّب ہوا۔ پوچھا، میاں! یہ گھوڑا عجیب نرالی صفت کا ہے۔ ایسا تو نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ اُس نے کہا، میاں! کیا بتاؤں! اس کم بخت گھوڑے نے

مجھ کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اس میں ایک مرض یہ ہے جس سے میں عاجز آگیا ہوں۔ پھر اس کو مفصل کیفیت سنائی۔ اُس نے کہا، دیکھو اس کا علاج میں کیا اچھا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے کر لیا اور جب وہ لید کر کے سونگھنے کا قصد کرتا تو یہ پیچھے سے ایک چابک رسید کرتا اور اس کو مُنھ تک نہ موڑنے دیتا۔ یا اے خدا خدا کر کے ایک بہت سا حصّہ راستہ کا پُر امن عجلت کے ساتھ گزر گیا۔

آگے چل کر اس دوسرے مسافر کو کسی دوسرے راستہ پر جانا تھا۔ وہ ایک موقع پر اس سے جدا ہُوا اور کہا کہ لو بھائی! جس قدر میرے امکان میں تھا میں نے تم کو اس مصیبت سے بچایا۔ اب تم جانو اور تمھارا گھوڑا۔ میں تو اب رخصت ہوتا ہوں۔ اس بے چارے نے بہت کچھ شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کو رخصت کیا۔

اُس کے جاتے ہی گھوڑے نے گردن موڑ کر دیکھا جب خوب اطمینان کر لیا کہ اب وہ سوار میرے پیچھے نہیں ہے اور چلا گیا ہے۔ اب کسی قسم کا خطرہ نہیں رہا تو وہیں سے رُک کر لوٹا اور جہاں جہاں لید کی تھی اور سونگھا نہ تھا، سب کو لوٹ کر باری باری سونگھا۔ سوار نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے مگر کم بخت باز نہ آیا اور اس کی ساری منزل کو کھوٹا کیا۔

یہ سب اس دوسرے رفیقِ سفر کی عنایت کا نتیجہ تھا۔ اگر اس کی یہ عنایت نہ ہوتی تو سفر تو کھوٹا نہ ہوتا۔ جتنا راستہ کٹتا جس طرح بھی اور جس زمانہ میں بھی کٹتا کچھ وصول تو ہوتا مگر یہ تو اتنی دیر کی محنت و مشقت سب بیکار گئی اور جہاں تھے پھر وہیں کے وہیں آ پہنچے اور روزِ اوّل کا مضمون ہو گیا۔ حالانکہ اس رفیق سفر نے اپنے خیال کے مطابق بہت بڑا احسان کیا تھا لیکن بعض وقت کا احسان بھی بدسلوکی سے بدتر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی واقعہ سے مشاہدہ ہو گیا۔

تو واقعی بالکل اسی حکایت کے مطابق ہماری حالت ہے۔ یہ دیکھیے ہماری نفس پروری کہ ان واقعات کو سن کر تو کس قدر تعجب کرتے ہیں اور صاحبِ واقعہ کو افسوسناک حالت میں خیال کرتے ہیں مگر اپنے گریبان میں مُنھ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہم خود اس مرض کے شکار ہیں۔ اس مسافر سے زائد افسوسناک حالت ہماری ہے۔ بہت سے خدا کے بندے ہم

ہیں جو پچھلی رات کو اٹھتے ہیں۔ نوافل ادا کرتے ہیں۔ عاجزی کے ساتھ دعائیں مانگتے ہیں توبہ استغفار کرتے ہیں۔ فریضہ پنجگانہ کے پابند روزے رکھنے کے عادی ہیں۔

عبادات پر غیبتوں کا اثر

مگر افسوس کہ اس صلوٰۃ لیل اور نوافل وجمیع عبادات وریاضات پر پانی پھیرنے کے واسطے وہ ایک دو غیبتیں جو صبح اٹھتے ہی ان کے منہ سے اپنے بھائیوں کے حق میں نکلتی ہیں کافی ہو جاتی ہیں اور تمام عبادات وریاضت کا حاصل وانجام یہ دو غیبتیں ہی ہو جاتی ہیں جو کہ عذاب اُخروی کا ذریعہ بننے کے واسطے کافی ہیں۔ تمام کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے اور جس حالت میں تھے اور جس جگہ تھے پھر وہیں لوٹ آتے ہیں جس طرح اس مسافر کو اس شریر گھوڑے نے سرراہ منزل پر لا ڈالا تھا۔ اسی طرح یہ وہ برائیاں جو کہ محض شرارتِ نفس کا نتیجہ ہیں پھر ہم کو ایسے غارِ ذلت میں لا ڈالتے ہیں۔ اتنی بڑی غفلت! غضب خدا کا۔ اس کی علت محض یہی ہے کہ وہی استحضار فنا دنیا نہیں جس کا رونا تھا اور وہی احساس قطع مسافرت ومسافت نہیں ہے جس کی ضرورت تھی۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم مسافر ہیں سفر کر رہے ہیں۔ دور دراز منزل ہمارے سامنے ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو مقیم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم ہر حالت میں باعتبار حرکت زمانی کے مسافر ہیں۔ بس جس طرح ہم بوجہ حرکت مکانی کے اپنے کو مسافر سمجھتے ہیں اسی طرح بوجہ حرکت زمانی کے بھی مسافر سمجھنا چاہیے۔ فرق دونوں مسافرتوں میں صرف یہی ہے کہ یہ سفر اوّل باعتبار حرکت مکانی کے سفر نہیں ہے اور یہی فرق ہے جس پر احکام عبادات کا تغیر وتبدل ہوتا ہے۔

سفر ثانیہ یہ ہے یعنی مسافرت بحسب المکان ہی کو اصطلاح فقہا میں سفر کہا جاتا ہے۔ جس کو تم بھی اپنے روز وشب کی اصطلاح میں سفر سے تعبیر کرتے ہو۔ چنانچہ جس وقت یہ انتقال مکانی ہوتا ہے اس وقت قصر کا حکم دیا جاتا ہے اور انسان مسافر سے تعبیر کیا جاتا ہے ورنہ مقیم کہا جاتا ہے اور جس سفر کا فرمان نبویؐ میں ذکر ہے جس کے اعتبار سے تم ہر وقت مسافر ہو یہ منشاء اور دارومدار تغیر احکام کا نہیں۔ اس سفر پر قصر ثابت نہیں

اس کو خوب غور سے سن لو کبھی نفس و شیطان کے مغالطہ میں پھنس جاؤ کہ ہم جب بروئے حدیث مسافر ٹھہرے تو مسافر کے واسطے تو قصر کا حکم ثابت ہے۔ رباعی نماز اس کے حق میں شاق ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم پھر کیوں بجائے دو کے چار پڑھیں۔ اللہ دے اور بندہ لے چلو دو رکعتوں سے تو فرصت ملی۔

جس طرح ایک جاہل کی حکایت ہے کہ وہ ہمیشہ قصر کیا کرتے تھے خواہ وطن اصلی ہی میں ہوں۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ ہر حالت میں قصر کرتے ہیں خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں، یہ تو صریح مخالفت ہے احکام فقہیہ شرعیہ کی۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ فعل اگر فقہ کے مخالف ہے تو ہو، حدیث کے تو موافق ہے۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عابر سبیل اور مسافر کے احکام فرماتے ہیں اور ہماری حالت قیام فی الدنیا کو سفر سے تعبیر کیا ہے لہٰذا ہم اگر قصر کرتے ہیں تو کونسا بُرا کام کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور صاحب تھے، اگر ان کو ایک میل جانے کی بھی ضرورت پیش آتی تو وہ قصر کرلیا کرتے تھے۔ ان سے کسی شخص نے کہا کہ آپ کا یہ طرز عمل عجیب و نرالا ہے جو تمام روایات فقہیہ کے خلاف ہے کسی امام کے مذہب پر بھی ایک میل کی مسافت میں قصر نہیں۔ آج تک کسی نے اس کو مدت سفر قرار نہیں دیا۔ جواب دیا کہ ہمیں کسی امام کے مذہب سے کیا لینا، جب نص صریح کلام اللہ میں موجود ہے:

اذا ضربتم فی الارض

اس سے بڑھ کر اور کونسی نص ہو سکتی ہے کیونکہ ضرب فی الارض ایک میل کی مسافت پر بھی صادق آتا ہے۔ لہٰذا ہم بموجب اس آیت کے قصر کرتے ہیں۔ تو اس شخص نے جواب دیا کہ اگر قصر کا ثبوت محض ضرب فی الارض سے ہے تو اس کے معنی لغوی تو زمین پر قدم مارنے اور چلنے کے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ مکان سے مسجد میں آ کر نماز پڑھا کریں تب بھی قصر کیا کریں۔ اس وجہ سے کہ اطلاق لغوی موجود ہے۔ اتنی دور چلنے سے بھی آپ کے قول پر زمین پر پیر مارنے کا اطلاق آسکتا ہے۔ اس میں کسی مقدار کی تعیین تو ہے ہی نہیں تاکہ اس کا لحاظ کیا جاوے۔

ایسے ہی ایک صاحب تھے۔ چلتے چلتے مغرب کا وقت ایسی جگہ آیا جہاں سے ایک طرف بلندی، بیچ میں سڑک اور ایک طرف خالی میدان، مغرب کی اذان ہو گئی۔ انھوں نے میدان کی ... ہو کر تیمم کیا اور نماز پڑھنا شروع کی۔ نماز کے بعد کسی نے پوچھا اُن سے کہ پانی تو سامنے مسجد میں موجود تھا آپ نے تیمم کیوں کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ میاں میرے پاس تو پانی نہیں، مسجد میں اگر ہے تو میں کیا کروں۔ اور قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے:

فلم تجدوا ماءً فتیمموا صعیداً طیباً

بتلاؤ کہ میرے پاس پانی کا وجود کہاں ہے۔ لہٰذا رخصتِ شرعی میرے حق میں ثابت ہے۔

غرض ان حکایات کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ہم لوگوں کا مذاق بگڑ گیا ہے کہ جہاں تک ہوتا ہے نفس کی سہولتیں تلاش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفس پر بار نہ پڑے اور ویسے ہی جان چھوٹ جائے۔ لہٰذا بموجب اس مذاق کے کہیں آپ یہ نہ سمجھ جائیں کہ جب ہم اس حدیث کے موافق مسافر بن گئے تو آج سے بس قصر کرنا شروع کر دیں، چلو دو رکعت سے جان چھٹی۔ اب کے ایسی ترکیب کریں گے کہ ان دو سے بھی جان چھوٹ جائے۔ خواہ وہ غرض جس کے اغنیاء سے منطوق حدیثِ مسافرت کو ثابت کرتا ہے حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس کا کوئی ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو۔ دنیا اور اس کے متعلقات سے نفرت پیدا ہو یا نہ ہو۔ بس نفس کو کسی طرح سے آرام مل جائے اس کے آسائش کی صورتیں پیدا ہو جائیں۔

سُود پر اصرار ـــــــ زکوٰۃ سے گریز

چنانچہ ہم نے ایسی بزرگ ہستیاں بھی سنی ہیں جو خوب دھڑلّے سے سود لیتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سود لینا تو حرام ہے تو کیوں لیتے ہو؟ تو نہایت بے باکی سے جواب دیتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں سُود لینا بعض علماء کے مذہب میں جائز و حلال ہے۔ ہم ان لوگوں کے مذہب پر عمل کرتے ہیں۔ بتلاؤ اس میں کیا حرج ہے لیکن جب زکوٰۃ دینے کا وقت آتا ہے اور ان سے زکوٰۃ دینے کا سوال ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بھائی ہمارا تو سارا مال حرام ہے، سُودی ہے اور غیر کا حق ہے۔

ایک فاسق سے بھی بڑھ کر کیوں نہ ہوں مگر ان سب سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

حالانکہ اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہو کہ بدون عمل کے یہ تصحیح اعتقاد بھی محض زبانی جمع خرچ ہے۔ پورا اعتقاد بھی نہیں۔ کیونکہ اعتقاد جازم کے لئے عادۃً افضاء الی العمل لازم ہے پس یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں اعتقادات شرعیہ راسخ ہوں اور عقائد میں وہ ما انا علیہ واصحابی کے طریق پر ہو اور اعمال اس قسم کے ہوں جن میں آپؐ کے اور آپؐ کے اصحاب و متبعین کے اعمال میں یوں بعید ہو اور فساق دنیا داروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

اور اس آفت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے زمرہ میں جو لوگ اہل حق کہلاتے ہیں اُن کے اوپر یہ رحمت خدا کی ہے کہ وہ بھی ما انا علیہ واصحابی میں اعتقادات کو کافی سمجھتے ہیں اور ان کے عادات اخلاق سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ جب یہ تعرض ترک کرتے ہیں اور محبت سے کام لیتے ہیں تو وہ بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور جو ان کا نفس پسند کرتا ہے وہی عمل اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضے ان میں سے اہل باطل اور ہوا پرستوں کا طرز معاشرت اور دنیا داروں کا فیشن اختیار کرتے ہیں۔ بزرگان دین کے طرز طریقہ کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اہل حق کی تعلیمات کو دقیانوسی خیالات سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو اہل حق کی یہ سخت غلطی ہے بلکہ نفس کی ایک بڑی زبردست چال ہے کہ اس نے ان بزرگوں کو ایک غیر مستحسن شرعی فعل کے تعرض سے باز رکھا ہے۔

غرض جس طرح موافقت اعتقادات میں شرط ہے دیگر اعمال و افعال میں بھی ضروری اور لازمی ہے۔ اور اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت میں اہل حق ہونے کا وہی لوگ دعویٰ کر سکتے ہیں جن کے عقائد کی طرح تمام اعمال و افعال و طرز معیشت آپؐ کے اور آپؐ کے اصحاب کی طرز پر ہو ان کے اخلاق نمونہ ہوں اخلاق نبویؐ کے۔ اور ان کی معاشرت ایسی ہی مستحسن ہو جیسی آپؐ کی اور آپؐ کے اصحاب کی تھی۔ نیز بزرگان دین کے شعائر کو جان سے زائد عزیز سمجھیں۔ دلوں میں ان کی قدر ہو۔ آنکھوں میں وقعت ہو۔ شعائر اہل باطل سے نفرت ہو۔

شرعی آسانیوں کا اثر

لہٰذا معلوم ہوا کہ جو سہولتیں شریعت میں دی گئی ہیں ان پر عمل کرنا موجب ازدیادِ شکر ہے اور ازدیادِ شکر سے ازدیادِ محبت ہوتا ہے۔ لہٰذا شرعی آسانیوں پر عمل کرنا چاہیے تاکہ خدا کی محبت زیادہ ہو۔ مگر آسانیوں کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل نفس کے مطیع ہو جاؤ کہ جس امر میں نفس کو آسانی معلوم ہوئی اس کو اختیار کر لیا اور باقی احکام کو پس پشت ڈال دیا۔

جیسے کسی اکال نے کسی سے پوچھا تھا کہ تم کو کلام مجید میں کون سی آیت زیادہ پسند ہے۔ اس نے کہا کہ حلوا و اشربوا۔ تو دیکھئے اس کا نفس چونکہ کھانے کا شیدا تھا لہٰذا تمام اوامر قرآنیہ میں سے آپ کو یہی دو امر پسند آئے۔ کیونکہ اس آیت کے مضمون سے نہایت سہولت و اطمینان کے ساتھ کھانے کو ملتا ہے۔

سو سہولت سے اس قسم کی سہولت مراد نہیں اور نہ یہ محمود ہے بلکہ شرعاً مذموم ہے ہاں وہ سہولت محمود ہے جو حدودِ شرعیہ میں رہ کر خود شارع علیہ السلام نے بطورِ انعام عطا فرمائی ہیں۔ نہ کہ شریعت سے بھی ایک ہاتھ آگے بڑھ جاؤ۔

میرے ایک دوست تھے۔ وہ کہتے تھے کہ علی الاطلاق اعمالِ شاقہ کرنے میں اجر زائد ملتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ مطلق ہے یا مقید۔ انھوں نے کہا کہ نہیں اعمالِ شاقہ مطلقاً ہی موجب اجر جزیل ہیں۔ اتفاق سے عصر کی نماز کا وقت آگیا تو میں نے اُن سے کہا کہ اب نماز کے واسطے وضو کرنے کے دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہیں مسجد کے کنویں سے پانی لے کر وضو کیا جائے اور دوسرا یہ کہ جلال آباد سے پانی لا کر وضو کیا جائے۔ بتلائیے اکون سی صورت اختیار کرنا مناسب ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہی مناسب ہے کہ مسجد کے کنویں سے پانی لے کر وضو کیا جاوے۔ میں نے کہا، اب وہ آپ کا اطلاق کہاں گیا کیونکہ مشقت تو اسی میں زائد ہے کہ جلال آباد سے پانی لا کر وضو کیا جائے تو بات یہ ہے کہ مطلقاً مشقت کو موجب اجر زائد کہنا غلط ہے بلکہ اوّل تو یہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہیں اور جو چیزیں کہ قربات یا اعمال مقصودہ بذاتہا نہیں ہیں بلکہ شرائط وغیرہ

نہیں، ان میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیشہ سہولت ہی کو اختیار فرمایا ہے۔
چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ:

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین الا اختار ایسرھما الخ

لہٰذا اسی حدیث کے موافق ہم کو یہی عمل کرنا چاہیے کہ ایسے مواقع پر رخصت ہی کو اختیار کریں۔ چنانچہ وضو بھی قربات مقصودہ سے نہیں بلکہ شرائط صلوٰۃ میں سے ہے لہٰذا اس کے بارے میں سہولت کو اختیار کرنا مناسب ہے۔ دوسرے مقاصد میں بھی جس محل میں رخصت میں کوئی شرعی مصلحت ایسی ہو جو کہ عزیمت میں نہ ہو وہاں مشقت اور عزیمت اختیار نہیں کی جاتی بلکہ رخصت وسہولت کو ترجیح ہوتی ہے۔

اور جیسے وضو قربت مقصودہ نہیں اسی طرح جو کا کھانا بھی گو سنت نبوی تو ضرور ہے اور تعامل صحابہ بھی یقیناً ہے لیکن یہ قربات میں سے نہیں بلکہ عادات میں سے ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جو قوی المعدہ تھے۔ تو اب جو لوگ اپنے اوپر یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ بے چھنے جو کھانے سے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ پیٹ کو پکڑے پکڑے نہ پھریں گے ان لوگوں کے واسطے جو کھانا مضائقہ نہیں بلکہ اولیٰ وانسب ہے اور نیت اتباع کے ساتھ باعث ثواب کثیر ہے۔

عمل بالسنۃ کے معنیٰ

اور اگر ضعیف المعدہ حضرات نے سنت نبوی پر عمل کرنے کے شوق میں اگر ایک وقت بے چھنے جو کی روٹی کھائی اور شام کو جب نماز کے واسطے کھڑے ہوئے تو پیٹ میں ایسا درد شدید ہوا کہ قیام پر بھی قادر نہ ہو سکے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنا پڑی تو ان جوؤں اور چھلکوں کے کھانے میں ان کو اتنا ثواب واجر کثیر نہ ملے گا جس قدر ترک قیام سے فضیلت نماز فوت ہوگئی اور اپنے ہاتھوں ہوئی۔

مگر جو کے کھانے سے اس طرح احتراز کرنا کہ سنت نبوی پر بھی کوئی الزام نہ آئے اور جو کا کھانا بھی ترک ہو جائے یہ اضداد کا جمع کرنا ہے۔ یہ انہیں حضرات کا کام تھا۔ سبحان اللہ! کیا لطیف طریقہ سے دست کشی فرمائی کہ بھائی ہم نے گستاخی کی اور بے ادبی ایسے کام

گزر کر حقائق ممتنعۃ الادراک کے معلوم کرنے کا تہیہ کر لیا ہو پھر اس میں وہ ایسے سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ جہاں پہ عقل کے گھوڑے نہیں چلتے اور یہ کارآمد ہتھیار بیکار ہو جاتا ہے۔ ہاں پر طرح طرح کی ضعیف بے محل تاویلیں کرتے ہیں۔ اور وہ متکلمین مراد نہیں جو رد بدعات و اعتراضات اہل باطل کی غرض سے کلام کرتے ہیں کہ ان کا مطمع نظر صرف بدعات کا ردّ کرنا اور مسائل دینیہ پر سے اعتراضات کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ ادراک حقیقت کا نہ وہ قصد کرتے ہیں اور نہ دعوےٰ۔ اور اگر کہیں ایسی بحث اجمالاً کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں دعویٰ نہیں ہوتا منع ہوتا ہے یعنی دوسرے کے کسی دعوے میں ایک احتمال نکال دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا کلام محمود مستحسن شمار کیا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ جیسے اُن کی شان ویسا ہی نزول۔ نہ ہم ان کی حقیقت کو جانیں کہ وہ کیسی ذات ہے جو اجسام اور مادیات بلکہ مجردات ممکنہ سے بھی پاک اور حرکات و سکنات سے مبرا ہے اور متصف بکمالات عجیبہ ہے۔ نہ ہم اُن کی ان صفات عجیبہ کو جانیں۔ اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ہم اس ذات قدوس کی حقیقت اور اس کے اوصاف کی ماہیت سے جاہل ہیں کیونکہ بہت سی چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کو ہم آج تک نہیں جانتے اور یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے رازوں اور پوشیدہ ملکوں سے ہم ناواقف ہیں بلکہ اکثر وہ ایسی معمولی چیزیں ہوتی ہیں جو ہر وقت ہم سے قریب رہتی ہیں مگر پھر بھی ہم ان کو نہیں جانتے بلکہ جب ان کا علم ہوتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی معمولی سی بات! اور ہم آج تک اس سے جاہل تھے۔ تو پھر اگر ہم ایک ذات قدوس بعید عن الادراک عجائب عن النظیر غیر محدود الاوصاف کے ادراک سے جاہل اور ناواقف رہیں تو کون سا ہماری شان میں بدنما داغ لگ جائے گا۔ افسوس! ایسی معمولی اشیاء کی جہالت سے تو ہماری قابلیت میں نقصان نہ آوے اور ایک ایسی باسطوت و جبروت ذات کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے ہماری قابلیت میں بٹہ لگ جاوے اور ہم تو کیا چیز ہیں، ہماری ہستی ہی کیا ہے یہاں تو ایسے ایسے جلیل القدر عارف کہ جن کی تمام عمر علوم و اسرار و معارف ہی میں گزرتی ہے کوئی لمحہ ان کی عمر کا عرفان سے خالی نہیں ان کا یہ حال ہے کہ شیخ فرماتے ہیں۔

دور بیان بارگاہ الست · غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

ایسے ہی عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں · کینجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

عنقا کنایہ ذات باری تعالیٰ سے ہے کہ یہاں عقل کا جال نہ پھیلاؤ۔ یہاں بجز ہوا کے جال میں اور کچھ نہ آئے گا۔ مولانا رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات او را گنج کو · تا در آید در تصور مثل او

یعنی خداوند تعالیٰ کے مثل کا تصور بھی ناممکن ہے اس وجہ سے کہ تصور مثل موقوف ہے تصور ممثل لہ پر کیونکہ ادراک مماثل کے شرائط میں مثلین کا انکشاف بھی ہے اور ممثل لہ یعنی ذات خداوندی کا ادراک و انکشاف ناممکن۔ لہذا انکشاف و تصور مثل بھی نہیں ہو سکتا اور یہاں تو کیا حقیقت باری تعالیٰ کا انکشاف تو آخرت میں بھی نہ ہوگا محض دیدار ہوگا۔ پس جب اس عالم میں جو کہ انکشاف حقائق کا عالم ہوگا یہ حقائق منکشف نہ ہوں گے تو اس عالم میں تو کیا توقع ہے۔ اور اس مسئلہ پر عرفاء و حکماء سب کا اتفاق ہے۔

اور بعض صفات جو واجب و ممکن میں بظاہر مشترک ہیں جیسے علم و قدرت وغیرہا ان سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ صفات ممکن کا تو ادراک بالکنہ ممکن ہے اور بوجہ اشتراک کے وہی حقیقت ہوگی صفات واجب کی پس صفات واجب کا ادراک بالکنہ ممکن ہوگیا۔ جواب یہ ہے کہ یہ اشتراک باعتبار حقیقت کے نہیں محض اعتبار اسم کے ہے اور حقیقت دونوں کی جدا جدا ہے۔ اس اصل پر ایک آیت کی تفسیر نہایت سہل ہو جاتی ہے۔ اس کی تقریر کرتا ہوں۔ وہ آیت یہ ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ الخ

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ۔

یہاں دو سوال ہیں۔ ایک یہ کہ آیت میں خداوند تعالیٰ نے دونوں مقام میں

خالدین فیہما کے بعد مادامت السمٰوٰت والارض فرمایا ہے یعنی خلود و دوام جب تک ہوگا جب تک آسمان و زمین باقی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حشر و نشر کے وقت جب صور پھونکا جائیگا تو جمیع مخلوقات کی طرح آسمان و زمین بھی فنا ہو جائیں گے تو جبکہ سمٰوٰت والارض فنا ہوئے اور انکے واسطے دوام نہ ہوا تو جو خلود اس کے ساتھ ہوگا وہ خلود غیر محدود نہ ہوا۔ تو یہ خلود نہ کفار کے واسطے دوزخ میں ہوا نہ مومنین کے واسطے جنت میں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جن آسمان و زمین کے ساتھ تحدید اور ظرفیت دوام کی اس جگہ فرمائی گئی ہے وہ آسمان و زمین ہمارے اس عالم فانی کے سمٰوٰت وارض نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عالم کے سمٰوٰت وارض مراد ہیں اور ان کا دوام غیر محدود ہے اور اس پر تعجب نہ کرو کہ کیا وہاں بھی آسمان و زمین ہوں گے۔ سو سمجھ لو کہ وہاں کے آسمان و زمین تو یہاں کے آسمان و زمین سے بھی بڑے ہیں اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں ؂

غیب را ابرے و آبے دیگرست   آسمانے آفتابے دیگرست

وہاں کا بادل اور پانی اور ہی پانی ہے۔ وہاں کا آسمان و آفتاب ہی جدا بلکہ میں اس سے زیادہ عجیب بات سناؤں۔ خود اس عالم میں ایسی چیز موجود ہے یعنی روح جس میں آسمان و زمین اس آسمان و زمین سے زیادہ عجیب موجود ہیں۔ اس کو حکیم سنائی فرماتے ہیں ؂

آسماں ہاست در ولایت جاں   کار فرمائے آسمان جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست   کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

اسی طرف ایک منصرؔ نے اشارہ کیا ہے ؂

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن در آ   تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بچمن در آ

اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؂

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است

چہ کوئی دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں ؂

تو دیکھئے احکامِ دنیوی میں کوئی حاکم اپنے عہدے و منصب پر اپنے اختیار سے دائم نہیں رہ سکتا بلکہ ہر حاکم پر ایک حاکمِ اعلیٰ ہے جس کا یہ ماتحت ہے اور وہ اس کو اس عہدہ سے علیحدہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ تو تحصیل جو کہ ایک نہایت ادنیٰ محکمہ ہے وہ تو کسی کے واسطے موروثی ہو نہیں سکتا اور جنت الفردوس جو دارُ النّعیم ہے جس کے وعدہ سے مومن کی روح تازہ ہوتی ہے۔ بدن میں قوّت آتی ہے۔ ایسی بڑی نعمت ہمارے واسطے موروثی ہو جائے کہ خدا کو بھی نعوذ باللہ اس سے علیحدہ کرنے کا اختیار نہ رہے۔ کیا خوب ابدیت اور دوام اگرچہ ممکن کے واسطے ثابت ہے لیکن دوام واجب کے ہرگز مساوی نہیں ہو سکتا بلکہ دونوں میں حقیقتِ تغائر نوعی ہے۔ پس خداوند تعالیٰ نے اس شرک اور باطل پرستی سے بچانے کی غرض سے اس استثناء کو بڑھا دیا ہے۔

تو دیکھئے کہ دوام منجملہ دیگر صفات خداوندِ قدوس کے ایک صفت ہے اور ممکن بھی اس میں مشارکت عرضی رکھتا ہے لیکن پھر بھی تغائر و امتیاز دونوں دواموں میں ایسا موجود ہے جس کی وجہ سے ہر ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اس ذات قدوس کا دوام اعلیٰ و برتر ہے۔ اس ذات ممکن کا دوام ادنیٰ و انقص ہے ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

جب دونوں میں ایسا تغائر ہے تو صفات ممکن کے ادراک سے صفات واجب کے ادراک کا امکان لازم نہیں آتا خواہ آخرت میں ہو یا دنیا میں کسی جگہ بھی ادراک و انکشاف حقیقت واجب تعالیٰ یا اُن کی صفات کا بالکنہ نہیں ہو سکتا۔ استحالہ عقلی و امتناع نقلی ہر دو موجود ہیں۔ چنانچہ جمیع عقلاء زمانہ و فلاسفہ متقدمین اور متاخرین کا اس پر اتفاق بھی ہو چکا ہے کہ ادراک ماہیت واجب تعالیٰ کا بالکنہ عقلاً مستحیل ہے۔ اور نقلاً بھی حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ آخرت کی سب سے بڑی نعمت اور اعلیٰ ترین انعام رویتِ خداوندِ ذوالجلال ہے کہ اس روز جمیع حجب و موانعات اس ذاتِ کبریائی کے چہرۂ انور سے اُٹھ جائیں گے اور تشنہ لب دیدار سے سیراب ہوں گے۔

ولا یبقیٰ علیٰ وجہہ حجاب الا رداء الکبریا - ایک حجاب یعنی رداء

اور اس کے نکات و معنی سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔

فنا و بقاء کا اعتقاد ضروری ہے

چنانچہ ایک یہی آیت ہے جس کو میں نے تلاوت کیا اور اس کے مطالب و مفہوم کو آپ کے سامنے واضح کر کے بیان کیا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس سے نفع حاصل کریں یعنی اعتقاد بقائے آخرت اور یقین فنائے دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت پیدا کریں اور دنیا کی جن غافل کر دینے والی اشیاء سے نفع اٹھایا جاتا ہے اس کو مقصود اصلی نہ قرار دیں اور اس معمولی فائدہ و آرام کو اپنا مطمع نظر اور مبلغ پرواز نہ بنائیں۔

غرض چونکہ اعتقاد بقائے آخرت فنائے دنیا کا لازمی نتیجہ اعراض عن الدنیا تھا لہٰذا اس آیت میں دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر کیا گیا:۔

وما هذه الحيوة الدنيا الا لهو ولعب

گویا دنیا کی حقیقت کو محصور کر دیا صرف دو چیزوں میں ایک لہو دوسرے لعب کہ دنیا بجز اس کے اور کچھ نہیں۔ یہاں پر دو لفظوں کا استعمال کیا گیا ایک لہو اور دوسرا لعب اگرچہ یہ دونوں لفظ بظاہر بالکل مترادف معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں تھوڑا سا تفاوت ہے۔ لعب کہتے ہیں کسی لغو و عبث فعل کو اور لہو کہتے ہیں غفلت میں ڈالنے والی بات کو۔ حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت عبث ہونے کی دوسری موجب غفلت ہونے کی۔ اوّل کو لعب فرمایا ہے اور دوسری کو لہو۔

لیکن اس پر ایک شبہ پڑتا ہے کہ جب دنیا بجمیع اجزائہا لغو و عبث ہو گئی تو لازم آیا کہ جمیع مخلوقات خداوندی بے فائدہ اور مہمل محض رہ جاویں حالانکہ خداوند تعالےٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ حکیم ذات ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرے جو مہمل محض ہو بسخت گستاخی ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا جرم ہے۔ علاوہ ازیں خود دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

افحسبتم انما خلقنکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون

یہاں پر استفہام انکاری ہے یعنی کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور لغو محض پیدا کیا ہے بالکل غلط ہے۔ نیز ایک آیت میں ارشاد ہے:

ربنا ما خلقت ھذا باطلا

جواب شبہ کا یہ ہے کہ فی الواقع کوئی شے مخلوقاتِ خداوندی سے عبث اور بیکار نہیں۔ البتہ تعین فوائد ایک امر اہم ہے اور اس میں غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ دنیا سے قابلِ قدر فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ انسان ان کے فوائد سے اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ دنیا کے منافع میں داخل ہیں لیکن ہم لوگوں نے ان جمیع منافع میں سے بعض منافع کو جو کہ واقعی منافع تھے نظر انداز کر دیا اور دنیا کے منافع کا انحصار صرف ان منافع کے اندر کر دیا جو کہ حظِ نفسانی سے پُر ہوتے ہیں اگرچہ ان منافع سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، آرام پاتا ہے لیکن ان کی وجہ سے وہ حظِ وافر جو اہم نفع اور قابلِ قدر فائدہ تھا اسکو ہم بھول جاتے ہیں اور اس نسیان کے باعث صرف یہی فوائد ملتے ہیں جو چند روز کے لئے ہم کو حظِ نفس کا مزہ چکھا دیتے ہیں اور مقصودِ اصلی اور اس کی نفعیت کو چھڑوا دیتے ہیں۔

اب ان لذتوں اور دلچسپیوں کو ہی فائدہ اور نفع قرار دے لینا اور انہیں پر قناعت کر لینا اس کی مثال تو لیجئے اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک دور دراز ریل کا سفر کر رہا ہے اور رستہ میں کسی جگہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہوئی سُنے اور وہاں جا کر کھڑا ہو جائے اور اس گھنٹی کو مزے لے کر سنتا رہے اور بجاتا رہے اور اس طرف گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ انجن نے سیٹی دے دی ہو اور جب اس سے کہا جائے کہ اے ظالم! گاڑی چھوٹنے والی ہے، انجن نے سیٹی دے دی ہے۔ تو وہ یہ کہے واہ صاحب! مجھ کو تو اس کی ٹن ٹن میں مزہ آ رہا ہے۔ بس تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا چاہے گاڑی جائے یا رہے۔

تو جس طرح اس شخص کو اس گھنٹی کی آواز اور لذت نے ایسا مست کر دیا کہ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی چھوٹ گئی سفر کھوٹا ہوا۔ اسی طرح اگر آپ بھی ان لذاتِ دنیوی اور دلچسپ اشیاء کی دلچسپیوں میں پڑے رہیں گے تو آپ کا بھی انجام یہی ہو گا کہ مقصودِ اصلی سے محروم ہو کر کوئی حظِ وافر نہ حاصل کر

ہی ہو محبت کی علامت ہے کہ اگر کسی ظالم بادشاہ سے کوئی سخت گفتگو ہوئی ہو اس کا ذکر کرتا ہے اور اگر کسی چمار سے ایسی ہی گفتگو ہوئی ہو اس کا تذکرہ نہیں کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ بادشاہ کو باعظمت سمجھتا ہے اور اس سے نیز اس گفتگو کو فخر سمجھتا ہے اس لئے اس کو نقل کرتا ہے بخلاف چمار کے۔ معلوم ہوا کہ مذمت بھی عادتاً باوقعت چیزوں کی کیجاتی ہے۔ پس اسی طرح دنیا کی مذمت کرنا متضمن ہے اس دعوے کو کہ ہم ایسی بڑی چیز کے تارک ہیں۔ یہ معنی ہیں تحبون الدنیا کے۔

دیکھئے اس مبغوضہ کا ذکر مجلس اولیا میں مستبعد سمجھا گیا چہ جائیکہ کلام حق، مگر اس ظاہری استبعاد کے باوجود بھی خداوند تعالیٰ نے تذکرہ دنیا کا اس لئے فرمایا ہے کہ اس میں ہمارے حال کی رعایت ہے کہ ہم بدون بتلائے اس کی حقیقت معلوم نہ کرسکتے تھے۔ پس جیسا کلام مجید میں تمثیل اصنام کی غرض سے مکھی اور مچھروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا ہی یہاں تقبیح کی غرض سے اس مبغوض دنیا کا بھی ذکر کیا اور مقابلہ کے لئے آخرت کو بھی بیان فرمایا۔

اور اگر یہاں کوئی سوال کرے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کے ذکر دنیا کو تم نے حکمت پر محمول کیا اسی طرح رابعہ بصری ؒ نے ان حضرات کے تذکرہ کو بھی حکمت پر کیوں نہ محمول کیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے کلام میں تو حکمت ظاہر ہے کیونکہ ہم کو مطلع کرنے کی ضرورت تھی لیکن ان حضرات کے کلام میں ایسی حکمت اس لئے نہ تھی کہ ان شیوخ کے پاس کون سا دنیا دار بیٹھا ہوا تھا جس کو تنفر و اعراض عن الدنیا کی ترغیب دینا مقصود تھا۔ لہٰذا ان کا یہ فعل متضمن ہوگا۔ ایسی باوقعت چیز کے ترک کے دعوے کو جیسے زاہد کسی فعل زہد کو اظہار زہد کے واسطے بیان کرتا ہے۔ جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارے پاس اتنا اتنا روپیہ لایا، ہم نے ایک حبہ بھی نہ لیا سب واپس کر دیا۔ یہ بھی ایک بڑی بھاری لغزش ہے۔ اس قسم کی لغزشوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک بزرگ کسی دوسرے بزرگ کے گھر مہمان تھے۔ میزبان نے خادم سے کہا کہ شیخ کو اس صراحی سے پانی پلانا جو ہم اپنے دوسرے حج میں مکہ سے لاتے تھے۔ شیخ

بھی ہو بہو واقع ہو جائے۔ یہ علامت ہے اس کی کہ اس شخص کو عالم غیب سے تعلق ہے اور اس حالت میں یہ معجزہ ہوگا کہ پیشین گوئی کے بعد اسی کے مطابق وقوع ہو جائے جب وہ پیشنگوئی بھی ایسی معمولی نہیں جس کو طبیب بھی ظاہری آثار سے معلوم کرلیں جیسا کہ آج کل بعض جاہلوں کی پیش گوئیاں ہوتی ہیں کہ فلاں شخص اتنی مدت میں ہلاک ہو جائیگا یا فلاں مرض میں مبتلا ہوگا، بلکہ ایسی عظیم الشان پیشین گوئی ہے جس کا تعلق دو سلطنتوں سے ہے اور تعلق بھی ایسا عجیب جو عقولِ ظاہرہ کے خلاف اور آثارِ موجودہ سے مستبعد ہے۔ پھر پیشین گوئی بھی مہمل نہیں بلکہ صاف صاف تحدید کے ساتھ اور اس میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اس وقت جن سلطنتوں کو غلبہ ہوا ہے چند سال میں اس کو مغلوبیت ہوگی اور مغلوب سلطنت کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور اس مدت میں اس کا وقوع بھی ہو گیا۔ تو یہ علامت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی اور یہ علامت اس وقت بھی جب کہ نبوت ختم نہ ہوئی تھی اور اب جب کہ نبوت ختم ہو چکی اگر کوئی پیشین گوئی کرے اور اس کی پیشنگوئی بھی غلط نہ ہو تب بھی وہ نبی نہ ہوگا اور نہ یہ نبوت کی علامت ہوگی۔ بلکہ اگر وہ ولی متبع شریعت ہے تو اس کو کرامت کہا جائے گا اور غیر متبع شریعت ہے تو استدراج ہوگا۔

رہا یہ شبہ کہ اگر وہ پیشین گوئی کرنے والا دعویٰ نبوت بھی کرے اور اس کے ساتھ اسکی پیشینگوئی غلط بھی نہ ہو تو کیا جب بھی یہ نبوت کی علامت نہ ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال محض فرض و تقدیر ہے جو واقعات کے خلاف ہے یعنی عادۃ اللہ میں ایسا نہیں ہوسکتا اور ایسے احتمالاتِ فرضیہ حقیقت واقعہ میں قادح نہیں ہوتے اور یہ سوال ایسا ہے جیسے امام ابو یوسفؒ کے ایک شاگرد نے سوال کیا تھا جو درس کے وقت ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ ایک دن امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ بھائی تم کوئی سوال نہیں کرتے۔ تم بھی کچھ پوچھا کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا، اب سوال کیا کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد امام نے ایک دن یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ غروب آفتاب کے بعد فوراً افطار کر لینا چاہئے تو وہ شاگرد پوچھتے ہیں کہ حضرت اگر کسی دن آفتاب غروب ہی نہ ہو تو کیا کرے؟ امام ہنسنے لگے اور فرمایا کہ بھائی تمھارا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

ضرور ایمان لائے گا اور یہی عمل ہے کیونکہ ایمان عملِ قلبی ہے تو اس اعتقادِ سابق کی وجہ سے ایمان و تصدیق ضرور پیدا ہوگی۔ اس درجہ میں اعتقاد کو عمل سے تخلف نہ ہوگا۔

رہا اظہار باللسان تو فیما بینہ و بین اللہ۔ یہ رکنِ ایمان نہیں۔ یہ مسئلہ متکلم فیہ ہے مگر مذہب منصور یہ ہے کہ ترک اظہار صرف معصیت ہے جب کہ اظہار پر قدرت ہو یعنی اگر باوجود قدرت کے اظہار نہ کیا تو عنداللہ مومن تو ہوگا مگر عاصی بھی ہوگا۔

رہا ایمان عندالناس و فی احکام الدنیا تو اس کے لئے اظہار شرط ہے۔ جب تک کوئی زبان سے اپنے کو مسلمان نہ کہے گا ہم اس کو کافر ہی کہیں گے بالخصوص جب کہ وہ اظہار پر قادر بھی ہو اور کفارِ مکہ تو مغلوب عاجز نہ تھے بلکہ مسلمان خود اُن سے ڈرتے تھے۔ اس حالت میں ہم کو کیسے احتمال ہو سکتا ہے کہ اُن کے دل میں ایمان ہے۔ اور اگر فرضاً کسی کے دل میں ایمان ہوتا بھی تب بھی ان کا برتاؤ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے ایسا تھا جو امارت تکذیب سے تھا جیسے القاء مصحف فی القاذورۃ امارت تکذیب ہے۔ اسی طرح کفار کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا اور مسلمانوں سے مقابلہ مجادلہ کرنا بھی امارت تکذیب سے تھا۔ اس کے ساتھ اُن کا وہ ایمانِ قلبی عنداللہ بھی معتبر نہ ہوتا کیونکہ ایمان عنداللہ کے لئے صرف تصدیقِ قلبی کافی نہیں بلکہ یہ بھی شرط ہے کہ امارات تکذیب سے احتراز کیا جائے۔

اب میں ایک اشکال طالب علمانہ کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا علم تھا چنانچہ ارشاد ہے:

ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون

اس میں استفہام انکاری ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو رسول کا رسول ہونا معلوم تھا۔ دوسری جگہ اہل کتاب کے متعلق صاف طور پر ارشاد ہے:

یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم

تو سمجھ لیجئے کہ یہ معرفت اضطراریہ تھی اور معرفت اضطراریہ ایمان نہیں بلکہ ایمان عملِ اختیاری کا نام ہے۔

بھی اُلفت ہوگئی اور جن میں وہاں تعارف نہیں ہوا اُن میں اختلاف ہوگیا۔

تو وہ بزرگ کہتے ہیں کہ اس تعارف و تناکر کی صورت یہ ہوئی کہ جب ارواح جمع کی گئی ہیں تو بعض تو رو در رو تھے اُن میں تو طرفین سے الفت ہوگئی اور بعض رو در پُشت تھے کہ ایک کا منھ دوسرے کی طرف اور اس کی پشت دوسرے کی طرف۔ ان میں ایک کو تو دوسرے سے اُلفت ہوگئی جس کا مُنھ دوسرے کی طرف تھا اور دوسرے کو اس سے نفرت ہوئی جس کی پُشت اس کی طرف تھی۔ اور بعض پشت در پشت تھے کہ اکی پُشت اسکی طرف اس کی پشت اس کی طرف۔ ان دونوں میں دنیا میں بھی نفرت ہوئی۔ اور اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ فلاں میری داہنی طرف تھا فلاں بائیں طرف تھا وغیرہ۔

حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ کا ارشاد ہے کہ جب اول رُوح کو جسم میں داخل ہونے کا حکم ہوا تو اس وقت حق تعالیٰ کا کلام رُوح نے سُنا اور وہ فلاں لہجہ میں تھا جو مجھ کو یاد ہے۔ اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اسی کی لذّت میں مست ہوکر روح جسم میں داخل ہوگئی۔ یہ وہ جسم ہے جس میں روح کو داخل کر کے عہدِ الست لیا گیا۔

یہاں یہ شبہ ہوگا کہ حق تعالیٰ کا کلام تو صوت سے منزّہ ہے چنانچہ حضرت شیخ فرید کا قول ہے ع ________ قول او رالحن نے آواز نے

بعض خشک اہلِ ظاہر حضرت فرید کو شیخ نہیں سمجھتے بلکہ خالی صوفی سمجھتے ہیں، کیونکہ وحدۃ الوجود میں ان کے بعض اشعار ذرا زیادہ تیز ہیں جن سے اہلِ ظاہر کو بوجہ اصطلاحات سے واقف نہ ہونے کے دھوکا ہوا ہے چنانچہ ان کا ایک طویل قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار — متجلی ست از در و دیوار

مگر یہ ان صاحبوں کی غلطی ہے حضرت شیخ فرید بہت بڑے عارف ہیں۔ مولانا رومیؒ اُن کی بہت تعریف فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت — ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

اور مصلح و مربی بھی ہیں چنانچہ ان کا پندنامہ اس پر شاہد عدل ہے۔ اسی میں قبر پرستوں کے خلاف ارشاد ہے ؎

بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں فلما تبینت وجہہ عرفت انہ لیس بوجہ کذاب۔
نبی کا چہرہ تو بھلا کیوں ممتاز نہ ہو جب کہ ولی کے چہرہ کی یہ حالت ہے کہ ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

اور یہ

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی
نیک بیں باشی اگر صاحب دلی

اور یہ نور دیکھنے ہی سے مدرک ہو سکتا ہے، بیان میں نہیں آ سکتا اسی کو ایک عارف کہتے ہیں ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

اور یہی مطلب ہے بعض علمائے محققین کے اس قول کا کہ معجزات دلیلِ نبوت نہیں مطلب یہ ہے کہ اہلِ بصیرت و اہلِ فہم کے لئے دلیلِ نبوت کا انحصار معجزات ہی میں نہیں ان کے اخلاق بھی دلیل ہیں۔ باقی عوام کے لئے تو معجزات ہی ضروری ہیں اور کفار عوام ہی ہیں اور دنیا میں اہلِ فہم کم ہیں عوام ہی زیادہ ہیں۔ اس لئے نبی کے واسطے صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے۔ اور جب عوام کے حق میں معجزات دلیلِ نبوت ہیں تو اہلِ فہم کے حق میں تو دلیلِ نبوت کیوں نہ ہوں گے۔ ان کے لئے تو بدرجۂ اولیٰ دلیلِ نبوت ہوں گے۔

عظیم پیش گوئی کی تفصیل

اب میں مختصر طور پر اس پیشین گوئی کا قصہ بیان کرتا ہوں جس کی تفصیل کتب سیر میں مذکور ہے کہ ہجرت سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اس وقت ایک سال فارس و روم میں لڑائی ہوئی اور اہلِ فارس کو رومیوں پر غلبہ ہوا جس سے کفارِ قریش کو خوشی حاصل ہوئی اور انھوں نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ تم بھی اہلِ کتاب ہونے کے مدعی ہو اور رومی بھی اہلِ کتاب ہیں اور اہلِ فارس تمہارے نزدیک مشرک ہیں تو اہلِ فارس کا رومیوں پر غالب ہونا ہمارے لئے نیک فال ہے کہ اسی طرح ہم بھی تم پر غالب ہوں گے۔

مطلب کے ادا کرنے میں بہت بڑا دخل ہے اسی لئے حنفیہ کے نزدیک عمل صحابی (خلاف روایت) موجب خلل ہے کیونکہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لہجہ اسی طرح دوسرے قرائن مقامیہ نہیں دیکھا اور صحابی نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ جو مراد ہم نے الفاظ سے سمجھی ہے وہ صحیح نہ ہو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کی پیشین گوئی نجومیوں کی پیشینگوئی کی طرح مجمل و مبہم نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی نہیں کہ قیامت تک کی پیشین گوئی ہو۔ سیغلبون پر سین داخل کر کے قرب کو بتلا دیا ہے کہ بہت جلد عنقریب رومی غالب ہوں گے۔ پھر فی بضع سنین کے ساتھ مقید کر کے اس کو بالکل واضح کر دیا کہ نو سال کے اندر اندر ایسا ہو گا۔

ایسی پیشینگوئی نہیں جیسا کہ ایک پاگل نے اس زمانہ میں پیشین گوئی کی تھی کہ فلاں عورت سے میرا نکاح ہو گا۔ جب اس کا نکاح دوسرے سے ہو گیا تو دعویٰ کیا گیا کہ یہ بیوہ ہو جائے گی اور پھر میرے نکاح میں آئے گی۔ مگر ایسا بھی نہ ہوا اور وہ یہ حسرت لے کر ہی قبر میں چلا گیا تو اس کے تابعین نے اس پیشین گوئی میں یہ تاویل کی کہ اس عورت کی اولاد میں سے کوئی لڑکی اس مدعی کی اولاد میں سے کسی لڑکے کے نکاح میں آئے گی۔ سبحان اللہ! ایسی بے تکی تاویل سے بھی اگر پیشین گوئی سچی ہو سکتی ہے تو ہر شخص کی پیشین گوئی سچی ہو جایا کرے گی اور کسی کی کوئی بات بھی غلط نہ ہوا کرے گی۔

سو قرآن کی پیشین گوئیاں ایسی نہیں ہوتیں بلکہ صاف اور واضح ہوتی ہیں اور حق تعالیٰ نے روم کے غلبہ اور فارس کی مغلوبیت کی پیشین گوئی اس لئے بیان فرمائی کہ کفار مکہ نے فارس کے غلبہ سے یہ فال لی تھی کہ ہم بھی مسلمانوں پر اسی طرح غالب ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے اس دلیل کے مقدمات پر کلام نہیں فرمایا کہ ایک قوم کے دوسری قوم پر غالب ہونے سے اس کی نظیر کا غلبہ دوسری نظیر پر غالب نہیں بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ چند سال میں اس کے برعکس کا وقوع ہو گا کہ روم کو فارس پر غلبہ ہو گا۔ اس وقت تم کو اس کے خلاف فال کا قائل ہونا پڑے گا۔ سبحان اللہ! کیا عجیب طرز مناظرہ ہے اور یہ الزامی جواب ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ایک دوسری واقعی اور حقیقی مسرت سناتے ہیں کہ غلبہ روم سے تو تم کو یہ خوشی ہو گی کہ کفار کی پہلی فال کا لغو ہونا واضح ہو جائے گا اور اس کے ساتھ

ہی علاین اسی زمانہ میں تم کو حقیقی مسرت بھی حاصل ہوگی۔ دیومئذ یفرح المومنون بنصر اللہ بنصرمت ایشلو۔ اس دن تم کو کفار مکہ پر غالب ہونے سے حقیقی خوشی بھی حاصل ہوگی بخلاف کفار مکہ کے کہ ان کو اس وقت محض خیالی مسرت ہے اور آئندہ ان کو حقیقی ذلت اور رسوائی حاصل ہوگی۔ تو حق تعالیٰ نے اس جگہ دو پیشین گوئیاں بیان فرمائی ہیں۔ ایک غلبۂ روم کی فارس پر۔ دوسری غلبۂ اہلِ اسلام کی کفار پر۔ یہ تو کفار کی بات کا جواب تھا۔

عطائی طبیبوں کا طریق علاج

پھر چونکہ قرآن مجید طبِ روحانی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے محض پیشین گوئی پر اکتفا نہیں فرمائے بلکہ اس کے بعد بتلاتے ہیں کہ ان پیشین گوئی کے وقوع پر کفار کو ایمان لے آنا چاہیے تھا مگر وہ پھر بھی منکر رہیں گے۔ اس کا سبب معلوم کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ محض آثار کا علاج نہیں کرتے بلکہ اصلی مرض کا علاج کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہم کو اس طب روحانی کا اہتمام نہیں۔ طبِ جسمانی کا تو اتنا اہتمام ہے کہ ذرا طبیعت میں تغیر ہوا اور طبیب کی تلاش کرنے لگے مگر طبِ روحانی سے اتنی بے پروائی کی کہ اس کی طرف التفات ہی نہیں۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں	حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب	صحت آں حس بجوئید از حبیب

پھر طبِ جسمانی میں کامل طبیب وہ ہوتا ہے جو اصل مرض کا علاج کرے اور وہ طبیب ناقص ہوتا ہے جو آثار کا علاج کرتا ہے کہ کسی نے کھانسی کی شکایت کی تو ملیٹھی بتلا دی۔ بخار کی شکایت کی تو گل گاؤزبان لکھ دیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں دیکھتا کہ بخار کا سبب کیا ہے، کھانسی کی وجہ کیا ہے، اس سبب کا استیصال کرنا چاہیے۔

اسی قسم کے ایک حکیم جی ہمارے قصبہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ یہ غضب کرتے ہیں کہ طب کی دو تین کتابیں اردو کی دیکھ کر علاج کرنے لگے اور لطیفہ یہ کرتے ہیں کہ مریضوں سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تشخیصِ مرض تو کسی اور حکیم سے کرالو، علاج میں کردوں گا

کوئی اس سے پوچھے کہ جب تم تشخیص نہیں کر سکتے تو علاج کیونکر کرو گے کیونکہ تشخیص مرض کے بعد تشخیص مزاج کی بھی تو ضرورت ہے۔ کتابوں کے نسخے ہر مریض کے مزاج کے موافق نہیں ہوتے۔ گو کسی خاص حالت میں مریض کے موافق ہوں تشخیص مرض کے بعد طبیب کامل بھی کتابوں ہی سے نسخے دیکھ کر یا یاد کر کے علاج کرے گا مگر اس کے ساتھ وہ مزاج مریض کی رعایت کر کے کتابی نسخہ میں کچھ تغیر و تبدل بھی ضرور کرے گا اور جس کو تشخیص بالکل نہیں آتی وہ اس کی رعایت کیونکر کرے گا۔ مگر عوام اس شخص سے اس لئے علاج کراتے ہیں کہ تشخیص فعل آنی ہے جو ایک دفعہ نبض دکھانے سے ہو جاتی ہے اور علاج فعل زمانی ہے۔ اس کے لئے زیادہ مدت کی ضرورت ہے اور لائق طبیب کو بار بار بلانے میں فیس اور کرایہ کا خرچ بہت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لائق طبیب کو ایک دفعہ بلا کر تشخیص اس سے کرا لیتے ہیں اور علاج اس سستے عطائی سے کرا لیتے ہیں۔

ایسے ہی ترجمہ دیکھ کر طبیب بننے والوں پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ کانپور مطبع نظامی میں ایک شخص کا خط آیا جس میں املا بھی درست نہ تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں فتوے بھی دے لیتا ہوں میرے پاس شرح وقایہ بروزن عطیہ کا اردو ترجمہ موجود ہے اس سے مسائل کا جواب دے لیتا ہوں فتویٰ بھی لکھ لیتا ہوں اور وعظ بھی کہہ لیتا ہوں۔ میرے پاس وعظ کی بھی ایک کتاب ہے۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ آپ سے سب فیض تو جاری ہو گئے مگر طب کا فیض نہیں ہے اس کو بھی جاری کیجئے۔ تو اگر آپ کے مطبع میں "طب احسانی" اردو ہو تو میرے نام ارسال کر دیجئے تاکہ یہ فیض بھی جاری کر دوں۔ (میرے نزدیک یہاں فا۔ کی جگہ حلہ ہونا چاہیے تھی)۔

ایسے ہی ترجمہ دیکھنے والوں کی ایک یہ بھی حکایت ہے کہ ایک غیر مقلد صاحب جب امام بنتے تو ہل ہل کر نماز پڑھاتے اور تنہا نماز میں ذرا حرکت نہ کرتے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو کہا، حدیث میں آیا ہے من ام منکم فلیخفف جس کا ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا کہ جو امام بنے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ ان حضرت نے ہلکی کو یوں پڑھا کہ ہا کو کسرہ دیا اور یار کو مجہول پڑھا یعنی ہل کے نماز پڑھائے۔ اس لئے وہ امامت کے

وقت خوب جانتے تھے۔ خدا بچائے اس جہالت سے۔

ایسے ہی ایک دنیا پرست مولوی نے ایک شخص کو فتوے لکھ دیا تھا جو میں نے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا کہ ساس سے نکاح کرنا جائز ہے اور دلیل یہ بیان کی۔ ساس وہ ہے جو منکوحہ کی ماں ہو اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح ہوا ہو۔ اور اس شخص کی بیوی جاہل ہے جس کی زبان سے کفریات کا صدور غالب ہے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان ہوئی نہیں۔ اس لئے وہ منکوحہ بنکاح صحیح نہیں تو اس کی ماں ساس بھی نہیں۔ کم بخت نے محض گمان وتخمین پر نکاح کو بھی فاسد کر دیا اور منکوحہ کی ماں کو بھی حلال کر دیا اور حرمت مصاہرت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ابو حنیفہ کی رائے ہے ہم اسکو نہیں مانتے۔ یہ واقعات تو میں نے استطراداً بیان کر دیئے۔ اصل گفتگو یہ تھی کہ عطائی طبیب آثار کا علاج کرتے ہیں اسباب کا علاج نہیں کرتا۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گاؤں میں ایک شخص تاڑ کے درخت پر اتفاق سے چڑھ گیا۔ جب اوپر پہنچ گیا تو زمین دیکھ کر اترتے ہوئے بہت ڈر لگا۔ شاید اس کو چڑھنا آتا ہوگا اور اترنا نہ آتا ہوگا۔ طریق باطن میں بھی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ترقی تو کرتے ہیں مگر نزول نہیں کرتے جیسے مجذوبین۔ یہ لوگ کامل نہیں بلکہ ناقص ہیں۔ کامل وہ ہے جو عروج و نزول دونوں کا جامع ہو۔ اب وہ لگا چلانے اور شور مچانے کہ مجھے کسی طرح اتارو۔ سب لوگ حیران ہو گئے کہ کس طرح اتاریں۔ آخر کار بوجھ بجھکڑ کو بلا کر لائے جو سب سے زیادہ گاؤں میں عاقل مشہور تھا۔ اس نے اول تو اوپر نیچے دیکھا اور سوچا۔ پھر کہا بس سمجھ میں آگیا۔ ایک لمبا سا رسہ لاؤ اور اس کے پاس پھینکو اور اس سے کہو کہ اپنی کمر سے باندھ لے۔ چنانچہ یہ سب کچھ کیا گیا۔ پھر کہا اس رسے کو زور سے جھٹکا دے کر کھینچو۔ لوگوں نے جو جھٹکا دیا تو اس کا بدن تو نیچے آگیا مگر روح اوپر کو اڑ گئی۔ لوگوں نے بوجھ بجھکڑ سے کہا کہ یہ کیا ہوا۔ کہنے لگا، اس کی قسمت ایسی نے تو اسی تدبیر سے بہت آدمیوں کو کنویں سے نکالا ہے۔ یہی حال ان عطائی طبیبوں کا ہے کہ صرف ظاہری آثار کا علاج کرتے ہیں، اسباب کو نہیں دیکھتے۔ ایک ہی نسخہ کو ہر جگہ برتتے ہیں، اسباب مختلفہ کو نہیں دیکھتے جیسے اس احمق نے

رسّی کی ایک ہی تدبیر یاد کرکے کنویں میں بھی استعمال کیا اور درخت میں بھی۔

مجھے ایک عطائی نے آنت اترنے کی دوا دی تھی جو کان میں ڈالی جاتی تھی میں ان عطائیوں کا علاج کبھی نہیں کرتا مگر اس وقت یہ خیال ہوا کہ خارجی علاج ہے اس کا کیا حرج ہے ؎

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

میں نے اس دوا کا استعمال کیا تو اس سے تمام بدن میں برودت کا ایسا غلبہ ہوا کہ حرارت غریزیہ بھی بہت کم ہوگئی۔ آخر میں نے اسے چھوڑا اور طبیب سے رجوع کیا۔ کئی دن کے بعد مختلف ادویہ سے حرارت غریزیہ اپنے حال پر آئی۔

شیوخ کی پہچان

جس طرح طب جسمانی میں بعض عطائی ہیں ایسے ہی طریق باطن میں بعض شیوخ اناڑی اور عطائی ہوتے ہیں، اس لئے میں شیوخ کی پہچان بتاتا ہوں جن میں ایک قبل رجوع ہے ایک بعد رجوع ہے۔ قبل رجوع تو یہ بات دیکھنی چاہیئے کہ علمائے عصر کا اس سے کیا برتاؤ ہے وہ اس کے متعلق کیا گواہی دیتے ہیں۔ اگر وہ اس کے کمال کے معتقد ہوں تو اس کو کامل سمجھنا چاہیئے۔

دوسری بات بعد رجوع کے قابل لحاظ یہ ہے کہ ابھی اس سے بیعت ہونے میں جلدی نہ کرو بلکہ اس سے اپنا حال عرض کرکے کام کرنا شروع کرو۔ اور اگر وہ بدون بیعت کے کام نہ بتلائے تو وہ ناقص ہے، اس کو چھوڑو کسی اور سے رجوع کرو، اور اول کام کرو پھر کام شروع کرکے اپنے حالات سے اس کو اطلاع دو اور یہ دیکھو کہ اس کے جوابات سے اطمینان و تسلی ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر اطمینان ہوتا ہو تو سمجھو کہ یہ شخص محقق ہے منزل شناس ہے اور اطمینان نہ ہوتا ہو تو سمجھو کہ ناقص ہے جو احوالِ سالکین کی حقیقت کو نہیں سمجھتا، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

وعدہا باشد حقیقی دل پذیر　　　وعدہا باشد مجازی تاسہ گیر

تاسہ گیر کے معنی ہیں اضطراب جھوٹے وعدوں سے اضطراب ہوتا ہے اور سچی باتوں سے تسلی ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی ہے الصدق طمانینۃ والکذب ریبۃ

وعدہ اہل کرم گنج رواں
وعدہ نا اہل چوں رنج زواں

عارف شیرازی ایسے ہی اناڑیوں کی شکایت فرماتے ہیں اور یہ بھی ایک علامت ہے شیخ کے غیر محقق ہونے کی جو عارف کے کلام میں مذکور ہے ؂

خستگاں را کہ طلب باشد و قوت نبود
گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

بعض شیوخ ہر شیخ کو یہ بتلاتے ہیں کہ چھ مہینے ہمارے پاس رہو۔ اب ایک شخص صاحب اہل وعیال ہے۔ اس کو بھی یہی بتلا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ کو تو ہمت نہیں شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ پھر ہمارے پاس کیوں آئے۔ یہ جواب اس کے غیر محقق ہونے کی علامت ہے۔ اگر کوئی طبیب بچاس روپیہ کا نسخہ لکھے اور غریب آدمی افلاس کا عذر کرے اور طبیب یوں کہے کہ پھر ہمارے پاس کیوں آئے تو وہ طبیب نہیں ہے۔ طبیب کامل وہ ہے جو غریبوں کا علاج دھیلے اور پیسہ کی دوا سے کرے۔

ہمارے حضرت استاد علیہ الرحمۃ نے ایک رئیس کو جامن کی گٹھلیوں کا استعمال کرنا بتلایا۔ ایک رئیس کا علاج دودھ میں اگاکر بیل کو جوش دیکر پینا بتلا دیا اور ایک شخص کو سویاں ابال کر کھانا بتلایا۔ آپ کے نسخے ہمیشہ پیسہ دو پیسہ کے ہوتے تھے اور بعض دفعہ بالکل مفت کی جنگلی دوا بتلاتے تھے۔ اطبا دیوبند کہا کرتے تھے کہ یہ مولانا کی کرامت ہے طب نہیں کہ ایسی معمولی چیزوں سے نفع ہو جاتا ہے۔ مولانا اس کو سن کر ہنستے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ لوگ طب سے ہی واقف نہیں۔

تو محقق کی تلاش کرو اور جب محقق مل جائے تو اس کی اطاعت کرو اور اس کے سامنے اپنی تجویز و رائے کو فنا کر دو۔ پہلے یہ حالت تھی کہ طالبین مشائخ کی ایسی اطاعت و انقیاد کرتے تھے کہ اگر کسی کو یہ کہا جاتا کہ تم کسی دوسرے سے تعلیم حاصل کرو تو وہ اس پر راضی ہو جاتے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کی اطاعت سے ہم کو نفع ہوگا اور خواہ ہم کسی سے رجوع کریں ہم کو انہی سے فیض ہوگا۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا، تم مولانا محمد قاسم صاحب سے بیعت ہو جاؤ وہ زیادہ کامل ہیں۔ وہ مولانا محمد قاسم صاحب

کی خدمت میں گیا۔ انھوں نے مولانا گنگوہی پر ٹالا اور فرمایا، تم انھی سے بیعت ہو جاؤ۔ وہ زیادہ کامل ہیں۔ وہ پھر گنگوہ حاضر ہوا۔ حضرت نے پھر مولانا محمد قاسم پر ٹالا۔ وہ پھر ان کے پاس آیا۔ اسی طرح کئی بار غریب کو دوڑایا۔ آخر ایک دفعہ گنگوہ میں یا نانوتہ میں قرانُ السعدین ہوا اور دونوں حضرات مسجد جا رہے تھے۔ وہ شخص راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہا، اب تم دونوں جمع ہو۔ میرے متعلق فیصلہ کر لو اور کوئی نہ کوئی مجھے بیعت کرے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہوگا، میں راستہ نہ چھوڑوں گا۔ اس وقت دونوں میں سے کسی نے اس کو بیعت کر لیا مگر آج کل حالت یہ ہے کہ اگر کسی کو دوسرے سے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا جائے تو وہ اطاعت نہیں کرتا اور یوں سمجھتا ہے کہ مجھے ٹال دیا اور غلط مشورہ دیا۔ جب اطاعت و انقیاد کا یہ عالم ہو تو پھر نفع کیونکر ہو۔ یہ گفتگو درمیان میں استطراداً آ گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ محقق وہ ہے جو سبب کا علاج کرے محض آثار کا علاج نہ کرے اور یہی محقق کی علامت ہے۔

حبِ دنیا و نسیانِ آخرت کا مرض

اور حق تعالیٰ کے کلام کی یہی شان ہے کہ اس میں مرض کی تشخیص بھی ہوتی ہے، اسباب امراض بھی بیان کیے جاتے ہیں اور اسباب کا علاج کیا جاتا ہے اور یہاں کسی مریض کو یاس کا جواب نہیں دیا جاتا۔ افسوس! ایسا کامل مطب اور اس کی ایسی بے قدری کہ ہم اس کے لکھنے پڑھنے کا ذرا اہتمام نہیں کرتے۔ گو تمہید طویل ہو گئی ہے مگر اس سے آپ کو اس سببِ مرض کا شدید و قابل اہتمام ہونا تو معلوم ہو گیا ہوگا۔

تو حق تعالیٰ اس مقام پر کفار کے انکار و اعراض کا سبب بتلاتے ہیں کہ یہ باوجود قیام دلائل و اظہار معجزات کے ایمان نہیں لاتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ محض دنیا کو جانتے ہیں یعنی ان کو دنیا کی طرف خاص درجہ کی توجہ ہے جس کی تفصیل آگے بتلاؤں گا اور ان کو آخرت سے غفلت ہے۔ خلاصہ سبب کا دو باتیں ہیں، ایک توجہ الی الدنیا دوسرے غفلت عن الاخرۃ۔ اب اپنے ذہنوں کو ٹٹول کے دیکھئے کہ اس کو کوئی شخص مرض سمجھتا ہے۔ تامل سے معلوم ہوگا کہ کوئی بھی اس کو مرض نہیں سمجھتا اور اگر کوئی مرض

سمجھتا ہے تو معمولی مرض سمجھتا ہے اور جس مرض کو معمولی مرض سمجھا جائے وہ سخت خطرناک ہے۔ حالی کا شعر ہے، گو حالی کا کلام پڑھنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر ان اشعار میں صحیح مضمون بیان کیا گیا ہے اس لئے پڑھتا ہوں ؎

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟
کہا دُکھ بنیں کوئی دُنیا میں ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں — کہے جو طبیب اُس کو ہذیان سمجھیں

حقیقت میں اگر سخت سے سخت مرض کا علاج اہتمام سے کیا جائے تو وہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے: ما من داء الا وانزل اللّٰہ لہ دواء "حق تعالٰے نے ہر مرض کے لئے دوا نازل کی ہے"۔ اور یہ عام ہے امراض ظاہرہ کو بھی یا طنہ کو بھی۔ البتہ اگر کسی مرض کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا جائے اور اس کا علاج نہ کیا جائے یا اہتمام سے نہ کیا جائے تو وہی سخت خطرناک ہے کیونکہ وہ اندر اندر جڑ پکڑلے گا۔ پھر اخیر میں اہتمام و توجہ کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا یہی حالت اس مرض کے ساتھ ہماری ہورہی ہے کہ ہم نے اسکو معمولی بات سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کفر کی جڑ ہے اور کفر کا منشا و سبب ہے۔ کفار کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی اس آیت کی دلالت سے توجہ الی الدنیا اور غفلت عن الآخرت ہے جس کو ہم معمولی خیال سمجھتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ اصل فرع سے اشد ہوتی ہے پس یہ اصل سہل ہے۔ تو اس قاعدہ کے موافق کیا نعوذ باللہ کفر کو بھی معمولی اور سہل کہا جاوے گا؟ ہرگز نہیں! تو ثابت ہو گیا کہ یہ مرض حبّ دنیا و نسیان آخرت کفر سے بھی اشد ہے اور گو خدا کا شکر ہے کہ ہم میں اس درجہ کی غفلت عن الآخرت تو نہیں جس درجہ کی کفار میں ہے اور وہی کفر سے اشد بھی ہے کیونکہ وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں محض دنیا ہی کو جانتے ہیں اور ہم آخرت کے قائل ہیں اور ہمارا اعتقاد ہے کہ دنیا کے سوا ایک دوسرا عالم بھی ہے۔ البتہ حالت یہ ہے کہ اعمال میں اس کا استحضار نہیں نہ اس کے لئے سامان کی فکر ہے۔ تو گو غفلت کا اعلےٰ درجہ ہمارے اندر نہ ہو مگر جس درجہ کی بھی ہے وہ معمولی

بات نہیں بلکہ بہت سخت چیز ہے کیونکہ اس ادنیٰ درجہ کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے۔
زکام۔ کہ نسی اول معمولی درجہ کی ہوتی ہے، پھر وہی رفتہ رفتہ دق اور سل کی صورت
اختیار کر لیتی ہے جب کہ اس کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح افیون و تمباکو شروع
میں قلیل مقدار سے کھایا جاتا ہے پھر وہ خود ترقی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص
ایک رتی افیون کا کھانے والا تھا سال بھر کے بعد وہ کئی ماشے کھانے لگتا ہے کیونکہ
نشہ کی چیز میں خاصیت ہے کہ وہ خود بخود بڑھتی ہے۔ اور حب دنیا بھی ایک نشہ ہے
چنانچہ مشہور ہے کہ سو روپیہ میں ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حب دنیا روز
بروز ترقی کرتی رہتی ہے جس شخص کی تنخواہ ۲۰ روپے ہے وہ کہتا ہے کہ پچاس ہو جائے
تو بہت اچھا ہے۔ جب پچاس ہو گئے تو کہتا ہے کہ ستر ہو جائیں۔ پھر ستر ہو گئے
تو اب سو کی تمنا ہے۔ سو گئے تو اس سے آگے کی تمنا ہے۔ بس وہ حال ہے کہ لا ینتہی
ارب رفعت والنفس للمتنبی وللہ درہ ما ابلغہ حیث قال۔

دہما احسب الاکیاس ان غایتہما — وفاجاتہ بامر غیر محتسب
وما قضی احد منہا لبانتہ — ولا انتہی ارب الا الی ارب

سو لوگوں کو دنیا کا تو ایسا نشہ ہے مگر آخرت میں یہ حالت ہے کہ ہر شخص اس کیلئے
قلیل درجہ پر قانع ہے۔ اگر کسی کو ترقی آخرت کی نصیحت کی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ پانچ
وقت کی نماز تو پڑھتے ہیں اور کیا جان نکالو گے۔ اور بعض تو آخرت کی طرف بھی اسی وقت
تک متوجہ ہوتے ہیں جب تک دنیا سلامت رہے اور اگر دنیا کا نقصان کسی وجہ سے
ہو گیا تو وہ آخرت کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ گویا خدا کی اطاعت و عبادت محض اس خوشامد
سے کرتے ہیں کہ وہ ان کی دنیا کو سنوارتے رہیں اور اگر دین پر عمل کرتے ہوئے اتفاقاً دنیا
بگڑ جائے تو بس خدا سے بھی بگڑ بیٹھتے ہیں۔
چنانچہ ایک دیہاتی نے روزہ رکھا تھا۔ اتفاق سے اسی دن اسکی بھینس مر گئی تو کم بخت
نے لوٹا کو منہ لگا کر پانی پیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہتا ہے اور رکھلے روجا (روزہ)
اسی طرح ایک بڈھے کی اولاد بڑھاپے میں اس کی خدمت نہ کرتی تھی تو وہ گھر چھوڑ کر

تقلیلِ عمل سے ممانعت ہے کیونکہ اس مبالغہ کا انجام تقلیلِ عمل ہی ہے اور بعض صوفیہ
سے جو خود تکثیرِ عمل اور مجاہداتِ کثیرہ منقول ہیں۔ تو اس کا راز یہ ہے کہ ان کے لئے
عملِ صالحہ طبیعتِ ثانیہ اور غذا بن گیا تھا جس کی تکثیر موجبِ ملال و تقلیل نہ تھی۔
اسی لئے جب کسی زاہدِ خشک نے ان پر اعتراض کیا کہ اتنا مجاہدہ کرنا اپنے کو ہلاکت
میں ڈالنا ہے جس سے "لا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ" میں ممانعت ہے۔ تو انھوں نے
جواب دیا کہ ہر ایک کی ہلاکت جدا ہے جس کے لئے تکثیرِ عمل موجبِ ہلاکت ہو وہ تکثیرِ
عمل ترک کرے اور جس کے لئے تقلیلِ عمل موجبِ ہلاکت ہو وہ تقلیلِ عمل کو ترک کرے
اور ہمارے لئے تقلیل موجبِ ہلاکت ہے اس لئے ہم کو تکثیرِ عبادات سے ممانعت نہیں۔
غرض ثمرہ کا انتظار کرنا مضر ہے اس سے عمل میں ہمت چند روز کے بعد شکستہ ہو
جاتی ہے۔ تو ایسی فکر تو مناسب نہیں کہ ہر وقت اسی فکر میں رہے اور ثمرات کی تدبیر
میں لگا رہے۔ تو اتنی فکر بھی نافع نہیں اور ایسی بے فکری بھی اچھی نہیں جیسی آج کل
ہمارے اندر ہے بس یوں کرو کہ اپنی طرف سے تبلیغ کا اہتمام کرو اور ثمرہ کی امید رکھو
مگر اس کے انتظار میں نہ رہو بلکہ اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔
میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل مذہبِ اسلام میں ہر شخص اجتہاد کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے
اس زمانہ کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ نا اہل اپنی حد سے بڑھ کر اہل کی جگہ لینا چاہتے ہیں

؎ آدمیاں گم شدند ملکِ خدا خر گرفت

اور یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ قرآن و حدیث کی فہم کے لئے صرف و نحو وغیرہ کی سخت ضرورت
ہے محض ترجمہ کافی نہیں۔ اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ ایک آیت میں قرآن سے یہ
معلوم ہوتا ہے کہ من تبعیضیہ ہے اور دوسری جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ من بیانیہ ہے
اور یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جس نے صرف و نحو و معانی کو پڑھا ہو محض ترجمہ سے
اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ بہرحال یہ دعویٰ ثابت ہے کہ دنیا تو جتنی چاہتے ہو اتنی
بھی نہیں ملتی اور آخرت چاہتے سے زیادہ ملتی ہے۔

طلبِ آخرت کا طریقہ

ایک اور آیت قابلِ تحقیق ہے:

ام للانسان ما تمنی فللہ الاخرۃ والاولیٰ

یعنی دنیا و آخرت خدا کی ملک ہیں تمہاری تمنا پر مدار نہیں۔ اس میں سوال یہ ہے کہ جب دونوں خدا کی ملک ہیں تو یہ تو معلوم نہ ہوا کہ وہ کس کو دینا چاہتے ہیں اور کس کو نہیں۔ سو اس کو دوسری آیات نے حل کر دیا ہے کہ دنیا کو تو وہ سب کو دینا چاہتے ہیں اور نہ تمنا کے برابر دینا چاہتے ہیں اور آخرت ہر طالب آخرت کو جتنا وہ چاہے گا اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ اب بہت ہی بعید از عقل ہے کہ انسان پھر بھی دنیا کا طالب ہو اور آخرت سے غافل ہو۔

رہا یہ کہ طلب آخرت کی حقیقت کیا ہے۔ تو اجمالاً اس کو سب جانتے ہیں کہ فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب کا نام طلب آخرت ہے مگر میں اس وقت ایسی حقیقت بتانا چاہتا ہوں جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے یعنی اس پر وھم عن الاخرۃ ھم غافلون۔ بطریق مفہوم دال ہے کیونکہ یہاں غفلت پر مذمت ہے پس غفلت کی ضد مطلوب ہوگی اور غفلت کی ضد ہے ذکر و فکر جس کا ترجمہ اردو میں دھیان اور دُھن ہے پس طلب آخرت کی حقیقت یہ ہوئی کہ آخرت کا دھیان اور دُھن ہے۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ اس میں تو کچھ وظیفے وظائف کی بھی ضرورت نہیں۔ بس اتنی ضرورت ہے کہ دل سے آخرت کی یاد ہو اور اس کی دُھن لگی رہے۔ اگر دھیان اور دُھن لگی رہے گی تو اوّل تو تم راستہ سے ہٹو گے نہیں اور اگر ہٹو گے بھی تو جلد ہی متنبہ ہو کر راستہ پر لگ جاؤ گے۔ اور اس کے حصول کا سہل طریقہ یہ ہے کہ صحبت اہل اللہ اختیار کرو۔ گاہے گاہے ان سے ملتے رہو۔ ان کے پاس بیٹھو۔ ان سے باتیں سنو۔ ان سے تعلق رکھو اور اگر یہ میسر نہ ہو تو تذکرہ اولیاء اللہ اس کے قائم مقام ہے۔ اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست ۔۔۔ صراحی مے ناب و سفینۂ غزل ست

سفینۂ غزل سے مراد اہل اللہ کے حالات و ملفوظات کی کتابیں ہیں۔ اگر شیخ کامل میسر ہو تب تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر یہ میسر نہ ہو تو غیر کامل کی صحبت و ملاقات و ملی نسبت بھی ترک کر دو یا کم کر دو کیونکہ غیر کامل کی صحبت سخت مضر ہے۔ اگر اس کے پاس بیٹھ کر محرمات کی طرف بھی گفتگو منجر نہ ہو تو مباحات ہی میں زیادت ہوگی اور مباحات میں حد سے زیادت مضر ہے۔ حدیث میں ہے:

ایاکم وکثرۃ الضحک فانھا تمیت القلب

جتنا جائز ہے مگر اس کی کثرت دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ حضرت فریدؒ فرماتے ہیں ؎

گرچہ گفتارش بود درّ عدن | دل ز پُر گفتن بمیرد در بدن

اور اگر باتیں بھی زیادہ نہ ہوں تو کم از کم دل تو اس کی طرف جب تک بیٹھے رہو گے بلاضرورت متوجہ رہے گا۔ تو یہی کس قدر ضرر ہے کہ قلب کو غیر اللہ کی طرف بلا ضرورت مشغول کیا گیا۔ اس ضرر کا احساس ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کو خدا کی طرف دل لگانے کچھ مزا حاصل ہے۔ اسی راز کی وجہ سے ہمارے اکابر نے توجہ متعارف کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ اس میں شرط یہ ہے کہ مخاطب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا تصور بھی اس کے تصور سے زیادہ نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے حضرات کو کسی وقت بھی کسی چیز کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوتی ممکن ہے کسی وقت کسی چیز کی طرف ان کو بھی زیادہ توجہ ہوتی ہو مگر ایک تو اتفاقاً بلا قصد ایسا ہو جائے اور ایک یہ کہ قصداً ایسی توجہ کر بیٹھے کہ خدا کا تصور بھی اگر آئے تو اس کو مغلوب کیا جائے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ہمارے حضرات کو قصداً ایسا کرنا پسند نہیں۔ اور بلا قصد کسی شے کی طرف توجہ ہو جائے وہ اور بات ہے۔ اپنی طرف سے وہ ہمیشہ یہی قصد رکھتے ہیں کہ توجہ الی اللہ سب سے زیادہ ہو اور کوئی شے اس سے مانع نہ ہو۔ باقی جو لوگ توجہ متعارف کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں میں ان پر اعتراض نہیں کرتا اُن کی نیت بخیر ہو گی تو اُن کو بھی کچھ ثواب مل جائے گا۔ وہ نیت یہ ہو گی کہ توجہ للہ بجائے توجہ الی اللہ کے ہے مگر عاشق کو کب گوارا ہے کہ قصداً غیر کی طرف متوجہ ہو۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شاعر نے ایک محفل میں یہ شعر پڑھا ؎

اُس کے کوچے سے جب اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں | تا نظر کام کرے رو بہ قفا جاتے ہیں

وہاں ایک اور شاعر بھی تھا اُس نے فوراً اس کا رد کیا اور کہا ؎

اُس کے کوچے سے کب اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں | وہ ہوسناک ہیں جو رو بہ قفا جاتے ہیں

یہ شخص عاشق تھا کیونکہ اس مضمون کو عاشق ہی رد کر سکتا ہے ورنہ ظاہر میں پہلے شعر کا مضمون بھی اچھا تھا مگر مذاقِ عشق کے خلاف تھا۔ حضرت! عاشق کا مذاق تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دم بھی محبوب سے غافل ہونے کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اپنی طرف سے ہر دم وہ

ادھر ہی متوجہ رہتا ہے خواہ محبوب متوجہ ہو یا نہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے ؎

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے   پر تم کو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے

مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش   تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یہ می تراش و می خراش دھیان اور دھن ہی کا ترجمہ ہے کہ ہر وقت اِدھر کو لگی رہے کیونکہ

تا دمِ آخر دمے آخر بود   کہ عنایت با تو صاحب سر بود

اور ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی   شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کوئی بد انتظام ہو جس سے نباہ کر کام نہ ہوتا ہو کبھی تو توجہ الی اللہ زیادہ ہوتی ہے کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا، معمولات بھی پابندی سے ادا نہیں ہوتے تو وہ بھی گھبرائے نہیں کیونکہ حضرت استاد علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے اس بد نظمی اور عدمِ دوام کی شکایت کی تھی، تو حضرت نے فرمایا کہ ہر شخص کا دوام جدا ہے۔

دوام کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ کبھی ہو کبھی نہ ہو یعنی ایسی حالت پر دوام ہو جائے کہ ذکر و فکر کو بالکل نہ چھوڑے بلکہ مہینہ میں بیس دن کام کر لیا دس دن چھوڑ دیا۔ یا دس دن کام کر لیا بیس دن چھوڑ دیا۔ اگر یوں کرتا رہا تو اس کا دوام یہی ہے یہ بھی محروم نہ رہیگا۔[1]

ایک دفعہ میرے ایک دوست کا منظوم خط میرے پاس آیا جس میں اول سے آخر تک اسی بد نظمی کی شکایت تھی۔ جی چاہا کہ میں بھی شعر میں جواب دوں اور شعر بھی اسی بحر کا ہو۔ اسی وقت مثنوی کا ایک شعر یاد آیا جس میں سلسلے خط کا جواب تھا تو میں خوش ہوا اور میں نے لکھا ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی   کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

یعنی ترک کلی سے کوشش بیہودہ ہی اچھی۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کا ارشاد ہے ؎

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں   گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

بلکہ میں اور ترقی کرتا ہوں کہ بد نظمی اور عدمِ دوامِ ذکر تو کیا اگر گناہ بھی ہو جاتے تو جب بھی یہ نہ سمجھو کہ مردود ہو گئے بلکہ پھر بھی اللہ تعالیٰ ہی کو لپٹو اور یہ سمجھو کہ گناہ کا علاج بھی وہی کر سکتے ہیں۔

---

[1] اور یہ حدیث دوام کی تعمیم نہیں ہے بلکہ ضعیف کی تقویت ہے کہ اس سے مطلوب دوام سے وہ دوام مطلوب پیدا ہو جاوے گا تو بحکم مقدمۃ الشئی فی حکم الشئی اسی کو بھی نام دوام فرما دیا ۱۲ منہ

حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر ایک بار وحی آئی کہ اے موسیٰ! میرا محبوب بندہ وہ ہے جو مجھ سے ایسا تعلق رکھے جیسا بچّہ ماں سے رکھتا ہے۔ پوچھا، الٰہی! یہ تعلق کیسا ہوتا ہے؟ فرمایا کہ ماں بچہ کو مارتی ہے اور بچّہ اسی کو لپٹتا ہے۔ پس گناہ کرکے بھی اُن کو نہ چھوڑو بلکہ انہی سے لپٹو۔ اب بتلائیے اس سے بھی زیادہ کوئی آسان طریقہ کامیابی کا ہوگا؟ اس میں تو کوئی بھی دشواری نہیں کچھ خرچ بھی نہیں۔ اس کو اختیار کیجیے، اس سے طاعات پر استقامت اور محرمات سے اجتناب سہل ہو جائے گا کیونکہ اس سے آپ کو حق تعالےٰ کی محبّت پیدا ہو گی اور طلب و محبّت تو وہ چیز ہے کہ ایک طوائف کا طالب اس پر جان و مال فدا کردیتا ہے اور ایک امرد کا طالب اس کے لئے ریاست کو تباہ کر دیتا ہے۔ پھر کیا خدا کا طالب اس کے لئے جان و مال سے دریغ کریگا خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ آپ کا جان و مال تباہ بھی نہیں کرنا چاہتے بلکہ سب کو صحیح سلامت رکھ کر اس میں برکت و ترقّی کا وعدہ فرماتے ہیں۔

واللہ یدعوالیٰ دارالسّلام

اور مشاہدہ ہے وہ اپنے طالب کو دونوں جگہ دارالسلام ہی میں رکھتے ہیں پس اگر اور بھی کچھ نہ ہو سکے تو کم ازکم یہ آسان کام تو اختیار کرلیا جائے کہ آخرت کا دھیان اور دھن رکھا جائے مگر افسوس! عوام تو کیا علماء میں بھی اس کی کمی ہے علماء میں نماز روزہ تو ہے مگر دھیان اور دُھن اور اللہ تعالیٰ سے تعلق، اُن سے لَو لگانا، لگا لپٹنا، محبّت میں گھُلنا یہ نہیں ہے اور بدوں اس کے کام نہیں چلتا۔ کیونکہ بدوں اس کے نماز روزہ پر استقامت خطرے میں رہتی ہے ہر وقت مجاہدہ اور نفس سے منازعت رہتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ منازعت کے ساتھ اوّل تو کام ہی خود دشوار ہوتا ہے پھر اس پر دوام کی امّید نہیں اور تعلق مع اللہ کے ساتھ منازعتِ نفس ختم ہوجاتی ہے اور دوام عمل کی امّید غالب قریب بہ یقین ہو جاتی ہے۔ اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

> ھمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی
> کہ درازو دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رسم پارسائی سے مُراد زہدِ خشک ہے اور رہ قلندر سے مُراد طریقِ عشق ہے۔ فرماتے ہیں کہ طریقِ زہدِ خشک بہت دُور دراز کا راستہ ہے۔ مجھے تو طریقِ عشق میں چلائیے

اس کی قدر کی گئی کہ یہ غریب کا عطیہ ہے حالانکہ مقصود محض اس بہانہ سے بڑی رقم
وصول کرنا ہے۔ صاحبو! ان لوگوں سے غریبوں کی کیا قدر ہو گی غریبوں کی قدر وہ کرے
گا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تو صاحبزادے نے شکریہ میں بہت لوگوں
کی دعوت کی۔ مولانا نے اپنے ایک خاص خادم سے فرمایا کہ جب غریب لوگ کھانا کھا چکیں
تو ان کے سامنے کا بچا ہوا کھانا جو کہ سقوں کو دیا جاتا ہے وہ سب میرے پاس لے آنا
کہ وہ تبرک کھاؤں گا اور خیال نہ کرنا کہ ان کا بدن صاف نہیں۔ اُن کے کپڑے صاف نہیں۔
اور اس کو تبرک اس لیے قرار دیا کہ اول تو وہ لوگ مومن ہیں۔ دوسرے اُن کی یہ شان ہے کہ
حدیث قدسی میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے انا عند المنکسرۃ قلوبھم۔ اسی لیے حدیث میں آیا
ہے یا عائشۃ قربی المساکین۔ چنانچہ وہ کھانا حضرت کے پاس لایا گیا اور حضرت نے
اس کو نہایت رغبت سے کھایا۔ تو کیا کسی نے اس قسم کی قدر غریبوں کی کر کے دکھائی ہے؟
مگر اس قدر دانی کی بھی نئی نئی فریب آمیز صورتیں ایجاد ہوئی ہیں کہ اس کی ایک
جوتی کو سینکڑوں روپیہ سے فروخت کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں علاوہ تلبیس کے ربوٰ
بھی لازم آتا ہے کیونکہ اس صورت میں تفاضل ہو جاتا ہے اور تفاضل ایک جنس میں ربوٰ
ہے اور اگر ربوٰ کا کوئی علاج بھی کر لیں تو تلبیس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

ایک مقام پر ایسا ہوا کہ ایک جوتی فروخت ہونے لگی۔ ایک غریب آدمی نے جو سبق
پڑھا ہوا تھا اس پر ایک ہزار روپیہ لگا دیا اور بیچنے والوں نے اسی کے نام پر نیلام
ختم کر دیا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ جوتی میرے نام پر ختم ہو گئی ہے تو رونے لگا۔ لوگوں
نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو صرف اس
لیے ایک ہزار کہہ دیا تھا کہ لوگ سن کر اس سے آگے بڑھیں گے۔ انجمن والوں کا فائدہ
ہو جائے گا۔ آخر ایک صاحب اُٹھے اور فرمایا کہ قوم میں کوئی ایسا نہیں جو اس عالی ہمت
غریب کا قرضہ اپنے ذمہ لے لے۔ غرض اس غریب کے واسطے پھر چندہ کیا گیا اور اس
طرح پر ایک ہزار کی تعداد پوری کی گئی۔

ہمارے غور ہے کہ یہ کارروائی صدق سے کس درجہ بعید ہے اور حاجو! یہ صدق ہی وہ چیز ہے جو کہ آج مسلمانوں سے بالکل مفقود ہے کہ اب ان کی ہر بات میں ایک پہلو ہوتا ہے۔ ہاں مخلصین میں اب بھی بحمد للہ یہ صدق باقی ہے۔ بغرض یہ حالت چندہ کی ہوتی ہے۔ اور اس مذاق والوں کی یہ حالت ہے کہ گویا یہ کام کر لیا تو دین پر پورا عمل کر لیا۔ نہ ان کو پھر نماز کی ضرورت ہے نہ روزہ کی۔ اور اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو گھروں میں۔ گویا مسجد میں آنے کی ان کو بالکل معافی ہے۔

اُمراء کے لچر حیلے

ایک رئیس صاحب کہنے لگے کہ مسجد میں کس طرح جائیں۔ وہاں نہ چٹائی ٹھیک ہے، نہ وہاں فرش پنکھے کا انتظام ہے۔ جگہ جگہ کائی جم رہی ہے۔ گھر پر ہر طرح کی آسائش ہے۔ میں نے کہا ذرا سنبھل کر شکایت کرو۔ یہ تم کس کی شکایت کرتے ہو۔ غریبوں کی یا خدا تعالےٰ کی۔ سو غریبوں کی شکایت تو اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ان کے پاس اتنی وسعت ہی نہیں کہ وہ سب سامان کر سکیں۔ خدا تعالیٰ کی شکایت اس لئے نہیں ہو سکتی کہ یہ خدا تعالےٰ کا اوّل تو کام ہی نہیں تمہارا کام ہے۔ دوسرے خدا تعالیٰ کیا فرشتوں سے کام لیں۔ یہ بھی خدا کا کرنا ہے کہ تم کو حکم دیا خدمتِ مساجد کا اور اس کے لئے وسعتِ مالی دی۔ پس یہ معلوم ہوا کہ تمہاری ہی کوتاہی ہے اس لئے تم اپنی ہی شکایت کر رہے ہو۔ اگر تم مسجد میں جاتے تو تم کو اس کی عشق ہوتی اور خیال پیدا ہوتا اور لطف یہ کہ بعضے لوگ مسجد کی مدد تو کیا کرتے، اُلٹا مسجد کی چیزیں اپنی ملک کے طور پر سمجھتے ہیں اور منگا منگا کر اپنے اپنے کاموں میں لاتے ہیں اور اگر کوئی روکے تو اُس غریب پر خفگی ہوتی ہے کہ مسجد کیا تمہاری ملک ہے؟ نہیں صاحب! مسجد تمہاری ملک ہے کہ اس کی چیزیں تم خوب استعمال کرو۔ کبھی مسجد میں کچھ دینے کی بھی توفیق ہوئی؟

ایسے لوگوں کی حالت بعینہٖ اس قصائی کی سی ہے کہ اس کا ایک رشتہ دار قصائی مر گیا۔ اس کی بیوی یہ کہہ کر روتی تھی کہ ہائے! تیری چھریاں کون لے گا؟ تیرے مویشی کون لے گا! وہ شخص ہر بات کے جواب میں بول اٹھتا تھا کہ میں لوں گا۔ اس پر وہ عورت تو حرمیں لوٹی کہ تیرا قرضہ کون دے گا۔ تو وہ صاحب کہنے لگے، لو لو بھائی کس کی بارہ ہے؟

تذکیر الآخرہ

آخرت کی یاد

قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھ لینا۔ اس میں سائنس و فلسفہ کے مسائل ڈھونڈنا اور کواکب وغیرہ کی تحقیقات کرنا بالکل ایسا ہے جیسے طبِّ اکبر میں جوتے سینے کی ترکیب دیکھنا۔

❖

قرآنِ مجید میں تو روحانی تربیت اور اصلاح کے نسخے ملیں گے سائنس و فلسفہ سے اسے کیا تعلق!

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمد عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم ۔ اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ کلا بل تحبون العاجلۃ وتذرون الاٰخرۃ ۔

تمہید

میں اس وقت جس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے اور مولوی شبیر احمد صاحب کی تقریر "دارالاخرۃ" کا گویا تتمہ ہے ۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں اعتقادِ آخرت کا بیان کیا ہے ۔ میں آخرت کے متعلق عمل کا بیان کرنا چاہتا ہوں ۔ جو آیت میں نے اوپر بیان کی ہے اس میں خداوند تعالیٰ زجر و توبیخ کے ساتھ فرماتا ہے کہ تم لوگ اس کو پسند کرتے ہو جو عاجلہ ہے اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو حاصل اس کا یہ ہے کہ جو لوگ دُنیا کو لئے ہوئے ہیں اور دنیا میں مبتلا ہیں اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہیں ان کے لئے اس آیت میں تنبیہ ہے ۔ پہلا مضمون (مولوی شبیر احمد صاحب کا مضمون) علمی تھا اور یہ گویا عملی ہے ۔ اور چونکہ مقصود علم سے عمل

ہی ہے اس لئے یہ مضمون گویا اس مضمون کا متمم ہے اور ہر چند کہ بعض علوم ایسے ہیں جو قطع نظر عمل سے خود من حیث العلم بھی مقصود ہیں اور اسی لئے حکما نے بھی اپنے فنون کے مثلاً کتاب ہی کے دو جزو قرار دیئے ہیں علمی اور عملی۔ اور تمام دنیا اس تقسیم کو مانتی ہے۔ اور یہ دونوں ہی مطلوب ہیں لیکن تاہم وہ علوم مقصود بھی نظرِ غائر میں کسی نہ کسی عمل سے من وجہٍ ضرور تعلق رکھتے ہیں مثلاً خدا کے ایک ہونے کا اعتقاد ایک مقصود ہے مگر عمل میں بھی اس کا ایسا خاص اثر ہے کہ جس درجہ کا یہ اعتقاد ہوتا ہے اسی درجہ تک اس عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔

عارف اور عامی کی عبادت کا فرق

عارف و صحابہ کی عبادت اور ہماری عبادت کا فرق مراتب کا یہی راز ہے۔ عارف و صحابہ کی عبادت خواہ مالی ہو یا بدنی اس کے مقابلہ میں کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی صحابہ کی عبادت میں کیا بات زیادہ ہے؟ وہی علم و خلوص عارف کی دو رکعتیں ہماری دو لاکھ رکعتوں سے بہتر و افضل ہیں اس لئے کہ علم و اذعان اور خلوص اس میں اس قدر پایا پایا جاتا ہے جو ہماری عبادت میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت مرشدی نے فرمایا تھا کہ عارف کی دو رکعت غیر عارف لاکھ رکعت سے بہتر و افضل ہیں۔ حضرت نے یہ غلط نہیں کہا اور نہ اس میں مبالغہ ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو میرا صحابی آدھا مد غلہ خیرات کرے وہ اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ اگر اس حدیث کی بنا پر آدھ سیر غلہ کے مقابلہ میں آدھ سیر سونا لیا جائے اور اس کی نسبت سے اُحد پہاڑ کو دیکھیں تو نسبت معلوم ہو گی کہ کیا ہے۔ اور اگر یہ نسبت اس طرح لی جائے کہ بجائے آدھ سیر غلہ کے اس کی قیمت لے کر بھر سونے کی قیمت سے موازنہ کیا جائے تو اور زیادہ نسبت حاصل ہو گی اور یہ ثواب کی زیادتی صرف علم معرفت کی زیادتی سے ہے۔ اور اس سے اچھی طرح صحابہ کی عبادت اور ہماری عبادت کی نسبت معلوم ہو سکتی ہے۔

بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ مولوی بھی عجیب آدمی ہیں کہیں اس حدیث کی علت محبت

وخلوص کو بتلاتے ہیں اور کبھی علم و معرفت کو۔ اور ایک ہی حدیث سے متعدّد مواقع پر متعدّد کام لیتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ خلوص و محبّت کا جذبہ بھی علم و معرفت ہی سے حاصل ہوتا ہے جو صحابہ میں پایا جاتا تھا۔ پس ایک ہی چیز ہے خواہ اس کو خلوص سے تعبیر کرو خواہ علم و معرفت سے۔ خوب کہا ہے ؎

عباراتنا شتّیٰ وحسنک واحد وکلّ الیٰ ذاک الجمال یشیر

اسی علم و معرفت سے ان حضرات کو وہ ادراک عطا ہوا تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّل بار دیکھا تو باوجودیکہ اس وقت تک وہ خلوص جو بعد صحبت میسّر ہوا نہ تھا مگر طلبِ حق کا جس قدر خلوص تھا اسی کا یہ اثر تھا کہ دیکھتے ہی بے ساختہ بول اٹھے ھذا لیس بوجہ کذاب ؎

نیک ہیں باشی اگر اہلِ دلی نورِ حق ظاہر بود اندر ولی !

کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور مردِ حقّانی کی پیشانی کا نور

سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود

تو جب وہ کامل خالص ہو گیا ہو گا تو کیا حال ہوا ہو گا ؎

صاف گر باشد ندانم چوں کند جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند

صحابہؓ کے علم کی حقیقت

غرض صحابہؓ کو علمِ خالص تھا۔ اسی وجہ سے ہماری سعادت کاملہ یہی ہے کہ صحابہ کا اتّباع کریں۔ ایک نظیر سے اس واقعہ کی کہ ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقشِ قدم پر کیوں چلیں اور ان کی زندگی ہماری رہنما کیوں ہے۔ تحقیق نہایت دلنشیں مثال سے ہو سکتی ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ ریل کس طرح چلتی ہے۔ ریل کے چلنے میں متحرک اوّلاً انجن ہے ہر گاڑی میں انجن نہیں ہوتا بلکہ اگر ہر گاڑی میں انجن ہوتا تو شاید ریل چلتی بھی نہیں بلکہ ساری گاڑیوں کے لئے ایک ہی انجن ہوتا ہے جو سب کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ترکیب یہ حرکت کی اولیہ ایک چیز میں ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کو مرتبط کر دیا جاتا ہے جیسا کہ ریل گاڑی میں ہوتا ہے کہ انجن صرف متحرک اوّلاً ہوتا ہے اور ساری ریل گاڑی انجن سے مرتبط ہوتی ہے۔

اکیلا انجن جو متحرک اولاً ہے ساری گاڑیوں کو بمارکا سے کلکتہ تک لے جاتا ہے۔

جب ایک انجن متحرک اولاً بہت سی گاڑیوں کو ہزار ہا کوس لے جاتا ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ایک شخص صحابہؓ سے تعلق رکھنے والا قدا تک پہنچ سکے جو شخص خدا تک پہنچ جاتا ہے وہ صحابہؓ کے انجنوں سے مرتبط ہو جائے ۔

دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید ۔۔۔ بود مولے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد

ایک چیونٹی تھی غریب و مفلوک الحال ۔ اس نے حج کے جانے کا ارادہ کیا لیکن کوئی سامان پاس موجود نہ تھا اسی فکر میں حیران و پریشان تھی ۔ حجاج سے ترکیب پوچھی ۔ حاجیوں نے بتلایا کہ جہاز میں اتنے دنوں سفر کرنا پڑتا ہے اور اونٹوں پر اتنے دنوں سفر ہوتا ہے ۔ تب کہیں یہ ہزار ہا میل کا سفر ختم ہوتا ہے لیکن اس میں بڑی دقتیں ہیں ۔ ہزاروں میل کا سفر ، سینکڑوں روپیہ کا خرچ ، چور ڈاکو کا خوف ، جان کا خطرہ ، غرض بڑی بڑی تکلیفیں ہیں ۔ جن کو اٹھا لینے کے بعد کہیں حج نصیب ہوتا ہے ۔ بیچاری یہ سن کر سخت پریشان و ہراساں ہوئی ۔ اسی ذوق و شوق اور غمگین حالت میں تھی کہ ناگہاں ایک رہبر نظر آیا جو مصداق تھا اس شعر کا

لے لقائے تو جواب ہر سوال ۔۔۔ مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اور اس نے پوچھا کہ کہو کیسی حالت ہے ۔ بیچاری رنج و غم میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ ایک دردمند کو پاکر کچھ تسکین حاصل ہوئی اور کہا کہ میری حالت کیا ہے حج کو جانا چاہتی ہوں ۔ دل میں شوق محبت بھرا ہوا ہے لیکن پہنچنے کے وسائل نہیں ۔ اس وجہ سے غمگین و پریشان ہوں ۔ اگر کوئی تدبیر آپ بتلا سکیں تو للہ بتلائیے ۔ اس شخص نے کہا کہ اچھا میں ایک طریقہ بتلاؤں اگر نخوت و تکبر نہ کرو کیونکہ نخوت و تکبر سے مقصد حاصل نہیں ہوتا اور آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے ۔ اس نے کہا بہت بہتر میں ہر طرح راضی ہوں ۔ اتنے میں ایک کبوتر آگیا اور جنگل میں دانہ چگنے لگا ۔ وہ شخص جانتا تھا کہ یہ کبوتر حرم جانے والا ہے ۔ اس سے کہا ، اگر تم جانا چاہتے ہو تو اس کبوتر کے پاؤں پکڑ لو اور نخوت و غرور نہ کرو ۔ حرم میں پہنچ جاؤ گی

دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید ۔۔۔ بود مولے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد

اتباع سے عار کی وجہ

غرض اس سے یہ ہے کہ وابستگی و ارتباط میں نخوت و غرور اور تکبر نہ کرو ۔ وابستگی و

ارتباط میں استنکاف کا ہونا ناکامیابی کی دلیل ہے۔ اگر وابستگی کے ساتھ استنکاف کرو گے تو ہرگز کامیاب نہ ہوگے اور رہ جاؤ گے۔ مسلمانوں میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ وہ متقدا سے ارتباط اور تعلق پیدا کریں کیونکہ مسلمانوں میں اتباع سے عار پایا جاتا ہے اور وجہ استنکاف کی یہ ہے کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اپنے کو دولتمند اور صاحب عزت خیال کرتے ہیں اور عارف باللہ اکثر غریب و خستہ حال ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ خیال کرکے کہ یہ لوگ چھوٹی حیثیت کے ہیں، غریب و مفلوک الحال ہیں۔ میلے کچیلے اور بدحیثیت ہیں۔ اور ہم بڑے دولت مند صاحب عزت ہیں۔ ہمارا اور ان کا کیا جوڑ۔ ہم ان سے کیا تعلق اور ربط پیدا کریں۔ افسوس! اسی چھوٹے بڑے کے خیال نے شیطان کو راندۂ درگاہ بنایا۔ یہاں شیطان نے بھی تو کہا تھا کہ میں ایک چھوٹی حیثیت کے وجود کو جو مجھ سے ارذل اور کمتر ہے کیوں سجدہ کروں۔ یہی نخوت و تکبر اس کی تباہی کا موجب بنا اور اسی نے اس کو کھویا اور یہی ہم کو خراب کر رہا ہے۔ آج یہ مرض مسلمانوں میں کثرت سے ہے اور ہر شخص اس میں مبتلا پایا جاتا ہے۔

میں اعتراضاً نہیں کہتا بلکہ شفقت کے لحاظ سے کہتا ہوں مسلمانو! اس خیال کو چھوڑ دو۔ ہماری ناکامیابی کی یہی وجہ ہے اور ہماری تباہی کا یہی موجب ہے۔ اس صورت پرستی نے ہم کو برباد کر دیا ہے۔ اہلِ حقیقت صورت کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انساں بُدے — احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند — نیستند آدم غلافِ آدم اند

لباس کو چھوٹے بڑے ہونے کا سبب نہ بناؤ۔ لباس کو دیکھ کر چھوٹے بڑے ہونے کا خیال نہ کرو۔ مولوی صاحب دس روپیہ کے نوکر ہیں۔ میلے کچیلے اور ٹوٹے پھوٹے حال میں ہیں۔ اس کی طرف نہ دیکھو۔ لباس کے اچھے بُرے ہونے سے آدمی کا اچھا بُرا ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر شریعت مجبور نہ کرتی تو اہل اللہ اور عارف باللہ پائجامہ بھی نہ پہنتے ان لوگوں کو جسم کی آرائش اور زینت سے کیا کام ؎

نباشد اہلِ باطن در پئے آرائشِ ظاہر — بنقاش احتیاجے نیست دیوارِ گلستاں را

ذوقؔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

عُریاں ہی دفن کرنا تھا بہتر زبیر مجھے — اِک دوستوں نے اور لگا دی کفن کی شاخ

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بادشاہ ذی حشمت و شوکت تھے لیکن انکے بھائی لنگی باندھے ہوئے پھرا کرتے تھے۔ بادشاہ کو شرم آتی تھی کہ میں اتنا بڑا بادشاہ اور میرا بھائی صرف لنگی باندھے ہوئے پھرا کرتا ہے۔ اُن کو بلا کر بادشاہ نے کہا کہ بھائی مجھے شرم آتی ہے، تم پائجامہ تو پہن لو۔ انھوں نے کہا کہ ایک شرط ہے کہ جب کرتا بھی ہو۔ کہا کرتے پہن۔ کہا کرتے کے ساتھ ٹوپی بھی ہو۔ بادشاہ نے کہا ٹوپی بھی پہن۔ کہا کہ جوتا بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا جوتے بھی پہن۔ کہا کہ جب یہ سب چیزیں ہوں تو ایک سواری بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کہ سواری بھی ہے۔ انھوں نے کہا سواری گھوڑے کی اور اس کے لیے ایک اصطبل اور سائیس بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا، یہ چیزیں بھی موجود ہیں۔ پھر کہا ایک مکان رہنے کے واسطے۔ بادشاہ نے کہا بڑے بڑے عالیشان مکان آپ کے واسطے موجود ہیں۔ کہا کہ پھر ایک سلطنت بھی ہونی چاہیے۔ بادشاہ نے کہا سلطنت بھی حاضر ہے شوق سے تخت پر بیٹھئے اور حکمرانی کیجیے۔ یہ سب پوچھ کر بادشاہ سے کہنے لگے کہ میں پائجامہ ہی کیوں پہنوں جس میں اتنے جھگڑے ہوں اور لمبا جھگڑا ہو۔

غرض جو لوگ عارف باللہ ہوتے ہیں، انھیں ایسے تکلفات سے غرض نہیں ہوتی سادہ زندگی رکھتے ہیں اور عبادات میں مصروف رہتے ہیں اور نہ انکے قلب میں اس سامان کی وقعت ہوتی ہے۔

ایک بادشاہ نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ اگر آپ کسی موقع پر راستہ بھول جائیں اور وہاں پیاس معلوم ہو اور تشنگی بے چین کر رہی ہو اور ایک شخص پانی لے کر آوے اور کہے کہ میں یہ کٹورا پانی آدھی سلطنت کو فروخت کرتا ہوں تو آپ اسے خرید لیں گے؟ بادشاہ نے کہا بلاشک، میں آدھی سلطنت میں اس ایک کٹورا پانی کو خرید لوں گا۔ بزرگ نے کہا، اگر اسی طرح کبھی آپ کا پیشاب بند ہو جائے اور کوئی شخص یہ کہے کہ میں نصف سلطنت کے معاوضہ میں پیشاب بند کھولتا ہوں تو آپ اس پر راضی ہو جائیں گے؟ کہا، بیشک۔ بزرگ نے فرمایا کہ آپ کی سلطنت کی کیا قیمت ہوتی! ایک کٹورہ بھر پانی اور پیشاب؟ ایسی قیمت کی چیز پر نخوت و غرور کرنا اور دوسروں کو حقیر و ذلیل خیال کرنا کہاں تک درست کہا جا سکتا ہے۔

زانکہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیم روز بیک جونمی خرم

ایک عارف کا قول ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہروئے — بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

جس شکستگی کو حقارت سمجھتے ہو اسکی نسبت حدیث قدسی ہے انا عند المنکسرۃ قلوبہم (میں شکستہ دل لوگوں کے ساتھ ہوں) یہی شکستگی شرط وصول ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ — جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود — ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے شفا آنجا رود — ہر کجا رنجے دوا آنجا رود

خدا تک پہنچنے کا صحیح راستہ

ہم لوگوں کو طلب نہیں ہے۔ اگر طلب ہوتی تو اتباع میں تذلل بھی گوارا ہوتا۔ اگر کوئی شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوقہ عاشق سے کہے کہ تمام کپڑے اتار کر لنگوٹ بند ہو جاؤ تب وصل ہوگا۔ واللہ ایسا ہی کریگا۔ اس کو لنگوٹ بند ہونے میں کچھ بھی تامل نہ ہوگا اور اور تمام شرم وحیا بالائے طاق رکھ دی جائے لیکن خدا کے لئے ایسا نہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود — گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

ایک زمانہ نظیر ہے اس کو دیکھئے کیمیاگروں کی حالت سب کو معلوم ہے کہ کپڑا ان کے بدن پر نہیں ہوتا۔ میلے کچیلے اور غلیظ رہتے ہیں لیکن عام لوگوں کے علاوہ والیان ملک اور بادشاہ تک ان کے پیچھے ایک لٹا ہوا حقہ لئے پھرا کرتے ہیں اگر چہ بحقیقت میں وہ کیمیاگر نہ ہو۔ اللہ اکبر! ایسی کیمیا کے لئے اپنے عیش وعشرت اپنی ذاتی عزت وجاہ، وحشمت کو تباہ کر دیا لیکن جن کو سچ مچ کی کیمیا آتی ہے جو لوہے کو سونا بناتے ہیں انکی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اگر انکے پیچھے پھرو تو تعجب نہیں کیونکہ کیمیاگر حقیقت میں وہی ہیں۔ ماحصل یہ کہ اگر تم بھی صحابہؓ سے ارتباط حاصل کرو گے، انکا واسطہ ڈھونڈو گے تو یقیناً کامیاب ہو گے کیونکہ خدا تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتلانے والے یہی ہیں جس طرح کہ

کبوتر کے پاؤں میں لگ کر کعبۂ مقدس میں پہنچ گئی تو ہم بھی اسی طرح صحابہؓ کے پاؤں میں لگ کر کس طرح اللہ تک نہ پہنچیں گے۔ پہنچیں گے اور ضرور پہنچیں گے اور صحابہؓ جیسے واسطہ پیدا کرنا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واسطہ حاصل کرنا ہے تو کامیابی یقینی ہے۔

غرض معرفت و علم ہی نے صحابہؓ کو یہ درجہ دیا ہے۔ علم و معرفت بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔ اگر علم و معرفت کوئی چیز نہیں ہے تو دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا تعلق بھی عمل سے ہے۔ بدون عمل وہ چنداں نافع نہیں۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ طلبا میں علم کا ناز پیدا ہو گیا ہے اور وہ خیال کرنے لگے ہیں کہ یہ علم ہمارے لئے کافی ذخیرہ ہے اور ہم بحیثیت علم ایک بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ عقائد تو ان کے درست ہوتے ہیں لیکن اعمال ان کے ٹھیک نہیں ہوتے۔ غلطی یہ پڑی ہوئی ہے کہ وہ علوم و عقائد ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور عمل کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں ان کو بتلاتا ہوں کہ تم عقائد کے گھمنڈ میں عمل درست نہیں کرتے اور جو کچھ ہے عمل ہی ہے اگرچہ علم و معرفت کے بعد ہی سہی۔

سب کچھ عمل پر موقوف ہے

قنوج میں ایک صاحب عامل بالحدیث سے ملاقات ہوئی مجھ سے کہنے لگے کہ اجی حضرت! ہم صرف نماز ہی کے چند مسئلوں میں حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ باقی معاملات میں حدیث کا نام بھی نہیں لیتے۔ مثلاً میں عطر بیچتا ہوں اور اس میں تیل بھی ملاتا ہوں۔ غرض عملاً ہم بہت کمزور ہیں۔ اسی طرح ہم حنفی ہیں۔ ہمارے عقائد درست ہیں لیکن اعمال کی شکایت ہم میں بھی ہے۔ حالانکہ وہ چیز ہے کہ جس پر سب چیز موقوف ہے۔ ہر چند کہ بعض علوم و معارف ایسے ہیں جن کا عمل سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ خود وہ علوم ہی مقصود ہوتے ہیں لیکن قرآن شریف اور احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غایت بھی عمل سے خالی نہیں۔

تقدیر کی تعلیم کا اثر

مثلاً خداوند تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے کہ:

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولافی انفسکم الافی کتب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولاتفرحوا بما اٰتاکم۔

اس آیت میں مسئلہ تقدیر کی تعلیم کی ہے یعنی جو کچھ مصیبت آفاقی یا انفسی پہنچتی ہے وہ ہم نے پہلے سے لکھ رکھی ہے۔ یہ ایک تعلیم ہے لیکن اس علم میں بھی ایک عملی غایت موجود ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تقدیر کی تعلیم کیوں دی۔ اس لئے کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے فوت ہو جائے اس پر مغموم مت ہو اور جو چیز مل جائے اس پر شاداں نہ ہو (مراد فرح کبر ہے) اس تعلیم میں یہ بھی ایک بڑی خوبی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے بالکل طبیعت کے موافق بتلایا ہے۔ کیونکہ غم ورنج طبعی ہوتا ہے۔ اس تعلیم سے غم کے موقع پر طبعاً تسلی وتسکین حاصل ہو سکتی ہے اور حوادث میں وہ سکون کا باعث ہو جاتی ہے۔ تمام عقلاء جمع ہو کر بھی ایسی تدبیر نہیں بتلا سکتے۔ غرض مسئلہ تقدیر کی ایک غایت تسلی وتسکین اور صبر وسکون بھی ہے چنانچہ لکیلا تاسوا میں اس کی تصریح ہے۔ اور یہ ایک غایت ہے جس کا فائدہ اظہر من الشمس ہے۔ ایک مفروضہ واقعہ سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

خیال کیجئے کہ دو شخص ایک ہی جگہ کے ہوں۔ دونوں کی ہر طرح سے یکساں حالت ہو لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ایک ان میں تقدیر کا قائل ہو اور دوسرا تقدیر کا قائل نہ ہو۔ اور دونوں کے دو لڑکے یکساں ہوں۔ دونوں نے یکساں تعلیم پائی ہو اور دونوں کے والدین نے یکساں تعلیم دی ہو۔ دونوں کے والدین کی امیدیں ان سے وابستہ ہوں۔ اتفاق سے دونوں لڑکے بیمار ہوں یکساں دونوں کا مرض ہو اور معالج دونوں کا بھی ایک ہی ہو۔ ڈاکٹر کی غلطی سے علاج ناکافی ہو اور دونوں مر جائیں۔ دونوں کے والدین کو سخت رنج ہوگا۔ لیکن دونوں کا فرق اس موقع پر تقدیر کے مسئلہ سے ہوگا۔ جو شخص تقدیر کا قائل ہے اس کی زبان سے تو اس موقع پر بے ساختہ یہ کلمہ جاری ہوگا لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا یعنی جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے آتی ہے۔ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔ خدا کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے جو ایک لڑکے کو مار ڈالا تھا اس میں بہتری ہی تھی۔ خداوند

تعالیٰ بلا کسی حکمت کے کوئی کام نہیں کرتا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے والد کے انتقال پر ایک بدوی نے مجھ سے کہا ۔

اصبر نکن صابرین انما — صبر الرعیۃ بعد صبر الراس

"آپ صبر کیجیے، آپ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے ہیں۔ آپکی وجہ سے ہم بھی صبر کریں گے۔"

خیر من العباس اجرک بعدہ — واللہ خیر منک للعباس

آپ کے والد کے مرنے سے کسی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ آپ کو اور اُن کو دونوں کو فائدہ پہنچا۔ آپ کو ثواب ملے گا جو عباسؓ سے بہتر ہے اور عباسؓ کو اللہ میاں مل گئے جو تم سے خیر ہے۔ جب کسی کا نقصان نہیں ہوا تو غم کیسا؟ یہ مقولہ ہے ایک بدوی کا جو تقدیر کا قائل تھا۔ دیکھو اس سے کیسی تسلّی ہو سکتی ہے۔

دوسرا شخص جو تقدیر کا قائل نہیں ہے کہتا ہے کہ لڑکے کو ڈاکٹر کی بے تدبیری نے مار ڈالا۔ اگر ڈاکٹر تدبیر سے علاج کرتا تو لڑکا کبھی نہ مرتا۔ میں ڈاکٹر پر دعویٰ کروں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب پر دعویٰ دائر کر دیا گیا اور بیچارے ڈاکٹر صاحب کو جیل خانہ ہو گیا۔ لیکن وہ حسرت اب بھی موجود ہے کہ اگر علاج میں بے تدبیری نہ ہوتی تو لڑکا نہ مرتا۔ اس سے معلوم ہو گا کہ تقدیر کا قائل ہونا کیا کام دیتا ہے کہ غم کی عمر دو تین ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ قائلِ تقدیر کا سکون غم کے ازالہ کا سبب بن گیا اور منکرِ تقدیر کا غم ہمیشہ باقی رہا۔

اسی طرح ہر علم اور ہر اعتقاد میں ایک غایت عمل کی ضرور ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ خداوند تعالیٰ آخر شب میں آسمانِ اول پر نزول فرماتے ہیں۔ اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ حرکت خداوند تعالیٰ کے لیے خلاف ہے لیکن اعتراض کی نوبت کیوں آتی ہے۔ غایت عمل پر نظر نہ ہونے سے۔ اگر غایت عمل پر نظر ہوتی، یہ اعتراض ہی پیدا نہ ہوتا بلکہ یہ سنتے ہی عزم ہوتا کہ اس وقت توجہ الی اللہ میں زیادہ اہتمام چاہیے کہ وقت قرب و قبول کا ہے۔ اس کا پتا مثال سے ملے گا۔

کوئی حاکم دورہ پر ہو اور کسی جگہ سے قریب آجاوے اور لوگ آکر کہیں کہ فلاں حاکم یہاں سے ۱۰ میل کے قریب آگئے ہیں اور عنقریب آنا چاہتے ہیں۔ اگر اس جگہ کے ملازم

کہنے لگیں کہ کل اتنے دو دو بجے آج اس قدر مسافت طے کر کے کیوں کر آئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ کام نہیں کرتے۔ اگر وہ لوگ کام کرتے ہو "تو قریب ہونے کی توجیہہ نہ ڈھونڈتے بلکہ کام کی درستی کے اہتمام لگ جاتے"۔

اسی طرح حدیث میں خداوند تعالیٰ کے قرب کو اس لئے بتلایا جاتا ہے کہ قرب کے جان لینے سے تنبیہ ہوگی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور بزبانِ حال کہیں گے ۔

امروزہ شاہ شاہان مہمان شدہ آمارہ جبرئیل با ملائک دربان شدہ عمارا

مجھے حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی۔ حدیث پڑھی گئی تھی کہ جو شخص تازہ وضو سے دو رکعت نماز پڑھے اور ان رکعتوں میں حدیث النفس نہ کرے تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت ایسا ہو سکتا ہے کہ نماز میں خیال نہ آوے۔ مولانا نے فرمایا کہ کبھی کر کے بھی دیکھا یا ویسے ہی شبہ کرتے ہو۔

غرض محض الفاظ کی توجیہہ کی تحقیق بیماری کی علامت ہے۔ عمل کو مقصود سمجھنا چاہیے۔ اور اسی وجہ سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا امر کبھی نہیں پوچھا اور نہ کبھی اعتراض کیا۔

سائنس و فلسفہ کی تحقیقات

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ بزرگ نے کیا جواب دیا ہے ۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

کسی اور نے کہا ہے ۔

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبانِ مرغان را

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

وجہ یہ کہ تمہاری عقلوں کا جس قدر احاطہ ہے اللہ میاں کا احاطہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ ان اللہ بکل شئ محیط۔ محیط محاط کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ پانی کے کیڑوں میں سے ایک کیڑا نکال کر دیکھیے کہ بڑے سے بڑے سامان ہیں۔ خدا کی حکمتوں سے جہان مجھو

ہے لیکن وہ سب کے اسرار کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح محققین کی وصیت ہے سے

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو   کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

اور اس مرض سے بڑھ کر علوم غیر شرعیہ کی تحقیق ہے بنصوص شرعیہ سے جیسا آج کل جب کوئی مسئلہ سائنس کا سنا اور اس کو قرآن مجید میں داخل کرنے کی کوشش کی بھلا قرآن مجید میں سائنس و فلسفہ کے مسائل ڈھونڈنا، کواکب وغیرہ کی تحقیقات کرنا لغویات نہیں تو کیا ہے قرآن مجید میں اس کے متعلق اگر کچھ آیا ہے تو وہ توحید پر استدلال کرنے کے لئے آیا ہے تو اس غرض و تفصیل کی حاجت نہیں بہت اجمال بھی کافی ہے حتیٰ کہ بدوی نے استدلال کر لیا ہے۔

البعرۃ تدل علی البعیر والاثر یدل علی المسیر فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاج کیف لا یدل ان علی اللطیف الخبیر۔

یعنی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے۔ یہ تمام چیزیں جو کائنات میں نظر آتی ہیں خدا کے وجود پر کیسے دلیل نہ ہوں گی۔ قرآن مجید میں سائنس و فلسفہ کی تحقیقات دیکھنے کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسی کہ کوئی جوتی سینے کی ترکیب طب اکبر میں ڈھونڈے۔ قرآن مجید طب اکبر ہے۔ جوتی سینے کی کتاب نہیں ہے۔ قرآن مجید میں روحانی تربیت اور اصلاح کے نسخے ملیں گے۔ سائنس و فلسفہ کی لغویات سے اسے کیا تعلق۔ اگر بقدر ضرورت کسی سائنس کے مسئلہ سے توحید وغیرہ پر استدلال کیا گیا ہے تو اس میں کلام نہیں لیکن قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ صحابہ کا خدا کی ذات و صفات پر بحث نہ کرنا امور کائنات کے متعلق کچھ دریافت نہ کرنا اس امر کو بتلاتا ہے کہ یہ سب باتیں زائد از ضرورت ہیں۔ ایک سچے مسلمان کو ایسی باتوں سے کیا واسطہ۔ ایسی علوم وہی مقصود ہیں جن کی کوئی غایت عملی بھی ہو جیسا مسئلہ تقدیر و حدیث نزول الرب میں معلوم ہوا۔

اسی طرح توحید کی غایت میں خداوند تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرمایا ہے قل ھو اللہ احد اللہ الصمد۔ اس صورت میں خدا کی ذات و صفات بیان کی گئی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ جس وقت خدا کو ایسا سمجھو گے غیر خدا پر طمعاً و خوفاً نظر نہ ہوگی جس طرح حاکم کا مقرب رعایا سے نہیں ڈرتا اسی طرح توحید پرست غیر خدا سے نہیں ڈرے گا۔

ہیں۔ چنانچہ گئے اور جاکر اس کو سمجھایا کہ یہ کام بہت بُرا ہے کسی کا ملک چھین لیا ٹیسے گن ہ کاموجب ہے۔ ایسا نہ چاہیے۔ غنیم کہیں ایسی نصیحتوں سے باز رہ سکتا تھا۔ ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ تو مانتا نہیں آپ ہی جانئے دیکھیے آپکا ملک گیا اور اس کا ایمان گیا۔

اسی طرح مولویوں کے کہنے پر چلیے تو سارا گھر بار چھوڑ بیٹھے ہیں بقسم کہتا ہوں کہ اس الزام کی وجہ صرف یہ ہے کہ علماء کی صحبت میں نہیں رہتے۔ ان کے پاس رہنے کے لئے کچھ مدت تو چاہیے۔ زیادہ نہیں تو چالیس دن ہی سہی۔ افسوس ہے اپنے جسمانی معالجہ کے لئے ملازمت سے بوضع تنخواہ رخصت لیتے ہیں۔ گھر کا انتظام کرتے ہیں۔ روپیہ خرچ کرتے ہیں جسمانی مرض کے لئے بیکار رہنا اور نقصان گوارا کرنا منظور ہے۔ معالج ڈاکٹر کو سولہ روپیہ فیس کے دینے منظور لیکن روحانی مرض کے واسطے کچھ بھی نہیں کرتے۔ عربی سول سرجن (مولوی) کے پاس روحانی امراض کے معالجہ کے لئے بہت قلیل مدت چالیس دن اگر رہیں تو تمام اعتراضات وسوالات کے جواب ہوجائیں۔ سب کام طلب اور ضرورت سے ہوتے ہیں چونکہ جسمانی امراض سے صحت مطلوب ہوتی ہے اس کے لئے ہر قسم کے نقصان اور تکلیف گوارا کرتے ہیں اور روحانی مرض سے خود ہی شفا پانا مقصود نہیں ہوتا۔ کاش! وہ اس کے ازالہ کی بھی ایسی ہی تدبیریں کرتے۔ کیا کسی محقق کے پاس چالیس دن رہ لینا بھی کوئی بڑا مشکل کام ہے۔ انشاء اللہ اس کی صحبت ہی تمام تر شبہات کے رفع کے لئے کافی ہوگی۔ زیادہ قیل وقال کی حاجت نہ ہوگی ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

اس کی دلیل یہی ہے کہ آزما کر دیکھ لو۔ بقول مولانا ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب　　گر دلیلت باید از وے رُو متاب

اور چالیس دن کی تخصیص جو میں نے عرض کی ماخذ اس کا ایک حدیث ہے جس کا مضمون ہے کہ جو شخص چالیس روز اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری کرتے ہیں لیکن یہ شرط ہے کہ مولویوں کے پاس رہنا کسی دنیوی غرض سے نہ ہو ورنہ ہرگز فائدہ نہ ہوگا۔

یعنی بچوں کو اگر تم بجائے دودھ کے روٹی کھلانے لگو تو وہ بیچارہ تو چار دن میں ہلاک ہو جائیگا۔ پس ہر شخص کو اس کے تحمّل کے موافق کام بتلانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ہر شخص کو ملازمت چھوڑا کر پہلے ہی دن تارک بنانا شروع کر دو۔ عارف شیرازی ایسے ہی اناڑی شیوخ کو ڈانٹتے ہیں ؎

خستگاں را چوں طلب باشد و ہمّت نبود — گر تو بیداد کنی شرطِ مروّت نبود

لوگ دیوانِ حافظ کو معمولی کتاب سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں تمام تر سلوک ہی سلوک بھرا ہوا ہے اور یہ محض اعتقاد کی بات نہیں ورنہ تم کسی اور کتاب سے تو اتنے مسائل تصوف سلوک کے نکال دو جو واقع میں تصوف کی کتاب نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ مضمون نکلتا اسی جگہ سے ہے جہاں پہلے سے ہوتا ہے۔ آخر دوسرے دیوان بھی تو ایسے موجود ہیں جن میں دیوانِ حافظ کا اتّباع کیا گیا ہے، مگر ان میں سے اتنے مسائل نہیں نکل سکتے کیونکہ وہاں پہلے ہی سے کچھ نہیں۔ غرض عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ جن ضعفا کو طلب ہو مگر ہمّت نہ ہو ان کو ان کی ہمّت کے موافق کام بتلانا چاہیے۔ ہمّت سے زیادہ ان سے کام لینا ظلم اور بے مروّتی ہے۔

میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو آج کل کم کھانے سے نقصان ہوا۔ حضرت مولانا گنگوہی کے ایک مرید کم کھایا کرتے تھے۔ مولانا نے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ دماغ خشک ہو جائیگا اور یہ حدیث پڑھی: المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف۔ کہ مسلمان قوی اور مضبوط کمزور سے بہتر ہے کیونکہ تندرست قوی آدمی دوسروں کی بھی خدمت کر سکتا ہے اور کمزور خود دوسروں پر بار ہوتا ہے۔ تو خواہ مخواہ غذا کم کر کے اپنے کو ضعیف بنانا اچھا نہیں۔ اور متقدمین سے جو ایسے مجاہدات منقول ہیں تو ان کے قویٰ پہلے سے اچھے ہوتے تھے پھر غذا کم کرنے سے ان کو ضرر اور ضعف نہ ہوتا تھا۔ وہ مجاہدات کے بعد اتنا کام کرتے تھے کہ ہم تندرستی کی حالت میں اس کا دسواں حصّہ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر ان مرید صاحب نے مولانا کی ایک نہ سنی اور غذا کم ہی کرتے رہے۔ پھر ان کو کچھ عربی عبارتیں نورانی حروف میں نظر آنے لگیں۔ مولانا سے بیان کیا وہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ بس مجھے کشف ہونے لگا اور میں بڑے درجہ میں پہنچ گیا۔ مولانا نے سُن کر فرمایا، جنون کا مقدمہ شروع ہو گیا۔ تقلیلِ غذا موقوف کر دو۔ دودھ گھی خوب کھاؤ اور طبیب سے دماغ کا علاج کراؤ ورنہ چند دن میں پاگل ہو جاؤ گے۔ مگر وہ

اب بھی بازدم آئے۔ چنانچہ چند روز کے بعد ان کو جنون ہو گیا۔ ننگے بیٹھے رہا کرتے اور ذکر کی بجائے گالیاں بکا کرتے۔

اطباء کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ جدا معاملہ اس کے مناسب کرتے ہیں تو شیوخ کاملین بھلا ایسا کیوں نہ کریں گے۔ اگر فہم ہو تو ان کے پاس رہ کر عامی آدمی بھی اس تفصیل کو سمجھ سکتا ہے چنانچہ ایک شیخ کے پاس ایک مرید رہتا تھا جس کی غذا سب سے زیادہ تھی۔ دوسرے مریدوں نے شکایت کی کہ فلاں مرید بہت کھاتا ہے۔ شیخ نے اس کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی، سالک کو تقلیل غذا اختیار کرنی چاہیے۔ نہ بہت کھانا چاہیے بلکہ اعتدال سے کھانا چاہیے۔ اس نے کہا حضرت! ہر ایک کا اعتدال جدا ہے۔ آپ نے پہلے میری غذا تو دریافت فرمائی ہوتی اس کے بعد معلوم ہوتا کہ میرا اعتدال وہی ہے جو میں نے اختیار کیا کیونکہ میں یہاں آنے سے پہلے پچیس روٹیاں کھایا کرتا تھا اب بارہ کھاتا ہوں تو اعتدال ہوا یا اعتدال سے زیادہ؟ اور جو لوگ خانقاہ میں ۵ روٹیاں کھاتے ہیں ان کی غذا پہلے سات آٹھ روٹیوں کی تھی تو ان کا بھی اعتدال ہے کہ وہ پانچ کھائیں شیخ نے فرمایا کہ واقعی تم سچ کہتے ہو بس اس سے کم مت کرنا اور مریدوں سے فرمایا کہ بھائی وہ زیادہ نہیں کھاتا، اپنی خوراک سے بہت کم کھاتا ہے۔

تو دیکھیے کہ صحبت کی برکت سے اس عامی کو خود معلوم ہو گیا کہ ہر ایک کا اعتدال جدا ہے۔ مجھے اپنی غذا اتنی نہ کم کرنی چاہیے جتنی اور لوگوں کی ہے۔ الغرض شریعت نے تمتع دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ ترجیح دنیا علی الآخرت سے منع کیا ہے۔ پس دنیا کو بقدر ضرورت حاصل کرنا خواہ تجارت سے ہو یا ملازمت سے یہ حرام نہیں۔ ہاں! دین کو برباد کر کے دنیا کمانا حرام ہے۔

ارادۂ دنیا کی قسمیں

اس جگہ شاید طلبہ کو ایک اشکال ہو گا۔ وہ یہ کہ قرآن میں تو ارادۂ دنیا کی مطلقاً مذمت وارد ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلٰھا مذموما مدحورا۔

دایک اور جگہ ہے:۔

ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا ومالہ فی الاخرۃ من نصیب (وامثالہما من الآیات) سو ان آیات میں ارادۂ دنیا پر بھی وعید وارد ہے طلب اور سعی تو ارادہ سے بھی آگے ہے)۔ وہ تو بدرجہ اولیٰ مذموم ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً پس دیگر نصوص کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مطلق ارادہ پر وعید کا ترتب نہیں ورنہ پھر احل اللہ البیع وحرم الربوا کے کیا معنی ہونگے۔ اگر ارادۂ دنیا مطلقاً مذموم ہے تو بیع و شرا کی اجازت کیوں ہے اور شریعت نے کھیتی پر عشر وغیرہ کیوں واجب کیا۔ اموال میں اور جانوروں میں زکوٰۃ کیوں مقرر کی۔ کیونکہ جب دنیا رکھنا ہی جائز نہ ہوگا تو ان حقوق کے وجوب کی نوبت ہی کہاں آویگی بلکہ اس تقدیر پر تو صاف یہ کہہ دیا جاتا تجارت بھی ممنوع ہے اور زیادہ مال جمع کرنا اور بہت سے جانور پالنا بھی حرام ہے۔ حالانکہ نصوص میں زراعت و تجارت اور زیادہ جمع مال کی کوئی ممانعت نہیں۔ ہاں ممانعت کے بجائے ان کے لئے احکام زکوٰۃ وغیرہ مشروع ہیں۔

پس دیگر نصوص کے ملانے سے ان آیات کا مطلب یہ ہے من کان یرید محض العاجلۃ کہ جو شخص صرف دنیا کا ارادہ کرے اس کیلئے یہ وعید ہے یعنی ارادۂ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو دنیا کے محض کا ارادہ کرنا کہ اس کے ساتھ آخرت کا ارادہ بالکل نہ ہو۔ یہ مذموم ہے اور موجب وعید۔ دوسرے دنیا کا ارادہ کرنا آخرت کیلئے کہ تجارت و زراعت و ملازمت بطریق حلال اس لئے کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور اطمینان سے آخرت کے کام بجالائے۔ اس صورت میں اصل ارادہ آخرت ہے اور دنیا کا ارادہ اس کے تابع ہے۔ اس کی مذمت نہیں نہ یہ موجب وعید ہے بلکہ یہ ارادہ تو ایک درجہ میں فرض ہے جسکو یہ حدیث بیان کرتی ہے طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ (رواہ البیہقی والطبرانی والدیلمی عن ابن مسعود وانس وابن عباس رضی اللہ عنہم وبعضہا یؤکد بعضا لاسیما وشواہد کثیرۃ اھ۔ مقاصد حسنہ ص ۴۸ اجامع ۱۲)

اگر ارادۂ دنیا مطلقاً مذموم ہوتا تو قرآن میں صحابہ کی طرف اس کو منسوب نہ کیا جاتا حالانکہ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حق تعالیٰ نے صحابہ کو اس کے سبب پر متنبہ فرماتے

ہوئے بتلایا کہ یہ شکست اس لئے ہوئی کہ ایک جماعت نے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درہ کوہ پر متعین فرما کر یہ حکم دیا تھا کہ تم یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم غالب ہوں یا مغلوب اس حکم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو غالب اور کفار کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر درہ کوہ پر ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور غنیمت کا مال لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرۃ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم۔

کہ تم میں سے یعنی صحابہ میں سے بعض دنیا کا قصد کرتے تھے اور بعض آخرت کا قصد کرتے تھے۔ اس میں صحابہ کی طرف ارادۂ دنیا کی طرف نسبت کی گئی ہے اور جو شخص صحابہ کے فضائل و مقامات سے واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ارادہ مذمومہ کی نسبت صحابہ کی طرف دشوار ہے صحابہ محض دنیا کا ارادہ کبھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہاں کیا مطلب ہے۔ ابن عطاء نے اس کی تفسیر بیان کی ہے یعنی منکم من یرید الدنیا للآخرۃ ومنکم من یرید الآخرۃ الصرفۃ کہ تم میں سے بعضے دنیا کا آخرت کے لئے ارادہ کرتے تھے اور بعض محض آخرت کا قصد کرتے تھے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ جب صحابہ کا ارادۂ دنیا آخرت کے لئے تھا تو وہ مذموم نہ تھا پھر اس کو شکست کا سبب کیوں بنایا گیا؟

جواب یہ ہے کہ ارادہ تو فی نفسہٖ مذموم نہ تھا لیکن وہ غلطی اجتہادی سے مفضی ہو گیا تھا مخالفت حکم رسول کی طرف۔ اس لئے عتاب ہوا

اب مسئلہ بالکل منقح ہو گیا کہ مذمت ارادۃ الدنیا للدنیا کی ہے۔ ارادۃ الدنیا للآخرت مذموم نہیں پس نوکری اور زمینداری و تجارت سے کسی کو منع نہیں کیا جاتا ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اتنی بات دیکھ لو کہ دین تو برباد نہیں ہوتا۔

لفظ دنیا کا نکتہ

آگے حق تعالیٰ ہماری اس غلطی کا منشا بتلاتے ہیں کہ ہم جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اس کا منشا کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا ہی میں اس منشا کی طرف اشارہ فرما دیا ہے، کیونکہ لفظ دنیا دنو سے مشتق ہے جس کے معنی قرب کے ہیں یعنی دنیا کے منافع چونکہ عاجل اور

قریب ہیں اور بالفعل حاصل ہونے والے ہیں اس لئے تم آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دنیا کی لذتیں ہم کو اس وقت حاصل ہیں خواہ وہ لذاتِ مباحہ ہوں یا افعالِ معصیت ہوں۔ اسی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں۔ اور آخرت کی لذتیں و نعمتیں ادھار ہیں اس لئے ان کی طرف وہ کشش نہیں جو دنیا کی طرف ہے چنانچہ ایک آزاد شاعر کہتا ہے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے   عاقبت کی خبر خدا جانے

یہ عذر تھا طالبانِ دنیا کا۔ حق تعالیٰ نے لفظِ دنیا میں اس کو بھی بیان فرما دیا۔ کیا رحمت ہے کہ ہمارا عذر بھی ساتھ ساتھ بیان فرما دیا۔ اور یہ قرآن کی کتنی بڑی بلاغت ہے کہ اس کا کوئی لفظ زائد و بیکار نہیں۔ بہت لوگوں کو اسجگہ لفظِ دنیا اختیار کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ وہ اس کو زائد سمجھتے ہونگے مگر زائد نہیں بلکہ اس میں ہمارے عذر کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے ایسا ہی نکتہ سورۂ عبس میں ان جاءہ الاعمیٰ کے متعلق بیان کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کفارِ قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی عبداللہ ابنِ ام مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور انھوں نے پکار کر کہا یا رسول اللہ علمنی مما علمک اللہ کہ مجھ کو بھی وہ باتیں بتلا دیجیے جو خدا تعالیٰ نے آپ کو بتلائی ہیں۔ اس موقع پر ان صحابی کا سوال کرنا کسی قدر حضورؐ کو گراں گزرا کیونکہ آپؐ کو یہ خیال ہوا کہ اصول کی تعلیم مقدم ہے فروع کی تعلیم پر۔ پھر یہ تو ہر وقت کے ہیں۔ یہ سرداران قریش اتفاق سے آگئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ موقع تبلیغ کا جاتا رہے۔ اور انکی تبلیغ صحابی کی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہ صحابی تو ایمان لا چکے ہیں۔ دوسرے وقت بھی احکام دریافت کر سکتے ہیں اور یہ لوگ کافر ہیں جن کو میرے پاس آنے کی طلب نہیں اس وقت اتفاق سے آگئے تو شاید ان کو تبلیغِ احکام سے ہدایت ہو جاتی۔ اس خیال کی وجہ سے صحابی کے سوال پر قدرے آپؐ کو گرانی ہوئی اور چہرہ پر بھی عبوس کا اثر ظاہر ہوا کہ فوراً حق تعالیٰ کی طرف سے محبت آمیز عتاب نازل ہوا عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ یعنی رسولؐ کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ اعراض کرنے لگے اس وجہ سے کہ اُن کے پاس ایک اندھا آپہنچا۔

تو علماء نے لکھا ہے کہ لفظ اعمیٰ میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر بیان فرمایا ہے

کہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ سے یہ بات بہت بعید ہے کہ کسی کے آنے پر آپ کی پیشانی پر بل پڑیں کیونکہ آنیوالے کی اس سے دل شکنی ہوتی ہے مگر وہ صحابیؓ چونکہ نابینا تھے جن کو حضورؐ کے عبوس کی اطلاع نہ ہوسکتی تھی اس لئے اس موقع پر عبوس کا اثر آپ کی پیشانی پر ظاہر ہوگیا کیونکہ اس سے انکی دل شکنی نہیں ہوتی۔ اگر وہ بینا ہوتے تو ہرگز آپ پر عبوس کا اثر ظاہر نہ ہوتا۔

رہا یہ سوال کہ جب آپؐ کا یہ عذر تھا تو حق تعالیٰ نے عتاب کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ کی بڑی شان ہے۔ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے اخلاق اعلیٰ درجہ کے کامل ہوں پس گو اس جگہ بوجہ ایک عارض کے ان صحابیؓ کی دل شکنی نہ ہوئی لیکن وہ فعل تو ایسا تھا کہ اگر صحابیؓ کو اس کی اطلاع ہو جاتی تو ان کی دل شکنی ہوتی پس ایسا فعل کبھی نہ کیا جانا چاہئے جو آپؐ کے پاس آنیوالوں کیلئے دل شکنی کا سبب کسی درجہ میں بھی ہوسکتا ہے سبحان اللہ! کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔

آج کل لوگ اس کو اخلاص سمجھتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے ناگواری ظاہر نہ کریں اور اگر اس کا اطمینان ہو جائے کہ دوسرے کو ہماری ناگواری معلوم نہیں ہوسکتی تو پھر اس کی رعایت نہیں کرتے حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ یہ بات کمال اخلاق کے منافی ہے۔

اب ایک سوال یہ باقی رہا کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسے اہم کام میں مشغول تھے جو ان صحابیؓ کی تعلیم سے مقدم تھا تو ان صحابیؓ کا اس اہم کام میں مخل ہونا ضرور موجب گرانی تھا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان ناگواری میں مصیب تھے۔ پھر عتاب آپ پر کیوں ہوا؟ ان صحابیؓ پر ہونا چاہئے تھا کہ یہ ایسے ناوقت کیوں آئے؟

جواب یہ ہے کہ لفظ اعمیٰ میں ان صحابیؓ کا عذر بھی مذکور ہے کہ وہ بوجہ نابینا ہونے کے معذور تھے۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ حضورؐ اس وقت کس کام میں مشغول ہیں اور دوسرا جواب حق تعالیٰ نے آگے بیان فرمایا ہے: اما من استغنیٰ فانت لہ تصدیٰ وما علیک الا یزکیٰ! جس کا حاصل یہ ہے کہ جن کفار کو آپؐ تبلیغ فرما رہے تھے وہ طالب نہ تھے محض حضورؐ کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن وہ خود حق سے اعراض کرتے تھے اور صحابیؓ طالب حق تھے۔ اس صورت میں کفار کی اصلاح موہوم اور صحابیؓ کی

اس ناپائیدار مُردار کے لیے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لیے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتے ہیں۔ پھر مزہ یہ کہ یہاں پر معاملہ برعکس ہے کہ دنیا کے عاجل عالیشان خوبصورت بھی زیادہ نہیں۔ آخرت اس سے کہیں وسیع اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوبصورت وعالیشان ہے۔ تو یہاں تم ایک کچے ناپائیدار مکان کے لیے جو عارضۃً مل رہا ہے اور رعایت بھی سال دو سال کے لیے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کے لیے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں شاید ابھی نفس نفس واپس ہو۔ ایسے عمدہ وعالیشان محل کو چھوڑتے ہو جو دوامًا تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔

اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب! دنیا تو اب مل رہی ہے اور آخرت کا معاملہ ادھار پر ہے۔ صاحبو! دنیا تم کو ایک دو لمحہ کیلئے مل رہی ہے جس میں کچھ راحت نہیں کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے جہاں رنج وغم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بیساختہ کہو گے

الحمد لله الذي اذهب عنا الحزن ان ربنا لغفور شكور الذي احلنا دار المقامة من فضله لا يمسنا فيها نصب ولا يمسنا فيها لغوب۔

اب ایک شبہ رہ گیا۔ وہ یہ کہ طالبانِ دنیا شاید یوں کہیں کہ ہم جو تجارت وزراعت میں نفع آجل زائد کو عاجل پر ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارت وزراعت میں وہ نفع آجل چھ مہینہ یا سال بھر کے اندر مل جاتا ہے اور آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ جانے کب ملے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ موجل کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو۔ اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ موجل ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بنا پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔

آخرت کا وقوع

اب دیکھو کہ آخرت کا وقوع محتمل ہے یا یقینی۔ فرماتے ہیں:۔

ان هذا لفي الصحف الاولى صحف ابراهيم وموسى۔

یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم اور موسیٰ

علیہما السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانہ میں دیجاری ہے۔ لہٰذا یہ عذر بھی باطل ہوا اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے۔ مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہو جائیگا اور مرنے میں دیر کیا ہے۔ زندگی کا دو منٹ بھی بھروسہ نہیں لہٰذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور ایک تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں حضرت ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں ہے بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انھوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی تو خدا تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت و راحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب و مقہور ہوئے اور وہ غالب و قاہر ہوئے۔ دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہو گئے اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع و تعظیم کرنیوالے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں۔ تو خیریت و بقاء آخرت کا نمونہ دنیا میں بھی اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ دنیا کی راحت و عزت بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیجائے۔ چنانچہ بحمد للہ ہر زمانہ میں جو لوگ آخرت کے طالب ہوتے ہیں اور اب بھی ہیں ان کو اہل دنیا سے زیادہ راحت و عزت حاصل ہے اور یہی اہل دنیا کا مقصود ہے۔ سو یہ بھی اہل آخرت کو زیادہ حاصل ہے۔ اب اس مضمون پر کوئی اشکال نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دو۔ اس کے بعد طلب دنیا کی بھی ممانعت نہیں۔ بس جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ آخرت تو برباد نہیں ہوتی۔

اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرماویں اور عمل کی توفیق ہو۔

والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ واصحٰبہٖ اجمعین!

سعادتِ سندھ کا مقام

دارالسعود

[illegible]

○

○ ○ ○ دُنیا کو چھوڑنے کا سب کو یقین ہے مگر پھر بھی ہم نے دنیا کو دل سے لگا رکھا ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان ایک تنگ و تاریک گڑھے میں مقید ہو جاتا ہے اور تنہا پڑا رہتا ہے اس تنہائی کے تصور سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے حالانکہ یہ تنہائی موجب راحت ہوگی اور اس خلوت میں وہ لطف ہے کہ بجز انسی اور چیز میں اس کے برابر لطف نہیں !!!

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لآ الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ
وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔

ہیں پھل بھی ہوتے ہیں۔ سایہ بھی ہوتا ہے۔ درخت اور پھول بھی ہوتے ہیں۔ فرحت بخش ہوا بھی ہوتی ہے۔ پانی بھی افراط کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملالو کہ وہ باغ خدائی باغ ہے۔ تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ معمولی باغ نہیں ہے۔ دنیا میں بھی جو سلاطین وامراء کے باغ ہیں ان میں تمام سامان راحت مہیا ہوتا ہے اور عجیب و غریب چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی بادشاہ کے باغ میں محلات وغیرہ کے علاوہ عجائب خانہ بھی ہوتا ہے۔ کسی کے باغ میں سیرگاہیں بینظیر ہوتی ہیں۔ تو اب سمجھ لو کہ خدا کا باغ کیسا ہوگا خصوصاً جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسکی طرف رغبت بھی دلائی ہے۔ تو یقیناً معمولی باغ نہیں بلکہ اس میں عجیب و غریب سامان ہوں گے۔

حاصل یہ ہوا کہ شہداء کو ایسا مت سمجھو کہ وہ مرنے کے بعد گئے گزرے ہو گئے بلکہ وہ ہر قسم کی راحت میں ہونگے۔ یہ خیال صرف کفار و منافقین کا تھا کہ مرنے کے بعد گئے گزرے ہوتے۔ پہلے مسلمانوں کا نہ یہ خیال تھا نہ حال تھا اور آجکل کے مسلمانوں کا گو یہ خیال تو نہیں سنا گیا مگر ان کے حال سے ضرور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرنیوالوں کو گیا گزرا ہوا سمجھتے ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ سمجھتے تو اس کا کچھ اثر تو ظاہر ہوتا۔ جنت کی طرف رغبت تو ہوتی اور آخرت سے توحش تو نہ ہوتا۔ منافقین کی حالت اور اعتقاد تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا وقالوا لاخوانھم اذا ضربوا فی الارض او کانوا غزی لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا لیجعل اللہ ذلک حسرۃ فی قلوبھم۔

کہ ان کو اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے مرنے سے حسرت ہوتی ہے کہ ہائے اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو قتل نہ ہوتے۔ جہاد میں چلے گئے اس لئے مر گئے۔ کفار اور منافقین کی یہ حالت اس لئے تھی کہ وہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ ان کو آخرت کی خبر ہی نہ تھی۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو جہاد میں قتل ہونے سے بالکل گیا گزرا ہوا سمجھتے تھے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کیڑا پتھر میں رہ کر یہ سمجھتا ہے کہ آسمان و زمین جو کچھ ہے سب اسی پتھر کے اندر ہے۔

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں است — زمین و آسمان وے ہماں ست

نیز ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مچھ کا قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ اس کے یہاں قا

چیزیں ہیں۔ برائے نام دونوں میں کچھ مشابہت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے راجہ محمود آباد
نے وائسرائے کی دعوت میں ایک انار تیار کرایا تھا جو دو سو روپے میں تیار ہوا تھا۔ اس کی
صورت اور نام تو انار کا تھا مگر حقیقت میں وہ اور چیز تھی۔ خود قرآن میں ارشاد ہے:۔

قَوَارِيرَ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا

کہ جنت میں چاندی کے شیشے ہوں گے یعنی جن میں آئینہ کی سی شفافی اور صفائی ہوگی۔ اس سے صاف
معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں سے صرف نام میں مشابہ ہیں ورنہ وہاں کی چاندی
آئینہ کی طرح شفاف ہوگی جس میں سے نگاہ آر پار ہو جائے گی۔ دنیا کی چاندی میں یہ بات کہاں
تو اب تم اس تمنا میں ہو کہ مزے یہاں ہوتے ہیں اور مُردے اس تمنا میں ہیں کہ تم وہاں
ہوتے۔ خدا جانے یہاں کیا رکھا ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں ؎

زو ز نقرہ چیست تا مفتوں شوی — چیست صورت تا چنیں مجنوں شوی

دنیا و آخرت کی نعمتوں کی مشارکت

وہاں کی نعمتوں کو حدیث سے معلوم کرو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حوروں کے سر پر ایسی
نفیس اوڑھنیاں ہیں کہ اگر ان کا ایک پلہ دنیا میں لٹک جائے تو آسمان کے چاند و سورج
ماند پڑ جائیں۔ وہاں کی حوریں ایسی حسین ہیں کہ ستر جوڑوں کے نیچے ان کا بدن جھلکتا ہے۔ جنت
کی مٹی جواہرات اور مشک کی ہے حوض کوثر کے پانی کی تعریف یہ ہے:۔

مَنْ شَرِبَ مِنْهُ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ بَعْدَهَا أَبَدًا

جس نے اس سے ایک دفعہ پانی پی لیا اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی اور لطف یہ کہ بدون
پیاس کے بھی اس کی طرف رغبت ہوگی اور اس کا لطف حاصل ہوگا۔ دنیا کے پانی میں پیاس
کے وقت تو مزا آتا ہے بدون پیاس کے مزا نہیں آتا۔ جنت کے پانی کی شان یہ ہے کہ
ایک دفعہ پی کر عمر بھر کے لئے پیاس کی کلفت دفع ہو جائے گی اور بدون پیاس کے اس کا
مزا حاصل ہوگا۔ بتلاؤ، دنیا میں ایسا پانی کہاں ہے جس سے پیاس ہی نہ لگے اور بدون پیاس
کے اس سے مزا آئے۔ اسی پر تمام نعمتوں کو قیاس کر لو کہ نعمائے جنت کو دنیا کی لذتوں سے محض
نام کی مشارکت و مشابہت ہے۔

اب یہ حسرت کرنا کہ ہمارے مردہ عزیز دنیا میں ہوتے اور یہاں کی نعمتوں سے متلذذ ہوتے سراسر حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسے ان نعمتوں کو انکے سامنے رکھو تو شاید اُن کو قے آنے لگے۔

میں نے اسی مضمون سے گنگوہ میں ایک درویش کی اصلاح کی تھی وہ حضرت حاجی صاحب رح سے مرید تھے مگر سماع کے اور بدعاتِ عرس وغیرہ کے عادی تھے۔ وہ گنگوہ میں آئے اور حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر پھول چڑھا کر میرے پاس آئے اور میرے گلے میں بھی پھولوں کا ہار ڈالا اور میرے پوچھنے پر کہا کہ میں ایک باغ میں گیا تھا وہاں سے یہ پھول لایا تھا۔ کچھ تو شیخ کے مزار پر چڑھائے کچھ تمہارے واسطے لایا ہوں کیونکہ تم بھی شیخ کی طرح میرے محبوب ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے شیخ کے مزار پر جو پھول چڑھائے بڑی غلطی کی کیونکہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو شیخ کی رُوح کو ادراک ہے یا نہیں۔ اگر ادراک نہیں تو پھول چڑھانے سے کیا نفع۔ اور اگر ادراک ہے تو بتلاؤ جو شخص جنّت کی شمائم و روائح وعطریات کو سُونگھ رہا ہو اُس کو ان پھولوں کی خوشبو سے کیا راحت پہنچ سکتی ہے بلکہ اس کو تو اُلٹی ایذا رسانی ہوگی۔ یہ بات سُن کر وہ متنبہ ہوئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرکے آئندہ کے لئے اس سے توبہ کی۔

بس آپ اس قاعدہ کو سمجھ لیجیے کہ جنّت کی نعمتوں کے سامنے یہاں کی نعمتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ پھر آپ کو موسمی چیزیں کھاتے ہوئے یہ حسرت نہ ہوگی کہ ہائے ہمارا فلاں عزیز بھی آج ہوتا وہ بھی کھاتا اور اب محروم ہے۔ صاحب وہاں کی نعمتوں سے تو دنیا کی نعمتوں کو کوئی نسبت ہی نہیں۔

چنانچہ ایک فرق بھی ہے کہ یہاں کے تمام لذائذ تھوڑی دیر میں بدبودار پاخانہ بن جاتی ہیں جس کی بدبو سے دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ جنّت کی نعمتوں میں فضلہ بالکل نہیں۔ جیسا چاہو کھا لو ایک ڈکار خوشبودار آجائے گی اور سارا کھانا ہضم ہو جائے گا۔ یا خوشبودار پسینہ آجائے گا اور سارا پانی ہضم ہو جائے گا۔ نہ وہاں پیشاب کی تکلیف ہے نہ پاخانہ کی نہ ہیضہ کا اندیشہ ہے نہ بدہضمی کا۔ وہاں کی راحتیں ہیں تکلیف کا نام نہیں۔ اسی لئے بعض علماء نے لکھا ہے کہ آدم علیہ السّلام کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا وہ دنیا کا درخت تھا جو جنت میں بطورِ امتحان آدم کے لگا دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم